جلد اوّل

توضیحاتِ فکرِ فراہی

علامہ خالد مسعودؒ
تلمیذ
مولانا امین احسن اصلاحیؒ

ترتیب و تدوین

حسان عارف / محسن فارانی

مجلس مرکزیہ حزب الانصار بھیرہ

Marfat.com

Marfat.com

38

بسم اللہ الرحمن الرحیم

توضیحاتِ فکرِ فراہی

علّامہ خالد مسعودؒ

تلمیذ

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

جلد اوّل

ترتیب و تدوین

حسّان عارف / محسن فارانی

مجلس مرکزیہ حزب الانصار بھیرہ

DATA ENTERED

Marfat.com

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

297-08
خ 196 ت
۱۴۵۰۰۳
جلد ۱

نام کتاب	توضیحاتِ فکرِ فراہی
مصنف	علامہ خالد مسعودؒ تلمیذ مولانا امین احسن اصلاحیؒ
ترتیب و تدوین	حسان عارف/محسن فارانی
قیمت	-/600
اشاعت طبع اوّل	اگست 2016ء
تعداد	1100
پرنٹنگ	شفیق پرنٹنگ پریس، لاہور
ناشر	مجلس حزب الانصار، شارع بگویہ، بھیرہ، ضلع سرگودھا
فون نمبر	048-6690847–0321-4868787
ای میل	hassanarif1972@gmail.com

کتاب سرائے
پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات
الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور، پاکستان
فون: 042 37320318 فیکس: 042 37239884

نفیس بک
فضلی بک سپر مارکیٹ
اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 2212991-2629724

مجلس مرکزیہ حزب الانصار بھیرہ

Marfat.com

انتساب

ایک نابغۂ روزگار عالم دین عظیم اور منفرد مفسرِ قرآن اور حدیث کے عالم بے بدل

مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ کے نام

کہ جن کے اصولی و تحقیقی ذہن نے اصولِ تفسیر، نظمِ قرآن، حکمتِ قرآن،

اصولِ فہمِ حدیث، اصولِ فقہ، فلسفہ، تصوف اور سیاست میں

غور و فکر اور بحث و تحقیق کی نئی راہیں کھول دیں۔

Marfat.com

فہرستِ مضامین

پیش لفظ .... پروفیسر ابوسفیان اصلاحی 6

مُصنف کے حالاتِ زندگی .... ڈاکٹر انوار احمد بگوی 8

بابِ اوّل ..... قرآنیات

سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل سے خطاب کی حکمت 12

چھٹے گروپ کی سورتوں کا نظم 17

کیا پُل صراط سے مؤمنین کو بھی گزرنا ہو گا؟ 27

بابِ دوم ..... تدبّرِ حدیث

علمِ حدیث پر تحقیق کی ضرورت 32

تحقیقِ حدیث میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل 35

حدیثِ جبریل علیہ السلام 44

حدیث قتال 56

مُوحدین کے لیے وعدۂ جنت 63

مُوحدین کے گناہوں کی مغفرت 70

ارادہ اور عمل کا صلہ 79

فرائضِ دین کی پابندی کا صلہ 86

عورت کے کردار کے چند قابلِ اصلاح پہلو 94

امانت اور رفعِ امانت 102

جھوٹی قسم اور حق تلفی کا انجام 110

ستاروں کی تاثیر کا عقیدہ 118

مماثل کردار کی یکساں سزا 123

سبعۃ اَحرف کی روایت 130

Marfat.com

باب سوم ...... فکرِ فراہی

علامہ حمید الدین فراہیؒ 138
امام فراہیؒ کی علمی خدمات 148
فکرِ فراہی 156
امام فراہیؒ کا تصورِ حکمت 159
حدیث و سنت کی تحقیق کا فراہی منہاج 166
فکرِ فراہی اور خدمتِ حدیث 177

باب چہارم ...... ذکرِ اصلاحی

مولانا اصلاحی کی علمی خدمات 192
ادارہ تدبرِ قرآن و حدیث ..... ایک تعارف 208
علم و عرفان کے ماہِ کامل کا غروب 214
یادگار سفرِ ہند 237

باب پنجم ...... اسلام اور سائنس

سائنس۔ قرآنِ کریم کے تناظر میں 246
سائنسی تلاش کے مقاصد ... قرآن کے نقطۂ نظر سے 256
سائنس کا صحیح طریقِ کار 264
ٹیکنالوجی اور قرآن 271
حیات و ممات کا راز ... ایک لاینحل مسئلہ 278

باب ششم ...... مقالات

اسلام کا شورائی نظام 286
اسلامی حکومت کا ایک کامیاب تجربہ 290
مسلم امّہ کی بیداری 297
قرآن کا تصورِ جنگ 302
اصلاحِ معاشرہ 315

Marfat.com

پیشِ لفظ

راقم الحروف کو یہ شرف حاصل ہے کہ سرمایۂ فراہی اور فراہیات پر ہونے والی تحقیقات سے وہ کافی حد تک واقف ہے۔ مولانا حمید الدین فراہی کی آفاقیت وعبقریت کا چرچا یورپ، بلادِ عربیہ اور ہند و پاک میں یکساں رہا ہے اور یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سرزمین پاکستان پر مولانا فراہی کا سب سے اولین نام لینے والا ماہنامہ ''شمس الاسلام'' ہے جو ''مجلس مرکزیہ حزب الانصار'' بھیرہ پنجاب کا ترجمان ہے۔ یہ تقسیم ہند سے قبل کی داستان ہے جب مولانا امین احسن اصلاحی کی ذاتِ گرامی سرزمینِ پاکستان کے روبرو بھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ وضاحت بھی یہاں ناگزیر ہے کہ خانوادۂ ذمہ داران مجلس مرکزیہ حزب الانصار مرحوم خالد مسعود (2003-1935ء) کی سسرال ہے۔ گویا ایامِ طفولیت ہی سے مرحوم کے کانوں میں اذانِ فراہی دی جانے لگی تھی، اسی معرفت اور فکرِ فراہی کی شیدائیت نے انہیں عاشقِ قرآنیات بنادیا اور تلمیذِ فراہی مولانا امین احسن اصلاحی کے حضور زانوئے تلمذ تہ کرنے پر مجبور کیا۔ اسی اشتیاق نے انہیں پاکستان میں فکرِ فراہی کا ترجمان بنایا، اب یہی فکر ان کی ردائے زیست بن گئی اور اسی تشخص کے ساتھ وہ دنیا سے رخصت ہوئے۔

مولانا امین احسن اصلاحی کے بعد جن تین شخصیات نے فکرِ فراہی کا آوازہ بلند کیا وہ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، علامہ خالد مسعود اور جاوید غامدی صاحبان ہیں۔ ڈاکٹر اصلاحی کی ''ذکرِ فراہی'' کا جائزہ لیا جائے تو یقیناً یہ ایک بڑا کام ہے لیکن اسے فکرِ فراہی کی ترجمانی سے جوڑنا اربابِ معارف کے لیے مشکل ہوگا۔ جناب غامدی کی ذہانت کی دنیائے قرآنیات قائل ہے لیکن انہوں نے جس انداز سے فکرِ فراہی کی تفسیر وتشریح کی ہے وہ متوسلینِ فراہی کے لئے باعثِ اضطراب رہی ہے۔

1984ء میں جب پہلی مرتبہ راقم الحروف پاکستان گیا تو اس چھوٹے کی دلنوازی اور توقیر وتکریم کے لئے مولانا اصلاحی نے خالد مسعود صاحب کو یاد کیا تھا، اس رجلِ عظیم کی محبتیں اور انکساریاں صفحۂ دل پر اب تک مرقوم ہیں۔ مولانا فراہی کا عکس آپ کی ذات سے جھلک رہا تھا۔ 1984ء کے بعد بیسیوں بار پاکستان گیا اور ہر بار ان کے درِ اقدس پر حاضر ہوا اور لذتِ کام ودہن سے سرفراز بھی ہوا۔ اب جب کہ وہ اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں تو ان کے لائق سپوت جناب حسان عارف کی وہی کرم فرمائیاں احقر کے سر پر ابرِ نیساں بن کر برستی ہیں اور اپنے والدِ محترم کی طرح تسبیحاتِ فراہی ہی ان کا وظیفہ حیات ہے۔

سید سلیمان ندوی (1953-1884ء) کہا کرتے تھے کہ جب مولانا فراہی دارالمصنفین آتے تو ایمان کی بہار آجاتی تھی۔ اس ایمانی بہار، علم وفضل اور زہد وورع کی ثناخوانی اپنی عربی اور اردو دونوں تحریروں میں کی ہے۔ خالد مسعود

Marfat.com

صاحب علم وورع کی انہی صفات کے امین تھے۔ خاکسار نے تین مضامین ان پر تحریر کیے، اس کے علاوہ مختلف مقامات پر ان کی قرآنی تحقیقات کا ذکر بھی رہا ہے اور یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ وہ فکر فراہی کی ترجمانی کرنے والوں میں اب سرخیل کے مانند ہیں۔ خالد مسعود صاحب نے دو زاویے سے مولانا فراہی پر کام کیا ہے۔ ایک تو تحقیقات فراہی کو نہایت سلاست اور متانت وصیانت کے ساتھ اردو میں منتقل کیا۔ مثال میں رسائل الفراہی، حکمت قرآن اور اسباق النحو کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ سورہ القیامۃ کے حوالے سے تدوین قرآن کے متعلق جس منطقی اور انتہائی جامع انداز کو مولانا فراہی نے اپنایا تھا اسی تدوینی بحث کو جس مفصل پیرایۂ بیان کے ساتھ ''حیات رسول امی'' میں پیش کیا گیا ہے اس کی مثال شاید عربی اور اردو مراجع میں دستیاب نہ ہو۔ یہ کتاب اپنی معنویت اور قرآنی طرز استدلال کی وجہ سے انفرادیت کی حامل ہے۔ دوسرا سب سے بڑا کام آپ کا یہ ہے کہ مولانا فراہی کے تصور حدیث کو جس عالمانہ انداز میں پیش کیا ہے اس کی نظیر بھی حلقۂ فراہی میں ملنی دشوار ہے۔ اپنی مختلف تحریروں کے ذریعہ مولانا فراہی پر منکر حدیث کا الزام لگانے والوں کو خاموش کر دیا۔

ہمیں انتہائی مسرت ہے کہ خالد مسعود صاحب کی قرآنیات، حدیث اور کوائف فراہی سے متعلق مختلف تحریریں ''توضیحات فکر فراہی'' کے نام سے پیش کی جارہی ہیں۔ افادات فراہی کے نام سے مولانا فراہی کے بہت سے فکری امتیازات کو اس میں موضوع بحث بنایا گیا ہے اور مولانا کی معروف کتاب ''اسالیب القرآن'' کی اہمیت وافادیت کو منظر عام پر لانے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ یہ توضیحات جو فکر فراہی کی تشہیر وترسیل میں نمایاں کردار ادا کریں گی، ان سے یہی مترشح ہے کہ قرآنیات کے ساتھ احادیث کی باریکیوں پر آپ کی گہری نظر ہے۔ وہ اہل علم جو مولانا فراہی کو فکر سرسید کے تناظر میں دیکھتے ہیں انہیں ان مضامین کو پڑھ کر اپنی فاش غلطی کا احساس ہوگا۔ اسی طرح مولانا امین احسن اصلاحی کے تصور حدیث کے باب میں جنہیں ترددات واضطرابات ہیں اگر انہوں نے معروضیت کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا تو انہیں اپنی کور چشمی کا ضرور احساس ہوگا۔ یہ کہنا بھی لازمی ہے کہ اگر خالد مسعود صاحب نہ ہوتے تو مولانا اصلاحی کی بہت سی تحقیقات اور حدیث پر آپ کے خطبات گردش لیل ونہار کی نظر ہو جاتے۔ خود ''تلخیص تدبر قرآن'' ایک عظیم کام ہے۔ جس کی عظمت کا اعتراف علمی حلقوں کی طرف سے کیا گیا ہے۔ بہر کیف خالد مسعود ایک ایسے شخص کا نام ہے جسے گوشہ تنہائی اور فکر فراہی سے عقیدت تھی اس عقیدت کا قبلۂ اول کبھی بدلا ہوا ایسا دیکھنے میں نہیں آیا۔ تاحیات تفردات فراہی سے وابستہ رہے اور فکر فراہی کے تار جوڑتے رہے۔ اپنے نام کے ساتھ ''تلمیذ امین احسن اصلاحی'' لکھ کر قلزم قرآنیات میں غواصی کرتے رہے۔

توضیحات فراہی کے مرتبین جناب حسان عارف اور جناب محسن فارانی لائق مبارکباد ہیں کہ انہوں نے اتنا حسین قرآنی وعلمی مرقع ترتیب دیا۔ لاریب اس سلسلۂ اخلاص کا ارتباط اخلاص خالد مسعود سے ہے۔ مجھے امید ہے کہ دہلیزِ خالد مسعود سے ہمیشہ نعرہ ہائے فکرِ فراہی بلند ہوتا رہے گا۔ میں آخر میں صاحبزادہ ابرار احمد بگوی صاحب کو اس گرانقدر علمی سوغات کی اشاعت پر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔

پروفیسر ابوسفیان اصلاحی
شعبہ عربی، علی گڑھ، مسلم یونی ورسٹی، انڈیا

Marfat.com

مُصنّف کے حالاتِ زندگی

علامہ خالد مسعود رحمہ اللہ کا تعلق پنجاب پاکستان کے قصبہ للہ تحصیل پنڈ دادن خان ضلع جہلم سے تھا جہاں اعوان قبیلہ کی ایک ذیلی شاخ ثنادھا آباد ہے۔ ایک روایت کے مطابق ثنادھا، اس خاندان کے ایک بزرگ ثناء اللہ کے نام پر موسوم ہے۔ علامہ خالد مسعود کے مورث اعلیٰ کا نام قاضی حسن دین تھا۔ آپ 16 دسمبر 1936ء کو مولانا سیف الرحمٰن رحمہ اللہ کے گھر پیدا ہوئے جو عربی کے استاد اور وسیع المطالعہ عالم دین تھے۔ دورانِ ملازمت وہ کئی جگہوں پر تعینات رہے۔ مولانا سیف الرحمٰن ایک روشن خیال عالم تھے۔ پیروں کے خانوادے سے تعلق کے باوجود وہ کسی سلسلۂ تصوف کے اسیر نہ تھے۔ اپنی اولاد کو بھی انہوں نے کسی خاص مسلک یا فکر کا پابند نہیں بنایا۔ والد کی ملازمت کی بنا پر علامہ خالد مسعود کی تعلیم اسی طرح چل پھر کر کیا مکمل ہوئی۔ میٹرک تک بھیرہ میں زیرِ تعلیم رہے۔ میٹرک اور ایف ایس سی سرگودھا سے کیا۔ بی ایس سی اور ایم ایس سی (کیمسٹری) اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور سے کیا۔ اعلیٰ فنی تعلیم حاصل کرنے کے لیے 1964ء میں انگلستان چلے گئے۔ اس دور میں اسلامی ذہن رکھنے والے جدید تعلیم یافتہ نوجوان غور وفکر کے بعد اپنی صلاحیتیں مجتمع کر رہے تھے۔ علامہ نے اپنے ساتھیوں کی فکری معاونت میں حصہ لیا اور لندن (یو کے) میں غیر ملکی مسلم طلبہ کی ایک تنظیم قائم کرنے میں کامیاب رہے۔ جنوری 65ء میں آپ اسلامک مشن، لندن کے صدر منتخب ہوئے۔ انگلستان اور یورپ کا مقبول اور مشہور رسالہ ''امپیکٹ انٹرنیشنل'' اسی دور کی یادگار ہے۔ کنگز کالج، لندن سے کیمیکل انجینئرنگ میں ڈپلومہ کیا۔ اس تربیت میں ایک خاص بات یہ تھی کہ ڈپلومہ کی سند کے اوپر ہی ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ نے یہ فقرہ ثبت کر دیا کہ (Commended for work on plant Design) گویا علامہ خالد مسعود کی رات دن کی محنت نے پروفیسر سے داد حاصل کر لی تھی۔

ڈگری حاصل کرنے کے بعد انہوں نے گورنمنٹ انڈسٹریل ریسرچ لیبارٹری، لاہور میں ملازمت کا آغاز کیا۔ یہ ادارہ محکمہ انڈسٹریز حکومت پنجاب کا ایک ذیلی ادارہ تھا جو سرکاری خریداریوں میں تکنیکی معیار ملحوظ رکھنے کا پابند تھا۔ بطور ریسرچ آفیسر اور بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر انڈسٹریز، علامہ مرحوم کے ہاتھوں سے لاکھوں کروڑوں کے سامان، مشینری اور کیمیکلز کی فائلیں گزرتی رہیں، مگر کسی ٹھیکے دار کو اپنے حق کے لیے بھاگنا پڑا اور نہ کچھ خرچ کرنا پڑا۔ ان کے پاس فائل جانے سے صرف ان عناصر کو شدید پریشانی لاحق ہوتی تھی جن کی سپلائی مشکوک اور مال ناقص ہوتا تھا۔

میاں نواز شریف کے اولین دورِ اقتدار میں محکمہ صنعت پنجاب کی ریسرچ ونگ ختم ہو جانے کے بعد علامہ خالد مسعود کچھ عرصہ سرکاری Pool میں نئی تقرری کے منتظر رہے۔ بعد میں قائد اعظم لائبریری، باغ جناح، لاہور میں بطور علمی محقق تعینات ہوئے۔ وہاں انہیں اپنے ذوق کا ماحول ملا۔ انہوں نے ایئر کموڈور انعام الحق مرحوم کی نگرانی میں دقیق سائنسی موضوعات کو اُردو

Marfat.com

قالب میں ڈھالنے کا مفید کام سرانجام دیا اور لائبریری نے ان کے متعدد معلوماتی کتابچے اور رسائل شائع کیے۔ علامہ مرحوم کو عربی، فارسی، اردو اور انگریزی زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔

اپنے استاذ امام حمید الدین فراہی کی طرح مولانا اصلاحی نے بھی محسوس کیا کہ تفسیری اثاثے کے بارِ امانت کی تحریر و تسوید اور یوں منتقلی سے اس کا حق ادا نہ ہوگا۔ ضروری ہے کہ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو دین کی طرف راغب کیا جائے۔ چنانچہ انہیں قرآن سے مناسبت رکھنے والی عربی زبان و عربی ادب پڑھا جائے اور مطالعہ قرآن کرنے کا اسلوب سمجھایا جائے۔ اس کام کے لیے مولانا اصلاحی نے اپنی رہائش گاہ واقعہ رحمان پورہ لاہور پر 1962ء میں عملاً حلقہ تدبر قرآن کا آغاز کر دیا چنانچہ علامہ خالد مسعود مولانا اصلاحی کے قائم کردہ حلقہ تدبر قرآن کے تاسیسی شاگردوں میں شامل ہو گئے۔

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ کے سینکڑوں شاگرد تھے، لیکن اپنے جلیل القدر استاذ کی طرح علامہ رحمہ اللہ زندگی بھر قرآن کے طالب علم اور قرآنی علوم و معارف کے ریسرچ سکالر رہے۔ ''تدبر قرآن'' کی تصنیف کے دوران علامہ رحمہ اللہ کو یہ سعادت ملی کہ وہ مولانا رحمہ اللہ کے لیے تحقیقی حوالے اور ریفرنس کتابوں سے متعلقہ مواد تلاش کریں۔ بعض تفسیری مقامات کے لیے علامہ رحمہ اللہ کے تحقیقی مضامین، مولانا نے نہ صرف پسند کیے بلکہ کسی حک و اضافے کے بغیر انہیں شامل جلد کیا۔ تدبر قرآن کی تقریباً تمام جلدوں کی پروف ریڈنگ علامہ مرحوم نے کی۔ کئی امور تفسیر و تحریر مولانا نے ڈسکس کیے اور بارہا اپنے شاگرد عزیز رشید کے ساتھ مشورہ کیا۔

فکر فراہی کے عظیم دھارے میں علامہ خالد مسعود مرحوم کی یہ شرکت و سعادت بلاشبہ امانتِ فکر کی دلالت ہے۔ اسباق النحو، عربی زبان کے قواعد سیکھنے کا منفرد انداز ہے۔ امام فراہی رحمہ اللہ کی یہ تصنیف، اصل میں فہم قرآن کی شاہراہ کا پہلا باب ہے۔ مولانا اصلاحی رحمہ اللہ کی رہنمائی اور نگرانی میں علامہ رحمہ اللہ نے کتاب کو نئی ترتیب، مثالوں اور مشقوں کے ساتھ تالیف کیا۔ اسم، فعل اور حرف کا ضروری تعارف شامل کیا اور اسے جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالا۔ فکر فراہی تفہیم اور ترویج کے لیے علامہ مرحوم نے درج ذیل خدمات سرانجام دیں:

- استاذ امام فراہی رحمہ اللہ کے عربی زبان میں افکار متفرقہ اور اوراق منتشرہ کا بڑا حصہ ہنوز تشنہ تعارف ہے۔ علامہ خالد مسعود نے متفرق اجزاء کو معیاری ترجمے کے ذریعے اردو میں ڈھالا اور میثاق و تدبر میں افادات فراہی کے عنوانات کے تحت پورے حزم واحتیاط سے شائع کیا۔
- استاذ مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ کی مطبوعہ تحریروں اور مقالوں سے مضمونوں کا انتخاب، تزئین و ترتیب اور پھر مقالات اصلاحی جلد اوّل کی اشاعت اور جلد دوم کی ترتیب۔
- کم و بیش 22 سال سہ ماہی رسالہ ''تدبر'' لاہور کے ذریعے مولانا اصلاحی رحمہ اللہ اور امام فراہی رحمہ اللہ کے افکار، نظریات اور خیالات کی براہ راست اور تدبر و تفکر کے ذریعے بالواسطہ تحقیق و اشاعت، تدبر حدیث میں شرح صحیح بخاری رحمہ اللہ (جلد اوّل و جلد دوم) اور شرح موطا امام مالک رحمہ اللہ (جلد اوّل) کی ترتیب و تدوین مولانا کے چند دوسرے شاگردوں کے ساتھ اور تدبر قرآن میں مولانا اصلاحی رحمہ اللہ کے اعلیٰ اور رواں ترجمے کے ساتھ تفسیر سے ماخوذ تلخیص کی تدوین و اشاعت۔

Marfat.com

❀ علامہ مرحوم کی کتاب ''حیات رسول امی ﷺ'' اگرچہ سیرت کی کتاب ہے، لیکن اس کی تصنیف میں وہی فکر اور وہی انداز کارفرما ہے جو فکر فراہی اور طرز اصلاحی کا امتیاز اور اس کی شناخت ہے۔ اس کتاب کے صحیح قدردان بھی وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو نظم اور حکمتِ قرآن کی اہمیت اور ضرورت سے واقف ہیں چنانچہ نو متعارف ''حیات رسول امی ﷺ'' پڑھ کر اصلاحی اور فراہی فکر کی طرف راغب ہو سکتے ہیں۔

❀ ادارہ ''تدبر قرآن و حدیث'' اصل میں تو مولانا اصلاحی رحمہ اللہ کے قائم کردہ حلقہ تدبر قرآن کا ہی پرتو اور تسلسل ہے۔ علامہ مرحوم اس ادارے کے ناظم رہے۔ اس ادارے نے مختصر افرادی قوت کے باوصف بڑے اہم کام سرانجام دیے ہیں جن سے اصلاحی اور فراہی فکر نہ صرف قائم رہا بلکہ توانا پذیر ہوا اور اس شجر طیبہ کی شاخیں پہلے پاکستان میں پھیلیں، پھر اس نے ہندوستان کی شاخوں کو تروتازہ کیا اور اب یہ بہار یورپ اور امریکا تک جا پہنچی ہے۔

علامہ خالد مسعود مرحوم کی زندگی کا ایک انتہائی خوشگوار واقعہ، مدرسۃ الاصلاح، انڈیا میں مولانا اصلاحی سیمینار کی صدارت کے لیے ان کا سفر ہندوستان تھا۔ میری خواہش پر انہوں نے مجھے بھی سیمینار میں شرکت کا دعوت نامہ فراہم کروا دیا تھا مگر میں ملازمتی مجبوری اور ویزا کی پابندی کے سبب نہ جا سکا۔ سرائے میر میں ان کا قیام بڑا یادگار رہا۔ انہوں نے اجلاسوں کی صدارت کی، اپنا مقالہ پڑھا، ندیدہ ہم سفر اصلاحی اصحاب اور ہم فکر اصلاحی احباب کے ساتھ ملاقاتیں رہیں۔ امام فراہی رحمہ اللہ اور مولانا اصلاحی رحمہ اللہ کے قیام سے متعلق آثار دیکھے، ان کی باتیں سنیں۔ اس سفر سے علامہ رحمہ اللہ بہت خوش اور مطمئن تھے لیکن جس نے ان کی مسرت کو بے پایاں بنایا وہ ایک کرسی کی نشست تھی۔ یہ کرسی یا پیڑھی امام فراہی رحمہ اللہ کی تھی جس پر بیٹھ کر وہ پڑھتے پڑھاتے تھے۔ امام فراہی رحمہ اللہ کی 1930ء میں رحلت کے بعد علامہ خالد مسعود مرحوم خصوصی طور پر اس اعزاز کے مستحق ٹھہرے اور تمام رفقاء، اساتذہ اور متعلقین مدرسۃ الاصلاح کی موجودگی میں وہ صدی کے سب سے بڑے مفسر اور محقق قرآن کی نشست پر تشریف فرما ہوئے اور درس قرآن دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ علامہ خالد مسعود مرحوم نے پاکستان میں فکر فراہی کو زندہ رکھا اور مولانا فراہی رحمہ اللہ اور مولانا اصلاحی رحمہ اللہ کے مشن کو باقی رکھا اور ان کے علمی اور فکری کام کو تسلسل دیا۔ سب سے اہم کہ انہوں نے مولانا اصلاحی کے فکر کی حفاظت کی، اس کی من مانی تعبیرات نہیں کی۔ انہوں نے اس فکر کو صحیح نہج جاری رکھا، توضیحات و تشریحات میں اور افراط و تفریط سے بچتے رہے۔ آپ عام معنوں میں مدرسۃ الاصلاح اعظم گڑھ کے فارغ التحصیل نہ تھے مگر نسبی اور درسی اصلاحیوں سے بڑھ کر اصلاحی تھے۔

سوزش جگر ''سی'' ٹائپ کی بیماری کا علامہ خالد مسعود رحمہ اللہ نے بڑی پامردی سے مقابلہ کیا۔ وہ بڑے اطمینان سے اپنی تکلیف بیان کرتے اور بڑے صبر کے ساتھ معالج سے اپنا علاج کرواتے تھے کہ اجل آ گئی اور یکم اکتوبر 2003ء/ 4 شعبان المعظم 1424ھ کو دوپہر کے وقت علامہ خالد مسعود رحمہ اللہ نے اپنے خاندان کے درمیان داعی حق کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

سمن آباد لاہور کی ڈونگی گراؤنڈ میں ایک بڑا جنازہ ہوا اور میت کو ان کے آبائی گاؤں للہ شریف میں لے جایا گیا جہاں ایک بہت بڑا جنازہ ہوا۔ للہ شریف کے بڑے قبرستان کے آبائی احاطہ میں اپنے والدین کے ساتھ آسودہ خاک ہوئے۔

ڈاکٹر انوار احمد بگوی

چیف ایگزیکٹو منصورہ ٹیچنگ ہسپتال لاہور

اگست، 2016ء

Marfat.com

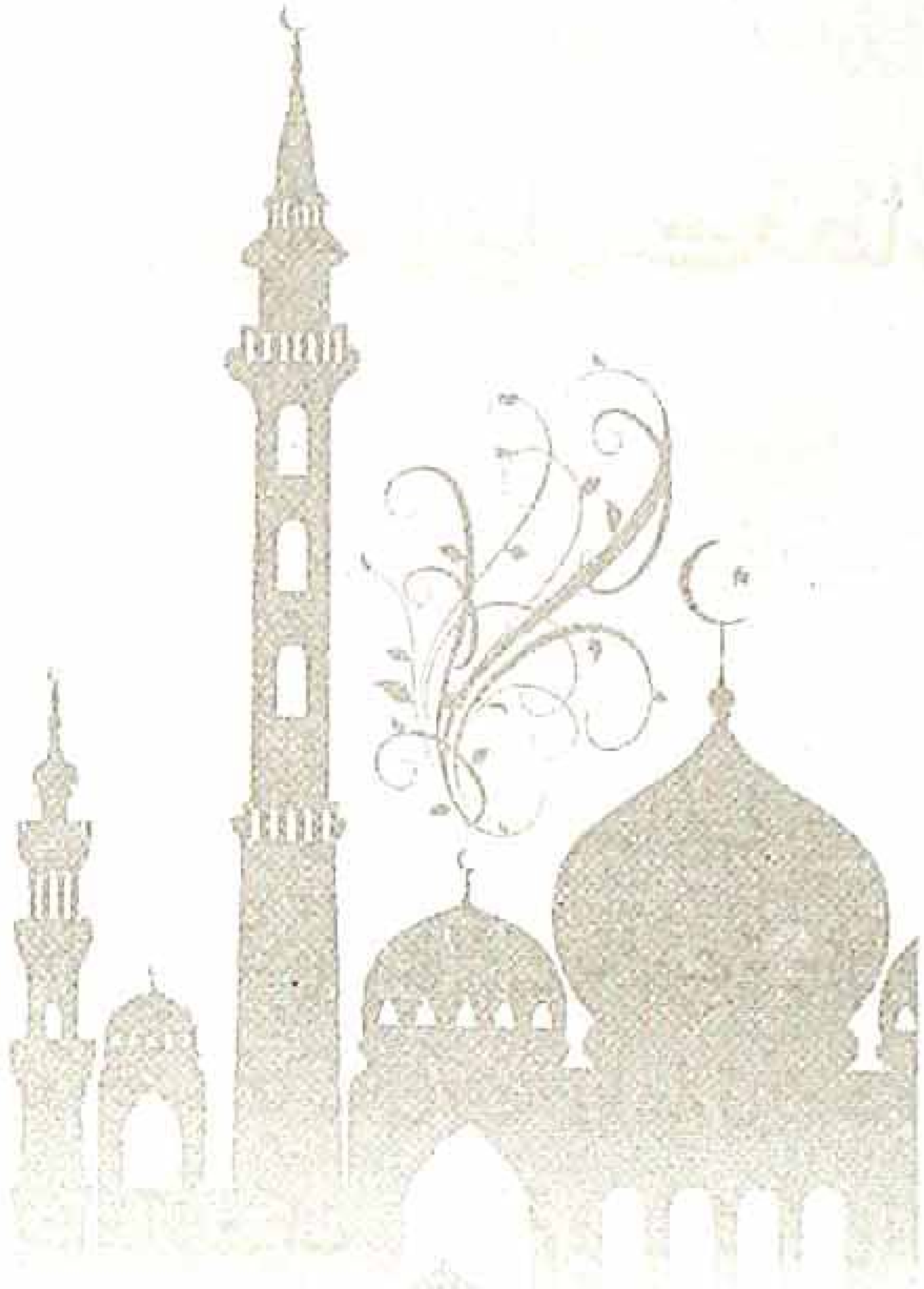

قرآنیات

باب اوّل

سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل سے خطاب کی حکمت

چھٹے گروپ کی سورتوں کا نظم

کیا پُل صراط سے مؤمنین کو بھی گزرنا ہوگا؟

Marfat.com

سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل سے خطاب کی حکمت

قرآن مجید کا آغاز اگرچہ سورۂ فاتحہ سے ہوتا ہے لیکن اہلِ تحقیق کے نزدیک اس سورہ کی حیثیت بندے کی زبان سے ایک دعا کی ہے جس کے جواب میں اللہ رب العالمین نے قرآن مجید کی تعلیم فرمائی جس کی پہلی سورہ البقرہ ہے۔ اس سورہ میں قرآن مجید کو ایک آسمانی کتاب کی حیثیت سے متعارف کرانے اور اس کے نزول کی ضرورت بیان کرنے کے بعد اس پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ دعوت اگرچہ عام ہے لیکن بنظر غائر دیکھنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ قرآن مجید نے خاص طور پر یہود کو خطاب کر کے ان کو ایمان لانے کی دعوت دی ہے۔ اس کے ذیل میں ان کے ساتھ بحث جو چھیڑی ہے تو تقریباً ایک سو آیات تک یہ بحث ختم ہونے میں نہیں آئی۔ قرآن کے ایک طالب علم کے ذہن میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ آخر پہلی ہی سورہ میں یہود کو کیوں مخاطب کیا گیا، ان کی تاریخ کے متعدد واقعات کی طرف اشارہ کرنے کا مقصد کیا ہے، بحیثیت گروہ ان کو کیوں مطعون کیا گیا اور اس ساری بحث کا مدعا کیا ہے؟

یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ قرآن مجید کا یہ دعویٰ نہیں کہ وہ پہلی آسمانی کتاب ہے بلکہ وہ یہ حقیقت بیان کرتا ہے کہ دین شروع سے ایک ہی رہا ہے اور وہ اسلام ہے، خدا کے پیغمبر ہر دور میں اسی کو پھیلاتے رہے، آسمانی شریعت درجہ بدرجہ مختلف امتوں کے حوالے کی گئی اور جب جب ان امتوں نے اس میں بگاڑ پیدا کیا، خدا نے اس بگاڑ کی اصلاح کا اہتمام فرمایا۔ اس حقیقت کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ آسمانی کتابیں پہلے بھی نازل ہوتی رہی ہوں اور ان میں ترمیم و تنسیخ بھی ہوتی رہی ہو۔ لہٰذا قرآن مجید آسمانی کتابوں کے سلسلہ کی آخری کڑی ہے۔ قرآن مجید کے اس دعوے کے نتیجہ میں یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کو منوانے سے پہلے اپنے نزول کا جواز فراہم کرے اور اس قوم کی نااہلیت کو واضح کرے جس کا یہ دعویٰ ہو کہ وہ پہلے سے آسمانی ہدایت کی حامل اور بنی نوع انسان کی تعلیم پر مامور ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو پہلی قوم کی حیثیت عرفی قائم رہتی ہے۔ لہٰذا قرآن مجید نے اپنی پہلی ہی سورہ میں یہود کو خدا کی دی ہوئی امانت کے خائن اور بدعہد ثابت کر کے یہ اعلان کیا کہ اب اس قوم سے یہ امانت واپس لے کر دوسری قوم کے حوالے کی جا رہی ہے اور یہود اب اپنے منصب سے معزول قرار دے دیے گئے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے زمانے سے قریب العہد قوم تو نصاریٰ تھے۔ اس لحاظ سے وہ اس لائق تھے کہ قرآن ان کو مخاطب کرتا اور ان کو ہدایتِ اقوام کے منصب سے معزول کرنے کا اعلان کرتا۔ اس میں کوئی

Marfat.com

شک نہیں کہ نصاریٰ اسلام سے قبل آخری مذہب کے حامل تصور کیے جاتے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ جس آسمانی شریعت کے ماننے والے ہیں وہ وہی ہے جس کے اصل حامل یہود ہیں۔ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قرآن مجید نے رَسُولاً اِلٰی بَنِیٓ اِسۡرَآئِیۡلَ (بنی اسرائیل کی طرف رسول) فرمایا ہے۔ یعنی آپ بنی اسرائیل ہی کی طرف بھیجے گئے رسولوں کے سلسلہ کی آخری کڑی تھے۔ موجودہ انجیلیں بھی اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صرف یہود ہی کی اصلاح سے دلچسپی تھی۔ آپ برملا کہتے تھے کہ مجھے اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی طرف بھیجا گیا ہے۔ (متی 15: 24)۔ آپ نے اپنے حواریوں کو تبلیغ کے مشن پر روانہ کیا تو انھیں خاص طور پر یہ ہدایت کی کہ میری تعلیم اسرائیلیوں کے لیے ہے، اسے غیر اسرائیلی لوگوں کے آگے پیش نہ کرنا۔ (متی 10: 5،6)۔ آپ کی شفا بخشی بھی یہود کے لیے خاص تھی۔ آپ نے ایک اسرائیلی عورت کو تو سبت کے دن بھی شفا دی لیکن ایک کنعانی لڑکی کو شفا دینے سے مسلسل انکار کرتے رہے کیوں کہ وہ اسرائیلی نہ تھی۔ پھر اس کی ماں کے بے حد اصرار کے بعد اس کو دعا دینے پر آمادہ ہوئے۔ آپ کی شریعت تورات ہی کی شریعت تھی، آپ نے مختلف مواقع پر اس کے احکام کی روح کو واضح فرمایا لیکن اس کے احکام کو منسوخ یا تبدیل کرنے کی سعی نہیں فرمائی۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اسلام سے پہلے اصل حامل شریعت گروہ یہود ہی کا تھا۔ نصاریٰ انہی کے حاشیہ بردار اور خوشہ چین تھے۔ لہٰذا قرآن مجید نے جب نئی شریعت دینے کا فیصلہ کیا تو سابقہ شریعت کو کالعدم قرار دینے کے لیے پہلے یہود کے جرائم پر سے پردہ اٹھانا ضروری سمجھا اور نصاریٰ کو ان کے تابع رکھا جیسا کہ ان کی واقعی حیثیت تھی۔

یہود کی تاریخ نہایت طویل ہے۔ اس گروہ کی اپنی خصوصیات رہی ہیں اور خود ان کے ان صحیفوں میں جو اس وقت عہد نامہ عتیق کا حصہ ہیں، ان کے کردار کے برے پہلوؤں پر انبیاء کی زبان سے نہایت سخت تنقیدیں موجود ہیں۔ یہ گروہ ہمیشہ اس زعم میں مبتلا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اقوام عالم میں ایک خاص مقام دے رکھا ہے۔ ان کو جو عزت دی گئی وہ ان کے اولاد اسرائیل ہونے کی بنا پر دی گئی۔ چناں چہ یہ خداوند کی ایک منتخب قوم ہیں، ان کے ساتھ خداوند نے خود میثاق باندھا ہے، لہٰذا ان کے لیے آتش دوزخ کا دائمی عذاب نہیں ہے۔ اس زعم میں یہ نہ صرف قدیم زمانے میں مبتلا رہے ہیں بلکہ عقلیت کے اس دور میں بھی ان کے اندر یہی مذہبی شعور موجود ہے۔ یہودیت کا ایک پروفیسر ڈاکٹر ایلین انٹرمن جو خود بھی یہودی ہے، اپنی کتاب ''یہود'' میں لکھتا ہے:

> ''روایتی طور پر یہودیت نے اپنے آپ کو ایک مذہب نہیں سمجھا بلکہ اس کی نظر میں یہ ان تعلیمات اور احکام کا مجموعہ ہے جو خداوند اور اسرائیل کے میثاق کے تعلق کا نتیجہ ہیں...... موجودہ دور میں روایتی یہودیوں کے اندر یہودیت کو ایک مذہب قرار دینے کے خلاف خاصی مزاحمت پائی جاتی ہے۔ اس کو وہ اپنی حیثیت سے فروتر سمجھتے ہیں۔ وہ یہودیت کو عیسائیت، اسلام یا بدھ مت کی قسم کا مذہب نہیں مانتے، ان کے نزدیک اس کی حیثیت منفرد ہے۔ یہ اپنی طرز کا واحد طرز زندگی ہے جس میں اسرائیل کے ساتھ خداوند کے عہد کے ذریعے خدا کی وحی تعلیم ہوتی ہے۔'' (صفحہ:7)

Marfat.com

مصنف کے مطابق یہود کے اس نظریے میں 70ء میں یروشلم کی تباہی کے بعد سے اب تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ دوسرے الفاظ میں چھٹی صدی عیسوی میں قرآن مجید کے نزول کے وقت بھی یہود کے خیالات یہی تھے۔
دورِ حاضر کا ایک مورخ ڈاکٹر رافیل پٹائی اپنی ضخیم کتاب ''یہودی ذہن'' میں اس بات کی تحقیق کرتے ہوئے کہ یہودی ذہن کے مرکز میں کون سا شعور ہے جو یہودیوں کو غیر یہودیوں سے مختلف کر دیتا ہے، جہاں دوسری خصوصیات بیان کرتا ہے۔ وہاں خداوند اور اسرائیل کے درمیان ایک خصوصی تعلق پر ایمان کو بھی ایک ایسی خصوصیت قرار دیتا ہے جس نے یہود کو ہر زمانے اور ہر علاقے میں ہمیشہ گرمائے رکھا اور اس کے سبب سے انھوں نے غیر یہودیوں سے ہمیشہ اپنے کو ممتاز سمجھا۔

گویا بائبل کے زمانہ سے لے کر آج کے دور تک یہود اس خوش گمانی میں مبتلا رہے ہیں کہ ان کی حیثیت اقوام عالم کے مقابلہ میں بالکل جداگانہ ہے۔ خدا کو اسرائیل کے گھرانے سے خاص محبت ہے کیوں کہ اسرائیلی عیال اللہ ہیں۔ اس محبت کے باعث خدا نے بنی اسرائیل کو اپنی خدمت کے لیے خاص کر لیا ہے۔ اس نے ان کے ساتھ میثاق باندھا ہے جس کی رو سے وہ ہمیشہ اس کے احکام کے محافظ رہیں گے اور وہ ان کو جہنم میں ہمیشہ کے لیے نہیں ڈالے گا۔ خدا اگرچہ تمام دنیا کا خالق و مالک بھی ہے لیکن چوں کہ اس کا میثاق صرف اسرائیل کے گھرانے کے ساتھ ہے، اس لیے دوسری کوئی قوم خدا کے ساتھ اس طرح کا تعلق نہیں رکھ سکتی جو تعلق خدا کا بنی اسرائیل کے ساتھ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس عقیدے کی رو سے نہ یہود کی شریعت کالعدم ہو سکتی اور نہ کوئی دوسری قوم یہ حق حاصل کر سکتی کہ وہ خدا کی ہدایت کی حامل بن کر ابھرے اور یہود کی جگہ لے لے۔ قرآن مجید نے جب نئی شریعت دینے کا ارادہ کیا تو پہلے یہود کے اس عقیدے کو باطل کیا۔

سورۂ بقرہ یہود کے اس عقیدے پر ضرب کاری لگاتی ہے اور اس نے اس کے ہر ہر حصے کی قلعی کھولی ہے۔ اس نے یہ واضح کیا ہے کہ یہود کا اقوام عالم سے انتخاب اسرائیل کے گھرانے سے کسی خاص محبت کی بدولت نہ تھا بلکہ ایمان وعمل صالح کی بدولت تھا اور ہر قوم کے ساتھ جس کو شریعت کی امانت سونپی گئی۔ خدا کا معاملہ اسی بنیاد پر ہوتا رہا ہے، اس میں یہود کو دوسری اقوام پر کوئی خاص ترجیح حاصل نہیں ہے۔ اس سورہ نے میثاق کے تحت یہود کی ذمہ داریاں بتا کر یہ واضح کیا ہے کہ یہود ان کے ادا کرنے میں کس طرح ناکام ہوئے پھر یہود کے اس گمان کی قلعی بھی کھولی ہے کہ خدا ان کو ہمیشہ کے لیے دوزخ میں نہیں ڈالے گا۔

سورۂ بقرہ کی آیات 40 تا 46 میں یہود کو ان کی منصبی ذمہ داریاں یاد دلا کر قرآن مجید پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے کہ یہ ان کے اس عہد کا تقاضا ہے جو انھوں نے خدا سے کر رکھا ہے اور اس کی خبر پہلے سے ان کو دے دی گئی تھی۔ یہود پر اس دعوت کا اثر نہ ہوا اور اس کے اسباب میں ان کی وہی خوش فہمیاں کارفرما تھیں جن کا حوالہ اوپر دیا گیا

Marfat.com

ہے۔ لہٰذا آیات 47 تا 62 میں یہ بیان کیا گیا کہ بلاشبہ اللہ کا بنی اسرائیل پر بڑا انعام ہوا۔ اس نے تمام اقوام پر ان کو فضیلت دی، اس نے ان کو طاقتور دشمن سے اپنے فضل خاص سے نجات دی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں انھوں نے بچھڑے کا بت بنا کر اس کی پوجا شروع کر دی تو خدا نے اس شرک سے بھی ان کی توبہ کو قبول کر لیا اور ان کو آسمانی شریعت عطا فرمائی، خدا نے ان کو پے در پے نعمتوں سے نوازا تا کہ ان کے اندر شکر گزاری کے جذبات پیدا ہوں لیکن ان کے اس انتخاب کا یہ مفہوم کبھی نہیں رہا کہ خدا کو ان سے کوئی گروہی محبت تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کی کوتاہیوں کو وہ نظر انداز کرتا رہتا لیکن وہ تو برابر ان کی زیادتیوں کی سزا دیتا رہا۔ ان کی نافرمانیوں پر ان پر آسمانی عذاب بھی آیا۔ شرارتوں پر ان سے نعمت زائل بھی ہوئی اور وہ خدا کے غضب کے مستحق قرار دیے گئے۔ خدا جب کسی قوم کا انتخاب کرتا ہے تو وہ اس کے نسب کی بنا پر نہیں کرتا بلکہ ایمان و عمل صالح کی بنیاد پر کرتا ہے اور تنہا یہود ہی اس بنیاد پر منتخب نہیں ہوئے بلکہ مسلمان، یہود، نصاریٰ، صابی سبھی اپنے اپنے زمانوں میں اس فضیلت کے مستحق قرار پائے اور سب کے لیے معیار یکساں رہا ہے۔ لہٰذا یہود اپنے دماغ سے اقوام عالم پر برتری کا کیڑا نکالیں۔

آیات 63 تا 90 میں یہود کے اس دعویٰ کو رد کیا گیا ہے کہ خدا کا ان کے ساتھ ایک ایسا عہد ہو چکا ہے جو رہتی دنیا تک قائم رہنے والا ہے۔ ان آیات میں یہ واضح کیا ہے کہ خدا نے شریعت کی پابندی کا بنی اسرائیل سے عہد لیا۔ لیکن اپنی تاریخ میں انھوں نے اس عہد کو پامال کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور چوں کہ کوئی معاہدہ یک طرفہ طور پر نافذ نہیں ہوتا اس لیے خدا نے عہد کی خلاف ورزی پر یہود کو سزا دی۔ سبت کی پابندیوں کو توڑنے والی بستی عبرت ناک انجام سے دوچار ہوئی۔ میثاق پر عمل کرنے میں یہود کس طرح لیت و لعل سے کام لیتے رہے اس کی وضاحت کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس حکم کا حوالہ دیا ہے جس میں انھوں نے یہود کو ایک گائے ذبح کرنے کو کہا تا کہ وہ اس پر قاتل کا سراغ لگانے کے لیے لوگوں سے حلف لے سکیں۔ ایک سادہ حکم پر فوراً عمل کرنے کے بجائے اسرائیلیوں نے سوالات کر کر کے اس کو ایک چیستان بنا ڈالا۔ اس طرح کے رویہ نے شریعت کے معاملہ میں یہود کے دل سخت کر دیے اور یہ واضح احکام میں اپنی مرضی کی تحریف کے مرتکب ہوئے۔ انھوں نے اپنے لیے دل پسند مستقبل کے خواب دیکھے اور ایسے ایسے عقیدے گھڑ لیے جن کا خدائی ہدایت سے کوئی دور کا تعلق بھی نہ تھا۔ اسی ضمن میں ان کا یہ عقیدہ بھی آتا ہے کہ دوزخ کی آگ ان کو بس چند روز کے لیے چھو سکتی ہے ہمیشہ کے لیے نہیں۔ قرآن نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ اگر یہ عقیدہ خدا کے عہد میں لکھا ہوا ہے تو یہود اس کو پیش کریں۔ خدا کی معروف سنت یہ ہے کہ گناہ میں گھر جانے والے شخص کے لیے ہمیشہ کی دوزخ ہوگی جب کہ ایمان و عمل صالح کے ساتھ آدمی ہمیشہ کی جنت میں داخل ہو سکے گا۔ ان آیات میں یہ بھی بتایا ہے کہ یہود نے حقوق اللہ و حقوق العباد میں سے ہر میثاق کو توڑا اور عہد کی خلاف ورزی ان کی عادت ثانیہ بن گئی۔ یہ اپنی مرضی کی توجیہات کر کے عہد کو توڑتے۔ قرآن نے اس کی مثال میں یہ بتایا ہے کہ اپنے ہی بھائی بندوں پر چڑھائی کر کے ان کی تذلیل کرتے اور پھر خود ہی فدیہ دے کر چھوڑ دیتے تا کہ نیکی کا بھرم قائم رہے۔

Marfat.com

خدا نے ان کو عہد کی یاد دہانی کے لیے پے در پے نبی بھیجے اور بالآخر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا لیکن بنی اسرائیل نے برابر تکبر سے کام لیا اور رسولوں کے قتل سے بھی دریغ نہیں کیا۔ اسی عادت کا مظاہرہ وہ قرآن مجید کے مقابل میں کرنا چاہتے ہیں۔

آیت 91 سے آگے قرآن مجید نے یہود کے ان وسوسوں کا جائزہ لیا ہے جو وہ مسلمانوں کے دلوں میں اپنے صاحب ایمان اور حامل کتاب گروہ ہونے کی حیثیت کے بارے میں ڈال رہے تھے۔ یہ ثابت کیا ہے کہ ان کا صاحب ایمان ہونے کا دعویٰ معتبر ہے، نہ حامل کتاب ہونے کا دعویٰ۔ یہ کتاب الٰہی پر سحر و ساحری کو فوقیت دینے والے لوگ ہیں۔ ان کو کتاب دے کر خدا نے اپنے ہاتھ باندھ نہیں لیے ہیں کہ اب وہ کوئی نئی کتاب کسی کو نہیں دے گا۔ اہل کتاب کے لیے نجات کے خاص ہونے کا عقیدہ ان کا خود ساختہ ہے اور اس کا پروپیگنڈہ یہ صرف لوگوں کو اسلام کی راہ سے روکنے کے لیے کر رہے ہیں۔ اس گروہ کے گناہ بہت بڑے ہیں۔ انھوں نے کجروی کے باعث عبادت گاہوں کی حرمت کو بھی محفوظ نہیں رہنے دیا اور توحید کی تعلیم میں بھی انھوں نے شرک کی آمیزش کر دی۔ لہٰذا یہ کسی طور پر اپنے منصب پر قائم رہنے کے حقدار نہیں ہیں۔ آیت 122 میں بنی اسرائیل کو پھر سے خطاب کر کے ان کی ذمہ داریاں آخری مرتبہ یاد دلائی ہیں اور یہ واضح کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ کیے گئے عہد کی بنیاد بھی کردار پر رکھی گئی تھی اور یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ یہ عہد اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والی بد عہد اولاد کے لیے نہ ہوگا۔ اولاد ابراہیم علیہ السلام میں حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے بیٹوں میں جس عہد کا چرچا رہا، وہ یہودیت و نصرانیت نہیں بلکہ توحید خالص پر جمے رہنے کا عہد تھا۔ لہٰذا اب یہود و نصاریٰ کی خواہشات کے علی الرغم امت مسلمہ اسی قدیمی ابراہیمی ملت پر مبعوث کی جارہی ہے اور اہل کتاب کے تمام دعووں کو کالعدم کیا جاتا ہے۔

سورۂ بقرہ کے زیر نظر حصے کے مضامین کا یہ تجزیہ واضح کرتا ہے کہ اس میں بنی اسرائیل کو مخاطب کرنے میں گہری حکمت ہے۔ جو بحث اٹھائی گئی ہے، اسے قرآن مجید کے آغاز ہی میں اٹھانے کی ضرورت تھی اور اس بحث میں جن پہلوؤں کو واضح کیا گیا ہے ان سے نہ صرف یہود کا دعویٰ کالعدم ہوا ہے بلکہ ان سے وہ سنت اللہ بھی سامنے آئی ہے جو منصب ہدایت پر سرفراز ہونے والی قوم کے بارے میں ہے۔ اس کی روشنی میں امت مسلمہ اپنا محاسبہ کر سکتی اور یہود کے سے انجام سے بچ سکتی ہے۔

Marfat.com

چھٹے گروپ کی سورتوں کا نظم

گزشتہ ایک صدی سے مستشرقین قرآن مجید پر جس پہلو سے کام کر رہے ہیں وہ اس کی سورتوں کی موجودہ ترتیب کو غیر عقلی، ناقص، الجھی ہوئی اور غیر مربوط ثابت کرنا اور اپنے زعم میں قرآن کو بہتر ترتیب کے ساتھ مدون کرنا ہے۔ اس مہم میں ان کا سرخیل جرمن مستشرق نولڈکی (Noldeke) تھا۔ اس نے اسلوب بیان کو بنیاد بنا کر مکی سورتوں کے تین اور مدنی سورتوں کا ایک گروپ قائم کیا اور اپنے قیاس کے مطابق سورتوں کو زمانی ترتیب دے کر قرآن کا ایک نسخہ شائع کیا۔ اس خدمت پر پیرس کی ایک اکیڈمی نے 1859ء میں اسے اعزاز سے نوازا۔ اس کے بعد ہوبرٹ گریم (Hubert Grimme) نے سورتوں کی ایک نئی ترتیب ان میں بیان کردہ عقائد کی بنیاد پر قائم کی جس میں توحید و آخرت کے مضامین پر مشتمل سورتیں آغاز میں رکھیں اور پیغمبروں کے واقعات پر مبنی سورتیں بعد میں۔ ایک اور مستشرق رچرڈ بیل (Richard Bell) نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور یہ رائے ظاہر کی کہ قرآن کی مربوط ترتیب قائم کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک سورتوں کو اجزا میں تقسیم نہیں کر دیا جاتا۔

قرآن مجید پر مستشرقین کی ان دست درازیوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ آسمانی ترتیب کو نظر انداز کر کے پانچ مختلف نسخے مرتب کیے گئے ہیں لیکن ان کے دو مرتبین بھی کسی ترتیب پر متفق نہیں ہو سکے اور نہ ہی کسی کی تحقیق کو ان مستشرقین کے اپنے حلقے میں ایسا قبول عام حاصل ہوا ہے جس سے سب مطمئن ہو گئے ہوں۔ چناں چہ دور حاضر کے مستشرق اب یہ تسلیم کرنے لگے ہیں کہ قرآن کی ترتیب کو مربوط بنانے کی کوششیں بار آور نہیں ہو سکیں اور یہ کام ناممکن نظر آتا ہے۔ البتہ اس حقیقت کے باوجود کہ قرآن مجید نے موجودہ ترتیب میں چودہ صدیوں کے دوران کروڑوں انسانوں کو متاثر کیا اور ان کو ہدایت دی ہے، یہ لوگ اس بات پر اصرار کیے جا رہے ہیں کہ اس ترتیب کے ہوتے ہوئے کوئی غیر مسلم مغربی باشندہ قرآن سے متاثر نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کا خود محافظ ہے۔ اس نے ہمیشہ اس کو لوگوں کی دستبرد سے بچایا ہے۔ تاریخ کے اس دور میں جب قرآن کے مربوط و منظم کلام ہونے پر اعتراض ہوئے، اس نے مولانا فراہی رحمہ اللہ کو اس بات کی توفیق دی کہ وہ قرآن مجید کو ایک مربوط کلام کے طور پر سمجھنے کے اصول وضع کریں اور قرآن فہمی کے ایک نئے، فطری اور عقلی انداز سے اہل علم کو روشناس کرائیں۔ اس کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ کی تالیف تفسیر تدبر قرآن نے کلام الٰہی کے ربط

Marfat.com

وترتیب کے حسن کو اس خوبی کے ساتھ واضح کیا کہ مستشرقین کے پیش کردہ اعتراضات ان کی کم علمی یا کج فہمی کا منہ بولتا ثبوت معلوم ہونے لگے ہیں۔ مولانا رحمہ اللہ نے نہایت دلنشین دلائل اور مثالوں سے قرآن مجید کی چند خصوصیات واضح کی ہیں مثلاً یہ کہ اس میں سورتوں کی تقسیم وترتیب مضامین کی بنیاد پر ہے۔ ان مضامین کے بعض پہلو مکی دور میں واضح کیے گئے اور بعض دوسرے پہلو مدنی دور کے حالات میں اجاگر ہوئے۔ لہٰذا ان مضامین کی تکمیل مکی اور مدنی سورتیں مل کر کرتی ہیں۔ اسی لیے مدنی سورتوں کا قرآن مجید میں یکجا نہ ہونا اس کی منطقی ضرورت ہے۔ مضمون کو نقصان پہنچائے بغیر مدنی سورتوں کو ان کی جگہ سے ہٹایا نہیں جاسکتا۔ مولانا رحمہ اللہ نے یہ بات بھی واضح کردی کہ ہر سورہ اپنی جگہ ایک وحدت ہے لیکن اس کے اندر بیان کردہ مضمون کی تکمیل اس سے متصل دوسری سورہ کے مضمون سے ہوتی ہے۔

پورا قرآن اس طرح مرتب ہوا ہے کہ سورتوں کے جوڑے بنتے چلے گئے ہیں۔ البتہ اس نظام کی کچھ تفصیلات ہیں مثلاً کہیں کہیں بعض سورتیں دوسری سورتوں کے لیے دیباچہ یا اس کا تتمہ وتکملہ بن کر بھی آئی ہیں۔ قرآن مجید کا یہ نظام نہایت محکم ہے اور گہرے غور وفکر کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرنے والے ہر شخص کو یہ نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تدبر قرآن کی تالیف سے مولانا اصلاحی رحمہ اللہ نے مستشرقین کی ترتیبِ قرآن بدلنے کی اسکیم کی عقلی واخلاقی بنیاد منہدم کردی ہے۔ اس کے علاوہ تحقیق وجستجو کا ذوق رکھنے والوں کے لیے ایک نیا میدان فراہم کردیا ہے اور وہ قرآن کے عجائب سے بہرہ مند ہونے کی سعادت حاصل کرسکتے ہیں۔

تفسیر تدبر قرآن میں قرآن کے مربوط ومنظم ہونے کے دعویٰ کو جانچنے کے لیے امریکہ کی مشی گن یونیورسٹی میں ڈاکٹر مستنصر میر نے مقالہ تحقیق پیش کیا۔ اس مقالہ میں فاضل محقق نے قدیم وجدید تفاسیر کا جائزہ لینے کے بعد یہ تسلیم کیا ہے کہ مولانا رحمہ اللہ کا تصور نظم قرآن فہمی میں ایک نئی پیشرفت ہے اور مولانا رحمہ اللہ اس بنیاد پر سورتوں کی تفسیر میں کامیاب رہے، البتہ انھوں نے چند سورتوں کے نظم کو قابل بحث پایا۔ ایسی سورتوں کی بیشتر تعداد مولانا اصلاحی رحمہ اللہ کے قائم کردہ سورتوں کے چھٹے گروپ سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ گروپ سورہ ق سے شروع ہوکر سورہ تحریم پر ختم ہوتا ہے۔ اس کی پہلی سات سورتیں مکی اور آخری دس سورتیں مدنی ہیں۔ گروپ کا عمود اثباتِ معاد ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے تجزیہ کا ماحصل حسب ذیل ہے:

(الف): زیر بحث 17 سورتوں میں سے ق اور ذاریات، نجم اور طور، صف اور جمعہ کو تدبر قرآن میں متعین طور پر ایک دوسرے کا جوڑا بتایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مجادلہ اور حشر، طلاق اور تحریم کو اگرچہ متعین طور پر جوڑا قرار نہیں دیا گیا لیکن تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا رحمہ اللہ کے نزدیک یہ جوڑے ہیں۔

(ب): ایک جگہ سورہ رحمٰن اور واقعہ کو جوڑا بتایا گیا ہے اور دوسری جگہ واقعہ اور حدید کا جوڑا قائم کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک قمر اور رحمٰن کو ایک جوڑا اور واقعہ اور حدید کو دوسرا جوڑا ہونا چاہیے۔

(ج): گروپ کی باقی تمام سورتوں...... قمر، ممتحنہ، منافقون اور تغابن...... کے جوڑے متعین طور پر نہیں بتائے گئے

Marfat.com

جب کہ متعین کیے گئے جوڑوں کی رو سے سورہ ممتحنہ بیچ میں تنہا ہے جس سے مولانا رحمہ اللہ کا قائم کردہ اصول مجروح ہو رہا ہے۔

(د): سورہ منافقون کو سورہ جمعہ کا تکملہ بتایا گیا ہے جب کہ سورہ طلاق اور تحریم سورہ تغابن کا تکملہ ہیں۔ اس طرح سورہ تغابن منفرد رہ جاتی ہے جس کا جوڑا موجود نہیں۔ یہاں پھر جوڑوں کا اصول مجروح ہوتا ہے۔

(ہ): مولانا رحمہ اللہ نے سورہ ق، ذاریات اور طور تینوں کو مشترک عمود کا حامل بھی قرار دیا ہے۔ نیز سورہ نجم اور قمر میں مماثلت محسوس کی ہے، جب کہ جوڑے بناتے وقت انھوں نے ق اور ذاریات اور طور اور نجم کے جوڑے تجویز کیے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ بعض مقامات پر تین سورتوں کے مجموعے کسی مضمون کی تکمیل کرتے ہیں لہٰذا توام سورتوں کا تعین کرتے وقت مولانا رحمہ اللہ سے تسامح ہو گیا ہو۔

(و): مولانا رحمہ اللہ نے سورہ طلاق اور تحریم کو سورہ تغابن کا تکملہ وتتمہ قرار دیا ہے۔ دو سورتوں کا تکملہ وتتمہ ہونا تصور نظم کو پیچیدہ بناتا ہے۔

(ز): تدبر قرآن میں سورہ مرسلات اور النبا کو توام قرار دیا گیا ہے لیکن سورہ مرسلات کو ذاریات اور رحمان کے مماثل بھی بتایا گیا ہے۔ اسی طرح واقعہ کی مماثلت سورۃ الحاقہ سے بیان کی گئی ہے حالاں کہ وہ سورہ القلم کی توام بھی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ سورتوں کے جوڑے قائم کرنے کے لیے ان کا متصل ہونا ضروری نہ ہو۔

(ح): چھٹے گروپ کا عمود معاد بیان کیا گیا ہے۔ گروپ کی مکی سورتیں تو اس عمود کے ساتھ مربوط ہیں لیکن سورہ حدید سے آگے یہ عمود گم ہو جاتا ہے۔ سورہ ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون اور تحریم میں عمود کے ساتھ تعلق بالکل سرسری ہے۔ علاوہ ازیں سورہ مجادلہ میں رسولوں کے غلبہ کا مضمون نمایاں ہے تو اس سورہ کو مولانا رحمہ اللہ کے قائم کردہ تیسرے گروپ میں کیوں شامل نہ کیا گیا جس کا عمود ہی رسولوں کا غلبہ ہے۔ اسی طرح سورہ طلاق اپنے مضمون کے اعتبار سے پہلے گروپ کی احکامی سورتوں میں شامل ہونے کے قابل تھی، اسے وہاں کیوں جگہ نہ دی گئی؟

ڈاکٹر صاحب کے یہ نکات ایسے ہیں جن پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے تا کہ قرآن کے نظم کے بارے میں جو بنیادیں تفسیر تدبر قرآن نے فراہم کی ہیں، ان پر چھٹے گروپ کی سورتیں حل ہو سکیں۔

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب کے اس تجزیہ سے پانچ اصولی بحثیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ کیا دو سورتوں کے جوڑا ہونے کے تصور کے لیے یہ بات ناگزیر ہے کہ وہ سورتیں متصل بھی ہوں؟ اتصال کی شرط کے بغیر ایک ہی عمود کی حامل دو سورتوں کو جوڑا قرار نہ دیا جا سکتا ہو۔ دوسری یہ کہ بعض سورتیں اپنے عمود کے لحاظ سے سورتوں کے کسی دوسرے گروپ میں شامل کیے جانے کے لائق ہیں، آخر ان کو چھٹے گروپ میں کیوں جگہ دی گئی؟ تیسری یہ کہ گروپ کی مدنی سورتوں کا تعلق گروپ کے عمود کے ساتھ کیوں واضح نہیں ہے؟ چوتھی یہ کہ سورتوں کے توام ہونے کے تصور میں تکملہ کی حیثیت کی حامل سورتوں کا مقام کیا ہے؟ پانچویں یہ کہ سورہ ق یا تحریم یعنی چھٹے گروپ میں کون سی سورہ

Marfat.com

کس کا مثنیٰ ہے؟ مناسب ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب کے قائم کردہ الگ الگ نکات پر بحث کرنے کے بجائے ان اصولی مباحث پر گفتگو کی جائے۔

دو سورتوں کے توام ہونے کے لیے اتصال کی شرط:

قرآن مجید کے بارے میں یہ حقیقت کوئی راز نہیں کہ اس کے مضامین ادل بدل کر مختلف سورتوں میں بیان ہوتے ہیں۔ مضامین کی یکسانی کے علاوہ نہج استدلال اور اسلوب بیان میں مماثلت مختلف سورتوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ مناسبتیں ایسی ہیں جن کی بنا پر مختلف گروپوں میں شامل یا ایک ہی گروپ کی بعید سورتیں ایک دوسرے کے مماثل قرار دی جاسکتی ہیں۔ لیکن دیکھا گیا ہے کہ ایسی دو سورتوں کا مضمون یا اسلوب بیان مماثل ہونے کے باوجود فی الجملہ اپنے اپنے گروپ کی مقامی ضرورت کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر وہاں سے اس کو نکال دیں تو مقامی مضمون تشنہ رہ جائے گا۔ فاضل محقق کی پیش کردہ مثالوں میں سورہ مرسلات اور ذاریات کی مماثلت محض ضمنی اور ان کی قسموں یا اثبات معاد کے مضمون کی یکسانی تک محدود ہے۔ اسی طرح مرسلات اور رحمان کی مماثلت آیاتِ ترجیع کے استعمال کی بنا پر ہے۔ فی الجملہ ان میں مضامین کا اشتراک نہیں پایا جاتا جب کہ ذاریات اور رحمان چھٹے گروپ میں اپنی اپنی جگہ عمود کے ساتھ پوری طرح وابستہ ہیں۔ اسی طرح مرسلات اپنے مقام پر ساتویں گروپ کے عمود کے تقاضوں کو پورا کر رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ دو سورتوں کے توام ہونے کا تصور ان کے اتصال کی شرط کے ساتھ ہی معنی خیز ہے۔ غیر متصل سورتوں کو باہمی مماثلت کے باعث مماثل تو کہا جاسکتا ہے، توام قرار نہیں دیا جاسکتا۔

دوسرے گروپ کے عمود کی حامل سورتیں:

ٹھیک یہی استدلال ان سورتوں کے حق میں بھی ہوگا جن کا عمود کسی دوسرے گروپ سے تعلق رکھتا ہو۔ جس طرح ایک ہی مضمون کی بازگشت مختلف سورتوں میں سنائی دیتی ہے۔ اسی طرح ایک ہی عمود کی بازگشت بھی مختلف گروپوں میں سنائی دیتی ہے۔ اور قرآن مجید کے اسلوب کا ایک معروف پہلو ہے۔ لہٰذا اگر رسولوں کے غلبہ کے مضمون پر مشتمل ایک الگ گروپ موجود ہے تو اس کے ساتھ دوسرے گروپوں میں ایسی سورتیں موجود ہوسکتی ہیں جن کا عمود غلبۂ رسل یا اس سے ملتا جلتا کوئی مضمون ہو جب کہ ان گروپوں کی مقامی ضرورت اس بات کی متقاضی ہو کہ وہاں یہ مضمون بیان کیا جائے۔ لہٰذا غلبۂ رسل کے مضمون کی حامل سورہ مجادلہ اور طلاق کے مضمون پر مشتمل سورہ طلاق کے چھٹے گروپ میں آنے میں کوئی قباحت نہیں۔ یہ دونوں مضمون جس پہلو سے بیان ہوئے ہیں اس پہلو کا واضح ہونا اس گروپ کی مقامی ضرورت تھی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے توحید کا مضمون اگرچہ پانچویں گروپ (سورہ سبا تا سورہ حجرات) کا عمود ہے لیکن یہ مضمون مقامی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے دوسرے تمام گروپوں میں بھی موجود ہے۔ پس کسی سورہ کی موزونیت گروپ کی دوسری سورتوں کے ساتھ دیکھنے کے لیے قابل غور چیز صرف یہ ہوتی ہے کہ ان کا مضمون جہاں بیان ہوا کیا سیاق وسباق اس کا متحمل تھا یا نہیں؟ اگر وہ اس جگہ اسی طرح مناسب ہو جس طرح انگشتری

Marfat.com

میں نگینہ ہوتا ہے تو پھر یہ سوال خارج از بحث ہو جاتا ہے کہ اس کو دوسری کوئی جگہ کیوں نہ دی گئی۔ سورہ مجادلہ، حشر، ممتحنہ اور صف میں رسول اللہ ﷺ کے غلبہ کا مضمون چھٹے گروپ کے عمود سے تعلق رکھتا ہے، جیسا کہ ہم آگے واضح کریں گے۔ اگر یہ مضمون یہاں بیان نہ کیا جاتا تو قرآن کا ایک مقدمہ بے دلیل رہ جاتا جو چھٹے گروپ میں قائم کیا گیا ہے۔

مکی و مدنی سورتوں کا گروپ کے عمود سے تعلق:

یہ بات کہ چھٹے گروپ کی مکی و مدنی سورتوں میں عمود کا اشتراک نہیں، قلت تدبر کا نتیجہ ہے۔ اصولی طور پر جاننا چاہیے کہ چھٹے گروپ کا مرکزی مضمون اثبات معاد مکہ میں جب سنایا گیا تو اصلی مخاطب مشرکین تھے۔ مدینہ میں ماحول بدل گیا۔ وہاں جن طاقتوں کے ساتھ معاملہ درپیش تھا ان میں یہود، یہود کے ایجنٹ منافقین اور مسلمان شامل تھے۔ ان تینوں کے تعلق کی بنیادیں بالکل مختلف تھیں اور مرکزی مضمون کے حوالے سے ان کو جو تعلیم دینی چاہیے تھی وہ اس سے مختلف انداز ہی میں دی جاسکتی تھی جو مکہ میں اختیار کیا گیا۔ مکہ میں اگر مشرکین کو دو عذابوں سے ڈرایا گیا تو یہاں بھی یہود کو دو عذابوں کی وعید سنانا قابل فہم ہے۔ منافقین کا طرز عمل اگر معاد اور آخرت کے محاسبہ سے بے خوفی پر مبنی تھا تو اس کردار کو بھی موضوع بنایا جاسکتا تھا اور اگر مسلمان کوئی ایسی کمزوری دکھاتے جو ان کے ایمان بالآخرۃ کی کمزوری پر دلالت کرتی تو اس کو بھی اس گروپ میں زیر بحث لایا جاسکتا تھا اور ان کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلائی جاسکتی تھیں۔ لہٰذا سوچنے کا انداز یہ ہونا چاہیے کہ جس گروپ کی سورتیں ہمارے پیش نظر ہیں اس گروپ کے مرکزی مضمون کے تقاضے مکہ میں کیا تھے اور مدینہ میں کیا۔ جب ماحول کی تبدیلی، مخاطبین کے فرق اور عملی زندگی کے تقاضوں کو مدنظر رکھا جائے گا تو پھر ان شاء اللہ ہر سورہ اپنے گروپ کے عمود سے مربوط نظر آئے گی۔ تب اندازہ ہوگا کہ عمود کہیں گم نہیں ہوا بلکہ دوسرے پہلو سے وہ ہر سورہ میں سرایت کیے ہوئے ہے۔

تکملہ سورتوں کا مقام:

تکملہ اور تتمہ ہونے کا تصور تدبر قرآن میں دو طرح کا دیا گیا ہے۔ ایک تو بعض آیات ہیں جو کسی مضمون سے پیدا ہونے والے اشتباہ کو رفع کرنے یا اس کے کسی دوسرے پہلو کو واضح کرنے کے لیے دوسری آیات کے لیے بطور تکملہ و تتمہ آئی ہیں۔ ان کو قرآن مجید میں انہی سورتوں کے اندر جگہ دی گئی ہے جن میں اصل مضمون بیان ہوا ہے۔ سورہ بقرہ اور سورہ نساء میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ دوسرا تصور بعض سورتوں کے سابق سورتوں کا تکملہ و تتمہ ہونے کا ہے۔ اس میں فائدہ کی نوعیت تو اسی طرح کی ہے جیسی پہلے تصور میں ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ ان میں سورہ کے کسی مضمون کو اس انداز سے لیا جاتا ہے کہ وہ بجائے خود مکمل ہو جاتا ہے اور اس لائق ہوتا ہے کہ اسے الگ سورہ کی حیثیت دی جائے۔ تکملہ ہونے کے باعث ایسی سورہ کو تمہید وغیرہ کی ضرورت تو نہیں ہوتی اور یہی اس کے تکملہ ہونے کی پہچان ہے، لیکن جب وہ سورہ ایک وحدت اختیار کر گئی اور ایک مستقل مضمون کی حامل ہوگئی تو سابق سورہ کا تکملہ و تتمہ کا مضمون

Marfat.com

رکھنے کے باوجود بطور سورہ کسی دوسری سورہ کے ساتھ جوڑا بنانے کی صلاحیت کی حامل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس کے لیے یہ بھی موزوں ہوتا ہے کہ کسی سورہ کے ساتھ اس کا جوڑا بنا دیا جائے۔

چھٹے گروپ کی توام سورتیں:

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ چھٹے گروپ کی کون سی سورتیں توام ہیں تو یہ ایک مشکل سوال ہے جس کے جواب کے لیے بڑے تفکر و تدبر کی ضرورت ہے۔ البتہ ایک بات واضح ہے کہ قرآن مجید اپنی موجودہ ترتیب میں اس قدر مربوط اور مختلف سورتوں کے مضامین ایک دوسرے کے اندر اس قدر پیوست ہیں کہ سالہا سال تک غور و فکر کرنے والے شخص کو بھی یہ اشتباہ پیش آ سکتا ہے کہ وہ کسی سورہ کو ماسبق سے جوڑا قرار دے یا مابعد سے۔ سورتوں کی باہمی مناسبتیں اس کا دامن کھینچتی ہیں اور بسا اوقات وہ متعین طور پر جوڑا بتانے میں دشواری محسوس کرتا ہے۔ مولانا اصلاحی رحمہ اللہ نے تفسیر میں ہر جگہ یہ التزام نہیں کیا کہ وہ سورتوں کے جوڑوں کے افراد متعین کرتے جائیں۔ انھوں نے تفسیر کے انداز ہی سے عموماً سورتوں کی مناسبتیں واضح کی ہیں اور فیصلہ قاری پر چھوڑا ہے۔ اب چوں کہ ڈاکٹر صاحب نے چھٹے گروپ کی بہت سی سورتوں کے بارے میں سوال پیدا کر دیے ہیں، اس لیے ذرا تفصیل سے سورتوں کے مضامین کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔

میری رائے میں اگر چھٹے گروپ کی پہلی سورہ ق کو گروپ کے لیے تمہید کی حیثیت دے دی جائے تو آگے کی سولہ سورتوں کو آٹھ جوڑے قرار دینے سے ربط بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

سورہ ق:

اس سورہ میں حشر و نشر کا اثبات کیا گیا ہے۔ اس پر قرآن مجید کی تعلیمات کو شاہد قرار دیا گیا ہے۔ بتایا ہے کہ مخاطبین متناقض باتوں میں پڑ کر روز حشر کو جھٹلا رہے ہیں حالاں کہ آفاق میں اللہ تعالیٰ کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کی نشانیں اس بات کی غماز ہیں کہ یہ دن آ کر رہے گا۔ ماضی میں مکذبین کا یہ انجام کہ وہ دنیا میں بھی عذاب کا نشانہ بنے اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ خدا جزا و سزا سے بے تعلق نہیں۔ سورہ اس نظام کی تفصیل بیان کرتی ہے جو اعمال کے محاسبہ کے لیے قائم کیا گیا اور ان صفات کی نشان دہی کرتی ہے جو آدمی کو جہنم یا جنت کا مستحق بنانے والی ہیں۔ سورہ کے آخر میں یہ بتایا ہے کہ کفار کی قوت عذاب کی راہ میں مزاحم نہ ہو سکے گی اور مسلمانوں کو استقامت، تسبیح و تحمید اور انجام کے انتظار کا حکم دیا گیا ہے۔

آگے کی سورتوں میں سورہ ق کے ان مضامین کو الگ الگ لے کر ان پر مفصل بحث ہے۔ اس کے متصلاً بعد آنے والی سورتیں ذاریات اور طور نہایت واضح جوڑا بناتی ہیں، اور ان تینوں سورتوں کے مضمون کی یکسانی کے باعث مولانا رحمہ اللہ نے ان کو مشترک عمود کا حامل قرار دیا ہے، لیکن سورہ ق کے مضامین میں عمومیت و تنوع اور ذاریات و طور میں مخصوص ایک مضمون پر بحث کی وجہ سے یہ کہنا قرین قیاس ہے کہ سورہ ق منفرد سورہ ہے اور گروپ کی تمہید کے طور پر

۱۴۵۰۰۳
Marfat.com

آئی ہے۔ یاد رہے کہ پہلے گروپ میں سورہ فاتحہ بھی تنہا بطور تمہید ہے اور آگے کی چار مدنی سورتیں دو جوڑے بناتی ہیں۔

سورہ ذاریات اور طور:

سورہ ق میں مکذبین کے لیے آخرت اور دنیا کے دو عذابوں کا مضمون بیان ہوا۔ ذاریات اور طور دونوں سورتوں کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ ان کے لیے عذاب کی دھمکی پوری ہو کر رہے گی۔ اس دھمکی میں مومنین کے حسن انجام کی خبر بھی مضمر ہوتی ہے، اس لیے ذاریات میں دنیاوی عذاب کی صورت میں اور طور میں آخرت کے عذاب کے پس منظر میں متقین کے اچھے انجام کو خوب نمایاں کیا گیا ہے۔

دونوں سورتوں کی مماثلت بالکل واضح ہے۔ دونوں کا آغاز آفاقی قسموں سے ہوتا ہے، مقسم علیہ دونوں کا ایک ہے۔ دونوں میں قریش کا یہ رویہ کہ وہ معاملہ کو سمجھنے کے بجائے اس کو باتوں میں اڑانے کی کوشش کر رہے ہیں، زیر بحث آیا ہے اور ان کے اس طرز عمل کا نتیجہ نیز متقین کا انجام بیان ہوا ہے۔ قریش کے طرز عمل کے پیچھے کارفرما عامل کی حیثیت سے شرک کا تذکرہ دونوں سورتوں میں کیا گیا ہے۔

ذاریات میں قریش کی سخن سازیوں اور شرک کا تذکرہ مجمل ہے جب کہ طور اس کی تفصیل کرتی ہے۔ اسی طرح ذاریات میں جنت کا بیان مجمل لیکن طور میں نہایت مفصل ہے۔ دونوں سورتوں کے اسلوب اور پیرایۂ بیان میں حیرت انگیز مماثلت ہے۔ عمود کی یکسانیت اور اسلوب کی مماثلت کی بنیاد پر یہ دونوں سورتیں جوڑا ہونے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

سورہ نجم اور قمر:

ان سورتوں میں ذاریات و طور سے مرکزی مضمون اور اسلوب کی مغائرت نمایاں ہے، اگرچہ ان کے مضامین انھی کے عمود سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کا عمود یہ ہے کہ قرآن مجید کی نعمت کے باوجود جو لوگ اس کی لائی ہوئی خبر معاد وجزا کو اہمیت نہیں دے رہے ہیں، ایسے مکذبین کے بارے میں اللہ کا اخروی و دنیوی عذاب کا فیصلہ ناطق ہوگا جس سے کوئی چیز انھیں بچا نہ سکے گی۔

دونوں سورتوں کی مماثلت واضح ہے۔ ان کا آغاز آسمانی اجسام کی قسم سے ہوا ہے۔ دونوں میں وحی کی خبر کی اہمیت بتائی ہے اور اس پر اعتماد کرنے کو کہا ہے۔ دونوں میں پیغمبر ﷺ سے اعراض کرنے اور وحی کی بات نہ ماننے والوں کے انجام کی خبر دی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ اللہ کا فیصلہ بندوں پر ناطق ہوگا۔

سورہ نجم میں انفرادی سعی و عمل پر آخرت کے انجام کے مترتب ہونے کا مضمون ہے۔ بتایا ہے کہ قیام آخرت کا مقصد اعمال کا بدلہ دینا ہے جس طرح دنیا میں کامل اختیار اللہ کا ہے۔ اسی طرح آخرت میں بھی ہر چیز اس کے اختیار میں ہوگی اور خدا کے فیصلہ سے کسی کو کوئی شفاعت نہ بچا سکے گی۔ سورہ قمر میں مکذبین کی تاریخ سے عبرت حاصل کرنے کو کہا ہے اور بتایا ہے کہ ماضی میں ایسی قوموں کو کوئی چیز خدا کے عذاب سے نہ بچا سکی اور مستقبل میں قریش کو بھی ان کی جمعیت اس سے نہ بچا سکے گی۔

Marfat.com

رحمان اور واقعہ:

ان سورتوں کا مضمون ق میں بھی مجمل طور پر موجود ہے اور اوپر کی سورتوں نجم اور قمر سے بھی پیدا ہوا ہے۔ ان دونوں سورتوں میں قرآن کا باعث رحمت ہونا اور آفاق میں بکثرت نشانیوں کا قرآن کی دی ہوئی خبر معاد پر دلالت کرنا بیان کیا گیا ہے۔ دونوں میں جنتوں کا تنوع مفصل بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ جس طرح دنیا میں ہر چیز خدا کے کنٹرول میں ہے اسی طرح آخرت میں بھی ہوگا اور خدا عدل وقسط کے تمام تقاضے پورے کرے گا۔ رحمان میں قرآن، آفاقی نشانیوں اور آخرت میں جہنم وجنت کا واضح تصور دیا ہے۔ واقعہ میں مضامین یہی ہیں، ان کی ترتیب بس بدل دی ہے۔ واقعہ میں جہنم و جنت کا بیان پہلے ہے، اس کے بعد آفاقی نشانیاں اور آخر میں قرآن کی رحمت کا حوالہ ہے۔

رحمان میں بتایا ہے کہ آخرت کی جزا وسزا خدا کے عدل وقسط کا تقاضا ہے۔ واقعہ میں بتایا کہ لوگوں کے اعمال کے مطابق ان کی درجہ بندی کی جائے گی اور انجام کو ٹالا نہیں جا سکے گا۔

حدید ومجادلہ:

یہاں سے مدنی سورتیں شروع ہوتی ہیں جو عملی زندگی میں ایمان بالآخرہ کے تقاضوں کو واضح کرتی ہیں۔ سورہ حدید میں مسلمانوں کو اللہ اور رسول پر ایمان کے مقتضیات پورے کرنے، جہاد کے لیے انفاق اور تمام امور میں وحی الٰہی کو مشعل راہ بنانے پر ابھارا ہے کہ اس سے وہ آخرت کی فوز وفلاح کے مستحق ہوں گے۔ منافقین کی فتنہ جوئی، اسلام کے مستقبل کے بارے میں ان کے خدشات اور خدا کے وعدوں کے ایفا میں ان کی شک ظاہر کرنے کی روش کو آخرت میں ان کے لیے موجب خسران بتایا ہے۔ ایمان بالآخرۃ کے حجابات...... دنیا پرستی اور مصائب کے اندیشوں...... کی حقیقت واضح کی ہے اور حکم جہاد کے خلاف اہل کتاب کے اٹھائے ہوئے اعتراضات کی قلعی کھولی ہے۔

سورہ مجادلہ بغیر تمہید کے شروع ہوئی ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ یہ سورہ حدید ہی کی تکملہ ہے۔ اس میں اہل کتاب کے اعتراضات کی سیاست کو اللہ اور رسول کے خلاف محاذ آرائی قرار دیا ہے اور دوٹوک انداز میں بتایا ہے کہ اہل کتاب اس طرح پیغمبر کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اللہ ورسول کے لیے غلبہ مقدر ہے۔ منافقین کی فتنہ جوئی اور ان کے خدشات وشکوک کو موضوع بحث بنا کر ان کو راہ راست پر آنے اور اہل کتاب کا ایجنٹ نہ بننے کی تلقین کی ہے گویا مجادلہ سورہ حدید ہی کے ایک ضمنی مضمون کی وضاحت ہے۔

حشر اور ممتحنہ:

یہ دونوں سورتیں مشترک مضمون کی حامل ہیں۔ حشر کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ اللہ ورسول کے خلاف پارٹی بازی خدا کی طرف سے شدید سزا کا مستوجب بنا دیتی ہے۔ اس کا نتیجہ دنیا میں وبال اور آخرت میں دردناک عذاب کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اہل کتاب کی حمایت کا دم بھرنے والے منافقین کا انجام ان کے آقاؤں کے ساتھ ہی ہوگا۔

Marfat.com

لہٰذا اہل ایمان کو اپنی عاقبت کی فکر کرنی چاہیے، قرآن سے اثر لینا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کی صفات کا استحضار رکھنا چاہیے تاکہ ان کے قدم جادۂ حق پر استوار رہیں۔

سورہ ممتحنہ بغیر تمہید کے شروع ہوئی ہے جو اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ سورہ حشر ہی کا تکملہ ہے۔ حشر میں یہود کی حمایت کا دم بھرنے والوں کو ملامت کی گئی۔ اس میں مشرکین سے تعلقات مودت رکھنے والوں کو ملامت کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ہجرت کر لینے کے بعد مشرکین کی قرابت کا کوئی شائبہ باقی رکھنا خدا و آخرت پر ایمان لانے والے کسی شخص کے لیے جائز نہیں۔ لہٰذا تعلیم دی ہے کہ مشرکہ بیویوں تک سے بھی قطع تعلق کر لیا جائے۔ اگر وہ اسلام کے دعویٰ کے ساتھ ہجرت کر کے آجاتی ہیں جب بھی ان کے اس دعویٰ کو اچھی طرح جانچ لیا جائے۔

سورہ حدید اور مجادلہ میں جہاد، غلبۂ رسول اور منافقین کے رویہ کا جو مضمون تھا۔ اس جوڑے میں اسی مضمون کا تسلسل ہے۔

صف اور جمعہ:

یہود کے حمایتی منافقین کے رویہ کے باعث ضروری ہوا کہ یہود کی محرومیوں سے مسلمانوں کو خبردار کیا جائے تاکہ یہ ان کی غلطیوں کا ارتکاب کر کے خدا کی ہدایت کی راہ اپنے اوپر مسدود نہ کر لیں۔ اس لیے ان دونوں سورتوں میں مسلمانوں کو یہود کے نقش قدم پر چلنے سے باز رہنے کی تلقین فرمائی ہے۔ صف میں یہ بتایا ہے کہ یہود اپنے پیغمبر کی اطاعت سے منہ موڑ کر جس ڈگر پر چلے اس نے ان کو خدا کی ہدایت ہی سے محروم کر دیا اور وہ ابھی تک اس فتنہ سے نہیں نکل سکے۔ لہٰذا مسلمان اسلام کے غلبہ کے لیے ایمان کے تقاضے پورے کریں اور جان و مال پیش کرنے سے دریغ نہ کریں۔ اس معاملہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے طرز عمل کو مثال بنائیں۔

سورہ جمعہ میں بتایا ہے کہ یہود نے دین کی ذمہ داریوں کو بوجھ سمجھا، آخرت کی سزا کو کوئی اہمیت نہ دی اور موت کے خوف میں مبتلا ہو گئے۔ مسلمان اس طرز عمل سے اپنے آپ کو بچائیں۔ ان پر خدا کا جو خاص فضل ہوا ہے اس کی قدر کریں اور مال کی محبت کو دین کے تقاضوں میں حارج نہ ہونے دیں۔

منافقون اور تغابن:

سورہ منافقون جمعہ کا تکملہ ہے جس کی علامت اس کا بغیر تمہید کے شروع ہونا ہے۔ جمعہ میں جس کردار سے اجتناب کی تلقین کی ہے سورہ منافقون میں اس گروہ کی نشان دہی کر دی ہے جس میں یہ کردار بدرجہ اتم موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ گروہ اس کردار کو اپنی کامیابی کا ضامن سمجھتا تھا۔ مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ وہ مال و اولاد کی محبت میں اپنی دینی ذمہ داریوں کو نہ بھولیں۔ وقت ان کا انتظار نہیں کرے گا۔

منافقین ایمان کا دعویٰ کرنے کے بعد عمل سے جان چھڑاتے ہیں اور مال و اولاد کی بیڑیاں ان کے ایمان کے تقاضے پورے کرنے میں مزاحم ہوتی ہیں۔ یہ طرز عمل خدا و آخرت کے صحیح تصور سے تہی دامن ہونے کا نتیجہ ہوتا ہے۔

Marfat.com

سورہ تغابن میں ان کے تصور کو درست کیا ہے کہ ہار جیت کا فیصلہ آج ممکن نہیں، یہ آخرت میں ہونے والا ہے۔ وہاں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ایمان کے ساتھ عمل، رسول اللہ ﷺ کے لیے سمع و طاعت، تقویٰ اور انفاق کا ہونا ضروری ہے۔ اس راہ میں اگر بیوی بچے بھی مزاحم ہوں تو ان کو بھی دشمن کی حیثیت سے جاننا دانشمندی کا تقاضا ہے۔

طلاق اور تحریم:

یہ دونوں سورتیں تمہید کے بغیر ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تغابن ہی کی اصل سے پھوٹی ہیں۔ ان دونوں سورتوں میں سورہ تغابن کے مضمون کے ایک اہم پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بیوی بچوں کے دشمن ہونے کا تصور نہایت عجیب اور غیر فطری نظر آتا ہے۔ لہٰذا یہ واضح کرنا ضروری تھا کہ وہ دشمن کس پہلو سے ہیں۔ چناں چہ سورہ طلاق میں یہ بتایا کہ بیوی سے اگر نفرت پیدا ہو جائے تو آدمی عموماً اس کی حق تلفی کا مرتکب ہوتا ہے، خدا کی مقرر کی ہوئی حدود کی پابندی نہیں کرتا اور تقویٰ کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے۔ یہ چیز خدا کے عذاب کو دعوت دینے والی ہے اور آخرت میں موجب خسران ہے۔

سورہ تحریم میں زوجین میں باہمی محبت اور اعتماد کے باعث حدود کے احترام میں جو کسر پیدا ہو جاتی ہے اس کو بیان کیا ہے۔ یہ بتایا ہے کہ آخرت میں معاملہ رشتہ داریوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ دینی تعلیمات کے ساتھ مطابقت یا عدم مطابقت کی بنیاد پر ہوگا۔ لہٰذا لوگ وحی الٰہی کو مشعل راہ بنائیں جو آخرت میں نور کی مشعل کے طور پر ان کی منزل کی راہ کو روشن کرے گی۔ یہ مضمون اوپر سورہ حدید میں بھی بیان ہوا ہے۔

اس تفصیل سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ سورتوں کے جوڑے ان میں بیان کردہ مرکزی مضمون کی بنیاد پر بنتے ہیں۔ مکی سورتوں میں اعتقادی یا نظری پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ جبکہ مدنی سورتوں میں عقیدہ آخرت کے عملی تقاضے زیر بحث آتے ہیں۔ سورہ ق میں جہنم میں پڑنے والوں کی صفات کفار (انتہائی ناشکرا)، عنید (دشمنی رکھنے والا)، منّاع للخیر (مال کو انفاق سے روکنے والا)، مُعتَد (زیادتی کا مرتکب)، مُرِیب (شک میں مبتلا) ہیں۔ دیکھئے کہ مدنی سورتیں یہود اور منافقین کے کردار پر کس طرح صادق آتی ہیں۔ فی الجملہ سورہ ق کے تمام اہم مضامین ہی کی وضاحت بعد کی سورتوں میں ہے۔ اس لیے یہ بات قرین قیاس ہے کہ سورہ ق گروپ کے لیے تمہید کی سورہ ہے جب کہ تمام باقی سورتیں جوڑے جوڑے بن کر ہر مضمون کی تکمیل کرتی ہیں لہٰذا سورتوں کے توام ہونے کا اصول کہیں مجروح نہیں ہوتا اور نہ کوئی بیچ کی سورہ منفرد رہ جاتی ہے۔

Marfat.com

کیا پُل صراط سے مؤمنین کو بھی گزرنا ہوگا؟

قرآن فاؤنڈیشن، لاہور کے بانی وسرپرست محترم ڈاکٹر محمد عثمان نے ماہنامہ محدث، لاہور میں چھپنے والے ایک مضمون ''کیا پل صراط سے مسلمانوں کو بھی گزرنا ہوگا؟'' کے بارے میں ہماری رائے دریافت کی ہے۔ یہ مضمون سورہ مریم کی آیت 71 کے بارے میں ڈاکٹر صاحب ہی کے ایک استفسار کے جواب میں جناب حافظ صلاح الدین یوسف نے قلم بند کیا ہے۔ استفسار یہ تھا کہ صاحب تدبر قرآن نے اپنی تفسیر میں آیت وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا (تم میں سے ہر ایک کو بہر حال اس میں داخل ہونا ہے) میں خطاب صرف کفار سے مانا ہے۔ جب کہ عام لوگ اس کے تحت یہ مانتے ہیں کہ مومن وکافر ہر ایک کو جہنم میں لازماً جانا ہوگا۔ صاحب تدبر قرآن اس تصور کو مفسرین کی غلطی قرار دیتے ہیں اور اس کو قرآن کی دوسری آیت أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ (الانبیاء: 101) (جن کے لیے ہمارا اچھا وعدہ ہے وہ اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے) کے خلاف ہے۔ حافظ صاحب نے اپنے مضمون میں دوسرے مضمون کو زیادہ صحیح اور اولیٰ بالصواب قرار دیا ہے کیوں کہ اس کی تائید پل صراط سے متعلق متعدد صحیح احادیث سے ہوتی ہے۔

محترم ڈاکٹر صاحب کے علم میں یہ بات ہوگی کہ صاحب تدبر قرآن نے پون صدی سے زیادہ عرصہ پر محیط اپنی تحریروں اور تقریروں میں روایت اور کلام پر مبنی طریقۂ تفسیر پر جرح کی اور اس کی غلطیوں کی طرف توجہ دلائی۔ انھوں نے تفسیر میں خود قرآن ہی پر اعتماد کرنے اور اسی سے مستنبط اصولوں کی روشنی میں تفسیر بیان کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے اپنے استاد مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کے مرتب کردہ ان اصولوں کو زیادہ شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا اور انہی پر مبنی اپنی تفسیر لکھی۔ یہ اصول نہایت سادہ اور عام فہم ہیں یعنی یہ کہ آیت کو سیاق وسباق سے الگ کر کے اس کی تفسیر بیان نہ کی جائے بلکہ نظم کلام کا لحاظ رکھا جائے۔ پھر قرآن مجید کے نظائر وشواہد کو پیش نظر رکھا جائے۔ ان سے ہٹ کر تفسیر کرنے میں غلطی کا اندیشہ ہوتا ہے۔ نیز الفاظ کے ایسے معانی لیے جائیں جو معروف ٹکسالی عربی میں لیے جاتے ہوں۔ تکلف کر کے کوئی مفہوم بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔ جب ایک مفسر اپنی تفسیر کی حدود کو خود متعین کر رہا ہو تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جانچا جائے کہ کسی آیت کی تفسیر میں اس نے اپنے مجوزہ اصولوں سے انحراف تو نہیں کیا۔ آیئے اس اعتبار سے آیت پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

(الف): ''ورود'' کا لفظ قرآن مجید میں سات آٹھ مقامات پر آیا ہے۔ اس کا مفہوم کسی گھاٹ پر پہنچنا ہے۔ خاص اس

Marfat.com

مفہوم میں یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں استعمال ہوا ہے کہ وَرَدَمَآءَ مَدْیَنَ (قصص : 23) (وہ مدین کے چشمہ پر پہنچا) فرعون کے بارے میں آیا ہے کہ اوردھم النار (وہ ان کو دوزخ کے گھاٹ پر پہنچائے گا) یعنی جن لوگوں کا وہ دنیا میں پیشوا بنا رہا، قیامت کے دن ان کا پیشوا بن کر ان کو جہنم کے گھاٹ اتارے گا۔ اسی ضمن میں بئس الورد المورود (اترنے کے لیے یہ کتنا برا گھاٹ ہوگا) کے الفاظ استعمال ہوئے۔ اسی مادہ سے اسم فاعل کی صورت میں 'وارد' کا لفظ زیر بحث آیت میں بھی آیا ہے اور سورہ انبیاء میں بھی۔ اس کے معنی جہنم کے گھاٹ اترنے والا کے ہوں گے۔ جہنم میں داخل ہونا اس تک پہنچنے کا منطقی نتیجہ ہوگا۔

(ب): وہ سلسلہ کلام جس میں زیر نظر آیت آئی ہے، ان لوگوں سے متعلق ہے جو مرنے کے بعد از سر نو جی اٹھنے کو اور آخرت کے تصور کو مستبعد مانتے ہیں۔ ان کے لیے آخرت کے واقع ہونے اور پھر مجرمین کے جہنم میں ڈالے جانے کے مختلف مراحل کی تصویر کشی کر دی ہے۔ اثنائے کلام میں غائب کے اسلوب کو بدل کر مخاطب کے اسلوب میں ان کو متنبہ کر دیا ہے کہ یہ تمہی لوگ ہو گے کہ جو جہنم کے گھاٹ اتریں گے۔ متقین کو تو ہم نجات عطا کریں گے۔ غائب کو حاضر سے بدلنے کا یہ اسلوب معروف ہے۔ بلاغت کی کتابوں میں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ قرآن مجید میں بھی یہ اسلوب کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔

(ج): اس مضمون اور اسی اسلوب کی نظیر سورہ انبیاء کی آیات 97-103 میں موجود ہے۔ وہاں بھی قیامت کے منکروں ہی کا تذکرہ ہے اور ٹھیک یہی اسلوب استعمال کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

﴿إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ أَنْتُمْ لَهَا وَارِدُونَ﴾ (الانبیاء: 98)

''اب تم اور جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے رہے ہو جہنم کے ایندھن بنو گے۔ تم لازماً اس میں داخل ہونے والے ہو۔''

یہاں بھی وارد ہی کا لفظ استعمال کیا ہے اور بلاشبہ یہ انھیں لوگوں کے لیے ہے جو قیامت کے منکر اور غیر اللہ کی عبادت کرنے والے ہیں۔ اس نظیر کی روشنی میں زیر نظر آیت کے مخاطب کے تعین میں کوئی اشتباہ نہیں رہ جاتا۔ لہٰذا مومنین کے جہنم میں داخلہ کا مضمون ان آیات سے نہیں نکلتا۔

(د): سورہ انبیاء کی اس کے بعد کی آیت میں واضح کر دیا گیا ہے کہ اہل ایمان جہنم سے دور رکھے جائیں، اتنے دور کہ وہ اس کی سرسراہٹ بھی نہیں سنیں گے۔ جب سورہ مریم اور سورہ انبیاء کے ان مقامات میں سیاق کلام ایک سا ہے تو ہر معقول آدمی یہ مانے گا کہ سورہ مریم میں متقین کے لیے نجات کا جو ذکر ہے تو اس کی وضاحت سورہ انبیاء کی مذکورہ بالا آیت کرتی ہے۔

ان نکات کے مطابق صاحب تدبر قرآن نے آیت کی تفسیر انھی اصولوں کی روشنی میں کی ہے جو انھوں نے پوری تفسیر قرآن مجید میں ملحوظ رکھے ہیں اور جن کو قرآن مجید سے وہ مستنبط اور منصوص مانتے ہیں۔ اب رہ گیا سوال ان روایات کا جن کا حوالہ محترم حافظ صاحب نے اپنے مضمون میں دیا ہے تو ان کی تاویل وتشریح ایک علیحدہ موضوع ہے جو احادیث

Marfat.com

کے شارح کی ذمہ داری ہے، کسی مفسر کی نہیں۔ ہم ان کی وضاحت میں محض چند نکات کی طرف توجہ دلائیں گے:

(الف): حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما کی روایت میں یہ بات کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز حکم دے گا کہ لوگ جن کو پوجتے رہے، ان کے ساتھ جمع ہو جائیں، قرآن مجید سے ثابت ہے۔ قرآن میں بتایا ہے کہ اس دن لوگوں کی درجہ بندی کی جائے گی۔

(ب): ان روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کا پل منافقوں کو مومنین سے ممیز کرنے کے لیے رکھا جائے گا۔ جب کہ سورہ حدید میں نہایت وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ابتدا میں مومنین اور منافقین اکٹھے ہوں گے۔ مومنین کے ساتھ ایک روشنی ہوگی جس میں وہ چلیں گے لیکن منافقین اس سے محروم ہوں گے۔ وہ مومنین کے ساتھ ہو کر ان کی روشنی میں چلنا اور اس کا کچھ حصہ حاصل کرنا چاہیں گے لیکن مومنین کہیں گے کہ یہ نور یہاں نہیں مل سکتا۔ اس کے لیے تمھیں واپس جانا ہوگا اور از خود اسے تلاش کرنا ہوگا۔ اس کے بعد مومنین اور منافقین کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی اور منافقین اندھیرے میں اپنے سر پیٹتے رہیں گے۔ مومنین و منافقین کے درمیان امتیاز کا یہ نہایت عمدہ طریقہ اختیار کرنے کی خبر جب قرآن نے خود دے دی ہے تو پھر اسی مقصد کے لیے پل صراط کی ضرورت کہاں باقی رہی!

(ج): پل صراط کے تصور کا انکار کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں انسانوں کو جو احکام دیے گئے ہیں ان کی حقیقت آخرت میں سامنے آئے گی۔ ہماری نمازیں، مسجدیں، روزہ اور حج کی اصلیت آخرت میں جا کر کھلے گی۔ اسی طرح آخری اتمام حجت کے لیے بھی اللہ تعالیٰ قیامت کے روز کچھ امتحان مقرر فرمائے گا، جیسا کہ بے نمازوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا جائے گا۔ دنیا میں انسانوں کو بتائے گئے صراط مستقیم کی حقیقت اگر وہاں اس طور پر سامنے آئے کہ وہ ایک بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز دھار کا پل ہے جس کے دونوں جانب آنکڑے اور کانٹے ہوں جو مجرموں کو اچک کر جہنم میں گرا دیں تو یہ تعبیر نہایت معنی خیز اور حقیقت کے مطابق ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی تو فرمایا ہے کہ صراط مستقیم کے دونوں جانب ترچھے راستے واقع ہیں جن میں سے ہر ایک پر شیطان بیٹھا ہوتا ہے جو اپنی طرف بلا کر انسان کو بے راہ کر دیتا ہے۔ تو شیطان کی دعوت پر بے راہ روی اختیار کرنے والوں کو اگر جہنم کے صراط پر آنکڑوں سے واسطہ پڑے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ ان پر آخری حجت تمام کر دے گا۔

(د): ایک قابل غور بات یہ ہے کہ احادیث میں نہایت اہم مواقع پر مجمعوں کے سامنے کی گئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تقاریر (مثلاً خطبہ حجۃ الوداع) تو جستہ جستہ اقتباسات کی صورت میں سامنے آئی ہیں لیکن آخرت کے متعلق دو تین صحابہ کی روایت سے مروی نہایت مفصل بیانات کتب حدیث میں موجود ہیں اور ہیں یہ متشابہات کی نوعیت کے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ راویوں نے مختلف روایتوں کو یکجا کر کے ایک مضمون مرتب کر دیا ہے اور اس کی

Marfat.com

نسبت نبی ﷺ کی طرف اس طرح کردی ہے جیسے وہ پورا بیان حضور ﷺ ہی کا ہو۔

ان اشارات کی روشنی میں ہمارا خیال یہ ہے کہ روایات کو ان کے میرٹ پر جانچنا اور ان کو قرآن مجید کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے، نہ کہ روایات کو اس قدر حاوی کر دیا جائے کہ قرآن کے واضح بیانات سے بھی ان کی خاطر انحراف کیا جائے۔

☆......☆......☆

خفیہ تبلیغ

یہ بات حیرت انگیز ہے کہ رسول اللہ ﷺ جیسے عظیم المرتبت خاتم الانبیاء کے بارے میں آپ کے سیرت نگاروں نے یہ تاثر کیسے پھیلا دیا اور امت نے اس کو قبول کیسے کر لیا کہ بعثت کے بعد تین سالوں تک آپ نے خفیہ تبلیغ کی۔ یہ بات رسولوں کی سنت سے مطابقت نہیں رکھتی اور حقائق کے بھی منافی ہے۔ اگر آپ نے قریش کی مخالفت کے خوف سے ایسا کیا تو کیا اللہ تعالیٰ کی وہ حفاظت آپ کو حاصل نہ تھی جو تمام رسولوں کو حاصل رہی ہے؟ پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ تین سالوں کے بعد جب آپ نے علانیہ تبلیغ شروع کی تو کیا اس وقت قریش کی عداوت ختم ہو چکی تھی؟ یا کیا اس عرصہ کے دوران میں آپ نے چوری چھپے اتنی نفری مہیا کر لی تھی کہ آپ قریش کے مدمقابل بن کر آ سکتے؟ تاریخ گواہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی صحیح نہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ آں حضرت ﷺ نے اس عرصہ میں دعوت کو لوگوں کے علم میں لانے میں رکاوٹ پیدا کی تو یہ اللہ تعالیٰ کی ڈالی ہوئی ذمہ داری کے ادا کرنے میں کوتاہی تھی جو حضور ﷺ کی عظمت و شان کے منافی ہے۔ خفیہ تبلیغ کی کوئی اور حکمت سیرت نگار بیان نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک آپ کی جدوجہد کا کوئی دور خفیہ نہیں رہا۔ آپ نے دعوت دین کا کام ٹھیک اس پلان کے مطابق کیا جو آپ کو اللہ رب العزت کی طرف سے دیا گیا تھا اور اس میں ایک تدریج ملحوظ رکھنے کا حکم تھا۔ فرمایا گیا:

﴿وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ ۝ وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝ فَاِنۡ عَصَوۡكَ فَقُلۡ اِنِّىۡ بَرِىۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ۝ وَتَوَكَّلۡ عَلَى الۡعَزِيۡزِ الرَّحِيۡمِ ۝﴾ (الشعراء: 214-217)

''اور اپنے قریبی خاندان والوں کو ڈراؤ اور جن اہل ایمان نے تمہاری پیروی کی ہے، ان کے لیے اپنی شفقت کے بازو جھکائے رکھو، اگر یہ لوگ تمہاری نافرمانی کریں تو ان کو سنا دو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، میں اس سے بری ہوں اور خدائے عزیز و رحیم پر بھروسا رکھو۔''

اس پلان کے مطابق دعوت دین کا آغاز آپ نے اپنے قریبی خاندان یعنی قریش سے کرنا تھا، جو لوگ دعوت قبول کرتے، ان کے ساتھ شفقت و محبت کا معاملہ کرنا اور ان کو کفار کے نرغے سے نکالنا تھا۔ بعد کے مرحلہ میں دعوت کو پورے زور و قوت کے ساتھ بلند آہنگ ہو کر پیش کرنا اور شرک پر جمے ہوئے ان لوگوں سے، جو آپ کی بات نہ سنیں، اعلان براءت کرنا تھا۔ اس پورے کام میں ہدایت یہ تھی کہ آپ محض اللہ پر بھروسا کریں جو زبردست اور اپنے ارادوں کو بروئے کار لانے پر قادر ہے۔

(حیاتِ رسولِ امی ﷺ، علامہ خالد مسعود رحمہ اللہ، صفحہ 110-111)

Marfat.com

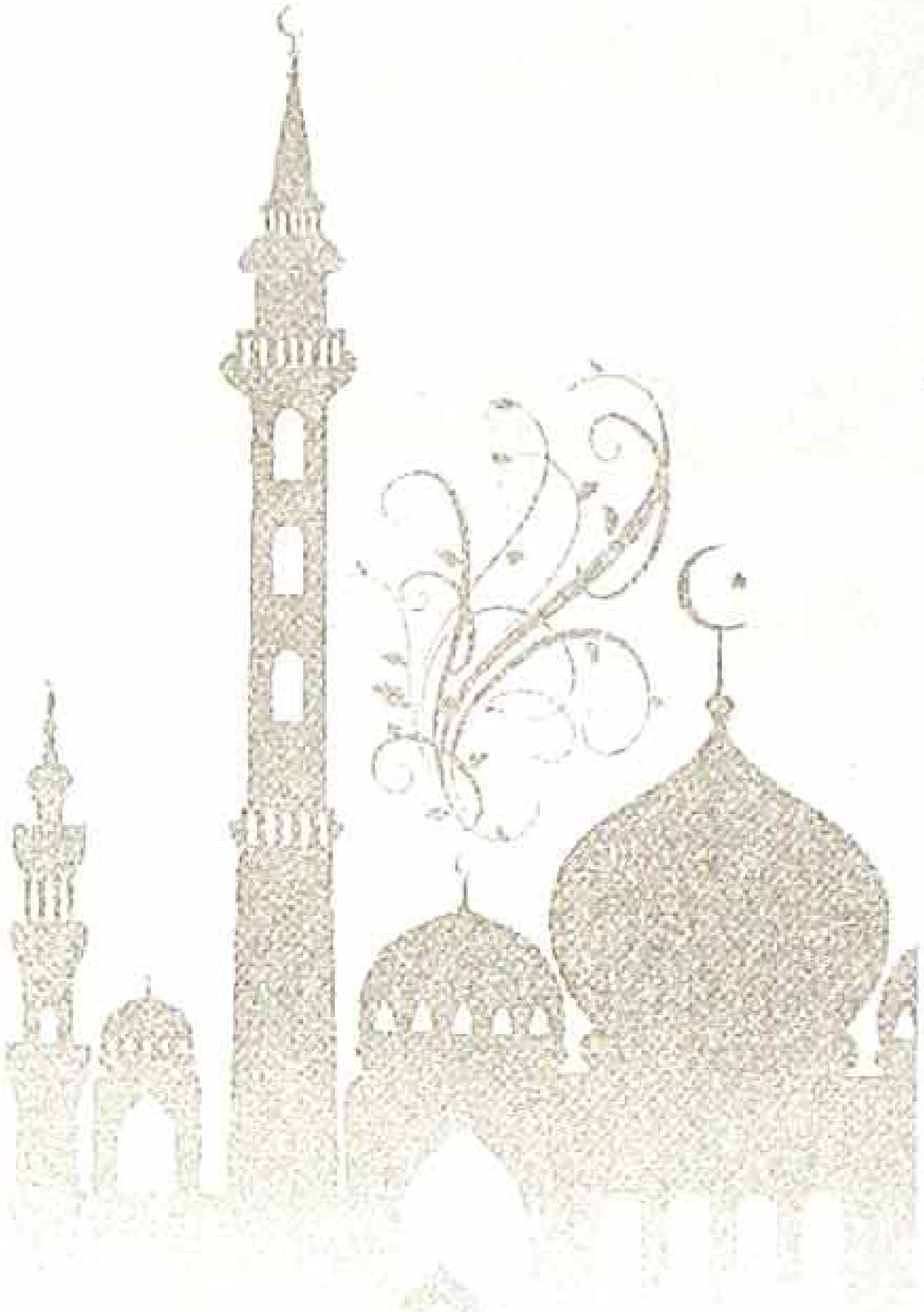

تدبرِ حدیث

بابِ دوم

علمِ حدیث پر تحقیق کی ضرورت

تحقیقِ حدیث میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل

حدیثِ جبریل علیہ السلام ○ حدیث قتال

مُوحدین کے لیے وعدۂ جنت

مُوحدین کے گناہوں کی مغفرت ○ اِرادہ اور عمل کا صِلہ

فرائضِ دین کی پابندی کا صِلہ

عورت کے کردار کے چند قابلِ اصلاح پہلو

اَمانت اور رَفعِ اَمانت ○ جُھوٹی قسم اور حق تلفی کا اَنجام

ستاروں کی تاثیر کا عقیدہ

مماثل کردار کی یکساں سزا ○ سبعۃ احرف کی روایت

Marfat.com

علمِ حدیث پر تحقیق کی ضرورت

حدیث اور اس سے متعلق علوم امت مسلمہ کے لیے سرمایۂ افتخار ہیں۔ یہ اس بات پر شاہد ہیں کہ امت نے اپنے پیغمبر ﷺ کے افعال واقوال کی تحقیق میں کس قدر جزرسی اور تندہی سے کام لیا جس کے نتیجے میں وہ آج بھی بڑے اعتماد اور جزم کے ساتھ یہ بتا سکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے قرآن مجید کے مضمرات کو کس طرح کھولا، آپ ﷺ کے معمولات کیا تھے، آپ ﷺ کی پسند اور ناپسند کی باتیں کیا کیا تھیں اور آپ ﷺ نے لوگوں کو کس طرز زندگی کی تعلیم دی۔ امت مسلمہ کے سوا دوسرے مذاہب کے حاملین اپنے پیشواؤں کے احوال کے تحفظ کے لیے کسی ایسی کوشش کی نشاندہی اپنے ہاں نہیں کر سکتے۔

پچھلی چودہ صدیوں میں علم حدیث نے مختلف ادوار دیکھے ہیں۔ ایک زمانے میں ہم نبی اکرم ﷺ کے جاں نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس کوشش میں سرگرداں دیکھتے ہیں کہ وہ علم نبوی سے کسب فیض کی کسی شکل سے محروم نہ ہونے پائیں۔ بعض صحابہ تو برسوں اور مہینوں کے لیے شبانہ روز آپ ﷺ کے ساتھ رہے تاکہ آپ ﷺ کے طرز زندگی کا مشاہدہ کریں۔ جو مصروف تھے وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ باری مقرر کر کے آستانہ عالیہ پر حاضر ہوتے تاکہ کسی اہم تعلیم سے محروم نہ رہ جائیں۔ ان کی یہ وابستگی محض اس لیے نہ تھی کہ وہ آنحضرت ﷺ کے بارے میں معلومات کا ذخیرہ کرنا چاہتے تھے بلکہ ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش ہوتی کہ وہ اپنے آپ کو علم وعمل کے اس سانچے میں ڈھال لے جس کو اللہ کے پیغمبر ﷺ پسند فرماتے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین اپنی معلومات کا دوسرے ساتھیوں کے ساتھ تبادلہ کرنے میں کبھی بخل سے کام نہ لیتے، اس لیے اس پاکیزہ دور میں علم حدیث نہایت خالص شکل میں محفوظ ہوا اور پھیلا۔ اس کے مطابق مسلمانوں نے اپنی زندگیاں ڈھالیں اور وہ بعد والوں کے لیے نجوم ہدایت قرار پائے۔

جب اسلام عرب کے اطراف میں پھیل گیا اور نئے لوگ اس سے وابستہ ہونے لگے تو علم حدیث ایک نئے دور سے گزرا۔ نئے مسلمانوں کے دل میں یہ حسرت پیدا ہوئی کہ کاش انھوں نے زمانۂ نبوت پایا ہوتا اور وہ آنحضرت ﷺ کی ایک ایک ادا کو اپنی زندگیوں میں سمو لیتے۔ اگر انھیں یہ معلوم ہوتا کہ فلاں علاقے میں کوئی ایسے صاحب مقیم ہیں جنھیں آنحضرت ﷺ کو دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے تو وہ ان سے ملاقات کے شوق میں گھر سے نکل کھڑے ہوتے، سفر کی صعوبتیں اٹھا کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور نبی ﷺ کے احوال واقوال کے

Marfat.com

بارے میں سوالات کر کے اپنی علمی پیاس بجھانے کا سامان کرتے۔ یہ وہ دور ہے جس میں علم حدیث کا چرچا ہوا۔ اس کے حاملین کی قدر افزائی ہوئی اور ہر اس شخص کو سر آنکھوں پر بٹھایا گیا جس کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ وہ علم نبوت کے کسی جز کا امین ہے۔

ایک خاص طرز فکر کو جب زیادہ اہمیت حاصل ہو جاتی ہے اور اس کے اپنانے والے قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں تو بعض لوگ اپنے ذاتی افکار کی ترویج کے لیے بھی اس طرز فکر کا سہارا لیتے ہیں تاکہ لوگ ان کی بات کا اعتبار کریں اور ان کے خیالات کا سکہ بھی چل نکلے۔ چناں چہ علم حدیث کی طرف مسلمانوں کی اس توجہ کو دیکھتے ہوئے بعض فتنہ جو عاقبت نا اندیش لوگوں نے اپنے مزعومات و معتقدات کو حدیث کا قالب دینا شروع کیا۔ یہ فتنہ اتنی تیزی سے پھیلا کہ اس سے اصل علم حدیث زبردست خطرے سے دوچار ہو گیا اور امت کے زعماء کے سامنے یہ مسئلہ آ گیا کہ فتنہ جوؤں کی دستبرد سے حدیث کو کیسے بچایا جائے۔ چنانچہ ائمہ محدثین نے خبر کی تحقیق کے لیے علوم وفنون وضع کیے اور معاشرے میں رواج پانے والی ایک ایک روایت کو جانچا اور پرکھا۔ انھوں نے راویوں میں مخلص اور غیر مخلص، ثقہ اور غیر ثقہ کے مابین امتیاز کرنے کی کوشش کی۔ اکابر محدثین نے اپنی اپنی تحقیقات پر مبنی ان روایات کے مجموعے تیار کیے جو ان کے بنائے ہوئے معیار صحت پر پوری اترتی تھیں۔ یہ دور حدیث کی تدوین کا دور ہے اور اس دور کی یادگار وہ کتب حدیث ہیں جو صدیوں سے امت میں متداول چلی آ رہی ہیں اور حدیث کا پیشتر قابل اعتماد ذخیرہ انھی میں محفوظ ہے۔

یہ حقیقت اہل علم سے پوشیدہ نہیں کہ حدیث کی ان تمام مصنفات کا معیار تحقیق ایک جیسا نہیں۔ نیز ایک روایت کی صحت کو جانچنے کے لیے اس کی سند کو واحد کسوٹی قرار دیا گیا ہے۔ متن حدیث پر بحث کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ حدیث کی امہات کتب کی تدوین کے بعد بھی صحت روایت کو دوسری کسوٹیوں پر پرکھنے کے سلسلہ میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی بلکہ علمائے حدیث کا پسندیدہ مشغلہ انھی کتب کی شرحیں لکھنے میں اور اپنے ذوق کی روایات کے منتخب مجموعے مرتب کرنے تک محدود رہا ہے۔

تحقیق حدیث کے میدان میں اس جمود کا نتیجہ یہ نکلا کہ حدیث صحیح، حسن، ضعیف اور موضوع کے اصطلاحی معانی تو گم ہو گئے اور عامۃ المسلمین میں یہ تصور پھیل گیا کہ جو خبر 'حدثنا' اور 'اخبرنا' کے سے الفاظ کے ساتھ بیان ہوتی ہے اس کی نسبت نبی ﷺ کے ساتھ صحیح ہوتی ہے اور اس کے بارے میں کلام کرنا گویا آنحضرت ﷺ کے مرتبہ و مقام کے انکار کے مترادف ہے۔ اس عامیانہ تصور سے یہ نقصان ہوا کہ ہمارے واعظین نے ضعیف اور موضوع روایتوں سے اپنے وعظوں کو آراستہ کر کے عوام کو دین کے اصل حقائق سے بے بہرہ کرنے کی راہ ہموار کر دی۔ مجمل روایات کی روشنی میں ایسے عقائد لوگوں میں پھیلا دیے گئے جو قرآن کے محکمات سے بھی ٹکراتے تھے حالانکہ یہ بات معمولی غور وفکر سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ حدیث کا فہم اس سے بھی زیادہ محنت چاہتا ہے جتنی محنت قرآن فہمی کے لیے درکار ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے محکمات محفوظ ہیں اور ان کی صحت وترتیب ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ ہر کلمہ جس

Marfat.com

سیاق وسباق میں استعمال ہوا ہے وہ معلوم ومتعین ہے۔ اس کے برعکس روایت حدیث میں بہرحال بہت سے راویوں کے علم، فہم، حافظہ اور امانت پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ روایت بالعموم راوی کے اپنے الفاظ میں ہوتی ہے، کلام کا موقع ومحل واضح نہیں ہوتا اور مختلف واسطوں سے آنے کے باعث بات کا انداز واسلوب بدل بدل جاتا ہے۔

روایت حدیث کی ان مشکلات کو دیکھتے ہوئے ہمارے زمانے میں منکرین حدیث نے امت میں ایک نیا فتنہ برپا کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے حدیث کو عجمی سازش قرار دے کر سرے سے اس علم کو ناقابل اعتماد قرار دے دیا۔ یہ موقف وہی شخص اختیار کرسکتا ہے جو امت کے ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کرنا چاہتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ علم نبوت کا یہ سرمایہ اس کی آزادی پر بے جا پابندیاں عائد کرتا ہے۔ منکرین حدیث نے ادھر ادھر سے بعض روایات کو موضوع سخن بنا کر اپنے موقف کا جواز پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن کسی حقیقی علمی تحقیق کے نتیجے میں وہ ذخیرۂ حدیث کو ناقابل استناد ثابت نہیں کرسکے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انکار حدیث کے اصل عوامل کچھ دوسرے ہیں۔ اس کا حقیقی علمی سبب موجود نہیں۔ کسی درجے میں اگر کوئی چیز اس کا سبب بنی ہے تو وہ تحقیق حدیث کے سلسلہ کا وہ جمود ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔

ہمارے نزدیک اس زمانے کی ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ علم حدیث پر تحقیق کی جائے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس موضوع سے متعلق بنیادی تصورات کو درست کرنے کی ضرورت ہے جن کا تصور واضح نہ ہونے کی وجہ سے لوگ بات کا محل تک بدل دیتے اور نتائج کے اخذ کرنے میں غلطی کردیتے ہیں۔ اس کے بعد حدیث پر تدبر کے اصول قائم کرنے کی ضرورت ہے جن سے روایت کے غث وسمین [1] میں امتیاز کرنے، اس کے مجمل کو کھولنے اور سیاق کلام کو سمجھنے میں مدد ملے۔ ان اصولوں کی روشنی میں اگر حدیث پر تدبر کیا جائے تو اس ذخیرۂ علم سے واقعی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اس کام کی اہمیت کے پیش نظر ہی ادارہ تدبر قرآن وحدیث کے زیر اہتمام ہونے والے درس حدیث میں مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ نے تدبر حدیث کے اصولوں پر متعدد لیکچر دیے تھے، ان کو ٹیپ کرلیا گیا تھا۔ یہ لیکچر اب کتابی شکل میں ''مبادی تدبر حدیث'' کے نام سے شائع ہوچکے ہیں۔

---

[1] غث وسمین: ضعف اور صحت (غث: دُبلا، سمین: موٹا)

Marfat.com

تحقیقِ حدیث میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کا طرزِ عمل

رسول اللہ ﷺ کا ہر قول و فعل دین میں جو مقام رکھتا ہے اور جس طرح حجت شرعی ہے، یہ امت کے مسلمہ امور میں سے ہے۔ سوادامت نے اس سے کبھی اختلاف نہیں کیا۔ آنحضرت ﷺ کے قول و فعل کی اسی اہمیت کی وجہ سے آپ ﷺ کی طرف غلط طور پر کوئی بات منسوب کرنے کو اتنا بڑا جرم قرار دیا گیا کہ اس کا بدلہ جہنم ہے، چناں چہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((ان کذبا علی لیس ککذب علی احد فمن کذب علی متعمد افلیتبوا مقعده من النار.))

''میری طرف جھوٹی بات منسوب کرنا کسی دوسرے شخص کی طرف جھوٹ منسوب کرنے کی مانند نہیں۔ جس شخص نے میری طرف جان بوجھ کر جھوٹ منسوب کیا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔''

آنحضرت ﷺ کی طرف غلط نسبت سے متعلق اس وعید کا یہ تقاضا تھا کہ ہر زمانے کے مسلمان حدیث رسول ﷺ کے معاملے میں نہایت بیداری کا ثبوت دیتے۔ چناں چہ مختلف ادوار میں حدیث کے متعدد علوم وجود میں آئے جن کے ذریعے ہر اس قول یا فعل کی روایت کو پرکھنے کا اہتمام کیا گیا جس کی نسبت نبی ﷺ کی طرف کی گئی۔ ہر دور کی الگ خصوصیات اور حدیث کے لیے منفرد خدمات ہیں۔ لیکن یہ جاننا ہمارے لیے خصوصاً بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ تحقیق حدیث میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا طرزِ عمل کیا تھا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین حدیث رسول ﷺ کے بڑے شیدائی تھے، اس کی طلب میں بڑی سرگرمی دکھاتے تھے اور جس معاملے میں ان کو حضور ﷺ کا کوئی قول یا فعل میسر آجاتا تو وہ اپنی ذاتی رائے سے فوراً دستبردار ہوجاتے اور اسی سے رہنمائی حاصل کرتے۔ آنحضرت ﷺ کے وصال کے فوراً بعد پیدا ہونے والے بعض اہم مسائل کا فیصلہ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے ان روایات کی روشنی میں کیا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے برسر موقع پیش کیں۔ مثلاً حضور ﷺ کی قبر کی جگہ کے انتخاب کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے حدیث بیان کی کہ نبی جہاں وفات پاتا ہے اسی جگہ اس کی قبر بنتی ہے۔ چناں چہ مسلمانوں نے حجرۂ عائشہ ہی میں قبر مبارک تیار کی۔ مسلمانوں کی سربراہی کے مسئلہ پر جب جذبات میں گرماگرمی پیدا ہوگئی اور انصار نے اپنے اندر سے امیر بنانے کا استحقاق جتایا تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث سنائی کہ

Marfat.com

سربراہ قریش میں سے ہوں گے۔ اس حدیث کو سن کر انصار خاموش ہو گئے۔ جب امہات المومنین رضی اللہ عنہن اجمعین اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت کی تقسیم کا مطالبہ کیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان سنایا کہ ہم گروہ انبیاء کی وراثت نہیں ہوتی، جو کچھ ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ یہ فرمان سن کر سب نے اپنا دعویٰ واپس لے لیا۔ علی ہذا القیاس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے سینکڑوں روایتیں بیان کیں جن کو ان کے ہم عصر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے بغیر ردوقدح کے قبول کیا اور یہ روایات اب حدیث کی ہر کتاب میں موجود ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی روایت حدیث میں بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ راوی سے کوئی تسامح ہو گیا، کسی روایت کے الفاظ میں تغیر وتبدل ہو گیا یا راوی نے موقع محل کو نہیں سمجھا اور حدیث کو غلط موقع پر منطبق کر دیا یا سننے والوں نے روایت کے الفاظ میں کسی طرح کا شبہ ظاہر کیا۔ اس صورت میں صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین یا تو اس روایت کی مزید تحقیق کرتے یا اس کو اصول کی بنیاد پر پرکھ کر فیصلہ کرتے۔ اس بارے میں خاص طور پر قابل ذکر بات یہ ہے کہ اگر ایسی روایت کسی جلیل القدر صحابی رضی اللہ عنہ کی جانب سے بھی آئی تو ان کے بلند مرتبے سے مرعوب ہو کر معاملہ سے صرف نظر نہیں کیا گیا بلکہ حدیث رسول کی صحت کے معاملے کو اولیت دی گئی اور اس کی تحقیق کی گئی۔ ایک موقع پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت پر گرفت کی اور فرمایا:

((انکم لتحد ثونی من غیر کاذبین ولا مکذبین ولکن السمع تخطی .))

”تم میرے پاس ایسے لوگوں سے حدیث بیان کرتے ہو جو نہ جھوٹے ہیں اور نہ جھٹلائے گئے ہیں لیکن بات سننے میں غلطی ہو جاتی ہے۔“

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے مبارک زمانے میں راویان حدیث معلوم ومشہور اور ان کی صحابیت ثابت تھی، اس لیے اسناد کا مسئلہ ان کے لیے پیدا نہ ہوا تھا۔ البتہ متن حدیث کے ضمن میں کئی بحثیں پیدا ہوئیں جن کے مطالعہ سے ہم یہ جان سکتے ہیں کہ متن حدیث کی تحقیق میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کن چیزوں کو رہنما بناتے تھے۔ اس بارے میں تمام روایات کا احاطہ کرنا مطلوب نہیں۔ اس لیے ذیل میں صحاح کی چند ایسی روایات پیش کی جا رہی ہیں جن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے مابین بحثیں پیدا ہوئیں اور جو ان کے نہج تحقیق کو واضح کرنے کے لیے فی الجملہ کافی ہیں۔ چوں کہ اس مضمون کا دائرہ ان روایات کے متعلق بیان کردہ اختلافی مسئلہ کی تحقیق تک وسیع نہیں بلکہ صرف یہ جاننے تک محدود ہے کہ بحث کس بنیاد پر اٹھائی گئی، اس لیے ہم ان کوششوں کے بیان میں صرف نظر کریں گے جو بعد کے ادوار میں مسئلہ کی تحقیق کے لیے کی گئیں۔

درست روایت کی نشان دہی:

1۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت پہنچی: ((اِنَّ الْمَیِّتَ یُعَذَّبُ بِبُکَاءِ اَھْلِہٖ .)) ”اہل خانہ کے رونے کے باعث میت کو عذاب دیا جاتا ہے۔“ تو انھوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ عمر رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے، رسول

Marfat.com

اللہ ﷺ نے ہرگز ایسا نہیں فرمایا تھا۔ بات یوں تھی کہ آنحضرت ﷺ کا گزر ایک یہودیہ کی قبر پر ہوا جس کے لواحقین رو رہے تھے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ قبر میں اس کو عذاب ہو رہا ہے اور اہل خانہ اس پر رو رہے ہیں۔ اس وضاحت سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ بتایا کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ایک خاص موقع کے لیے تھا لیکن روایت کرتے وقت اس کو عام قاعدہ سمجھ لیا گیا جو منشائے نبوی نہ تھا۔

(مسلم ، كتاب الجنائز، باب : الميت يعذب ببكاء اهله عليه)

2۔ سہل ابن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ نے روایت بیان کی کہ ایک انصاری خیبر میں مقتول پائے گئے۔ ان کے ساتھیوں نے حضور ﷺ کے سامنے یہود کو قتل کا الزام دیا۔ آپ ﷺ نے اس کا ثبوت مانگا جو ان کے پاس نہ تھا تو آپ ﷺ نے ان سے کہا کہ تب یہود کے پچاس آدمی قسم کھائیں کہ انھوں نے قتل نہیں کیا۔ انصار نے کہا کہ انھیں یہود کی قسم کا کوئی اعتبار نہیں، چنانچہ حضور ﷺ نے اپنے پاس سے مقتول کی دیت ادا کر دی۔ اس پر عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن بجید نے واقعہ کی صحیح نوعیت یہ بتائی کہ انصاری کے قتل کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اہل خیبر سے باز پرس کی اور دیت ادا کرنے کو کہا۔ اس پر انھوں نے پچاس آدمیوں کی قسم کے ساتھ کہا کہ نہ انھوں نے قتل کیا اور نہ اس کا انھیں علم ہے، چنانچہ حضور ﷺ نے مقتول کی دیت ادا کر دی۔

3۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت بیان کی کہ: ((لان يمتلى جوفكم قيحا و دماء خير له من ان يمتلى شعر .)) ''تم میں سے کسی کا پیٹ پیپ اور خون سے بھر جائے تو اس سے کہیں اچھا ہے کہ یہ شعروں سے بھر جائے۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حدیث کو پورا یاد نہیں رکھا۔ اس کے آخری الفاظ یہ تھے: ((ان يمتلى شعرا هجيت به .)) ''ایسے شعروں سے بھر جائے جن سے تم ہجو کرتے پھرو۔'' یہاں حدیث کے الفاظ ناتمام نقل ہونے سے مفہوم بدل گیا جس کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی وضاحت سے درست کر دیا۔ معلوم ہوا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے سامنے جب کوئی ایسی روایت آتی جس میں اضطراب، انحراف یا کمی بیشی کا کوئی پہلو ہوتا جو سننے والوں کے علم میں ہوتا تو وہ فوراً راوی کے تسامح کو دور کر کے روایت کو درست کر دیتے۔

نص قرآنی کی روشنی میں تنقید:

1۔ کعب رضی اللہ عنہ احبار نے روایت بیان کی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دو مرتبہ اللہ تعالیٰ سے کلام کیا اور رسول اللہ ﷺ نے دو مرتبہ ذات باری تعالیٰ کا مشاہدہ کیا۔ مسروق نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے استفسار کیا کہ کیا واقعی رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ تمھاری یہ بات سن کر تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔ جو شخص یہ کہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا تھا وہ اللہ پر ایک بہتان لگاتا ہے۔ کیا تم نے قرآن مجید کی یہ آیات نہیں سن رکھی ہیں کہ ﴿لا تدركه الابصار﴾ (نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں) اور ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ﴾ (کسی بشر کی یہ حیثیت

Marfat.com

نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کی صورت میں یا پردے کے پیچھے سے)۔ یہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا استدلال یہ تھا کہ ان آیات کی رو سے جب کسی بشر کے لیے ذات باری تعالیٰ کا مشاہدہ ممکن ہی نہیں تو آنحضرت ﷺ کی رویت الٰہی کی یہ روایت کیسے صحیح ہو سکتی ہے۔(مسلم کتاب الایمان، باب: بل رای النبی)

2۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے روایت بیان کی گئی ((الطیرة من الدار والمراة والفرس.)) ''بدفالی مکان، عورت اور گھوڑے میں ہوتی ہے۔'' اس پر وہ غضب ناک ہوئیں اور فرمایا: اس ذات کی قسم جس نے محمد ﷺ پر فرقان اتارا، رسول اللہ ﷺ نے ہرگز یہ نہیں فرمایا۔ آپ ﷺ کا ارشاد تو یہ تھا کہ دور جاہلیت میں لوگ مکان، عورت اور گھوڑے سے بدشگونی لیتے تھے۔ ہمیں تو قرآن مجید سے یہ تعلیم ملی ہے کہ:

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ كِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا﴾

(الحدید: 22)

''تمہیں کوئی مصیبت نہیں پہنچتی، نہ زمین میں اور نہ تمہارے نفوس کے اندر مگر یہ کہ ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے اس سے پہلے کہ ہم اس کو وجود میں لائیں۔''

یہاں آپ ﷺ نے نہ صرف روایت کو درست شکل میں بیان کر دیا بلکہ یہ بھی واضح کیا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت نص قرآنی کے خلاف ہوگئی ہے، اس لیے یہ قبول نہیں کی جاسکتی۔

3۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت قیس نے بیان کیا کہ ان کے شوہر ابو عمرو رضی اللہ عنہ بن حفص نے ان کو یمن سے تیسری طلاق بھجوائی اور طلاق کے ساتھ کچھ مال دینے کی ہدایت اپنے عزیزوں کو کر دی۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہم فاطمہ کو نفقہ کا حق دار نہیں سمجھتے جب تک وہ حاملہ نہ ہو۔ نبی ﷺ سے حکم پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اس کے لیے نفقہ ہے نہ رہائش۔ فاطمہ کی یہ روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش ہوئی تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہم ایک خاتون کی روایت کی بنا پر کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کو نہیں چھوڑ سکتے۔ ہم نہیں جانتے کہ اس نے بات کو یاد رکھا یا بھلا دیا جب کہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے: ((لَا تُخْرِجُوْهُنَّ وَلَا یَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ.)) ''مطلقہ عورتوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ ہی وہ خود نکلیں سوائے اس صورت کے کہ وہ کسی واضح بے حیائی کی مرتکب ہوئی ہوں۔''

(مسلم کتاب الطلاق۔ باب: المطلقہ ثلاثا)

یہاں نص قرآنی کی روشنی میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فاطمہ بنت قیس کی روایت کو قابل اعتبار نہ سمجھا۔

4۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے روایت بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے مقتولین قریش کو بدر کے میدان میں دفن کرایا تو ان کو مخاطب کر کے پوچھا: تمہارے رب نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اس کو تم نے اب حقیقت پالیا نا؟ پھر فرمایا: ﴿انہم یسمعون الان ما اقول لہم﴾ (اس وقت میں ان سے جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ اس کو سن رہے ہیں) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جب یہ روایت سنی تو فرمایا: ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بھول ہوگئی۔ آنحضرت ﷺ کے

Marfat.com

الفاظ یہ تھے کہ: ﴿انھم الان لیعلمون ان الذی کنت اقول لھم ھو الحق﴾ (اس وقت ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ میں ان سے جو کچھ کہا کرتا تھا وہی حقیقت تھا) پھر انھوں نے قرآن سے استدلال کرتے ہوئے یہ آیت پڑھی: ﴿مَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ﴾ ''جو قبروں میں ہیں ان کو تم سنانے والے نہیں ہو۔'' گویا ان کا استدلال یہ تھا کہ جب قرآن قبر والوں کے سننے کی نفی کر رہا ہے تو آنحضرت ﷺ یہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ کفار میری یہ بات سن رہے ہیں۔

5۔ اوپر اہل خانہ کے گریہ و بکا پر میت کے عذاب والی جو روایت بیان کی گئی ہے اس پر گرفت کرتے ہوئے بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آیت ﴿لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی﴾ (کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ نہ اٹھائے گی) سے استدلال کیا کہ اگر رونے والے روتے ہیں تو مرنے والا ان کے گناہ کا ذمہ دار کیوں ہونے لگا۔

سنت رسول ﷺ کی روشنی میں تنقید:

مذکورہ پانچ روایات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے متن حدیث کی مطابقت قرآن مجید کی نصوص کے ساتھ دیکھی اور اس کی بنا پر روایت کے اضطراب کو واضح کیا۔ اب چند روایات ملاحظہ کیجیے جن میں ان کی مطابقت نبی ﷺ کے عمل اور سنت معلومہ کے ساتھ دیکھی گئی اور اگر سنت کے جاننے کا زیادہ مضبوط ماخذ میسر ہوسکتا تھا تو اس کی طرف رجوع کیا گیا۔

1۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے ایک گروہ میں یہ بات پھیل گئی کہ آدمی قضائے حاجت کے لیے بیٹھے تو اس کو اپنا رخ قبلہ یا بیت المقدس کی طرف نہیں کرنا چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے سنا تو اپنا ذاتی مشاہدہ یوں بیان کیا کہ میں ایک مرتبہ اپنی ہمشیرہ ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر کی چھت پر چڑھا۔ دیکھا تو آنحضرت ﷺ قضائے حاجت کے لیے بیٹھے تھے اور آپ ﷺ کا رخ بیت المقدس کی سمت کو تھا۔ گویا آپ ﷺ کا یہ عمل اس بات کا شاہد ہے کہ بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کی ممانعت کی روایت صحیح نہیں۔

(مسلم، کتاب الطھارۃ۔ باب الاستطابتہ)

2۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت بیان کی کہ اگر کسی شخص کو جنابت کی حالت میں فجر ہو جائے تو وہ روزہ نہ رکھے۔ یعنی روزہ کے درست ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انتہائے سحر سے پہلے غسل کر لیا جائے۔ عبدالرحمٰن بن حارث رضی اللہ عنہ اس کی تحقیق کے لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں گئے۔ انھوں نے بتایا کہ نبی ﷺ کو جنابت کی حالت میں اگر فجر ہو جاتی تو آپ ﷺ روزہ رکھ لیا کرتے تھے۔ اس طرح ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت حضور ﷺ کے عمل کے خلاف ہوئی۔

(مسلم، کتاب الصوم، باب صحتہ صوم من طلع علیہ الفجر وھو جنب)

3۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ اگر کوئی شخص ہدی کا جانور مکہ بھیجے تو جب تک وہ قربان نہیں ہو جائے گا، بھیجنے

Marfat.com

والے پر وہ پابندیاں ہوں گی جو احرام کی حالت میں ہوتی ہیں۔ ابن زیاد رضی اللہ عنہ نے ہدی کا جانور مکہ بھیجنا چاہا تو اس بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی ان کی رائے دریافت کی۔ آپ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ میں نے اپنے ہاتھوں سے اون کے پٹے بٹ کر جانور کے گلے میں ڈالے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ جانور مکہ بھیجا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اوپر ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی جو محرم پر ہوتی ہے۔ گویا ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت معروفہ کے خلاف تھا۔ (مسلم، کتاب الحج، باب استحباب بعث الهدی الی الحرم)

4۔ ابوذر رضی اللہ عنہ نے روایت بیان کی کہ آدمی نماز کے لیے کھڑا ہو تو اسے کجاوے کی پچھلی لکڑی کے برابر اونچا سترہ اپنے آگے رکھ لینا چاہیے ورنہ گدھا، عورت اور کتا اس کی نماز کاٹ سکتا ہے۔ یہ سن کر ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں نماز پڑھا رہے تھے۔ میں ایک گدھی پر سوار آیا اور صف کے سامنے گدھی کو چرتا چھوڑ کر خود نماز میں شریک ہوگیا۔ میرے اس عمل پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ گویا اگر ایسی کوئی تعلیم ہوتی تو لازماً مجمع میں سے میرے خلاف آوازیں بلند ہوتیں یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھے ٹوکتے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سنی تو اس پر یوں تبصرہ کیا کہ کیا ہی بری بات ہے کہ آپ لوگوں نے ہم عورتوں کو کتوں اور گدھوں کے برابر قرار دے دیا۔ میرا مشاہدہ تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے ہوتے اور میں آپ کے بالکل سامنے اس طرح لیٹی ہوتی جس طرح جنازہ رکھا ہوتا ہے۔ پس عورت کے سامنے ہونے سے نماز فاسد ہونے کی روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے خلاف ہونے کے باعث صحیح نہیں ہوسکتی۔

(مسلم، کتاب الصلوٰۃ باب سترۃ المصلی وباب قدر ما یستر المصلی وباب الاعتراض بین یدی المصلی)

5۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کو نماز عصر کے بعد غروب آفتاب تک نماز پڑھنے سے روکتے تھے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، عبدالرحمٰن بن ازہر رضی اللہ عنہ اور مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے استفسار کیا۔ انھوں نے کہا کہ عمر رضی اللہ عنہ کو غلط فہمی ہوئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف طلوع وغروب آفتاب کے اوقات میں نماز پڑھنے سے روکا تھا۔ مزید تحقیق کے لیے آپ نے ان لوگوں کو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس جانے کو کہا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز عصر کے بعد گھر میں نماز پڑھنے لگے۔ اس کا سبب پوچھا گیا تو فرمایا کہ آج وفد عبدالقیس کی مصروفیت میں نماز ظہر کے بعد کی دو رکعت نماز رہ گئی تھی، میں اس کی قضا ادا کر رہا تھا۔ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اس بات کا شاہد ہے کہ نماز عصر کے بعد نماز پڑھنے کی مطلق نہی نہیں ہے۔

(مسلم، کتاب الصلوٰۃ باب لا تتحروا بصلوتکم طلوع الشمس وباب معرفته الرکعتین بعد العصر)

اصول دین یا عقل عام کی روشنی میں تنقید:

متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین بسا اوقات کسی روایت کو اس بنا پر قبول نہ کرتے کہ وہ

Marfat.com

کسی اصول دین سے ٹکرا رہی ہوتی یا عقل عام کے خلاف ہوتی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

1۔ معقل رضی اللہ عنہ بن سنان نے روایت بیان کی کہ ہمارے قبیلے کی ایک عورت بردہ بنت واشق کا نکاح ہوا۔ ابھی نہ اس کے مہر کا تعین ہوا تھا نہ رخصتی ہوئی تھی کہ اس کے شوہر کا انتقال ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس عورت کو مہر مثل کا حقدار گردانا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے معقل رضی اللہ عنہ کی یہ روایت اس بنا پر قبول نہ کی کہ یہ اس قرآنی اصول کے خلاف تھی جو اس کی مماثل صورت حال میں مطلقہ کو مہر مثل کی نہیں بلکہ حسب استطاعت کچھ دینے دلانے کی حق دار قرار دیتا ہے۔

﴿وَّ مَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ﴾ (البقرہ: 236)

”ان کو دے دلا کر رخصت کرو، صاحب وسعت اپنی وسعت کے مطابق اور غریب اپنی حالت کے مطابق (دے)۔“

2۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت بیان کی کہ جس چیز کو آگ نے چھولیا اس کے کھانے سے وضو کی تجدید لازم ہوجاتی ہے۔ اس پر ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جس چیز کو میں کتاب اللہ میں حلال پاتا ہوں، کیا محض آگ پر گرم ہونے کی وجہ سے اس کے لیے مجھے نیا وضو کرنا ہوگا؟ پھر اپنا مشاہدہ بیان کیا کہ آنحضرت ﷺ نے وضو کیا، پھر حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے ہاں گوشت کھایا، اس کے بعد تجدید وضو کے بغیر نماز پڑھی۔ اس طرح کا مشاہدہ عمرو رضی اللہ عنہ بن امیہ اور ابورافع رضی اللہ عنہ نے بھی بیان کیا۔

(مسلم، کتاب الطھارۃ، باب الوضو مما مست النار و باب نسخ الوضو)

3۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت بیان کی کہ تین آدمی بہت برے ہیں اور ان میں بدترین ولد الزنا یعنی حرامی بچہ ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس روایت کو درست نہیں مانا اور کہا کہ اگر ولد الزنا ایسا ہی برا ہوتا تو اس کی ماں کے رحم میں وضع حمل تک تاخیر کا حکم نہ دیا گیا ہوتا۔

خلفائے راشدین کا محتاط رویہ:

جن معاملات میں قرآن کا کوئی حکم نہ ہوتا اور اصول دین کی روشنی میں مسئلہ حل نہ ہوسکتا اور کوئی صحابی ان معاملات میں کوئی شاذ روایت بیان کر دیتے تو خلفائے راشدین اس کی تحقیق مزید کے لیے ان سے ثبوت بھی طلب کر لیتے۔ اس کی بعض مثالیں ملاحظہ کیجیے:

1۔ ابن ابی ذویب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دادی پوتے کی میراث میں سے اپنے حق کا مطالبہ لے کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کتاب اللہ میں مجھے اس بارے میں کوئی رہنمائی نہیں ملتی اور سنت رسول ﷺ میں بھی کوئی ایسی چیز میرے علم میں نہیں ہے، اس لیے جاؤ میں مشورہ کر کے کوئی فیصلہ کروں گا۔ آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے سامنے یہ سوال اٹھایا تو مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے دادی کو چھٹے حصہ کا حق دیا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پوچھا، کیا اس واقعہ کا کوئی اور شاہد ہے؟ اس پر محمد بن مسلمہ انصاری رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور مغیرہ رضی اللہ عنہ کی تائید کی۔

Marfat.com

2۔ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملنے لگے، دروازے پر تین مرتبہ اجازت مانگی، جب آپ کو کوئی جواب نہ ملا تو لوٹ گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو بلا بھیجا اور واپس جانے کا سبب دریافت کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آنے والا اہل خانہ سے تین مرتبہ اجازت طلب کرے۔ اگر اجازت مل جائے تو فبہا ورنہ لوٹ جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس حدیث کا ثبوت لائیے، وہ گئے اور اُبی کو ساتھ لے کر آئے۔ اُبی نے گواہی دی اور کہا کہ عمر! آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے لیے عذاب نہ بن جائیے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں ابو موسیٰ کو متہم نہیں کر رہا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی قبول کی نسبت کا معاملہ ہی بڑا سنگین ہے۔ اگر میں ایسا نہ کروں تو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط باتیں منسوب کرنے لگیں گے۔

(سنن ابی داؤد۔ باب کم مرة یسلم الرجل فی الاستیذان)

مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جنین کی دیت کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے روایت بیان کی کہ اس صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لونڈی یا غلام آزاد کرنے کا حکم دیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ اس پر گواہ لاؤ۔ چنانچہ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے گواہی دی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ عہد صدیقی میں جب قرآن مجید کو مدون کیا گیا تو اس کی ہر آیت کے الفاظ، ترتیب اور سیاق وسباق پر دو صحابہ رضی اللہ عنہما کی گواہی لازم قرار دی گئی۔ معلوم ہوتا ہے شیخین رضی اللہ عنہما کے نزدیک سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت میں بھی پسندیدہ روش یہی تھی کہ اس کے کم سے کم دو گواہ ہوں۔ اگر تدوین حدیث کے دور میں یہی شرط ائمہ محدثین بھی ملحوظ رکھتے تو احادیث کے ایسے مجموعے تیار ہو جاتے جن کی صحت کا معیار بہت بلند ہوتا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ میرا معمول یہ تھا کہ میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث سنتا تو حسب توفیق اس پر عمل کرتا اور اس سے فائدہ اٹھاتا لیکن جب کوئی دوسرا شخص میرے سامنے روایت نقل کرتا تو میں اس پر اس سے حلف لیتا۔ جب وہ قسم کھا لیتا تو میں اس کی روایت کو صحیح تسلیم کر لیتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ طرز عمل بھی شیخین رضی اللہ عنہما کے طرز عمل کے مماثل ہے، دوسرے شاہد کی عدم موجودگی میں حلف ہی سے روایت کے مضمون کو مؤکد کیا جا سکتا ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں منافقین کو جب قوت حاصل ہوئی اور اس کے بعد مسلمانوں کے اندر گروہ بندی کو فروغ حاصل ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح ہدایات اور وعید کے باوجود لوگوں نے روایت حدیث میں احتیاط کا دامن چھوڑ دیا۔ چوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہر بات میں مسلمانوں کے لیے بڑی کشش تھی، اس لیے ان روایات کا بھی چرچا ہونے لگا جو منافقین اور فرقہ پرستوں نے پھیلانی شروع کیں۔ اس صورت حال میں بھی بزرگ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین اپنا فرض نہیں بھولے بلکہ معاملہ کی سنگینی کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کراتے رہے۔ چناں چہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے خطبوں میں برابر لوگوں کو ایسی روایات سے خبردار کرتے رہتے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور تک شائع نہ ہوئی تھیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ صحت روایت کا لوگوں کو احساس دلاتے

Marfat.com

رہتے تھے، اس لیے ان کے زمانے تک لوگ محتاط رہے۔ ان کے بعد گروہ بندی کے باعث نئی نئی باتیں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے منسوب کی جانے لگیں۔ ان باتوں کو بلاتحقیق قبول کر لینا دین کے لیے خطرناک تھا۔

روایات میں سند پر انحصار کا آغاز:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے جب کوئی شخص مشتبہ روایت بیان کرتا تو اس کی باتوں پر توجہ نہ دیتے۔ بشیر عدوی ان کے پاس آئے اور حدیثیں بیان کرنے لگے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ان کی باتوں پر کان نہیں دھرا۔ اس پر انھوں نے کہا: ابن عباس! میں حدیث روایت کر رہا ہوں اور آپ سن نہیں رہے؟ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ایک وقت تھا کہ جب کوئی شخص قال رسول اللہ ﷺ کہتا تو ہماری نگاہیں فوراً اس کی طرف اٹھ جاتیں اور ہم ہمہ تن گوش ہو کر اس کی بات سنتے۔ جب سے لوگوں نے ہر طرح کی قوی وضعیف روایات بیان کرنی شروع کر دی ہیں تو ہم اب انہی لوگوں کی بات سنتے ہیں جن سے ہم واقف ہیں۔

سوچنے کا یہی انداز جو ابن عباس رضی اللہ عنہ کا تھا، بعد میں ائمہ محدثین نے بھی اختیار کیا اور ہر روایت کی سند دریافت کرنے لگے۔ مشہور تابعی محدث ابن سیرین رحمہ اللہ کا قول ہے کہ پہلے اسناد معلوم کرنے کا رواج نہ تھا۔ جب فتنہ کا زمانہ آیا تو لوگوں نے راویوں سے پوچھنا شروع کیا کہ رجال سند کا نام لو۔ وہ نام لیتا تو جس کو اہل سنت میں سے سمجھتے اس کی روایت قبول کر لیتے اور جس کو اہل بدعت میں شمار کرتے اس کی روایت کو قبول نہ کرتے۔ اس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے درایت حدیث کے اسلوب کے بجائے اسناد کے ذریعے روایت کو پرکھنے کا طریقہ رائج ہو گیا اور تدوین حدیث کے زمانے میں اسی بات کا لحاظ رکھتے ہوئے ائمہ نے اپنے مجموعے مرتب کیے۔

خلاصہ بحث:

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین حدیث رسول ﷺ کے بارے میں نہایت بیدار (Alert) تھے۔ ان کے لیے سند کا مسئلہ ابھی پیدا نہ ہوا تھا لیکن متن حدیث پر وہ برابر غور کرتے اور درایت کے اصولوں پر اس کو پرکھتے۔ راوی اگرچہ ثقہ ہی نہیں بلکہ نہایت جلیل القدر بھی ہوتا تو بھی وہ متن حدیث کے اضطراب کی تحقیق کر کے اس کو دور کرتے۔ درایت کے اصولوں میں روایت کے شاہد تلاش کرنا، قرآن مجید اور سنت معلومہ سے اس کی مطابقت معلوم کرنا اور اصولی و عقلی بنیادوں پر اس کو جانچنا خاص اہمیت رکھتا تھا۔ خلفائے راشدین نے اپنے سامنے پیش ہونے والی بعض روایات کے حق میں گواہ طلب کیے یا حلف لیا اور روایت حدیث کے کام کی نزاکت سے مسلمانوں کو برابر آگاہ رکھا۔ دور صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے بعد روایت حدیث میں اسناد کو زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی۔ درایت کے پہلو سے تحقیق حدیث میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے طرز عمل میں ہمارے لیے آج بھی رہنمائی کا بڑا سامان ہے۔

Marfat.com

حدیثِ جبریل علیہ السلام

عَنْ يَحْيَى بْنِ يَعْمَرَ قَالَ كَانَ أَوَّلَ مَنْ قَالَ فِي قَدْرٍ بِالْبَصْرَةِ مَعْبَدُ الْجُهَنِيُّ فَانْطَلَقْتُ أَنَا وَحُمَيْدُ بْنُ عَبْدِالرَّحْمٰنِ الْحِمْيَرِيُّ حَاجَّيْنِ أَوْ مُعْتَمِرَيْنِ فَقُلْنَا لَوْ لَقِينَا أَحَدًا مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَسَأَلْنَاهُ عَمَّا يَقُولُ هٰؤُلَاءِ فِي قَدْرٍ فَوُفِّقَ لَنَا عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ دَاخِلَ الْمَسْجِدَ فَاكْتَنَفْتُهُ أَنَا وَصَاحِبِي أَحَدُنَا عَنْ يَمِينِهِ وَالْآخَرُ عَنْ شِمَالِهِ فَظَنَنْتُ أَنَّ صَاحِبِي سَيَكِلُ الْكَلَامَ إِلَيَّ فَقُلْتُ أَبَا عَبْدِالرَّحْمٰنِ إِنَّهُ قَدْ ظَهَرَ قِبَلَنَا نَاسٌ يَقْرَؤُنَ الْقُرْآنَ وَيَتَقَفَّرُونَ الْعِلْمَ وَذَكَرَ مِنْ شَأْنِهِمْ وَأَنَّهُمْ يَزْعُمُونَ أَنْ لَّا قَدَرَ وَأَنَّ الْأَمْرَ أُنُفٌ قَالَ إِذَا لَقِيتَ أُولٰئِكَ فَأَخْبِرْهُمْ أَنِّي بَرِيءٌ مِنْهُمْ وَأَنَّهُمْ بُرَآءُ مِنِّي وَالَّذِي يَحْلِفُ بِهِ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ لَوْ أَنَّ لِأَحَدِهِمْ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا فَأَنْفَقَهُ مَا قَبِلَ اللّٰهُ مِنْهُ حَتّٰى يُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ ثُمَّ قَالَ حَدَّثَنِي أَبِي عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ إِذْ طَلَعَ عَلَيْنَا رَجُلٌ شَدِيدُ بَيَاضِ الثِّيَابِ شَدِيدُ سَوَادِ الشَّعْرِ لَا يُرٰى عَلَيْهِ أَثَرُ السَّفَرِ وَلَا يَعْرِفُهُ مِنَّا أَحَدٌ حَتّٰى جَلَسَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَأَسْنَدَ رُكْبَتَيْهِ إِلٰى رُكْبَتَيْهِ وَوَضَعَ كَفَّيْهِ عَلٰى فَخِذَيْهِ وَقَالَ يَا مُحَمَّدُ أَخْبِرْنِي عَنِ الْإِسْلَامِ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اَلْإِسْلَامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَتُقِيمَ الصَّلٰوةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكٰوةَ وَتَصُومَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ إِنِ اسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيلًا قَالَ صَدَقْتَ قَالَ فَعَجِبْنَا لَهُ يَسْأَلُهُ وَيُصَدِّقُهُ قَالَ فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِيمَانِ قَالَ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ قَالَ صَدَقْتَ قَالَ فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِحْسَانِ قَالَ أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ قَالَ فَأَخْبِرْنِي عَنِ السَّاعَةِ قَالَ مَا الْمَسْئُولُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ قَالَ فَأَخْبِرْنِي عَنْ أَمَارَاتِهَا قَالَ أَنْ تَلِدَ الْأَمَةُ رَبَّتَهَا وَأَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُونَ فِي الْبُنْيَانِ قَالَ ثُمَّ انْطَلَقَ فَلَبِثْتُ مَلِيًّا ثُمَّ قَالَ لِي يَا عُمَرُ أَتَدْرِي مَنِ السَّائِلُ قُلْتُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ قَالَ فَإِنَّهُ جِبْرِيلُ أَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِينَكُمْ.

''یحییٰ بن یعمر سے روایت ہے کہ بصرہ میں سب سے پہلے جس شخص نے تقدیر کا انکار کیا وہ معبد الجہنی تھا۔ میں اور

Marfat.com

حمید بن عبدالرحمٰن الحمیری حج یا عمرہ کے لیے چلے تو ہم نے باہم یہ مشورہ کیا کہ اگر ہمیں رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے کوئی صاحب مل گئے تو ان سے تقدیر کے متعلق لوگوں کے خیالات کے بارے میں دریافت کرنا مناسب رہے گا۔ چنانچہ جب ہمیں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما مسجد میں داخل ہوتے نظر آئے تو میں نے اور میرے ساتھی نے انھیں دائیں بائیں سے گھیر لیا۔ مجھے گمان ہوا کہ میرا ساتھی چاہتا ہے کہ بات میں کروں، اس لیے میں نے کہا: ''ابوعبدالرحمٰن! ہمارے ہاں کچھ ایسے لوگ ظاہر ہوئے ہیں جو قرآن پڑھتے لیکن اس کے علم سے دھینگا مشتی کرتے ہیں۔'' میں نے ان کے مزید حالات سے انھیں آگاہ کیا اور بتایا کہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ تقدیر کچھ نہیں اور ہر معاملہ بالکل آغاز سے واقع ہوتا ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: ''جب تم ان لوگوں سے ملو تو انھیں بتانا کہ نہ میرا ان سے کوئی تعلق ہے اور نہ ان کا مجھ سے کوئی تعلق ہے۔ قسم اس ذات کی جس کے نام کی عبداللہ بن عمر قسم کھاتا ہے، اگر ان میں سے کسی کے پاس کوہ احد کی مانند سونا ہو اور وہ اسے (اللہ کی راہ میں) خرچ بھی کر دے تو اللہ اس کی یہ عبادت اس وقت تک قبول نہیں کرے گا جب تک وہ تقدیر پر ایمان نہ رکھتا ہوگا۔''

پھر انھوں نے حدیث بیان کی:

میرے والد عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے مجھے بتایا کہ ایک دن جب ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں موجود تھے، ناگاہ ایک ایسا شخص نمودار ہوا جس کے کپڑے بالکل سفید اور بال گہرے کالے رنگ کے تھے۔ اس پر سفر کا کوئی اثر دکھائی نہ دیتا تھا اور ہم میں سے کوئی اسے پہچانتا بھی نہ تھا۔ وہ سیدھا نبی ﷺ کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے اپنے گھٹنے حضور ﷺ کے گھٹنوں کے ساتھ جا ٹیکے اور ہاتھ اپنی رانوں پر رکھ لیے اور کہنے لگا: ''محمد ﷺ! مجھے اسلام کے بارے میں بتائیے۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اسلام یہ ہے کہ تو یہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، تو نماز قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرے، رمضان کے روزے رکھے اور بیت اللہ کا حج کرے، اگر اس تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو۔'' اس شخص نے کہا: ''آپ نے سچ کہا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ ہمیں اس شخص پر تعجب ہوا کہ حضور ﷺ سے سوال بھی کرتا ہے اور آپ ﷺ کی تصدیق بھی کرتا ہے۔ اس شخص نے پھر پوچھا: ''مجھے ایمان کے بارے میں بتائیے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر، آخرت کے دن پر اور تقدیر پر یعنی اچھی اور بری دونوں پر ایمان لائے۔'' اس شخص نے کہا: ''آپ نے سچ کہا۔'' پھر پوچھا: ''مجھے احسان کی بابت بتائیے۔'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے کیوں کہ اگرچہ تو نے اسے نہیں دیکھا وہ تو تجھے دیکھ ہی رہا ہے۔'' اس نے کہا: ''مجھے قیامت کی اطلاع دیجیے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس سے سوال کیا گیا ہے وہ سوال کرنے والے سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔'' اس نے کہا: ''مجھے اس کی

Marfat.com

نشانیاں ہی بتا دیجیے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''نشانی یہ ہے کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جنم دے اور تو ننگے پاؤں، ننگے بدن والے، کنگلے ریوڑ چرانے والوں کو دیکھے کہ وہ عمارتوں میں فخر کر رہے ہیں۔'' عمر رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ پھر وہ شخص چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد حضور ﷺ مجھ سے مخاطب ہوئے اور پوچھا: ''عمر! جانتے ہو سوال کرنے والا کون تھا؟'' میں نے عرض کی: ''اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ جبریل علیہ السلام تھے جو تمھیں تمھارا دین سکھانے کے لیے آئے تھے۔''

(صحیح مسلم، کتاب الایمان باب ماجاء فی الایمان والاسلام وذکر القدر وغیرہ)

مشکل الفاظ کے معانی:

قال فی القدر: ان اعتراضات کی تعبیر کے لیے آیا ہے جو تقدیر کی نفی میں کیے گئے۔ یہی مضمون دوسری روایت میں لما تکلم معبد بما تکلم به فی شان القدر کے الفاظ سے ادا کیا گیا ہے جن کا مفہوم ہے جب معبد نے تقدیر کے باب میں بعض نازیبا اعتراضات کیے۔

معبد الجہنی قبیلہ جُہینہ سے تعلق رکھتا تھا اور اس فرقے کا لیڈر تھا جو عام طور پر قدریہ کہلاتا ہے۔ یہ لوگ جیسا کہ حدیث سے واضح ہو رہا ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے دور ہی میں پیدا ہو گئے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ دنیا میں ظلم و تعدی کا اس قدر دور دورہ ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ خدا نے یہ سب کچھ پہلے سے مقدر کر دیا ہے تو وہ ظالم ٹھہرتا ہے۔ لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ تمام حالات کی باگ ڈور خود انسان کے ہاتھ میں ہے تو پھر خدا پر کوئی الزام نہیں آتا۔ گویا تقدیر کے انکار کا یہ عقیدہ خدا کی تنزیہہ (عیب سے پاک قرار دینے) کے لیے وضع کیا گیا۔

اکتنفته: کنف پہلو اور جانب کے معنی میں آتا ہے اور اکتناف پہلوؤں سے گھیر لینا کے معنی ہیں۔

سیکل الکلام الی: وہ بات کو میرے حوالے کرے گا۔ یعنی بات کرنے کا اختیار مجھے دے گا۔

یتقفرون العلم: قَفَرْتُ اَثَرَہٗ میں اس کے پیچھے چلا۔ اقتفر العظم: اس نے ہڈی چچوڑی۔

یتقفرون: موقع شاہد ہے کہ اچھے معنی میں نہیں۔ مطلب ہو گا دھینگا مشتی کرتے ہیں، بال کی کھال اتارتے ہیں۔

الامر انف: یہ قدریہ کے عقیدہ کی تعبیر ہے۔ انف معاملے کے آغاز کو کہتے ہیں۔ کاس انف: اس جام کو کہا جاتا ہے جس میں سے کسی نے پہلے نہ پیا ہو۔ الامر انف: کے معنی یہ ہوں گے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ پہلے سے طے نہیں بلکہ اس کا آغاز انسان خود کرتا ہے۔

حفاۃ: حافی کی جمع ہے یعنی ننگے پاؤں والے۔

عراۃ: عاری کی جمع ہے یعنی ننگے بدن والے۔

عالۃ: عائل کی جمع ہے یعنی کنگال، محتاج۔

یتطاولون: یعنی تکبر کے اظہار کے لیے گردن اٹھا کر اکڑتے ہیں۔

Marfat.com

روایت کے دوسرے طُرق:

یہ روایت سنن ابی داؤد میں بھی آئی ہے اور ان اہم روایات میں سے ایک ہے جن میں دین کی تعبیر بڑی جامعیت کے ساتھ پیش کی گئی ہے اور اس کی اساسات سمودی گئی ہیں۔اس میں جبریل علیہ السلام کی آمد کا جو واقعہ بیان ہوا ہے اس کی روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی کی ہے۔اسے امام مسلم رحمہ اللہ نے باب الایمان ماھو اور باب الاسلام ماھو میں لیا ہے اور یہ صحیح بخاری میں بھی ہے۔حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایتوں میں جو فرق ہے وہ صرف تفصیلات میں ہے نفس واقعہ میں نہیں ہے۔اول الذکر میں صورت حال کا باریک مشاہدہ ہے، سائل کی ہیئت کی تفصیل ہے اور اس کے سوال و جواب کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ذاتی تاثرات بھی بیان ہو گئے ہیں۔حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ امور تو راوی کی گرفت میں نہیں آئے البتہ بعض اضافے ایسے ہیں جو فہم حدیث میں مدد دیتے ہیں۔

اولاً اس میں جبریل علیہ السلام کی آمد کی تقریب یہ بتائی گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو دین کی بابت سوال کرنے کا موقع دیا تو وہ کچھ پوچھنے سے ہچکچائے۔اس پر جبریل امین علیہ السلام ایک اجنبی شخص کی ہیئت میں آ کر سوالات پوچھنے لگے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی ہچکچاہٹ کا سبب یہ رہا ہوگا کہ انھیں آیت:

﴿لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَلَكُمْ تَسُؤْكُمْ﴾ (المائدہ: 101)

”ایسے امور کے بارے میں سوال نہ کرو جو اگر ظاہر کر دیے جائیں تو تمھیں برے لگیں۔“

کے ذریعے بعض قسم کے سوالات سے روک دیا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ بالعموم سوالات کرتے رہنے میں محتاط ہو گئے تھے۔

ثانیاً ابوحیان رحمہ اللہ کے واسطہ سے روایت میں جبریل علیہ السلام کا پہلا سوال ایمان کے بارے میں نقل ہوا ہے اور دوسرا اسلام کے بارے میں۔اس ترتیب کا صحیح ہونا قرین قیاس ہے کیوں کہ ایمان دین کی نظری بنیاد اور اسلام اس کی عملی بنیاد ہے۔نظری بنیاد کو عملی تقاضوں سے پہلے واضح ہونا چاہیے۔

ثالثاً اس میں بیان ہوا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قیامت آنے کے وقت سے لاعلمی کا اظہار فرمایا تو یہ بھی فرمایا کہ وقوع قیامت کا تعلق علم غیب سے ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔آپ علیہ السلام نے سورہ لقمان کی آخری آیت:

﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ﴾

(لقمان: 34)

”قیامت کا علم اللہ کو ہے، وہ بارش برساتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ ماؤں کے پیٹ میں ہوتا ہے۔کوئی نہیں جانتا کہ کل کیا کرے گا اور کوئی نہیں جانتا کہ کس سرزمین پر مرے گا۔ بلاشبہ اللہ علم و خبر رکھنے والا ہے۔“

Marfat.com

سے استشہاد بھی فرمایا۔ یہ اضافہ قرین قیاس ہے کیونکہ حضور ﷺ اپنے فرائض منصبی کے لحاظ سے معلم قرآن تھے اور سائلوں کی تربیت کی خاطر جوابات میں آیات قرآنی کا حوالہ دیا کرتے تھے۔ حضور ﷺ کی یہ عادت مبارکہ متعدد روایات سے ثابت ہے۔ نیز حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں علامات قیامت نسبتاً زیادہ واضح ہیں۔

رابعاً اس سے پتا چلتا ہے کہ سائل کے چلے جانے کے بعد حضور ﷺ نے حاضرین مجلس سے کہا کہ وہ اسے واپس بلائیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم جب باہر گئے تو انھیں سائل کے آثار کہیں دکھائی نہ دیے۔ حضور ﷺ کے اس حکم کی مصلحت یہ معلوم ہوتی ہے اہل مجلس بچشم خود اس بات کا مشاہدہ کر لیں جو حضور ﷺ فرمانے والے تھے یعنی یہ کہ سائل جبریل امین علیہ السلام تھے جو مجلس سے اٹھنے کے بعد اصل ہیئت میں لوٹ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

صحیح بخاری کی روایت میں ایمان کے ذیل میں کتاب پر ایمان کا ذکر نہیں اور الحفاۃ العراۃ رؤس الناس کا جملہ بھی نقل نہیں ہوا۔ صحیح مسلم کی روایت اس سے زیادہ جامع ہے۔

وضاحت حدیث:

مذکورہ صدر روایت کا ابتدائی حصہ راوی کے اس بیان پر مشتمل ہے کہ ان کی اس حدیث تک رسائی کیسے ہوئی۔ وہ کہتے ہیں کہ بصرہ میں معبد الجہنی کا اٹھایا ہوا فتنہ قدریہ کی شکل میں پھیلنے لگا۔ یہ لوگ تقدیر کا انکار کرتے تھے۔ بعض لوگ ان کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر یہ سمجھنے لگے کہ مسلمان ہونے کے لیے تقدیر پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ اس صورت حال میں صحیح الفکر مسلمانوں کو تشویش لاحق ہوئی۔ انھوں نے معاملہ کو چند دانشوروں کی جدت پسندی پر محمول کر کے نظر انداز کرنے کے قابل نہیں سمجھا بلکہ انھیں اہل علم صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی طرف رجوع کرنے کی خواہش ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اس خواہش کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین چوں کہ گلشن نبوت کے خوشہ چین ہیں، اس لیے ان کی رائے فکر نبوی کی عکاس ہوگی۔ اور ایک مسلمان کے لیے وہی سرمایۂ ہدایت ہے، چنانچہ راوی یحییٰ بن یعمر اور ان کے ایک دوست حُمید بن عبدالرحمٰن الحمیری جب مکہ کے سفر پر روانہ ہونے لگے تو انھوں نے اپنے قیام مکہ کے دوران اس مسئلہ کی تحقیق کا بھی عزم کر لیا۔ چنانچہ وہاں اتفاقاً ان کی ملاقات حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ہوگئی۔ دونوں ساتھیوں نے تمام صورت حال ان کے سامنے پیش کی۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے قدریہ کے عقیدہ سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد اس سے سخت بیزاری کا اظہار کیا اور اس کی تردید میں ایک حدیث سنائی جو انھوں نے اپنے والد محترم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے سنی تھی اور جس میں اجزائے ایمان میں تقدیر پر ایمان کا ذکر بھی موجود ہے۔ گویا انھوں نے اس حدیث سے واضح کیا کہ ایمان بالقدر کا ضروری ہونا خود حضور ﷺ کے فرمان سے ثابت ہے، لہٰذا کوئی مسلمان اسے غیر ضروری قرار دینے کی جسارت نہیں کرسکتا۔

روایت کا دوسرا حصہ اصل حدیث پر مشتمل ہے۔ اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ جبریل امین علیہ السلام ایک اجنبی کے روپ میں صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی مجلس میں اس حال میں پہنچے کہ ان کا لباس صاف ستھرا تھا اور

Marfat.com

ان پر سفر کا کوئی گرد و غبار نہ تھا۔ وہ آ کر ایک مؤدب شاگرد کی طرح حضور ﷺ کے سامنے گھٹنوں سے گھٹنے ملا کر بیٹھ گئے اور پے در پے دین کے بارے میں سوال کرنے لگے۔ حضور ﷺ ان کے نہایت جامع جواب دیتے اور یہ بات حاضرین مجلس کے لیے حیرت کا باعث ہوئی کہ یہ اجنبی حضور ﷺ کے جوابات کی تائید بھی کرتے جا رہے تھے۔ جب وہ فارغ ہو کر مجلس سے اٹھ گئے تو حضور ﷺ نے انکشاف فرمایا کہ یہ جبریل علیہ السلام تھے جو امت کی تعلیم کی غرض سے بعض اہم دینی امور کے بارے میں سوالات کرنے آئے تھے۔

جبریل علیہ السلام کے تین ابتدائی سوالات اسلام، ایمان اور احسان کے بارے میں ہیں۔ اسلام دین کے عملی مطالبات اور ایمان اس کی فلسفیانہ بنیادوں کی تعبیر ہے اور احسان اس میں ترقی درجات حاصل کرنے کا راستہ ہے۔ گویا ایمان دین کی بنیاد ہے، اس بنیاد پر جو عمارت کھڑی ہوتی ہے وہ اسلام ہے اور اس عمارت کو رفعت اور شان وشوکت احسان سے حاصل ہوتی ہے۔ قیاس یہ چاہتا ہے کہ چونکہ ایمان وہ اساس فراہم کرتا ہے جس پر اسلام کی عمارت تعمیر ہوتی ہے اس لیے جبریل علیہ السلام کا پہلا سوال ایمان کے بارے میں ہوتا اور دوسرا اسلام کے بارے میں۔ ہمارے نزدیک اصل میں سوالوں کی یہی ترتیب رہی ہوگی۔ اس کی تائید ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے ہوتی ہے جسے امام مسلم رحمہ اللہ نے باب الایمان ماھو وبیان خصالہ میں بیان کیا ہے۔

اسلام:

اس حدیث میں جبریل امین علیہ السلام کا پہلا سوال یہ نقل ہوا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ یوں تو اسلام کا لفظ خدا کی مرضی کے آگے اپنے آپ کو ڈال دینے اور حوالے کر دینے کے لیے آتا ہے اور اسلام کی روح بھی کامل سپردگی اور کامل حوالگی ہی ہے لیکن حضور ﷺ نے یہ جواب نہیں دیا۔ اصل میں سوال نقل کرنے میں عموماً اختصار سے کام لیا جاتا ہے۔ جواب دینے والا شخص چوں کہ سائل کے سوال کو پیش نظر رکھ کر ہی جواب دیتا ہے، اس لیے سوال کا اصل رخ جواب ہی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہاں حضور ﷺ کے جواب کو مدنظر رکھا جائے تو جبریل امین علیہ السلام کا اصل سوال یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین اسلام کے اختیار کرنے کے عملی تقاضے کیا ہیں؟ اس کا جواب حضور ﷺ نے یہ دیا کہ سب سے پہلے آدمی یہ اقرار کرے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ یہ وہ شہادت یعنی حلف ہے جس کے نتیجے میں بندہ خدا کی وحدانیت اور حضرت محمد ﷺ کی رسالت کی بنیاد تسلیم کر کے اسلام کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال لیتا اور دوسرے مذاہب سے اپنے آپ کو ممیز کر لیتا ہے۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے عبادات کا ذکر فرمایا جو اقرار توحید کے عہد کی بنیادی دفعات ہیں اور جن پر دین اسلام کا نظام قائم ہے یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ یہ عبادات تعلق باللہ کی اساس ہیں اور حقوق العباد سے عہدہ برآ ہونے اور احکام شریعت پر عمل کرنے کی تربیت مہیا کرتی ہیں۔

اقرار توحید کے عہد کی پہلی دفعہ کی حیثیت نماز کو حاصل ہے۔ یہ تمام نیکیوں اور بھلائیوں کا سرچشمہ، سب کی کلید اور احکام خداوندی کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس سے بندہ خدا کا قرب حاصل کرتا اور دین کی راہ پر چلنے کی قوت پاتا ہے۔ یہ

Marfat.com

خدا کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کا عملاً اظہار ہے۔

زکوٰۃ ان تمام احکام کا منبع ہے جو حقوق العباد سے متعلق ہیں۔ یہ بخل اور حب مال پر ضرب لگا کر آدمی کے اندر خدا کے بندوں کے لیے ہمدردی اور مواخات کے جذبات پیدا کرتی ہے جن کے نتیجہ میں وہ ان کے حقوق ادا کرنے میں فراخ دل ہو جاتا ہے۔ زکوٰۃ سے خدا کی راہ میں سب کچھ تج دینے کا حوصلہ بھی پیدا ہوتا ہے اور بندہ دین کی راہ میں عالی حوصلگی کا ثبوت دیتا ہے۔

روزہ و حج نظام دین میں تقویٰ کی تربیت کی عبادتیں ہیں اور تقویٰ تمام احکام شریعت کی بنیاد ہے۔ اس تقویٰ سے خدا کے آگے اعمال کی جواب دہی کا احساس پیدا ہوتا ہے اور بندہ اپنے ہر قول و فعل کو حق و باطل کی کسوٹی پر پرکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔

ایمان:

جبریل امین علیہ السلام کا دوسرا سوال یہ ہے کہ ایمان کیا ہے؟ ایمان کے اصل معنی یقین، اعتماد اور اعتقاد کے ہیں لیکن یہاں بھی سوال کی نوعیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب سے سمجھ میں آتی ہے۔ یعنی جبریل علیہ السلام نے یہ پوچھا کہ کن باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے؟ اس کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ پر، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر، آخرت کے دن پر اور اچھی اور بری دونوں طرح کی تقدیر پر ایمان لانا ضروری ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں قرآن مجید ہی کی بیان کردہ اساسات بیان ہوئی ہیں۔ وہاں آیا ہے:

﴿لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ﴾ (البقرة: 177)

"وفاداری ان کی ہے جو اللہ پر، یوم آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور نبیوں پر ایمان لائیں۔"

اس ایمان سے پہلو تہی کو بڑی دور کی گمراہی قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا﴾

(النساء: 136)

"جس شخص نے اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور یوم آخر کا انکار کیا وہ بہت دور کی گمراہی میں بھٹک گیا۔"

اس جواب میں دین کی عقائدی اور فلسفیانہ بنیادوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اللہ پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ بندے کو یہ یقین ہو کہ تنہا وہی ہمارا اور ہر چیز کا خالق، مالک، آقا اور رب ہے۔ اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں اور صرف وہی یہ حق رکھتا ہے کہ بندہ اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرے۔ فرشتوں پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ وہ یہ مانے کہ فرشتے خدا کی اطاعت شعار مخلوق ہیں جو اس کی اطاعت سے سرمو انحراف نہیں کرتے۔ وہ معصوم، امین اور خدا کے معتمد کارکن ہیں جو احکام الٰہی کے نفاذ کا ذریعہ بنتے اور انسانوں کے پاس اللہ کی ہدایت لاتے ہیں۔ کتابوں پر ایمان یہ ہے کہ یہ

Marfat.com

مانے کہ تمام کتابیں اللہ کی جانب سے نازل ہوئیں اور یہ صحفِ ہدایت اور واجب الاتباع ہیں۔ ان میں قرآن مجید چوں کہ آخری اور محفوظ کتاب الٰہی ہے اس لیے یہ حق وباطل کی کسوٹی ہے۔ زندگی کے ہر پہلو میں اس کی رہنمائی موجب فلاح ہے۔ رسولوں پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ تمام رسولوں کو خدا کی طرف سے مامور اور واجب الاطاعت ہادی مانے، ان کے علم کو بے خطا سمجھے، ان کے عمل کو زندگی کے لیے اسوہ قرار دے، ان کی اتباع، اطاعت اور محبت کو لازم جانے اور رسولوں کے مابین کوئی تفریق نہ کرے۔ یوم آخرت پر ایمان کا تقاضایہ ہے کہ مرنے کے بعد حاصل ہونے والی نئی زندگی کو شدنی مانے، اپنے ہر قول وفعل کا خدا کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ سمجھے اور خدا کے بے لاگ انصاف پر یقین رکھے کہ وہ نیکوں کو ان کی نیکی کا صلہ اور بدوں کو ان کی برائی کی سزا دے گا اور اس کے فیصلے کے نفاذ میں کوئی طاقت حائل نہ ہوسکے گی۔ ایمان بالقدر کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ اس امر کا یقین رکھے کہ ہر انسان اپنی زندگی میں جس طرح کے حالات سے دوچار ہوتا ہے وہ خیر ہوں یا شر، وہ اللہ کے اذن سے رونما ہوتے ہیں اور اس کے لیے ایسا ہونا مقدر ہے۔ زندگی اور موت، بیماری اور صحت، رزق کی تنگی اور فراخی، عزت وذلت وغیرہ ہر فرد کے لیے پہلے سے طے ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی مذکورہ آیات میں اجزائے ایمان میں ایمان بالقدر کو شمار نہیں کیا گیا، اس لیے حدیث میں اس کا مستقل ذکر قرآن پر ایک اضافہ ہے۔ اگر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ تقدیر پر ایمان، اللہ اور یوم آخرت پر ایمان ہی کی ایک فرع ہے۔ قرآن مجید کی رو سے ہر فرد انسانی کو دنیا کی جو زندگی ملی ہے وہ اس کے رویّے اور عمل کو جانچنے کے لیے ملی ہے۔ وہ خدا کے حکم سے ایک خاص مدت کے لیے ایک امتحان میں ڈالا جاتا ہے جس میں اس کی کارکردگی کا نتیجہ قیامت کے روز اس کے سامنے آئے گا۔ یہ امتحان بعض احوال ہی سے عبارت ہے جن میں ہر انسان پیدا ہوتے ہی اپنے آپ کو پاتا ہے اور جو اس کے مالک کے تجویز کردہ ہیں۔ ان احوال کو بدلنے پر کوئی شخص قادر نہیں۔ اگر بدلنا ممکن ہوتا تو بندہ خدا کی طاقت کی نفی کر کے اپنے آپ کو اس امتحان سے نکال لیتا اور یوں مقصد حیات کالعدم ہو جاتا۔ لہٰذا تقدیر کا انکار خدا اور بندے کے مابین تعلق کا انکار اور اس اساس ہی پر ضرب ہے جس پر دنیا وآخرت کا نظام قائم ہے۔

احسان:

جبریل امین علیہ السلام کا تیسرا سوال احسان سے متعلق ہے۔ احسان کا لفظی مفہوم کسی کام کو بہتر سے بہتر طریقہ پر سرانجام دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند وہ دین داری ہے جس میں احسان پایا جائے۔ یعنی بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا جائے۔ فرمایا:

﴿وَ مَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ﴾ (النساء: 125)

''اس شخص سے اچھا دین کس کا ہے جو اپنا چہرہ اللہ کے آگے جھکا دے جبکہ وہ خوب کار بھی ہو۔''

Marfat.com

حدیث میں جبریل علیہ السلام کا سوال اصلاً یہ ہے کہ یہ احسان کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ جواب میں نبی ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کی عبادت اس احساس کے ساتھ کرو کہ تم اسے دیکھ رہے ہو۔ چوں کہ کسی کو ذات باری تعالیٰ کا حسی مشاہدہ نہیں ہوتا، اس لیے حضور ﷺ نے ساتھ ہی یہ فرما دیا کہ اگر چہ تم نے اللہ کو نہیں دیکھا مگر وہ تو تمھیں دیکھتا ہے۔ یعنی اللہ کو دیکھنے کا احساس پیدا کرنے کے لیے یہی جاننا کافی ہے کہ وہ ہمارے اعمال پر نظر رکھے ہوئے ہے۔

اللہ کی عبادت کا تقاضا اس کی اطاعت بھی ہے، اس لیے حضور ﷺ کا یہ فرمان اہل دین کے درجات کی بلندی کے لیے بڑی وسیع جولان گاہ فراہم کرتا ہے۔ ایک بندہ خدا کی بندگی میں مشغول ہو یا اس کی شریعت پر عمل کر رہا ہو، دونوں صورتوں میں اس کو یہ احساس ہو کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہے تو اس کا کام اعلیٰ ترین معیار پر سرانجام پائے گا اور اللہ کے ہاں مقبول ہو کر کرنے والے کی مقبولیت کا باعث ہوگا۔ رہا یہ سوال کہ بہترین عمل کے لیے یہ احساس ضروری کیوں ہے؟ تو اس کا جواب خود حضور ﷺ کے الفاظ میں موجود ہے۔ عبادت اللہ اور بندے کے درمیان ایک عہد کی تکمیل ہے جس میں بندہ اپنے آقا کے آگے نیاز مندی اور وفاداری کا اظہار کرتا ہے۔ اللہ چوں کہ علیم وخبیر ہے، اس لیے وہ بندے کی ہر کیفیت سے واقف ہے۔ بندے کا اظہار عبودیت غیر مخلصانہ یا سرسری ہوگا تو وہ اپنی عبادت کا مقصد حاصل کرنے سے قاصر رہے گا۔ چونکہ خدا بندے کے دل کی بے کیفی کو جانتا ہے، لہٰذا اس کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ اپنی عبادت پورے خلوص واہتمام اور اس شعور کے ساتھ کرے کہ وہ مالک کو دیکھ رہا ہے تاکہ یہ عبادت خدا کی نظروں میں پسندیدہ ٹھہرے۔

کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ جب خدا کو حسی طور پر دیکھنا ممکن ہی نہیں تو عملاً یہ شعور پیدا کرنا بھی ناممکن ہے کہ بندہ خدا کو دیکھ رہا ہے، اس لیے حدیث میں بیان کردہ کیفیت کا حصول ناقابل عمل ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ بندے کے لیے مالک کی پہچان کا ذریعہ اس کی صفات ہیں جن کا مشاہدہ اسے زندگی میں ہر لمحہ اور ہر قدم پر ہوتا ہے اور جن کے بیان سے قرآن مجید مملو ❶ ہے۔ اگر عبادت واطاعت کے وقت بندہ ان صفات الٰہیہ کو مدنظر رکھے جو اس سے متعلق ہیں اور ان کی مناسبت سے اپنی حیثیت کو بھی نہ بھولے تو اس کی عبادت واطاعت خدا کو دیکھ کر سرانجام پائے گی۔

مثال کے طور پر نماز اور روزہ کی ادائیگی کے وقت خدا کی فرماں روائی، الوہیت، علم وخبر وغیرہ کی صفات ذہن میں مستحضر ❷ ہوں۔ انفاق کرتے وقت یہ شعور ہو کہ رزق کی کشائش ❸ یا تنگی، عزت وذلت سب خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہی غنی اور سب کا رب ہے۔ کمزوروں کے ساتھ معاملہ کرتے وقت یہ احساس ہو کہ اصل طاقت اللہ کی ہے، وہ عزیز وجبار ہے۔ احکام شریعت پر عمل کرتے وقت خدا کا شدید العقاب (سزا دینے میں سخت) ہونا ذہن سے

---

❶ مملو: بھرا ہوا۔ املاء (بھرنا) سے اسم مفعول۔

❷ مستحضر: حاضر، یاد (مصدر 'استحضار' یاد ہونا)۔

❸ کشائش: کشادگی، فراخی۔

Marfat.com

اوجھل نہ ہو۔ علیٰ ہذا القیاس جب ہر اطاعت خدا کی ان صفات کو مستحضر کر کے کی جائے جو اس سے متعلق ہوں تو بندے کے قلب کو صحیح رخ حاصل ہوگا۔ یہ عبادت و اطاعت خدا کو دیکھ کر سرانجام پائے گی اور بندہ اسے اس طرح پورا کر سکے گا جیسا کہ اس کا مالک اسے دیکھنا چاہتا ہے۔ اس سے کم تر احساس یہ ہے کہ بندہ ہر عمل کے وقت یہ جانتا ہو کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے۔

قیامت:

جبریل علیہ السلام کا اگلا سوال یہ ہے کہ قیامت کب واقع ہوگی؟ اس کا جواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھیک وہی دیا جس کی قرآن مجید میں آپ کو تعلیم دی گئی تھی۔ قرآن میں ہے:

﴿يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ۖ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ اللَّهِ﴾ (الاحزاب: 63)

''لوگ تم سے قیامت کی بابت پوچھتے ہیں، کہو اس کا علم تو اللہ کے پاس ہے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس معاملے میں میں بھی اتنا ہی بے خبر ہوں جتنا سائل ہے، یعنی اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ البتہ سائل کے مطالبے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس کی بعض علامات سے تمھیں آگاہ کرتا ہوں۔ علامات یہ ہوں گی کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جنے گی، ننگے بدن اور ننگے پاؤں والے کنگال چرواہے عمارتوں پر فخر سے رہا کریں گے۔ یہ علامات جب ظاہر ہونے لگیں تو سمجھنا قیامت قریب ہے۔

ان علامات کے ذریعے جس حقیقت کی تعبیر کی گئی ہے اس تک پہنچنا آسان نہیں۔ مستقبل کے واقعات و کیفیات اور قرب قیامت کے فتنوں کی خبر متعدد احادیث میں دی گئی ہے۔ اس طرح کی احادیث کو مختلف ادوار میں مختلف احوال پر چسپاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اس سے اختلاف تاویل پیدا ہوا ہے۔ ہمارے نزدیک ان احادیث کی حیثیت بالکل وہی ہے جو قرآن مجید کی آیات متشابہات کی ہے جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

﴿مَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ﴾ ''اس کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

اس لیے اصولی طور پر یہ مانتے ہوئے کہ مستقبل کے ان واقعات کی حقیقت کا علم صرف اللہ کو ہے، اپنی جستجو اسی حد تک محدود رکھنی چاہیے جہاں تک الفاظ حدیث یا نظائر حدیث رہنمائی دیتے ہوں۔

جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں قدرے وضاحت سے یوں آئے ہیں:

((اذا ولدت الامة ربها فذاك من اشراطها و اذا كانت العراة الحفاة رؤس الناس فذاك من اشراطها و اذا تطاول رعاء البُهم فى البنيان فذاك من اشراطها))

''جب لونڈی اپنے آقا کو جنم دینے لگے تو یہ اس کی ایک علامت ہوگی۔ جب ننگے بدن اور ننگے پاؤں والے لوگوں کے سردار بن جائیں تو یہ اس کی ایک علامت ہوگی اور جب بہائم (جانوروں) کے چرواہے عمارتوں میں اکڑنے لگیں تو یہ اس کی ایک علامت ہوگی۔''

Marfat.com

ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

((اذا رایت الحفاة العراة الصم البکم ملوك الارض فذاك من اشراطها))

''جب تو ننگے پاؤں، ننگے بدن والے، بہرے گونگے لوگوں کو زمین کا بادشاہ بنے دیکھے تو یہ اس کی ایک علامت ہوگی۔''

اس سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ نے تین علامات بیان فرمائیں جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ایک حد تک یکجا کر دیا گیا ہے۔ ان علامات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی علامت نظام عائلی کے فساد سے متعلق ہے جس میں اولاد اور والدین کے باہمی حقوق تلف ہوں گے، دوسری نظام سیاسی کے فساد سے متعلق ہے جس میں غیر مہذب پست ذہنیت کے نااہل لوگ بنی نوع انسان کے سیاہ وسفید کے مالک بن جائیں گے اوران کے ہاتھ میں دنیا کی زمام کار آجائے گی۔ تیسری نظام معیشت میں ایک انقلاب سے متعلق ہے جس کے نتیجے میں چرواہے محلات میں ٹھاٹ سے رہیں گے۔

جہاں تک نظائر کا تعلق ہے علامات قیامت کا یہ مضمون ان الفاظ میں بھی آیا ہے:

''ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی مجلس میں مصروف گفتگو تھے کہ ایک اعرابی نے سوال کر دیا کہ قیامت کب ہوگی؟ حضور ﷺ نے اپنی گفتگو جاری رکھی تو کچھ لوگوں نے کہا: آپ ﷺ نے سن تو لیا ہے لیکن یہ سوال آپ ﷺ کو ناگوار گزرا ہے۔ دوسروں نے کہا: نہیں آپ ﷺ نے سنا ہی نہیں۔ جب حضور ﷺ اپنی گفتگو مکمل کر چکے تو پوچھا: قیامت کے بارے میں سوال کرنے والا کہاں ہے؟ اس نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! میں یہاں ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جب امانت ضائع کر دی جائے تو قیامت کا انتظار کرنا۔ اس نے پوچھا: امانت کو ضائع کرنے کی کیفیت کیا ہوگی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جب زمام کار نااہلوں کے حوالے کر دی جائے تو قیامت کا انتظار کرنا۔''

(صحیح بخاری، کتاب العلم)

''ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ جب...... مرد اپنی بیوی کے کہنے پر چلے اور ماں کی نافرمانی کرنے لگے، جب وہ دوستوں کو اپنے قریب کرے اور باپ کو دور رکھے، جب مسجدوں میں آوازیں بلند ہونے لگیں، قبیلے کی سربراہی اس کے فاسق شخص کے ہاتھ میں ہو، قوم کا لیڈر ان کا کمینہ آدمی بن جائے، ایک شخص کی عزت اس کے شر کے اندیشے سے کی جائے...... تو اس وقت لوگ قیامت کی پے در پے نشانیوں کا انتظار کریں......'' (ترمذی)

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ دنیا کی آخری بربادی سے قبل ایک عام فساد دنیا پر مسلط ہو جائے گا جس کے نتیجے میں لوگ ایک دوسرے کے حقوق تلف کریں گے، عزوشرف کے اصل معیار معدوم ہو جائیں گے اور معاشرے میں شریر لوگوں کی عزت ہوگی۔ عدل وقسط اور شرافت سے عاری فساق واراذل [1] کے ہاتھ میں بنی نوع انسان کے

---

[1] فُسّاق: فاسق (بدکار) کی جمع۔ اراذل: ارذل کی جمع، نالائق، کمینے لوگ۔

Marfat.com

معاملات کی باگ ڈور ہوگی۔ ان حالات کے بعد ایک وقت آئے گا جب فساد کا غلبہ اس حد تک بڑھ جائے گا کہ خالق کائنات دنیا کی بساط ہی لپیٹ کر رکھ دے گا۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ یہ کیسے معلوم ہوگا کہ علامات قیامت نمودار ہوچکی ہیں یا نہیں؟ تو اس کا بھی دوٹوک جواب دینا ممکن نہیں۔ برسات کے بعد بالکل غیر محسوس طریقہ سے ایک کے بعد دوسری پتی خشک ہوکر درخت سے گرنے لگ جاتی ہے لیکن کئی ہفتے گزرنے کے بعد ہی ایک وقت آتا ہے جب صاف الفاظ میں یہ کہنا ممکن ہوتا ہے کہ موسم خزاں آچکا ہے۔ یہی صورت علامات قیامت کے ظہور میں پیش آئے گی۔

حدیث کے آخر میں بیان ہوا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اجنبی کے چلے جانے کے بعد یہ سوال کیا کہ یہ شخص کون تھا؟ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے بارے میں کچھ نہ بتا سکے تو حضور ﷺ نے بتایا کہ یہ جبریل امین علیہ السلام تھے جو دین سکھانے کی غرض سے آئے تھے۔ یہ بات قرآن مجید سے ثابت ہے کہ فرشتے انسانی شکل میں کئی مرتبہ ظاہر ہوئے ہیں اور دین کے احکام پر عمل کرنے کا طریقہ سکھانے کے لیے بھی وہ انبیاء کے پاس آتے رہے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے پاس جبریل علیہ السلام کی آمد متعدد حدیثوں میں بیان ہوئی ہے۔

تفسیر تدبر قرآن

تفسیر تدبر قرآن منفرد انداز میں تصنیف کی گئی ہے۔ مولانا اصلاحی رحمہ اللہ ہر سورہ کی تفسیر سے پہلے اس کا مرکزی مضمون یا عمود بیان کرتے اور پہلے پچھلی سورتوں کے ساتھ اس کے معنوی ربط پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کے بعد وہ پوری سورہ کا تجزیہ کرکے آیات کے ایسے مجموعوں کی نشان دہی کرتے جو ایک مضمون پر مشتمل ہوتی ہیں۔ پھر وہ ہر مجموعہ کو لے کر اس کی تفسیر کرتے ہیں۔ اس میں وہ ہر آیت کے مشکل الفاظ اور جملوں کی ساخت نیز اسالیب زبان کی شرح کرتے ہیں، پھر ہر آیت کا اندرونی نظم کھولتے اور آیات کے مجموعہ میں اس کا مفہوم واضح کرتے ہیں۔ اس طرح ہر آیت کا مفہوم اپنے سیاق وسباق میں متعین ہو جاتا اور پوری سورہ ایک وحدت کی صورت میں سامنے آجاتی ہے۔ یہ طرزِ بیان بالکل نیا اور نہایت دل نشین ہے۔

(علامہ خالد مسعود رحمہ اللہ صاحب کی مولانا امین احسن میموریل لیکچر میں کی گئی تقریر میں سے ایک اقتباس)

Marfat.com

حدیث قتال

عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ لَمَّا تُوُفِّیَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَاسْتُخْلِفَ أَبُو بَکْرٍ بَعْدَهٗ وَکَفَرَ مَنْ کَفَرَ مِنْ بِالْعَرَبِ قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ لِأَبِی بَکْرٍ کَیْفَ تُقَاتِلُ النَّاسَ وَقَدْ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَقُولُوا: لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، فَمَنْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ فَقَدْ عَصَمَ مِنِّی مَالَهٗ وَنَفْسَهٗ إِلَّا بِحَقِّهٖ وَحِسَابُهٗ عَلَی اللّٰهِ فَقَالَ أَبُو بَکْرٍ وَاللّٰهِ! لَأُقَاتِلَنَّ مَنْ فَرَّقَ بَیْنَ الصَّلٰوةِ وَالزَّکٰوةَ، فَإِنَّ الزَّکٰوةَ حَقُّ الْمَالِ، وَاللّٰهِ! لَوْ مَنَعُونِی عِقَالًا کَانُوا یُؤَدُّونَهٗ إِلٰی رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ لَقَاتَلْتُهُمْ عَلٰی مَنْعِهٖ فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَوَاللّٰهِ مَا هُوَ إِلَّا أَنْ رَأَیْتُ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ قَدْ شَرَحَ صَدْرَ أَبِی بَکْرٍ لِلْقِتَالِ فَعَرَفْتُ أَنَّهُ الْحَقُّ.

(صحیح مسلم، باب الامه بقتال الناس)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی اور آپ ﷺ کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنائے گئے اور بعض عربوں نے کفر اختیار کرلیا تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ لوگوں سے کس بنا پر جنگ کریں گے جبکہ رسول اللہ ﷺ فرما چکے ہیں کہ مجھے لوگوں سے اس وقت تک جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک کہ وہ لا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ کا اقرار نہ کرلیں۔ پس جو شخص لا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ کا اقرار کرلے تو اس کا جان و مال مجھ سے محفوظ ہوگئے، بجز اسی کلمہ کے کسی حق کی خاطر۔ اور اس شخص کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔ اس پر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: اللہ کی قسم! میں ہر اس شخص سے جنگ کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ کے درمیان تفریق کرے گا کیوں کہ زکوٰۃ مال کا حق ہے (جو حقداروں کو ادا کیا جاتا ہے)۔ اللہ کی قسم! یہ لوگ اگر اونٹ کا گھٹنا باندھنے کی ایک رسی بھی جو وہ رسول اللہ ﷺ کو دیتے رہے مجھ سے روکیں گے تو میں اس کے روکنے پر ان سے جنگ کروں گا۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہتے تھے: اللہ کی قسم! اسی بات کو دیکھ کر کہ اللہ عزوجل نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جنگ کے معاملہ میں شرح صدر عطا کردیا ہے، میں نے بھی یہ سمجھا کہ جنگ کرنا ہی حق ہے۔''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت جس میں ایک حدیث نبوی کی توجیہہ پر دو گرامی قدر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی بحث کا حوالہ دیا گیا ہے، صحاح کی تمام اہم کتابوں میں بیان ہوئی ہے۔ یہ بحث حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں اس وقت ہوئی جب عرب میں سیاسی خلفشار پیدا ہوا، جیسا کہ روایت کے الفاظ ((کفر من کفر من

Marfat.com

العرب)) سے واضح ہورہا ہے۔اس خلفشار میں بہت سے وہ لوگ مرتد ہوگئے جو اسلام کے سیاسی غلبے کے نتیجے میں مصلحتاً مسلمان ہوگئے تھے اور آنحضرت ﷺ کی رحلت کے بعد انھوں نے سمجھا کہ ان کی مجبوری اب ختم ہوگئی۔ بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ اب نبوت کا خلا واقع ہوگیا ہے۔ اگر وہ نبی ہونے کا دعویٰ کردیں تو یہ دعویٰ انہیں سیاسی جمعیت اور اقتدار سے ہم کنار کردے گا۔ان کے ایسا دعویٰ کرنے کے بعد ان کے ہمنواؤں نے اسلامی حکومت سے ٹکر لی۔ تیسرا طبقہ ایسا بھی تھا جو اپنی شرائط پر اسلام میں رہنا چاہتا تھا۔ یہ لوگ نماز کا فریضہ ادا کرنے کو تیار تھے لیکن زکوٰۃ کو وبال جان سمجھتے تھے اور اس سے جان چھڑانے کے خواہاں تھے۔

روایت کے دوسرے طُرق:

مذکورہ صدر روایت کو امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الاعتصام بالکتاب والسّنۃ کے باب الاقتدار بسنن رسول اللہ ﷺ میں بعینہٖ انہی الفاظ میں لیا ہے جو اوپر بیان ہوئے لیکن کتاب استتابۃ المرتدین والمعاندین اور باب وجوب الزکوٰۃ میں انھوں نے جو روایت لی ہے اس میں لفظ عِقَالاً (اونٹ کا گھٹنا باندھنے کی رسی) کے بجائے عناقا (بکری کی میمنی) آیا ہے اور اس کی مناسبت سے مونث ضمیریں استعمال ہوئی ہیں۔ باقی مضمون میں کوئی اہم فرق نہیں۔

امام مسلم رحمہ اللہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہم کی بحث سے مجرد کر کے بھی اصل حدیث کو باب الامر بقتال الناس میں لائے ہیں۔ واسطوں کے اختلاف کے باعث حدیث کے الفاظ میں جو فرق واقع ہوگیا ہے وہ ملاحظہ ہو:

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت جو سعید بن مسیّب رحمہ اللہ کے واسطہ سے آئی ہے، اس کے الفاظ تو وہی ہیں جو اوپر مذکور ہوئے لیکن ان کی دوسری روایت عبدالرحمٰن بن یعقوب رحمہ اللہ کے واسطہ سے ہے جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

((عن رسول اللہ ﷺ قال اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الہ الا اللہ ویومنوابی وبما جئت بہ فاذا فعلوا ذلک عصموا منی دماء ھم واموالھم الا بحقھا وحسابھم علی اللہ))

''میں لوگوں سے جنگ کرتا رہوں گا یہاں تک کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور ایمان لائیں مجھ پر اور اس پر جو میں لے کر آیا۔ جب وہ ایسا کریں تو وہ اپنے جان و مال کو مجھ سے محفوظ کرلیں گے بجز اسی کلمہ کے کسی حق کے لیے اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہوگا۔''

جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ مذکورہ صدر حدیث کے مطابق ہیں۔ صرف 'من قال' کے بجائے 'فاذا قالوا' کے الفاظ آنے کے باعث جمع کی ضمیریں استعمال ہوئی ہیں۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ان الفاظ میں ہے:

((امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الہ الا اللہ وان محمد رسول اللہ

Marfat.com

ویقیموا الصلاۃ ویؤتوا الزکوٰۃ فاذا فعلوا عصموا منی دماء ھم واموالھم الا بحقھا وحسابھم علی اللہ))

''مجھے لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا حتی کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب وہ ایسا کریں تو وہ اپنے جان و مال کو مجھ سے بچالیں گے بجز اسی کلمہ کے حق کے لیے اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔''

مالک رحمہ اللہ کی روایت ہے:

((قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول من قال لا الہ الا اللہ وکفر بما یعبد من دون اللہ حرم مالہ ودمہ وحسابہ علی اللہ))

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ جس شخص نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا اور اللہ کے سوا جن کی عبادت کی جاتی ہے ان کا انکار کیا، اس کے مال و جان محترم ہوگئے اور اس کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔''

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ چار مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین جن کی روایت امام مسلم رحمہ اللہ تک پہنچی ہے کلمہ لا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ کا اقرار نہ کرنے والوں کے ساتھ آنحضرت ﷺ کے ارادۂ قتال، اور اس کے اقرار کے بعد لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت اور ان کی نیتوں کے حساب کے خدا کے ذمہ ہونے کے مضامین پر متفق ہیں۔ اس طرح روایت کے مختلف طُرق سے اس کی صحت کا یقین حاصل ہوتا ہے۔ ان روایات میں جو معمولی فرق واقع ہوا ہے وہ اس لیے ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے نبی ﷺ کے اصل الفاظ نہیں دہرائے بلکہ روایت بالمعنی کی ہے۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے جن الفاظ میں روایت کی ہے اگر وہ الفاظ آنحضرت ﷺ نے فی الواقع استعمال کیے ہوتے تو وہ بحث نہ پیدا ہوتی جو مانعین زکوٰۃ کے ساتھ جہاد کے وقت پیدا ہوئی۔ اس صورت میں نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے کسی اعتراض کی گنجائش ہوتی اور نہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو انھیں قائل کرنے کے لیے دلائل دینے پڑتے اس لیے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں یقیموا الصلوٰۃ ویوتو الزکوٰۃ کی تفصیل سے اگرچہ مضمون کی تکمیل ہوگئی ہے اور اس میں کوئی خلا باقی نہیں رہا۔ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ اصل حدیث میں نہ تھے۔ ان کا اضافہ روایت کے بالمعنی ہونے کے باعث ہوا ہے۔

وضاحت حدیث:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی بحث سے مجرد حدیث کے الفاظ کا مفہوم بالکل صاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم ہے۔ یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک لوگ لا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ کا اقرار نہیں کر لیتے۔ اگر وہ یہ اقرار کرلیں تو میں ان کے جان و مال کی حفاظت کا ضامن بن جاؤں گا حتی کہ وہ خود کوئی ایسی حرکت نہ کریں کہ ان کے جان و مال اسی کلمہ لا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ ہی کے تحت

Marfat.com

مطلوب ہوں۔ لوگوں کا یہ اقرار نیک نیتی پر مبنی ہوتا ہے یا بدنیتی پر، اسے دیکھنا میرے دائرہ کار میں نہیں ہے۔ میں ان کے ظاہری اقرار کی بنیاد پر معاملہ کروں گا اور ان کی نیتوں کا حساب اللہ کے ذمہ ہوگا۔

'لوگوں سے جنگ' کے الفاظ اگرچہ عام ہیں لیکن معلوم ہے کہ نبی ﷺ نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا جس سے لوگوں کو تلوار کے زور سے مسلمان بنانے کی سعی کی گئی ہو۔ آپ ﷺ نے طویل عرصہ تک تبلیغ دین فرمائی اور اس میں آپ ﷺ کو ظلم وستم بھی سہنے پڑے۔ ہجرت کے بعد یہود سے معاہدات کیے گئے جن کی رو سے اسلامی حکومت ان کی دست و بازو تھی۔ بعض علاقوں کے اہل کتاب سے جزیہ قبول کیا گیا۔ آپ ﷺ کو متعدد جنگیں لڑنی پڑیں لیکن یہ بیشتر مدینہ کے قرب وجوار میں پیش آئیں۔ ان کا سبب آپ ﷺ نہیں بنے بلکہ ان میں قریش پیش پیش نظر آتے ہیں۔ اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ سے کوئی خاص معنی مراد ہیں۔

جب ہم مضمون قتال کی بابت قرآن مجید کے احکام کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں ایک تدریج نظر آتی ہے۔ ہجرت مدینہ تک مسلمانوں کو کسی بھی جنگی کارروائی سے روکا گیا تھا۔ ہجرت کے بعد آغاز میں صرف ان کارروائیوں میں حصہ لینے کی اجازت دی گئی جو بالکل ناگزیر ہوجائیں۔ فتح مکہ کے بعد ایک مرحلہ آیا جب مسلمانوں کو مشرکین سے قتال عام کا حکم ہوا۔ اس کا الٹی میٹم نبی اکرم ﷺ نے 9ھ کے حج کے اجتماع میں دلوایا تاکہ پورے عرب کے قبائل اس کو سن لیں اور اس دارو گیر سے عام طور پر واقف ہوجائیں جو چند ماہ بعد ہونے والی تھی۔ پھر یا تو شرک سے تائب ہوکر ایمان لے آئیں یا جنگ کا لقمہ بننے کو تیار رہیں۔ اسلام قبول کرنے کی علامت اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کو قرار دیا گیا۔ قرآن مجید میں یہ حکم ان الفاظ میں دیا گیا:

﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (التوبہ: 5)

"پھر جب محترم مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں ان کو پاؤ، ان کو پکڑو، ان کو گھیرو اور ان کے لیے ہر گھات میں بیٹھو۔ تب اگر وہ توبہ کرلیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔ بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔"

پس حدیث کے الفاظ میں 'لوگوں' سے مراد یہی مشرکین بنی اسماعیل ہیں اور 'جنگ' سے مراد وہ دارو گیر ہے جس کا اعلان 9ھ کے حج میں ہوا۔ اس بات کی شہادت کہ حضور ﷺ کا یہ ارشاد اسی موقع کا ہے اس بات سے بھی ملتی ہے کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اس کے راویوں میں ہیں جو 7ھ میں اسلام لائے۔

ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ اس مرحلے میں مشرکین کے ساتھ قتال کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رسولوں کو ان قوموں کے لیے فیصلہ کن داعی بنا کر بھیجتا رہا ہے جو ان کی

Marfat.com

مخاطب تھیں۔ جب انھوں نے قوم پر اتمام حجت کر دیا تو نافرمانی کی صورت میں یا تو قوم پر عذاب بھیجا گیا جس سے وہ ہلاک ہوگئی یا اسے مومنین کے ہاتھوں تباہ کر دیا گیا۔ اس سنت اللہ کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے ایک طویل مدت تک قریش کو، جو پورے عرب کے سردار تھے دین کی تبلیغ کی۔ ایمان لانے کے بجائے انھوں نے آپ ﷺ کو ہجرت پر مجبور کر دیا۔ آپ ﷺ نے مدینہ کو مرکز دعوت بنایا تو وہ آپ ﷺ کو وہاں سے بھی اکھاڑنے کے درپے ہوگئے۔ متعدد جنگوں کے بعد آپ ﷺ نے مکہ فتح کر لیا تو قریش عام طور پر ایمان لے آئے۔ اس سے دوسرے عرب قبائل کے قبول اسلام کی راہ ہموار ہوگئی۔ مسلمانوں کی اس کامیابی کے بعد کسی مشرک کے لیے اس بات کا جواز باقی نہ رہا کہ وہ اپنے آبائی دین پر اڑا رہے۔ چنانچہ خاصی مدت گزرنے کے باوجود جو لوگ اپنی ضد پر قائم رہے ان سے نمٹنے کے لیے آنحضرت ﷺ کو یہ ہدایت دی گئی کہ ان کی سرکوبی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا جائے کیوں کہ رسول کی بعثت اور اتمام حجت کے بعد اس کے مخاطبوں کو شرک پر قائم رہنے دینا اللہ تعالیٰ کی سنت کے خلاف ہے۔

اب حدیث کا مفہوم متعین کیجیے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے داروگیر کے اسی حکم کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ میں برابر مشرکین بنی اسماعیل سے جنگ کرتا رہوں گا حتی کہ یہ اپنے موقف سے توبہ کر کے لَا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰـهُ کا اقرار کر لیں۔ اس اقرار میں ظاہر ہے کہ اس کلمہ کے تقاضے از خود شامل ہیں جن میں نماز اور زکوٰۃ سرفہرست ہیں۔ اور سورہ توبہ کی آیت 5 میں ان کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ جو لوگ نبی ﷺ پر ایمان لانے والے بنے ان کے لیے حضور ﷺ نے یہ ضمانت دی کہ اسلامی حکومت ان کو شہریت کے تمام حقوق دے گی اور ان کی جان و مال کی حفاظت کرے گی، الا یہ کہ وہ خود ہی اس کلمہ کے کسی تقاضے کی خلاف ورزی کر کے اپنے جان و مال کو خطرے میں نہ ڈال لیں۔ اس میں اشارہ ہے ان حدود کی طرف جو اسلام نے رائج کیں اور بعض جرائم کی سزا میں قتل، پھانسی، جلاوطنی وغیرہ کی بھی گنجائش رکھی۔ جو شخص اپنی ظاہری زندگی میں مذکورہ تبدیلی پیدا کر لیتا وہ امت مسلمہ کا فرد بن جاتا اور شہری حقوق اسے حاصل ہو جاتے۔ رہا اس کی نیت کا معاملہ کہ اس نے اسلام کا ظاہری لبادہ اوڑھا یا واقعی ایمان اس کے دل میں راسخ ہو گیا تو اس کے بارے میں حضور ﷺ نے واضح فرما دیا کہ نیتوں کا حساب اللہ کے ہاں ہوگا۔ میری ذمہ داری اسی دنیا کی حد تک ہے۔

حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی بحث:

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فتنہ جو لوگوں کے خلاف سخت رویہ اختیار کیا اور مختلف اطراف میں پے درپے جنگی مہمات کا آغاز کیا تو انھوں نے منکرین زکوٰۃ کے خلاف بھی اقدام کا فیصلہ فرمایا۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: 'کیف تقاتل الناس' کہ ایسے لوگوں سے آپ جنگ کس بنا پر کریں گے؟ وہ اسلام سے مرتد نہیں ہوئے۔ وہ کلمہ گو ہیں اور ایسے لوگوں کو رسول اللہ ﷺ ان کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دے چکے، ان سے برسرپیکار ہو جانے کا کیا جواز ہے؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس سوال کا جو جواب دیا وہ ظاہر ہے اس قدر مدلل اور بالتفصیل رہا

Marfat.com

ہوگا کہ اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے زیرک اور مزاج شناس وحی کو قائل کر دیا لیکن روایت میں اس کے صرف تین جملے بیان ہوئے ہیں۔ البتہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جواب کے تین پہلو تھے، ایک یہ کہ نماز اور زکوٰۃ میں تفریق نہیں کی جاسکتی۔ دوسرا یہ کہ زکوٰۃ کلمہ لَا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰهُ ہی کے تحت مال کا حق ہے لہٰذا اس سے انکار کرنے والے کے لیے جان و مال کی حفاظت ختم ہو جائے گی۔ تیسرا یہ کہ زکوٰۃ کی وصولی کی سنت رسول اللہ ﷺ نے قائم کی ہے جس کو بدلنے پر میں قادر نہیں۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ جواب قدرے تفصیل چاہتا ہے جو حسب ذیل ہے:

پورے قرآن مجید میں دین اسلام کی تعبیر کا جو مختصر اور جامع اسلوب اختیار کیا گیا ہے اس میں بیسیوں جگہ نماز اور زکوٰۃ کا حکم اکٹھے آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں بنیادی نیکیوں کی حیثیت انہی دو کو حاصل ہے۔ باقی نیکیاں انہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ نماز انسان کو خدا سے صحیح طور پر جوڑ دیتی ہے اور زکوٰۃ سے خلق کے ساتھ اس کا تعلق بالکل صحیح بنیاد پر استوار ہو جاتا ہے۔ نماز اور زکوٰۃ پر تمام دین و شریعت کا مدار ہونا صرف قرآن ہی سے واضح نہیں بلکہ تورات، انجیل اور دوسرے صحیفوں میں بھی ان کی یہی حیثیت ہے۔ قرآن مجید میں جہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو یہ خبر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ملک میں اقتدار بخشے گا وہاں حکومت کے فرائض میں اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کو سرفہرست رکھا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿الَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ﴾ (الحج: 41)

''وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو ملک میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے۔''

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ نماز اور زکوٰۃ اسلامی نظام کے وہ بنیادی اجزاء ہیں جن کے نفاذ پر ایک اسلامی حکومت مامور ہے۔ ان میں سے کسی کی اہمیت گھٹائی نہیں جاسکتی۔ ان میں سے کسی ایک کو نظر انداز کرنا دین میں وہ رخنہ پیدا کرتا ہے جس کے بعد دین کی عمارت قائم نہیں رہ سکتی۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسی پس منظر میں یہ عزم فرمایا کہ میں نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کرنے پر ہرگز تیار نہیں اور منکرین زکوٰۃ کو اس بنا پر کوئی رعایت دینے کو تیار نہیں کہ وہ نماز پڑھنے پر تیار ہیں اور اسلام کی حمایت کا دم بھرتے ہیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے جواب کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ کلمہ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ میں توحید کا جو اقرار کیا جاتا ہے اس کے بعض واجبات اور تقاضے بھی ہیں۔ اس کے تحت نماز اللہ تعالیٰ کا پہلا حق ہے۔ اس کا دوسرا حقِ زکوٰۃ ہے جو اس نے مال پر عائد کیا ہے۔ اسلامی حکومت زکوٰۃ کی وصولی اللہ کے مقرر کیے ہوئے حق کی حیثیت سے کرتی ہے۔ یہ اس کا اپنا عائد کردہ ٹیکس نہیں ہے جسے وہ اپنی صوابدید پر ختم کر سکے۔ لہٰذا اگر لوگ لَا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰـهُ کے اس تقاضے کو پورا نہیں کریں گے تو ان کے لیے حکومت کی وہ امان ختم ہو جائے گی جس کی ضمانت نبی اکرم ﷺ نے دی تھی۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس جواب کو سمجھنے کے لیے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ خلفائے راشدین کی حکومت رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا تکملہ و تتمہ تھی، اس لیے آنحضرت ﷺ کے ناتمام کاموں کی تکمیل اور دین کا نفاذ اس کی ذمہ داری میں

Marfat.com

شامل تھا۔ مشرکین کے لیے دار وگیر کے مذکورہ حکم کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانا خلیفہ رسول کا فرض منصبی تھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پالیسی اس عزم کی آئینہ دار تھی کہ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کی تکمیل چاہتے تھے۔ اس لیے آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی ضمانت مال کا حق حکومت کو ادا نہ کرنے پر ختم ہو جائے گی۔

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے جواب کا تیسرا پہلو یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذمہ داری کی حدود کا پورا پورا خیال رکھا اور اسلام لانے والوں کو ایسی مراعات نہیں دیں جو انھیں بنیادی فرائض مثلاً ادائیگی زکوٰۃ سے بری الذمہ قرار دیتی ہوں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے نفاذ میں کوئی مداہنت (1) نہیں برتی تو آپ کے کسی جانشین کے لیے یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ وہ لوگوں کے جائز مطالبہ پر دینی فرائض میں کتر بیونت کرے؟ اسی لیے آپ نے فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تکمیل دیے ہوئے کسی کام کو ڈھانے پر تیار نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ کی حیثیت سے مال کا وہ ادنیٰ سے ادنیٰ حصہ (یا دوسری روایت کے الفاظ میں بکری کی وہ میمنی) بھی جو یہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتے رہے وصول کر کے رہوں گا، خواہ مجھے اس کے لیے ان سے جنگ ہی کیوں نہ لڑنی پڑے۔

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وضاحت اس قدر مدلل اور دلنشین تھی اور اس میں اس قدر اعتماد تھا کہ وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دل میں اتر گئی اور اس بات کا انھیں بھی یقین کامل ہو گیا کہ لوگوں کی اپنی شرط پر لا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کا اقرار واقعی بے معنی ہے اور ایسے لوگوں کا شمار ان لوگوں میں ہونا چاہیے جو اسلامی حکومت کا قلادہ اپنی گردن سے نکال کر اس کے مستحق ہو گئے ہیں کہ تلوار ان کا فیصلہ کرے۔

روایت سے امیر کے اختیار پر استدلال:

اس روایت سے بعض لوگ امیر کے لیے اپنے شوریٰ کی رائے کو مسترد کرنے کے اختیار کا حق ثابت کرتے ہیں۔ جہاں تک اس روایت کے الفاظ کا تعلق ہے ان سے یہ اشارہ تک بھی نہیں نکلتا کہ منکرین زکوٰۃ کے ساتھ جنگ کا مسئلہ کبھی مجلس شوریٰ میں پیش بھی ہوا یا حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے مابین اس افہام و تفہیم میں کوئی تیسرا شخص بھی شریک تھا۔ مزید برآں اس روایت میں کسی ایسے فیصلے کا کوئی حوالہ نہیں جو مجلس شوریٰ نے کیا ہو اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسے رد کر دیا ہو۔ اس کے برعکس معلوم یہ ہوتا ہے کہ سربراہ مملکت اور خلیفۂ رسول کی حیثیت سے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ جو ذمہ داریاں ادا کر رہے تھے ان کے حق میں دلائل اور اپنے اقدامات کی حکمت انھوں نے واضح فرمائی اور یہ بتایا کہ میرے یہ اقدامات شریعت کی فلاں فلاں نصوص پر مبنی ہیں۔ لہٰذا اس روایت سے امیر کے لیے ویٹو کا حق تو ثابت نہیں ہوتا، البتہ اس سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ امیر کے لیے اپنے ان اقدامات کو شوریٰ کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت نہیں جو وہ شریعت کے احکام کے نفاذ کے لیے کر رہا ہو۔ نیز اسلامی مجلس شوریٰ کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ شریعت کے واضح احکام کو موضوع بحث بنائے۔ البتہ افہام و تفہیم کی غرض سے وہ امیر کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے اس سے وضاحت طلب کر سکتی ہے۔

☆......☆......☆

---

(1) مداہنت: سستی۔

Marfat.com

مُوحّدین کے لیے وعدۂ جنّت

"عن عثمان رضی اللہ عنہ قال قال: رسول الله ﷺ من مات وهو يعلم انه لا اله الا الله دخل الجنة." (مسلم، کتاب الایمان، باب من لقی الله بالایمان)

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص یہ مانتا ہوا مرا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ جنت میں داخل ہو گیا۔''

وضاحت حدیث:

عَلِمَ یَعْلَمُ کے سادہ معنی تو جاننے کے ہیں لیکن عربی زبان میں الفاظ کبھی اپنے بالکل ابتدائی اور سادہ مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں اور کبھی اپنے انتہائی اور کامل مفہوم میں۔ چنانچہ یہ لفظ بھی جب اپنے کامل مفہوم میں آتا ہے تو اس سے مراد وہ جاننا ہوتا ہے جو پورے یقین واذعان [1] اور عزم و جزم کے ساتھ ہو۔ اس معنی کی تائید قرآن مجید میں اس لفظ کے بعض استعمالات سے بھی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر سورہ بقرہ کی آیت 259 میں ایک پیغمبر کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ ان کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا جو برباد ہو چکی تھی۔ انھیں خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ اس بستی کو کیسے دوبارہ زندگی عطا کردے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی قدرت کا مشاہدہ کرانے کے لیے سو سال تک کے لیے ان پر موت طاری کردی۔ جب ان کو اٹھایا تو ان کا سواری کا گدھا ہڈیوں کا پنجر بن چکا تھا۔ اللہ نے ان کے دیکھتے دیکھتے اس پنجر کی ہڈیوں کو پھر سے جوڑا اور ان پر گوشت چڑھا کر گدھے کو نئی زندگی دے دی۔ اس موقع پر جب ان پیغمبر کو عین الیقین حاصل ہوا تو وہ پکار اٹھے: "اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ" (میں مان گیا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے) ظاہر ہے کہ اللہ کی قدرت کا اتنا بڑا مظاہرہ دیکھ کر وہ یہ کمزور جملہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ مجھے معلوم ہے کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ انھوں نے اگر کہا تو یہ کہا کہ میرے دل سے شک کا کانٹا نکل گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ گویا 'اعلم' یہاں اپنے انتہائی اور کامل معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے آسمانی دستر خوان کے نزول کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا:

﴿وَ نَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا﴾ ''اور ہم یہ جان لیں کہ تم نے سچ کہا۔'' (المائدۃ: 113)

---

[1] اذعان: فرمانبرداری، اقرار، یقین۔

Marfat.com

یہاں بھی 'نَعْلَمَ' اپنے کامل معنی میں ہے گویا حواریوں نے درخواست کی کہ ہمیں آسمان سے دسترخوان نازل کر کے ایک معجزہ دکھا دیا جائے تاکہ ہمیں پوری طرح یقین واذعان حاصل ہو جائے کہ آپ نے ہم سے سچا وعدہ کیا۔

زیر بحث حدیث میں بھی 'یَعْلَمُ' کا لفظ ہمارے نزدیک اپنے کامل مفہوم میں ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ بندۂ مومن کے دل میں اس حقیقت کے بارے میں شک کا کوئی کانٹا نہ ہو بلکہ اسے پورا یقین وایمان ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

من مات وھو یعلم میں مرنے والے کی حالت کا بیان ہے یعنی ''جو شخص یہ یقین رکھتا ہوا مرا کہ......'' یہ حالت تقاضا کرتی ہے کہ مرنے والے کی یہ کیفیت مرنے سے پہلے کی زندگی میں بھی رہی ہو اور اسے موت آئے تو اسی ایمان ویقین کی حالت میں آئے۔ یعنی وہ زندگی گزارے تو کلمہ توحید پر قائم رہ کر اور اس کا خاتمہ ہو تو وہ بھی اسی کلمہ پر۔ یہ سعادت ظاہر ہے کہ موت کو دیکھ کر ایمان لانے والے کو حاصل نہیں ہو سکتی، اسی لیے اس کا ایمان مقبول نہیں ہوتا، بلکہ اس شخص کو حاصل ہوتی ہے جو ہر لمحہ اور ہر آن خدا کی توحید کا استحضار [1] رکھے اور لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ کی حقیقت کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دے۔ اگر دل ودماغ پر غفلت کو طاری ہونے کا موقع دیا جائے تو کیا معلوم کہ جب بندے پر وقت آخر آئے تو وہ اسی غفلت کی حالت میں ہو اور توحید پر اس کا خاتمہ نہ ہو سکے۔ لہٰذا انبیائے کرام نے اپنے متعلقین کو ہمیشہ یہی نصیحت کی ہے کہ وہ دین توحید کے بارے میں ہوشیار اور محتاط رہیں تاکہ ان کی موت اسلام ہی پر آئے۔ سورۂ بقرہ میں خانوادۂ ابراہیم خلیل اللہ کی اسلام کے ساتھ وابستگی کا جہاں ذکر ہوا ہے وہاں بتایا گیا ہے کہ اپنے وقت آخر میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ (البقرة: 132)

''اللہ نے تمھارے لیے دین توحید کو منتخب کر لیا ہے، پس تمھیں ہرگز موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔''

یہی تلقین اس امت کو کی گئی جب یہ فرمایا:

﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ (آل عمران: 102)

''اللہ سے ڈرو جیسا ڈرنے کا حق ہے اور تمھیں موت ہرگز نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔''

حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ ایمان واسلام پر اپنے خاتمہ کی دعا کیا کرتے تھے:

﴿تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ﴾ (یوسف: 101)

''مجھے وفات دے اسلام کی حالت میں اور مجھے ملا نیکوں کے ساتھ۔''

پس ان تفصیلات کی روشنی میں زیر بحث حدیث کا مفہوم یہ متعین ہوا کہ اگر ایک بندہ مومن اپنی زندگی کلمہ توحید کے تقاضوں کے مطابق توحید پر پورے یقین واعتماد کے ساتھ گزارتے ہوئے اسی حالت میں اپنی جان جان آفرین کے سپرد کرے گا تو اس کے لیے آخرت میں جنت کا حتمی وعدہ ہے۔

[1] استحضار: ذہن میں (حاضر) رکھنا۔

Marfat.com

اس مجمل مفہوم کی کچھ تفصیل ہے جس کے لیے اس مفہوم کی حامل دوسری روایات پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ یہ روایات کتب حدیث میں بکثرت موجود ہیں لیکن ہم بحث کو مکمل کرنے کے لیے صرف مسلم شریف کی چند روایات پر اکتفا کرتے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

نظائر حدیث:

1۔ حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ (من شهد ان لا اله الا الله وان محمداً رسول الله حرم الله عليه النار) ''جس شخص نے یہ گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں، خدا اس پر آتش دوزخ کو حرام کردے گا۔''

اس روایت میں کلمہ توحید کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت کو بھی دوزخ سے بریت کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے اور یہ بات فلسفۂ دین کے مطابق ہے کیوں کہ توحید کی اصل حقیقت کو لوگوں پر واضح کرنے والے پیغمبر ہی ہوتے ہیں۔ ان کی رہنمائی سے بے نیاز ہو کر ایک شخص نہ توحید کا فہم حاصل کرسکتا ہے اور نہ اس کے تقاضوں سے واقف ہوسکتا ہے۔

2۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک سفر کے دوران صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا زادراہ کم پڑ گیا۔ خوراک کی کمی کے باعث باربرداری کے جانوروں کو ذبح کرنے کی نوبت آگئی۔ اس مرحلہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام شرکائے سفر کو اپنا بچا کھچا زادِراہ یکجا کرنے کی ہدایت فرمائی۔ جب انھوں نے ایسا کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں برکت کی دعا فرمائی جس کے نتیجے میں زادِراہ پورے سفر کے لیے کفایت کرگیا۔ اس معجزے کے ظہور کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پکار اٹھے: (اشهد ان لا اله لا الله وانى رسول الله لايلقى الله بهما عبد غير شاك فيهما الادخل الجنته) ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بے شک میں اللہ کا رسول ہوں۔ کوئی بندہ جو یہ دو گواہیاں دیتا ہوا اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ وہ ان کے بارے میں کسی شک میں مبتلا نہ ہو، وہ جنت میں داخل ہوگا۔''

اس روایت میں توحید و رسالت کی گواہی کو اس شرط کے ساتھ مشروط کردیا گیا ہے کہ یہ دل کے یقین کے ساتھ ہو، گواہی دینے والا شک میں مبتلا نہ ہو اور اسی پر قائم رہتا ہوا رب سے جا ملے۔ یہ وہی شرط ہے جو زیر بحث روایت کے الفاظ سے متعین ہوتی ہے، جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا، لیکن وہاں یہ اس طرح نمایاں نہیں جیسی اس روایت میں ہے۔

3۔ حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے یہ اقرار کیا کہ میں یہ گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے جس کا کوئی شریک نہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں، عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے، اس کی بندی کے بیٹے، اس کا وہ فرمان جو اس نے مریم علیہا السلام پر ڈالا اور اس کی جانب سے ایک روح ہیں اور یہ کہ جنت حق ہے اور دوزخ حق ہے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کے آٹھ

Marfat.com

دروازوں میں سے جس دروازے میں سے چاہے گا داخل کرے گا۔

اس روایت میں نبی ﷺ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیثیت کے اقرار اور جنت و دوزخ پر ایمان کو بھی توحید کی گواہی کے تضمنات ❶ کی حیثیت سے بیان کر دیا گیا ہے۔ اس گواہی پر جنت کا حتمی وعدہ کیا ہے۔

ایک ہی مفہوم کی حامل ان روایات کے الفاظ میں کمی بیشی کا نمایاں اور قوی تر سبب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ کلمات مختلف مواقع پر ارشاد فرمائے۔ چوں کہ ہر جگہ سامعین الگ تھے آپ نے الفاظ کے انتخاب میں سامعین کے علم وفہم، سابقہ معلومات وعقائد، قدامت اسلام اور صلاحیتوں کا لحاظ رکھا۔ مثلاً زیر بحث روایت میں مخاطب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ جیسے اکابر رہے۔ اس طرح کے مخلص اور وفا شعار متبعین رسول کو یہ بتانا تحصیل حاصل تھا کہ توحید کی شہادت کا ایک لازمہ رسالت کی شہادت بھی ہے اور یہ شہادت پورے شرح صدر کے ساتھ مطلوب ہے نہ کہ شک وشبہ کے ساتھ۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے صرف کلمہ توحید کی شہادت ہی کا تذکرہ فرمایا جبکہ عامۃ المسلمین کے سامنے بات کو زیادہ کھول کر کہا تا کہ ان کے علم میں اضافہ ہو، ان کی تربیت ہو اور ان کی خامیوں کی اصلاح ہو۔

الفاظ حدیث کے ان فطری اختلافات کے پیش نظر اصولی طور پر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی بھی روایت کے حقیقی مفہوم کو جاننے کے لیے اس کے تمام نظائر کو جمع کریں اور ان کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد نتائج اخذ کریں۔ چنانچہ زیر بحث روایت کے ظاہری الفاظ سے اگر کوئی شخص یہ فلسفہ قائم کرے کہ ایک مرنے والا اگر یہ جانتا رہا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو جنتی ہوگا، تو اس کا یہ نظریہ صحیح نہ ہوگا بلکہ نظائر حدیث کی روشنی میں نتیجہ یہ نکالا جائے گا کہ اگر ایک بندۂ مومن دل کے یقین اور ایمان کے ساتھ خدا کی توحید اور اس کے تضمنات نیز رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی شہادت دیتا رہا، اس کے بارے میں کسی شک وتذبذب میں مبتلا نہیں ہوا اور اسی حالت میں اسے موت آئی تو وہ جنتی ہوگا۔

ایک مغالطہ اور اس کی حقیقت:

اس حدیث اور اس کی ہم معنی مجمل روایات سے لوگوں نے فی الواقع یہ مطلب نکالا ہے کہ محض کلمہ توحید کا اقرار جنت کے حصول کے لیے ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مطلب اخذ کرنا قلت تدبر کا نتیجہ ہے۔ اگر فی الحقیقت یہ بات صحیح ہوتی تو اس طرح کا اقرار فرعون نے بھی اس وقت کر لیا تھا جب وہ ڈوبنے لگا تھا اور اسے اپنی موت نظر آنے لگی تھی۔ اس کے باوجود قرآن نے خبر دی ہے کہ وہ آخرت میں دوزخیوں کا پیشرو ہوگا۔ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں منافقین نہ صرف کلمہ توحید کا اقرار کرتے تھے بلکہ دوسرے دینی کاموں میں حصہ بھی لیتے تھے، اس کے باوجود قرآن نے ان کے لیے دوزخ کے انتہائی نچلے طبقے کی سزا کی خبر دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ توحید کی محض قولی شہادت کسی شخص کے نیک ہونے کی دلیل نہیں۔

❶ تضمنات: مشمولات (تضمّن: ملا لینا، قبول کرنا)۔

Marfat.com

اس نقطہ نظر کو اگر صحیح مان لیا جائے تو اس میں اور یہود کے اس دعویٰ میں کہ وہ اللہ کا محبوب گروہ ہیں، اس لیے جنت ان کا حق ہے، کوئی اصولی فرق نہیں رہ جاتا۔ جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے اس نے نہ صرف یہود کے اس دعویٰ کی تردید کی ہے بلکہ یہ اصل الاصول بھی بیان کیا ہے کہ ملت خواہ کوئی ہو، مسلمان، یہود، نصاریٰ یا صابی، خدا کے ہاں فیصلہ ان کے ایمان باللہ، ایمان بالآخر اور عمل صالح کی بنیاد پر ہوگا۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک بندے کے لیے اصل مطلوب توحید کا محض علم نہیں بلکہ اس کے تقاضے ہیں۔ یہ علم تو ایک نقطۂ آغاز فراہم کرتا ہے ان اعمال کا جن سے عہدہ برآ ہو کر آدمی اللہ کے حقوق ادا کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ قرآن میں اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ﴾ (طٰه: 14)

''میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس تو میری عبادت کر اور میری یاد کے لیے نماز کا اہتمام کر۔''

﴿فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا وَ بَشِّرِ الْمُخْبِتِیْنَ﴾ (الحج: 34)

''تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے، پس اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دو اور بشارت دو خدا کے آگے فروتنی[1] کرنے والوں کو۔''

﴿هُوَ الْحَیُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ﴾ (المومن: 65)

''وہ زندہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پس تم اس کو پکارو اطاعت کو اس کے لیے خالص کر کے۔''

ان آیات سے یہ مضمون بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ کلمہ توحید کے اقرار کے بعد اصل مطلوب خدا کی عبادت، اس کی یاد، اس کے لیے فرمانبرداری اور مخلصانہ اطاعت ہے۔ ظاہر ہے کہ محض قولی شہادت اس کا بدل نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جن لوگوں سے جنت کا وعدہ کیا ہے ان کے لیے اس ایمان کی قید لگائی گئی ہے جو نیک اعمال کا بدرقہ[2] لیے ہوئے ہو۔ کہیں بھی اعمال صالحہ کو نظر انداز کر کے محض دعوائے ایمان پر جنت کی بشارت نہیں دی گئی۔ چند آیات ملاحظہ ہوں:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ﴾ (المومن: 40)

''جس نے نیک عمل کیے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت لیکن ہو وہ مومن، پس ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔''

﴿وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ﴾ (البقرة: 25)

''ان لوگوں کو بشارت دے دو جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے کہ ان کے لیے جنت کے باغ ہوں گے۔''

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِیْمٌ﴾ (المائدة: 9)

''اللہ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہوگا۔''

---

[1] فروتنی: عاجزی، انکسار، تواضع۔ [2] بدرقہ: رہبر، محافظ۔

زیر بحث حدیث میں موجود اس اندیشے کے باعث کہ عامۃ الناس اس کا غلط مفہوم لے کر زندگی میں بے عملی کا فلسفہ اپنا لیں گے، نبی ﷺ نے اس کی عام روایت سے روکا اور خود صحابہ کرام نے بھی اس کو پھیلانے کے معاملہ میں سخت احتیاط سے کام لیا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ (جو ایک جلیل القدر اور فقیہ صحابی تھے) ایک مرتبہ نبی ﷺ کے ساتھ ایک ہی سواری پر سوار تھے۔ آنحضرت ﷺ نے انھیں پکارا: معاذ! انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں حاضر ہوں اور آپ کا تابعدار۔ آپ ﷺ نے وقفوں سے تین مرتبہ انہیں پکارا اور معاذ رضی اللہ عنہ نے یہی جواب دیا۔ جب وہ حضور ﷺ کے ارشاد کے لیے ہمہ تن گوش ہو گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: جو بندہ یہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں تو اللہ اس پر آتش دوزخ حرام کر دے گا۔ معاذ رضی اللہ عنہ نے اجازت طلب کی: یارسول اللہ! کیا میں لوگوں کو اس کی بشارت نہ سنا دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں اگر ایسا ہوا تو لوگ اسی پر تکیہ کر لیں گے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اس واقعہ کو راز رکھا اور اپنے مرض الموت میں اس کا انکشاف کیا۔ اوپر حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ جو حدیث گزری ہے انھوں نے اس کی روایت بھی اپنے مرض الموت میں ایک شاگرد سے کی۔

اسی طرح ایک موقع پر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ چند اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے ہمراہ نبی ﷺ کے پیچھے بنی نجار کے باغ میں جا رہے تھے۔ انھوں نے سبقت کر کے ہمراہیوں سے پہلے آنحضرت ﷺ سے ملاقات کر لی۔ آپ ﷺ نے احوال پوچھنے کے بعد ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ان جاں نثار صحابہ کو خوشخبری دے دیں کہ جو شخص لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ کی گواہی دل کے یقین کے ساتھ دے گا اس کے لیے جنت کی بشارت ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ باغ سے نکلے تو سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ان کی ملاقات ہوئی۔ جب انھیں خوشخبری دی گئی تو انھوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو وہیں روک لیا اور ان کو واپس آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لے آئے۔ یہ تحقیق کرنے کے بعد کہ واقعی آنحضرت ﷺ نے یہ بشارت دینے کا حکم دیا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے درخواست کی کہ حضور اس بشارت کے بیان کو رکوا دیں۔ ایسا نہ ہو کہ لوگ اس پر تکیہ کر کے عمل سے غفلت برتیں، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو روک دیا۔

ایک صحابی محمود بن الربیع رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ انھوں نے بدری صحابی حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث سنی کہ ایسے شخص پر دوزخ کی آگ حرام ہوگی جس نے لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ پڑھا اور اس سے اس کا مقصود اللہ کی رضا تھی۔ انھوں نے یہ حدیث قسطنطنیہ پر حملہ آور ہونے والے اس لشکر کے بعض شرکاء کو سنائی جو 49ھ میں یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں اس مہم پر گیا تھا اور اس میں بڑی تعداد میں صحابہ رضی اللہ عنہم شریک ہوئے تھے۔ سامعین میں قدیم الاسلام بزرگ صحابی حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ انھوں نے حدیث سنتے ہی کہا کہ میں نہیں سمجھتا کہ آنحضرت ﷺ نے وہ کچھ فرمایا ہوگا جو تم بیان کر رہے ہو۔ محمود رضی اللہ عنہ پر یہ بات نہایت شاق گزری اور انھوں نے مہم

Marfat.com

سے واپسی پر پہلا کام یہ کیا کہ مدینہ میں حضرت عتبان رضی اللہ عنہ سے مل کر دوبارہ حدیث کے الفاظ کے بارے میں تسلی کی۔

امام مسلم رحمہ اللہ نے محمود بن الربیع رضی اللہ عنہ کی روایت لینے کے بعد ان کے شاگرد اور جلیل القدر امام حدیث زہری رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ (ثم نزلت بعد ذلك فرائض وامور نری ان الامر انتھی الیھا فمن استطاع ان لا یغتر فلا یغتر) ''اس کے بعد دین کے کتنے فرائض وواجبات نازل ہوئے تو اب نجات کا معاملہ ان پر منحصر ہے، لہٰذا جس شخص کے بس میں ہو کہ ان کو پورا کر کے حدیث کے ظاہری الفاظ سے دھوکا نہ کھائے تو وہ ضرور ایسا کرے۔'' اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد کے اخیار امت نے بھی اس خطرے سے لوگوں کو آگاہ کیا جو اس مضمون کی مجمل روایات سے ان کو پیش آسکتا ہے اور امام مسلم رحمہ اللہ نے اس تاثر کو اپنی کتاب کے قارئین تک پہنچانا ضروری سمجھا۔

ان روایات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض قدیم الاسلام اور ذکی وفہیم صحابہ کے سامنے اس مضمون کو بیان کر دیا لیکن عامۃ المسلمین میں اس کو پھیلانا خلاف مصلحت سمجھا۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ عوام اس طرح کی خبر کو اس کے ظاہری پہلو کے لحاظ سے قبول کر لیتے ہیں۔ وہ اس کا وہ مفہوم تو اخذ کر لیتے ہیں جو نسبتاً آسان اور دل خوش کن ہو لیکن اس کے ساتھ جو فرائض اور ذمہ داریاں ہوتی ہیں وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں۔ چنانچہ اندیشہ تھا کہ اگر یہ روایت عوام میں پھیلی تو وہ شریعت کے اعمال سے غفلت برتیں گے۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اس حدیث کے الفاظ سے غلط فہمی پھیلنے کے اس قدر زیادہ امکانات تھے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر اس کو بیان ہی کیوں کیا؟ کیوں نہ امت کو عمل کے لیے چھوڑ دیا؟ اس کا جواب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اس ارشاد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک تو دین میں توحید کے مقام اور اس کی اہمیت کو واضح فرمانا چاہتے تھے تا کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ جنت کو جانے والا سیدھا راستہ ایک ہی ہے اور وہ توحید ہے۔ شرک کی کوئی راہ جنت تک نہیں پہنچاتی۔ توحید کو نظر انداز کر کے کسی دوسرے راستے پر چل کر وہ یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ خدا کے ہاں فائز المرام ہوں گے۔ دوسرے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وضاحت سے اللہ کے نیک بندوں کو اطمینان دلانا چاہتے تھے کہ ان کی نیک نفسی اور خلوص اللہ کے ہاں مقبول ہوگا۔ دنیا کی اس چند روزہ زندگی میں اللہ کے بندوں کے سامنے اگر کوئی پریشان کن مسئلہ ہوتا ہے تو یہ کہ آخرت کی غیر فانی زندگی میں وہ کیسے سرفراز ہوں اور اپنے آپ کو دوزخ کے خطرے سے محفوظ کر کے وہ کس طرح رب کریم کی عنایات کے حقدار ٹھہریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ان کو یقین دہانی کراتا ہے کہ آخرت میں وہ کامیابی سے ہم کنار ہو کر جنت میں داخل ہونے کے مستحق ٹھہریں گے بشرطیکہ وہ دنیوی زندگی میں توحید کے علمبردار رہے ہوں، یہ کام انھوں نے نیک نیتی سے اللہ کی رضا کے حصول کے لیے کیا ہو، وہ زندگی بھر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی شہادت دیتے رہے ہوں اور اسی کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے انھوں نے اپنی جان جان آفرین کے حوالے کی ہو۔

☆......☆......☆

Marfat.com

مُوحِّدِین کے گناہوں کی مغفرت

أَنَّ أَبَا الْأَسْوَدِ الدِّيلِيَّ حَدَّثَهُ أَنَّ أَبَا ذَرٍّ حَدَّثَهُ قَالَ أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ وَهُوَ نَائِمٌ عَلَيْهِ ثَوْبٌ أَبْيَضُ ثُمَّ أَتَيْتُهُ فَإِذَا هُوَ نَائِمٌ ثُمَّ أَتَيْتُهُ وَقَدِ اسْتَيْقَظَ فَجَلَسْتُ إِلَيْهِ فَقَالَ مَا مِنْ عَبْدٍ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ مَاتَ عَلَى ذٰلِكَ إِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ قُلْتُ وَإِنْ زَنٰى وَإِنْ سَرَقَ قَالَ وَإِنْ زَنٰى وَإِنْ سَرَقَ قُلْتُ وَإِنْ زَنٰى وَإِنْ سَرَقَ قَالَ وَإِنْ زَنٰى وَإِنْ سَرَقَ ثَلَاثًا ثُمَّ قَالَ فِي الرَّابِعَةِ عَلَى رَغْمِ أَنْفِ أَبِي ذَرٍّ قَالَ فَخَرَجَ أَبُو ذَرٍّ وَهُوَ يَقُولُ وَإِنْ رَغِمَ أَنْفُ أَبِي ذَرٍّ .

(صحيح مسلم، باب : من مات لا يشرك بالله شيئا دخل الجنته)

''ابو الاسود دیلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ابوذر رضی اللہ عنہ نے انھیں بتایا کہ میں نبی ﷺ کے ہاں گیا تو آپ ایک سفید چادر لیے سو رہے تھے۔ میں دوبارہ گیا تو بھی آپ سو رہے تھے۔ میں پھر حاضر ہوا تو آپ بیدار ہو چکے تھے۔ میں آپ کی خدمت میں بیٹھ گیا تو آپ نے فرمایا: ایسا کوئی بندہ نہ ہوگا جس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا اقرار کرلیا اور پھر اسی اقرار پر اس کی موت واقع ہوئی مگر وہ جنت میں داخل نہ ہو، اس پر میں نے عرض کی: اگر وہ کبھی زنا کا مرتکب ہوا یا چوری کرلی تو! آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ہاں اگرچہ وہ زنا کا مرتکب ہوا یا اس نے چوری کی۔ میں نے کہا: کیا وہ زنا کا مرتکب ہوا اور چوری کی تب بھی؟ آپ نے فرمایا: ہاں، اس نے زنا کا ارتکاب کیا یا چوری کی تب بھی۔ یہ کلمات تین دفعہ کہے گئے۔ چوتھی مرتبہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: خواہ ابوذر رضی اللہ عنہ اس پر ناک بھوں چڑھائے۔ راوی کہتے ہیں کہ ابوذر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کے پاس سے نکلے تو ان کی زبان پر یہ الفاظ تھے: ''خواہ ابوذر رضی اللہ عنہ اس پر ناک بھوں چڑھائے۔''

روایت کی دوسری سند:

ابوذر رضی اللہ عنہ سے اس واقعے کی روایت معرور رحمہ اللہ بن سوید نے بھی کی ہے۔ اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

عَنِ الْمَعْرُورِ بْنِ سُوَيْدٍ قَالَ سَمِعْتُ أَبَا ذَرٍّ يُحَدِّثُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ قَالَ أَتَانِي جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَبَشَّرَنِي أَنَّهُ مَنْ مَاتَ مِنْ أُمَّتِكَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ قُلْتُ وَإِنْ زَنٰى وَإِنْ سَرَقَ قَالَ وَإِنْ زَنٰى وَإِنْ سَرَقَ .

Marfat.com

''معرور بن سوید کہتے ہیں کہ میں نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو بیان کرتے سنا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جبریل علیہ السلام میرے پاس آئے اور بشارت دی کہ تمھاری امت میں سے جو شخص اس حال میں مرے گا کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہوگا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اس پر میں نے پوچھا: اگر اس نے زنا کا ارتکاب کیا یا چوری کر لی تب بھی؟ اس پر جبریل علیہ السلام نے کہا: ہاں اگر اس نے زنا کا ارتکاب کیا یا چوری کر لی تب بھی۔''

اس روایت میں اگرچہ جبریل علیہ السلام کا نام نہیں لیا گیا جس سے یہ احتمال ہوتا ہے کہ یہ ابوذر رضی اللہ عنہ ہی کی بات نقل ہوئی ہو لیکن دوسرے واسطے سے روایت میں 'یا جبریل' کے الفاظ کا اضافہ ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ معرور بن سوید کی روایت میں سوال و جواب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور جبریل علیہ السلام کے مابین ہوئے۔

مذکورہ دونوں روایتوں کے تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں صورت واقعہ دو مختلف انداز سے پیش کی گئی ہے۔ پہلی روایت میں جبریل امین کا کوئی حوالہ نہیں اور 'ان زنی وان سرق' کے الفاظ میں سوال ابوذر رضی اللہ عنہ نے کیا ہے۔ دوسری روایت میں یہ سوال خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل ہوا ہے اور اس کا جواب دینے والے جبریل علیہ السلام ہیں۔ اس روایت میں ابوذر رضی اللہ عنہ کا اپنا ردعمل بالکل بیان نہیں ہوا۔

اس بات میں شبہ کرنے کی تو کوئی گنجائش نہیں کہ ان دونوں واسطوں سے یہ روایت ایک ہی واقعہ کو بیان کرتی ہے لیکن یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ بیان میں اتنا فرق کیوں کر واقع ہوگیا۔ آیا کسی راوی نے ابوذر رضی اللہ عنہ کی بات سمجھنے میں غلطی کی ہے یا اسے یاد نہیں رکھ سکے۔ ہمارے نزدیک زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ واقعہ کا ایک حصہ ایک روایت میں بیان ہوا ہو اور دوسرا حصہ دوسری روایت میں۔ اس طرح کے مواقع پر روایتیں ایک دوسری کے خلا کو بھر دیتی ہیں، اس لیے صحیح صورت حال کو سمجھنے کے لیے روایات کو جمع کر دینا مناسب ہوتا ہے۔ جمع روایات کے بعد یہ روایت کچھ یوں بنتی ہے:

''جبریل امین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ کو یہ خوشخبری دی کہ کوئی ایسا موحد بندہ نہ ہوگا جس نے لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ کا اقرار کیا، پھر خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا اور اسی موقف پر قائم رہ کر اس نے اپنی جان خدا کے حوالے کی کہ وہ جنت میں داخل نہ ہو۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے وضاحت چاہی کہ اس صورت میں کیا ہوگا جب اس شخص سے کبھی زنا یا چوری کا ارتکاب ہوگیا ہو۔ جبریل علیہ السلام نے جواب دیا: تب بھی وہ جنت میں داخل ہوگا۔ جبریل علیہ السلام کے ساتھ اس گفتگو کے بعد ابوذر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لیے حاضر ہوئے تو آپ نے یہ واقعہ ان کو سنایا۔ ابوذر رضی اللہ عنہ کے لیے یہ بات بڑے اچنبھے کا باعث ہوئی۔ انھیں اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آیا، اس لیے انھوں نے بار بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ وضاحت چاہی کہ کیا اس صورت میں بھی بندۂ مومن کی مغفرت ہو جائے گی جب اس سے زنا یا چوری کا ارتکاب ہوگیا ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر بار اس بات کی تصدیق فرمائی اور یہ دیکھتے ہوئے کہ ابوذر رضی اللہ عنہ کو اس بات پر کسی طرح یقین نہیں آ رہا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر میں فرمایا: ہاں ابوذر رضی اللہ عنہ اس حقیقت پر ناک بھوں چڑھائے تب بھی ایسا ہی ہوگا۔''

Marfat.com

وضاحت حدیث:

اس حدیث کے مضمون کو ہم سہولت کے لیے دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں اس شخص کے لیے جنت کی بشارت ہے جس نے مرتے دم تک توحید کا دامن نہ چھوڑا اور شرک کی آلودگی سے اپنے کو بچاتا رہا۔ دوسرا یہ کہ بشارت ایسے شخص کے لیے بھی ہے جس سے شرک کا گناہ تو سرزد نہیں ہوا لیکن کسی دوسرے بڑے گناہ کا مرتکب ہوگیا۔ اب ہم ان دونوں حصوں کی الگ الگ وضاحت کریں گے۔

شرک کا گناہ:

یہ حقیقت کہ وعدۂ جنت صرف موحدین کے لیے ہے اور شرک کرنے والوں کے لیے اس میں کوئی حصہ نہیں، قرآن مجید کے ایک طالب علم سے مخفی نہیں رہ سکتی کیوں کہ قرآن کی تمام تر دعوت اسی ہدف کی طرف مرکوز ہے۔ اس میں شرک کو سب سے بڑا ظلم اور افترا پردازی قرار دیا گیا ہے اور دوٹوک الفاظ میں یہ بتایا گیا ہے کہ شرک کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ ہرگز معاف کرنے والا نہیں۔ اس کی مغفرت کے مستحق صرف اس کے موحد بندے ہیں۔

نبی ﷺ سے جب سب سے بڑے گناہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: شرک تمام کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑا ہے۔ اس مضمون کو آپ نے قاعدہ کلیہ کے سے الفاظ میں ذہنوں پر مرتسم کرنے کی کوشش فرمائی۔ اس مضمون کی تمام روایات کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں، صرف مثال کے لیے ہم مندرجہ ذیل دو روایتوں کے انداز اسلوب کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں:

”عَنْ جَابِرٍ قَالَ أَتَى النَّبِيَّ ﷺ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ مَا الْمُوجِبَتَانِ فَقَالَ مَنْ مَّاتَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ مَّاتَ يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ النَّارَ.“

(صحيح مسلم، باب: من مات لايشرك بالله شيئا دخل الجنة)

”جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی ﷺ کے پاس آیا اور پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! واجب کردینے والی دو چیزیں کون سی ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اس حال میں مرا کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا تھا وہ جنت میں داخل ہوگا اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتا ہوا مرا وہ دوزخ میں داخل ہوگا۔“

دوسری روایت میں یہ بیان ہوا کہ معاذ بن جبل نبی ﷺ کے ساتھ ایک ہی سواری پر سوار تھے۔ دوران سفر حضور ﷺ نے معاذ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: جانتے ہو کہ اللہ کا حق بندوں پر اور بندوں کا حق اللہ پر کیا ہے؟ انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ حَقَّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ أَنْ يَعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا يُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَحَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ أَنْ لَّا يُعَذِّبَ مَنْ لَّا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا.)) (مسلم، باب: من لقي الله بالايمان)

Marfat.com

''اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور بندوں کا حق اللہ عزوجل پر یہ ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو عذاب نہ دے جو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔''

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ روایت کے مضمون کا پہلا حصہ قرآن مجید اور نبی ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں ثابت ہے۔ اس کے بارے میں اگر کوئی سوال پیدا ہوتا ہے تو یہ کہ شرک کیوں قابل معافی نہیں اور نجات صرف توحید ہی پر کیوں منحصر ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی وجہ سمجھنے کے لیے اللہ اور بندے کے تعلق کو بنیادی طور پر سمجھنا ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں انسان ایک شتر بے مہار کی طرح نہیں جس کا کوئی مالک ہو اور نہ کوئی متعین راہ اور منزل۔ یہ ایک خودرو وجود بھی نہیں جس نے اپنے بل بوتے پر قائم رہنا ہے اور کسی کی بالادستی اسے تسلیم نہیں۔ اس کی اصل حیثیت اس عظیم کائنات کی کروڑوں مخلوقات میں سے ایک مخلوق کی ہے جسے اس کے پیدا کرنے والے نے ایک ذمہ دار مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا، اسے بہترین صلاحیتوں سے نوازا، اس نے دنیا کے وسائل اس کی خدمت میں لگا دیے، اسے نیک فطرت، عقل، ارادہ اور اختیار دیا اور اس کی ذمہ داریوں سے اسے آگاہ کر دیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اسے ایک محدود موقع دے کر آزمانا چاہتا ہے کہ کون بندہ اپنے خالق، مالک اور آقا کو پہچانتا اور اس کا وفادار ثابت ہو کر اس کے حقوق ادا کرتا ہے اور کون اس کے برعکس رویہ اختیار کرتا ہے۔ جو شخص اپنی اصل حیثیت کو جان چکا ہو وہ اپنے مالک کو پہچاننے اور اس کے حقوق ادا کرنے میں غلطی نہیں کرتا۔ اسی خدا شناسی کا نام توحید ہے۔ یہ توحید دین کی رو سے سب سے بڑی نیکی اور دوسری تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے۔ اس کو اختیار کر کے بندہ اس راہ پر چل کھڑا ہوتا ہے جو اسے اپنے رب کی طرف پہنچاتی ہے۔ اس راہ سے بھٹکانے میں اگر کوئی چیز سبب بنتی ہے تو وہ آدمی کے جذبات، اس کی خواہشات اور میلانات ہوتے ہیں جن کے ساتھ اسے زندگی بھر کشمکش کرنی پڑتی ہے۔ اس کش مکش کے دوران شیطان برابر اس کو بھٹکانے کی کوشش کرتا ہے اور بسا اوقات اس میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے لیکن بندہ اگر مخلص ہو اور خدا کے ساتھ اس کا تعلق صحیح اساس پر قائم ہو تو وہ شیطان سے وقتی طور پر شکست کھانے کے باوجود بھی سنبھل جاتا اور خدا سے اپنی نالائقی کی معافی مانگ کر پھر اپنی سمت خدا کی طرف کر لیتا ہے۔ اگر وہ اپنے اس شعور کو بیدار رکھے تو وہ گرتا پڑتا بہرحال اپنے مالک کے پاس پہنچ جاتا ہے کیوں کہ اس کا سفر صحیح سمت میں تھا۔

اس کے برعکس انسان جب نہ اپنے مالک و آقا کو پہچانے اور نہ اپنی حیثیت کو درست طور پر متعین کرے تو وہ شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ پاتا رب سے ہے لیکن گن دوسروں کے گاتا ہے، اس کی زندگی خدا کے قبضہ میں ہوتی ہے لیکن دوسروں کو اپنے لیے نفع و ضرر دینے والا سمجھتا ہے، اس کے معبود اللہ کے سوا دوسرے بھی ہوتے ہیں جن کے ناموں کی وہ دہائی دیتا اور ان سے طالب مدد ہوتا ہے۔ وہ اپنے اس رویے سے اپنے غیور خداوند کی غیرت کو چیلنج کرتا ہے لہٰذا اس کا رویہ خدا کی نگاہوں میں باغیانہ قرار پاتا ہے۔ عملاً اس کا رخ اس صراط مستقیم سے ہٹ جاتا ہے جو بندے

Marfat.com

کو خدا تک پہنچاتی ہے۔ اس لیے وہ جتنا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اس کی راہ اصل منزل سے دور تر ہوتی جاتی ہے۔ اس راہ میں وہ شیطان کا آلۂ کار بن جاتا ہے لہٰذا اس کا ہر کام خواہ وہ بظاہر نیکی نظر آئے نیکی کی روح سے خالی ہوتا ہے۔ اس کی زندگی مفاسد سے عبارت ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں شرک تمام شر کا سرچشمہ ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک بندہ خدا کے باغیوں اور بے وفاؤں کی صف میں جا کھڑا ہوتا ہے اور بغاوت اور بے وفائی سے بڑا کوئی جرم نہیں۔

خیر اور شر دونوں کا اختیار رکھتے ہوئے جب ایک بندہ خیر کو اختیار کرتا ہے (جس کی اصل توحید ہے) تو اس کا یہ عمل خدا کو محبوب ہوتا ہے۔ جب بندے کی زندگی بھر کی جدوجہد اسی ایک ہدف کے لیے ہوتی ہے اور وہ اسی پر جان دیتا ہے تو گویا اس نے اپنا حق عبودیت ادا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ قدر شناس ہے، وہ اپنے بندے کو اس کا معاوضہ جنت کی صورت میں دے گا۔ اس کے برعکس شرک کو اختیار کرنے والا ہر ہمدردی سے محروم ہو کر سزا کا مستحق ہو جاتا ہے اور خدا کے ہاں اس کے لیے ابدی جہنم ہو گی۔

ارتکاب معاصی کے باوجود بخشش:

اب روایت کے دوسرے حصہ کی طرف آئیے۔ اس سے عام طور پر جو مفہوم اخذ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کہنے والوں کے لیے شاید زنا اور سرقہ کی شناعت (گھناؤنے پن) میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور امت مرحومہ کے معاملے میں اللہ تعالیٰ اپنے فضل خاص کا مظاہرہ فرماتے ہوئے ان جرائم کو بھی نظر انداز کر دے گا۔ جو لوگ ذرا محتاط ہیں وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والے مسلمان کو سزا تو ہو گی لیکن سزا بھگتنے کے بعد اسے جنت میں پہنچا دیا جائے گا۔ اس طرح وہ حدیث میں بیان کیے گئے وعدے کا مصداق بن جائے گا۔ ہمارے نزدیک معاملہ کی نوعیت یہ نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں ہماری معروضات حسب ذیل ہیں:

امت مرحومہ کے لیے صحیفۂ ہدایت قرآن مجید ہے۔ جو سنن الٰہیہ اس میں بتا دی گئی ہیں وہی ہر ملت و امت (بشمول امت مسلمہ) کے معاملے میں جاری ہوں گی۔ قرآن مجید نے نیکی اور بدی کو راز رہنے دیا ہے نہ ان کے نتائج کو بیان کرنے میں اجمال سے کام لیا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ کسی بھی روایت کی توجیہ و تاویل کرتے ہوئے ہم قرآن مجید کے محکمات کو پس پشت نہ ڈالیں۔ اب اسی زنا اور سرقہ کو لیجیے۔ ان کی حیثیت قرآن مجید کے لحاظ سے یہ ہے کہ یہ خداوند تعالیٰ کے محرمات میں سے ہیں۔ فرمایا:

﴿قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾

(الاعراف: 33)

''کہہ دو خدا نے حرام تو بس بے حیائیوں کو ٹھہرایا ہے، خواہ کھلی ہوں خواہ پوشیدہ، اور حق تلفی اور ناحق زیادتی کو......''

امت مسلمہ کو مخاطب کر کے نہایت واضح الفاظ میں فرمایا کہ زنا کے قریب بھی نہ پھٹکنا، یہ نہایت برا راستہ ہے۔

Marfat.com

﴿وَ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤی اِنَّهٗ کَانَ فَاحِشَةً وَ سَآءَ سَبِیْلًا﴾ (بنی اسرائیل: 32)

''اور زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو۔ یہ بلاشبہ ایک بے حیائی ہے اور نہایت ہی برا راستہ۔''

اللہ کے حقیقی بندوں کی صفات میں ان کی ایک صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ ''لَا یَــزْنُــوْنَ'' (وہ زنا نہیں کرتے)۔ جب ان آیات میں خطاب امت مسلمہ ہی سے ہے تو یہ خیال صریحاً غلط ہو جاتا ہے کہ زنا اور سرقہ کے گناہوں کی حیثیت دوسری قوموں کے لیے اور ہے اور امت مسلمہ کے لیے اسے مختلف رکھا گیا ہے۔

جہاں تک گناہ کے انجام کا تعلق ہے قرآن مجید نے یہ اصول قائم کیا ہے کہ ہر گناہ کی ذمہ داری گناہ کرنے والے پر ہے۔ اس پر اس کا مواخذہ ہوگا۔ فرمایا:

﴿وَ مَنْ یَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا یَكْسِبُهٗ عَلٰی نَفْسِهٖ﴾ (النساء: 111)

''اور جو کسی بدی کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا وبال اسی پر آئے گا۔''

البتہ گناہوں میں دو طرح کے گناہ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کو بڑے گناہوں میں شامل کیا گیا ہے اور محکم الفاظ میں ان سے روک دیا گیا ہے۔ دوسرے وہ جو بڑے گناہوں کی تعریف میں نہیں آتے، یہ لغزشیں ہوتی ہیں جو بشری تقاضے سے ایک بندے سے ہو جاتی ہیں۔ یہ لغزشیں بندے کی ان چھوٹی چھوٹی نیکیوں کے ذریعے محو ہوتی رہتی ہیں جو وہ روزانہ کرتا رہتا ہے لیکن بڑے گناہوں کا معاملہ یہ نہیں۔ فرمایا:

﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ نُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِیْمًا﴾

(النساء: 31)

''تم جن باتوں سے روکے جا رہے ہو اگر ان کے بڑے گناہوں سے تم بچتے رہے تو ہم تم سے تمھاری چھوٹی برائیاں جھاڑ دیں گے اور تمھیں ایک عزت کے مقام میں داخل کریں گے۔''

ایک بندۂ مومن کے لیے بڑے گناہوں کے ارتکاب کی دو ہی وجہیں ہو سکتی ہیں، یا تو اسے اس گناہ کی شناعت اور اس کے بارے میں خدا کے حکم کا علم نہ ہو یا وہ کسی وقتی جذبے سے مغلوب ہو کر اس کا ارتکاب کر بیٹھے۔ پہلی صورت عملاً پیش نہیں آتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بڑے گناہوں کا تصور ہر انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے اور جاہل سے جاہل معاشرے میں بھی ان کے گناہ ہونے میں شک نہیں کیا جاتا۔ ایمان تو بہر حال ایک سلیم الفطرت آدمی کا حصہ ہے، اس لیے بندۂ مومن بڑے گناہوں کی ماہیت سے کیسے بے خبر ہو سکتا ہے۔ دوسری صورت میں گناہ ایک بندۂ مومن سے سرزد ہو سکتا ہے لیکن یہ اس کے کردار کا مستقل حصہ نہیں بن سکتا بلکہ جب وہ کسی وقت اس کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے تو اس کا ضمیر فوراً اسے ملامت کرتا ہے اور وہ توبہ کر کے اپنی اصلاح کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے گناہگاروں کے لیے مغفرت کی خبر دی گئی ہے۔ فرمایا:

﴿وَ اِذَا جَآءَكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰی نَفْسِهِ

Marfat.com

الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۝﴾
(الانعام: 54)

''اور جب تمھارے پاس وہ لوگ آیا کریں جو ہماری آیات پر ایمان لائے تو تم ان سے کہو کہ تم پر سلامتی ہو! تمھارے رب نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے۔ جو کوئی تم میں سے نادانی سے کوئی برائی کر بیٹھے گا، پھر وہ اس کے بعد توبہ اور اصلاح کرے تو وہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔''

ہمارے نزدیک حدیث کی بشارت ایسے ہی مومن گناہگاروں کے لیے ہے۔ یہ ان کے لیے نہیں، جرم جن کی عادت ثانیہ بن چکا ہو اور انھیں توبہ کی توفیق نہ ہوئی ہو۔

نبی ﷺ نے بھی اس مضمون کو اچھی طرح واضح فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے بڑے گناہوں کا ارتکاب کرنے والے مومن کی حالت یوں بیان فرمائی ہے:

"عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ لَا یَزْنِی الزَّانِی حِینَ یَزْنِی وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا السَّارِقُ حِینَ یَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا یَشْرَبُ الْخَمْرَ حِینَ یَشْرَبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَالتَّوْبَةُ مَعْرُوضَةٌ بَعْدُ."
(مسلم، باب: بیان انه لا یدخل الجنته الاالمومنون)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ایک زانی جب زنا کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ حالت ایمان میں زنا نہیں کرتا۔ ایک چور جب چوری کا مرتکب ہوتا ہے تو حالت ایمان میں چوری نہیں کرتا۔ ایک شرابی جب شراب پیتا ہے تو وہ حالت ایمان میں شراب نہیں پیتا۔ توبہ ارتکاب فعل کے بعد پیش کی جاتی ہے۔''

یہ حدیث ہمارے موقف کو مزید تقویت پہنچاتی ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ایمان اور عمل فاسد میں مغائرت ہے۔ ایک شخص جب محرمات میں ملوث ہوتا ہے تو وہ ایمان سے عاری ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایمان دل کے یقین سے پیدا ہوتا ہے۔ ہمیں یقین ہوتا ہے کہ آگ کا کام جلا دینا ہے تو ہم اس میں ہاتھ ڈالنے کی کبھی جرأت نہیں کرتے۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو یا تو اسے آگ کی جلانے کی خاصیت کا علم نہیں ہوتا یا کوئی وقتی جذبہ اسے اندھا کر دیتا اور وہ آگ میں ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ ایک بندے کے اندر جب ایمان پختہ ہوتا ہے تو وہ محرمات سے اپنے آپ کو اسی طرح بچاتا ہے جیسے ایک عاقل آدمی اپنے آپ کو آگ سے، کیوں وہ جانتا ہے کہ محرمات میں پڑنا خداوند تعالیٰ کی نگاہوں میں اسے ذلیل اور مستوجب سزا کر دے گا۔ لہٰذا کسی عمل فاسد کو اختیار کرنا اسی شخص کے لیے ممکن ہے جس کا دل یا تو ایمان سے خالی ہو یا جسے خواہشات اور جذبات کی رو میں ایمان کے تقاضوں کا خیال نہ رہے۔

دوسری حقیقت جو اس روایت سے واضح ہوتی ہے یہ ہے کہ ارتکاب گناہ کے بعد ایک بندۂ مومن کے سامنے توبہ پیش کی جاتی ہے یعنی اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے، اسے اپنی غلطی پر ندامت کا احساس ہوتا ہے اور اسے اپنے رب کی طرف رجوع کر کے معافی کا طلب گار ہونے کی تحریک ہوتی ہے۔ اگر وہ ایسا کر لیتا ہے تو اس کا ایمان جو

Marfat.com

ارتکاب گناہ کے وقت اس کے اندر سے نکل چکا تھا لوٹ آتا ہے۔ لیکن فرض کیجیے کہ ایک شخص پر یہ توبہ پیش کی گئی لیکن اس نے اس کو نظر انداز کر دیا تو اس شخص پر اس کے گناہ کا اثر بد کیسے ختم ہوگا جب تک کہ وہ توبہ نہ کرے۔ اگر یہ بدقسمت اصلاح حال کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا اور گناہ اس کی زندگی کا احاطہ کر لیتے ہیں تو ظاہر ہے کہ کلمۂ توحید کا زبانی اقرار اس کے کسی کام نہیں آ سکتا اور وہ اپنے آپ کو اس بدقسمت گروہ میں شامل کر لیتا ہے جس کے متعلق قرآن نے نہایت دوٹوک الفاظ میں فرمایا ہے کہ:

﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (البقرة: 81)

''ہاں جس نے کوئی بدی کمائی اور اس کے گناہ نے اس کو اپنے گھیرے میں لے لیا تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

ظاہر ہے کہ یہ شخص وعدۂ جنت کا مستحق نہیں اور وہ کسی طرح حدیث کا مصداق نہیں ہو سکتا۔ ایسے شخص کے لیے اس بات کا امکان بھی نہیں کہ وہ چند روز سزا بھگتنے کے بعد جنت میں جا براجے، جیسا کہ فرض کر لیا گیا ہے۔

ایک گناہ گار کا محض توبہ کر لینا بھی اس بات کے لیے کافی نہیں ہوتا کہ اس کا گناہ معاف کر دیا جائے۔ قبولیت توبہ پر بہت سی قیدیں خود قرآن مجید سے ثابت ہیں مثلاً یہ کہ گناہ دل کے محکم ارادے سے نہیں بلکہ جذبات کی رو میں ہو گیا ہو، بندہ اپنے کیے پر فوری طور پر نادم ہو، ندامت کے اظہار میں تاخیر نہ کرے، وہ اللہ سے اپنی غلطی کی معافی چاہے، وہ اس فعل بد کو دہرانے کی تمنا نہ رکھتا ہو بلکہ فی الفور اپنی اصلاح کر لے۔ قرآن مجید کی رو سے بڑے گناہوں کی توبہ اسی وقت قبول ہوگی جب وہ ان شرائط کو پورا کرے گی۔

جہاں تک حدیث زیر بحث کی اندرونی شہادت کا تعلق ہے، اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وعدۂ جنت کا مستحق ہر قسم کے گناہ گار کو نہ سمجھا جائے۔ اولاً ان زنی وان سرق میں فعل کا صیغہ استعمال ہوا ہے، صفت کا نہیں۔ فعل کے صیغہ سے عادی زانی اور عادی چور ہونے کے معنی پیدا نہیں ہوتے۔ ثانیاً صیغہ ماضی کے ساتھ 'ان' کا حرف یہ معنی دیتا ہے کہ فعل کبھی کبھار واقع ہوا ہو۔ عام وقوع پذیر ہونے والے فعل کے لیے یہ اسلوب استعمال نہیں ہوتا۔ ثالثاً جبریل امین علیہ السلام سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وضاحت طلب کرنا اور ابوذر رضی اللہ عنہ کا حیرت واستعجاب کا اظہار یہ بتاتا ہے کہ زنا اور سرقہ کے جرائم بہرحال توحید کے اقرار کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتے اور ان کی مغفرت کا معاملہ اتنا سادہ نہیں کہ اسے معمول کی ایک کارروائی سمجھ لیا جائے۔ رابعاً "ثم مات علی ذالك" کے الفاظ کا تقاضا یہ ہے کہ وہ بندہ ایمان سے عاری ہونے کی حالت میں نہیں مرا بلکہ جب موت آئی تو وہ مومن تھا۔ یہ عملاً اسی وقت ممکن ہے جب ارتکاب گناہ کے بعد کی زندگی اس نے اصلاح کے ساتھ گزاری ہو اور اسی حالت میں اس کی موت واقع ہوئی ہو۔

قرآن مجید کی مذکورہ تصریحات، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت اور حدیث کی اندرونی شہادت کی روشنی میں

Marfat.com

خلاصہ کلام یہ نکلا کہ ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت میں 'ان زنی وان سرق' کا مصداق وہ لوگ نہیں ہوں گے جو زنا اور سرقہ کے عادی مجرم ہوں، جنھیں اپنے اس فعل پر ندامت اور توبہ کی توفیق نہیں ہوئی اور جنھوں نے توبہ کی وہ شرائط پوری نہیں کیں جو قرآن مجید نے بیان کی ہیں۔

اب روایت مذکورہ صدر کے دونوں حصوں کو جمع کیجیے تو اس سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ خدا کے ہاں وعدۂ جنت صرف اس شخص کے لیے ہے جو توحید پر ایمان رکھتا ہو، ساری عمر وہ اس کے تقاضوں پر کار بند رہے اور اسی پر اپنی زندگی کا آخری سانس لے۔ شرک ایک ایسا گناہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں ناقابل معافی ہے، اس کے سوا دوسرے گناہ خواہ وہ زنا اور سرقہ جیسے سنگین جرائم کیوں نہ ہوں اس بندۂ مومن کے لیے بخش دیے جائیں گے جو اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ شرائط کے مطابق توبہ و استغفار کرے گا۔ دوسرے الفاظ میں یہ حدیث قرآن مجید کی آیت:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا﴾ (النساء: 116)

''بے شک اللہ اس چیز کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک ٹھہرایا جائے۔ اس کے نیچے جس کے لیے چاہے گا، بخش دے گا۔ اور جو شخص اللہ کا شریک ٹھہرائے، وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔''

ہی کی ایک وضاحت ہے۔

سیرت النبی ﷺ کے مآخذ

قرآن پڑھیے تو اس میں رسول اللہ ﷺ کی ذات و صفات، آپ کی بعثت کے کوائف، دعوت دین کے مراحل، ہجرت، جنگوں کے واقعات، مشرکین اور یہود کے ساتھ اہم بحثوں اور حضور ﷺ کی زندگی سے متعلق دیگر موضوعات کا بیان ملتا ہے۔ ایک آدمی قرآن کا مطالعہ غور سے کرے تو وہ سیرت النبی ﷺ کے تمام ضروری مباحث سے آگاہی حاصل کر لیتا ہے۔ اسی لیے یہ بات علمی حلقوں میں مانی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات پاک یا سیرت کا سب سے اہم مآخذ قرآن مجید ہے۔ اس کے بعد احادیث صحیحہ اور اولین کتب سیرت کا مطالعہ اس کے مآخذ کی حیثیت سے راہنمائی دیتا ہے۔ اس اعتراف کے باوجود عملاً یہ دیکھا گیا ہے کہ حضور ﷺ کے جدید سیرت نگاروں نے ماضی میں لکھی گئی کتب سیرت ہی پر اعتماد کیا ہے۔ جن لوگوں نے قرآن سے استفادہ کیا ہے وہ بالعموم محض آیات کو نقل کر دیتے ہیں۔ ان سے سیرت نگاری میں مدد نہیں لیتے۔ اس لیے نقل کردہ آیات بے ربط سی نظر آتی ہیں۔

(حیات رسول امی ﷺ، علامہ خالد مسعود رحمہ اللہ، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، صفحہ: 11، سن اشاعت: 2014ء)

Marfat.com

اِرادہ اور عمل کا صلہ

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِيمَا يَرْوِى عَنْ رَبِّهٖ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى قَالَ إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ ثُمَّ بَيَّنَ ذٰلِكَ فَمَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ عِنْدَهٗ حَسَنَةً كَامِلَةً وَإِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ عِنْدَهٗ عَشْرَ حَسَنَاتٍ إِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ إِلٰى أَضْعَافٍ كَثِيرَةٍ وَإِنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ عِنْدَهٗ حَسَنَةً كَامِلَةً وَإِنْ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ سَيِّئَةً وَّاحِدَةً ۔ (صحیح مسلم، کتاب : الایمان باب تجاوز الله عن حديث النفس)

''ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو حدیثیں اللہ تبارک وتعالیٰ سے روایت کی ہیں ان میں سے ایک میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے نیک کام اور برے کام معین کر دیے اور پھر ان کو اچھی طرح واضح کر دیا۔ پس جس شخص نے ایک نیکی کا ارادہ کیا لیکن اس پر عمل نہ کر سکا تو اللہ تعالیٰ اس کی ایک کامل نیکی لکھ لیتا ہے۔ اگر وہ نیکی کا ارادہ کرے اور اس پر عمل بھی کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی دس سے لے کر سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ نیکیاں لکھتا ہے۔ اگر وہ شخص برے کام کا ارادہ کرے لیکن اس پر عمل نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اپنے ہاں سے اسے ایک نیکی لکھ لیتا ہے اور اگر وہ برے کام کا ارادہ کرے اور اس پر عمل بھی کرے تو وہ اسے ایک برائی لکھتا ہے۔''

نظائر حدیث:

یہ روایت تھوڑے سے تغیر الفاظ کے ساتھ صحیح بخاری میں یوں بیان ہوئی ہے:

عَنْ أَبِى هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ يَقُولُ اللّٰهُ إِذَا أَرَادَ عَبْدِى أَنْ يَعْمَلَ سَيِّئَةً فَلَا تَكْتُبُوهَا عَلَيْهِ حَتّٰى يَعْمَلَهَا فَإِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوهَا بِمِثْلِهَا وَإِنْ تَرَكَهَا مِنْ أَجْلِى فَاكْتُبُوهَا لَهٗ حَسَنَةً وَإِذَا أَرَادَ أَنْ يَعْمَلَ حَسَنَةً فَلَمْ يَعْمَلْهَا فَاكْتُبُوهَا لَهٗ حَسَنَةً فَإِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوهَا لَهٗ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا إِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ ۔

(صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب : قول الله يريدون ان يبدلوا كلام الله)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے کہ جب میرا کوئی

Marfat.com

بندہ کسی برے کام کا ارادہ کرے تو جب تک وہ اس پر عمل نہ کرے اس کی برائی نہ لکھو۔ اگر وہ اس پر عمل کرے تو اس برائی کے مثل اس کا گناہ لکھو اور اگر میری وجہ سے برائی کا ارادہ ترک کر دے تو اس کی ایک نیکی لکھو۔ اگر بندہ نیکی کرنا چاہے لیکن عملاً ایسا نہ کر سکے تو اس کی ایک نیکی لکھ لو۔ اگر وہ اس کو عملی جامہ پہنا لے تو اس کی دس سے لے کر سات سو گنا تک نیکیاں لکھو۔"

بخاری رحمہ اللہ کی اس روایت میں مسلم رحمہ اللہ کی روایت پر دو اضافے ہیں۔ ایک یہ کہ برے کام کے محض ارادے کو بندے کی بدی شمار نہ کیا جائے اور اس ارادے کو ترک کرنا اس کے لیے اس وقت نیکی قرار پائے جب وہ خداوند کی خاطر اس ارادے سے باز آئے۔ ان دونوں اضافوں کی تائید مسلم رحمہ اللہ کی ایک حدیث سے ہوتی ہے جس کے راوی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی ہیں:

"وَإِذَا تَحَدَّثَ بِأَنْ يَعْمَلَ سَيِّئَةً فَأَنَا أَغْفِرُهَا لَهُ مَا لَمْ يَعْمَلْهَا فَإِذَا عَمِلَهَا فَأَنَا أَكْتُبُهَا لَهُ بِمِثْلِهَا وَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ رَبِّ ذَاكَ عَبْدُكَ يُرِيدُ أَنْ يَعْمَلَ سَيِّئَةً وَهُوَ أَبْصَرُ بِهِ فَقَالَ ارْقُبُوهُ فَإِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوهَا لَهُ بِمِثْلِهَا وَإِنْ تَرَكَهَا فَاكْتُبُوهَا لَهُ حَسَنَةً إِنَّمَا تَرَكَهَا مِنْ جَرَّائِي." (کتاب: الایمان۔ باب: تجاوز الله عن حديث النفس)

"(اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) جب میرا بندہ برائی کرنے کا خیال کرتا ہے تو میں اسے اس وقت تک معاف کرتا ہوں جب تک وہ اس خیال پر عمل نہ کرے۔ جب وہ اس کو عمل میں لے آتا ہے تو میں اس کے مثل اس کا گناہ لکھتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں کہ خدایا تیرا فلاں بندہ برائی کا ارتکاب کرنا چاہتا ہے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ خود اس بندے کو خوب دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ اس بندے پر نگاہ رکھو۔ اگر یہ برائی کا ارتکاب کرے تو اس کے مثل اس کے حساب میں لکھ لو اور اگر ارادہ ترک کر دے تو اس کے لیے اسے ایک نیکی شمار کرو۔ اس نے اسے میری خاطر چھوڑا۔"

صحیح مسلم و صحیح بخاری دونوں میں حدیث زیر بحث کی ایک روایت میں 'اذا احسن احد کم اسلامه' کا اضافہ بھی ہے یعنی فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص اپنے اسلام میں خوب کار ہو تب اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا وہ حکم ہے جو روایت میں بیان ہوا۔ جو بندے اسلام کی شرط کو پورا نہیں کرتے ان کے عمل کے بارے میں اس حدیث میں خبر نہیں دی گئی ہے۔ یہ اضافہ نہایت اہم ہے اور اس کی تائید قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے۔ سورہ توبہ میں بعض مسلمانوں کی جہاد میں عدم شرکت کے بیان میں فرمایا:

﴿مَا عَلَى الْمُحْسِنِينَ مِنْ سَبِيلٍ﴾ (التوبة: 91)

"خوب کاروں پر کوئی الزام نہیں۔"

یعنی یہ مسلمان اگرچہ اس خاص مہم میں حصہ نہیں لے سکے لیکن اپنے عام رویّے میں چوں کہ خوب کار ہیں، اس

Marfat.com

لیے یہ عدم شرکت کے الزام سے بری ہیں۔ معلوم ہوا کہ ایک بندے کا عام رویہ اگر یہ ہو کہ وہ نیکی کا طالب ہو تو وہ بعض معاملات میں اگر عمل میں ناکام بھی ہوتا ہے تو اپنی عمومی نیکی کے باعث کسی قدر الاؤنس کا مستحق ہوتا ہے۔ اس کے برعکس وہ شخص جس کا عام وتیرہ برائی ہی کا ہو وہ کسی الاؤنس کا مستحق نہیں سمجھا جاتا۔

حدیث کا مفہوم:

حدیث زیر بحث اور اس کی روایت پر جو اضافے اوپر بیان ہوئے ہیں ان کی روشنی میں حدیث کا سادہ مفہوم مندرجہ ذیل نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے:

(ا) اللہ تعالیٰ نے نیک اور بد اعمال کے درمیان حد بندی کر دی ہے اور نیک اور بد کے تعین کو بندوں کی اپنی صوابدید پر نہیں چھوڑا۔ اس حد بندی کو حسب ضرورت نہایت واضح کر دیا گیا ہے۔

(ب) اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ اسلام کو اختیار کریں اور اس پر عمل میں خوب سے خوب تر معیار کو اپنائیں۔

(ج) اسلام میں خوب سے خوب تر معیار اپنانے والوں کے نیک اور بد ارادوں اور ان پر عمل کی جزا کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ضابطہ بنا دیا ہے اور فرشتے اس کے مطابق ان کے اعمال کو لکھتے ہیں۔ ضابطہ یہ ہے:

- ❀ برائی کے محض ارادہ پر جس میں عمل نہ پایا جائے، گناہ نہیں لکھا جاتا۔
- ❀ ایک بندہ برائی کا ارادہ خدا کے خوف کے تحت ترک کر دے تو اسے ایک مثبت نیکی لکھا جاتا ہے۔
- ❀ برائی کے ارادے کو عملی جامہ پہنا دیا گیا ہو تو بندے کے حساب میں اس برے کام کا ایک مثل گناہ لکھا جاتا ہے۔
- ❀ نیکی کے محض ارادہ پر ایک نیکی کے مثل ثواب لکھا جاتا ہے۔
- ❀ نیکی عملاً کرنے پر اس نیک کام کے دس مثل سے لے کر سات سو مثل تک بلکہ اس سے بھی زیادہ نیکی کا ثواب لکھا جاتا ہے۔

اب ہم ان نکات کی بقدر ضرورت وضاحت کرتے ہیں:

نیک اور بد میں امتیاز:

یہ بات کہ اسلام میں نیک اور بد کے درمیان حد بندی کر دی گئی ہے اس دین سے واقف ہر شخص پر نہایت واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کی تشکیل اس طرح فرمائی ہے کہ اس کے اندر نیکی اور بدی دونوں کا شعور ودیعت فرمایا ہے۔ یہ شعور انسان کی فطرت کے اندر روز اول سے ہے۔ بندہ جب کوئی غلط کام کرتا ہے تو اسے گناہ کا احساس ہو جاتا ہے جس پر اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے۔ برے سے برا آدمی بھی گناہ کو نیکی سمجھ کر نہیں کرتا بلکہ اسے گناہ سمجھتے ہوئے اپنی طبیعت کے فساد سے مغلوب ہو کر کرتا ہے۔ اس کی فطرت کے اندر احترام نیکی ہی کے لیے ہوتا ہے۔ فلسفہ اخلاق کے ماہرین بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ چند بنیادی نیکیوں کا نیکی ہونا اور چند معروف برائیوں کا برائی

Marfat.com

ہونا انسان کی فطرت میں راسخ ہے۔ فطرت انسانی کے اسی الہام کو اللہ تعالیٰ نے شریعت کا جامہ پہنا دیا تا کہ معاملہ بندے کی اپنی صوابدید پر نہ رہ جائے اور اسے اعمال کے نیک یا بد ہونے کے معاملے میں کوئی اشتباہ نہ ہو۔ لہٰذا اب نیک و بد کی واضح کسوٹی قرآن مجید اور شریعت اسلامی میں محفوظ ہے۔ اس سے ہٹ کر نیکی اور بدی کا کوئی تصور قائم کرنا درست نہیں۔ زیر نظر حدیث میں جو ضابطہ بیان کیا گیا ہے وہ خدا کے بتائے ہوئے نیک و بد کے بارے میں ہے نہ کہ اس سے ہٹ کر کسی اور معیار پر جانچے ہوئے نیک و بد کے بارے میں۔

بندے کا امتحان اور اسلام کی شرط:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین ساخت (احسن تقویم) پر پیدا فرمایا۔ اس نے اسے بہترین ظاہری اور باطنی صلاحیتیں عطا کیں۔ اسے عقل وفہم، امتیاز اور اختیار وارادہ جیسی نعمتیں دیں تا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ارضی خلافت کی ذمہ داریوں سے بطریق احسن عہدہ برآ ہو سکے۔ یہ ذمہ داریاں اسلام کو اختیار کر کے ادا ہو سکتی ہیں۔ اسلام وہ دین ہے جس میں ایک بندہ رب کے ساتھ اپنے تعلق کو صحیح بنیاد پر قائم کر لیتا اور اس کی عبادت واطاعت پر کمر بستہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ بندے کو ایسا کرنے یا نہ کرنے کا اختیار حاصل ہے اس لیے اس کا عرصۂ حیات ایک امتحان میں گزرتا ہے۔ وہ چاہے تو اپنی ذمہ داریوں کو سمجھ کر نیکی کی راہ اختیار کرے اور چاہے تو دنیا کی رنگینیوں میں کھو کر اپنے فرائض سے غافل ہو جائے۔ دنیا کی زندگی کے اس امتحان کا نتیجہ آخرت میں ظاہر ہونے والا ہے جب اللہ تعالیٰ اپنے ہر بندے کے اعمال کا محاسبہ کرے گا۔ وہاں یہ کھلے گا کہ کس شخص کے اعمال خدا کی میزان میں بے وقعت ٹھہرے اور کس کے اعمال مثمر (بار آور) ثابت ہوئے۔ قرآن مجید میں یہ حقیقت واضح کر دی گئی ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی میزان میں انہی نیک اعمال کا وزن ہوگا جو خدا کے مخلص ومطیع بندوں نے خدا کی شرائط پر کیے ہوں گے اور جن میں اللہ تعالیٰ کی رضا پیش نظر رکھی گئی ہوگی۔ باقی رہے ان لوگوں کے اعمال جو خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو صحیح بنیاد پر قائم نہیں کرتے اور ان کا مطمح نظر دنیا ہی کے فوائد ہوتے ہیں، خدا کے ہاں ان کی کوئی قدر وقیمت نہ ہوگی۔ وہ قیامت میں راکھ کے اس ڈھیر کے مانند ہوں گے جس پر تیز ہوا چلے اور اسے اڑا کر لے جائے، ایسے اعمال کرنے والوں کو کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں سے محبت رکھتا ہے جو زندگی کے امتحان میں کامیاب ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے اس کا معاملہ ان کے ساتھ احسان پر مبنی ہے جو رب کریم کی شان کریمی سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس کو قرآن مجید میں واضح بھی کر دیا گیا جب فرمایا:

﴿لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ﴾ (یونس: 26)

''احسان کی روش اختیار کرنے والوں کے لیے اچھا بدلہ ہوگا اور اس پر مزید بھی۔''

رسول اللہ ﷺ نے اس حقیقت کو 'اذا احسن احد کم اسلامہ' کے الفاظ سے واضح فرمایا، تا کہ معلوم رہے کہ آخرت میں نتیجہ خیز اعمال صرف خوب کاروں کے ہوں گے۔

Marfat.com

عمل کی حیثیت اور اس کے بدلے کا ضابطہ:

حدیث میں بیان کردہ اجر کے ضابطے کو سمجھنے سے قبل خود عمل کی حیثیت کو سمجھنا ضروری ہے۔ دنیا میں بندہ جو عمل کرتا ہے اس کی مثال ایک بیج کی ہے جسے کسان زمین میں بوتا اور اس کا ثمرہ حاصل کرنے کا منتظر ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ بیج کے مثمر (بارآور) ہونے کی کئی شرائط ہیں۔ مثلاً یہ کہ بیج خراب یا گلاسڑا نہ ہو بلکہ صحت مند ہو، اسے نمو کے لیے مناسب ماحول ملے یعنی موسم کاشت کے لیے موزوں ہو، زمین زرخیز ہو اور بیج ڈالنے سے قبل اس کو نرم کر لیا گیا ہو، وقت پر فصل کو پانی دیا جائے اور اس کی نگہداشت کی جائے۔ جب تمام حالات سازگار ہوں تو بیج پھوٹتا اور برگ وبار لاتا ہے اور کسان کو اس کی محنت کا صلہ اس کے بیج کی کوالٹی، زمین کی تیاری، مناسب وقت پر آبپاشی اور پودوں کی حفاظت ونگہداشت کے مطابق ملتا ہے۔

بیج اگر ناقص ہو تو وہ بہترین سازگار حالات میں بھی برگ وبار لانے سے قاصر رہتا ہے اور بیج اچھا ہو لیکن سازگار حالات اسے میسر نہ آئیں تو اگرچہ وہ پھل لاتا ہے لیکن پیداوار کی مقدار کم ہوتی ہے۔

نیک عمل جو خدا کی شرائط پر کیا جائے ایک صحت مند بیج ہے جس کے اجر کی کم سے کم شرح اس کے دس مثل کے برابر ہے۔ بندہ جب اسے صحیح وقت پر کرے، اس کے لیے مشقت اٹھائے، کم وسائل رکھتے ہوئے ایثار سے کام لے، اس کے احساسات خوش دلی اور فائز المرامی [1] کے ہوں نہ کہ تنگ دلی اور مجبوری کے، تو اس کا صلہ اس عمل کی نسبت بہت بڑھ جاتا ہے جو اگرچہ صحیح ہو لیکن اس کے کرنے میں بندے کو زیادہ مشقت نہ اٹھانی پڑے یا اس کے احساسات وجذبات میں کوئی کمی رہ جائے۔ انفاق فی سبیل اللہ کے ضمن میں قرآن مجید نے بیج کی تمثیل بیان کر کے یہ واضح کیا ہے کہ نیک عمل اپنے سے سات سو گنا یا اس سے بھی زیادہ اجر لائے گا۔ فرمایا:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَ اللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾ (البقرۃ: 261)

''ان لوگوں کی تمثیل جو اللہ کی راہ میں انفاق کرتے ہیں یوں ہے جیسے ایک دانہ جو سات بالیاں نکالے جن میں سے ہر بالی میں ایک سو دانے ہوں۔ اللہ اس سے زیادہ کرے گا جس کے لیے چاہے گا اور اللہ وسعت والا اور علم والا ہے۔''

ہر برا عمل ایک ناقص بیج ہے جو کوئی پیداوار نہیں لاسکتا، البتہ کاشت کار کی محنت کو رائیگاں کرسکتا ہے۔

عمل نیک ہو یا بد، اس کے وجود میں آنے سے پہلے اس کا ارادہ پایا جاتا ہے۔ زیر بحث حدیث نے ارادہ اور عمل دونوں کے اس نتیجے کی خبر دی ہے جو آخرت میں بندوں کے سامنے آئے گا۔

ایک بندے کے دل میں جب کوئی برائی کرنے کا خیال آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ اس

---

[1] فائز المرامی: مقصد پورا ہونا (مرام: مقصد)۔

Marfat.com

بندے پر نگاہ رکھیں۔ اگر وہ اسے عمل میں نہ لائے تو محض برے خیال کو اس کی برائی نہ لکھا جائے۔ نبی ﷺ نے وہ حد بھی بتادی جہاں تک ایک برا خیال محض خیال سمجھا جاتا ہے اور اس کے بعد اسے برے عمل کے طور پر لکھا جاتا ہے۔

"عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ تَجَاوَزَ لِأُمَّتِی عَمَّا حَدَّثَتْ بِهٖ أَنْفُسَهَا مَا لَمْ تَعْمَلْ أَوْ تَکَلَّمْ بِهٖ." (مسلم۔ باب : تجاوز الله عن حديث النفس)

"ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے محض خیالات سے درگزر فرمایا ہے جب تک ان پر عمل نہ کیا جائے یا ان کے بارے میں زبان نہ کھولی جائے۔"

یعنی دل میں آنے والے وسوسے پر صرف اس وقت گرفت ہوگی جب آدمی اس کو اپنے قول و فعل کا موضوع بنالے۔ اس راہ میں وہ جتنی پیش قدمی کرتا جائے گا، خدا کے ہاں اس کے گناہ کی مقدار اسی قدر بڑھتی جائے گی۔

جب گناہ کا دل میں خطور ہو (محض خیال گزرے) لیکن آدمی اس پر متنبہ ہوجائے اور خدا کے خوف سے اس خیال کو دل سے نکال دے تو یہ ایک مومنانہ کردار ہے جسے ایک نیکی لکھا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس کی حیثیت توبہ کی طرح ہے جس میں آدمی خدا کی طرف رجوع کر کے ایک گناہ سے باز آجاتا ہے۔ جب توبہ ایک مثبت نیکی ہے تو خدا کے خوف سے ایک برے خیال کو دل سے نکال دینا کیوں نیکی نہ ہوگا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ بندہ اگر میرے خوف سے اپنے برے ارادے سے باز آجائے تو اسے ایک مثبت نیکی شمار کرو۔

عملاً برائی کرنے پر اللہ تعالیٰ بندے کے حساب میں اس کے عمل کے مثل گناہ لکھ لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب آدمی اپنے خیال کا کسی سے تذکرہ کرے گا، اس کو عملاً کرنے کی تجویزیں سوچے گا، اس کے لیے منصوبے بنائے گا اور عملی اقدامات کرے گا تو ان میں سے ہر کام گناہ ہوگا اور جس کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑے گا۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں برائی کے مثل جو گناہ لکھا جاتا ہے اس کو معمولی چیز سمجھ لینا ایک غلطی ہے۔ ہمیں دنیا میں کسی فعل بد کے اثرات یا نتائج کا صحیح علم نہیں ہونے پاتا۔ ایک مضمون نگار چند صفحے لکھ دیتا ہے لیکن ان کے اندر فطرت کے خلاف بغاوت اور حق کی تضحیک کا ایسا سامان رکھ دیتا ہے کہ لاکھوں افراد اس سے متاثر ہو کر غلط روش اختیار کر لیتے ہیں تو اس مضمون نگار کا گناہ آخرت میں ان لاکھوں افراد کی ضلالت اور گمراہی کے برابر ہوگا۔

ایک شخص عدالت میں جھوٹی گواہی دے دیتا ہے جس کے نتیجے میں ایک آدمی اور اس کی اولاد اپنے جائز حق سے محروم ہوجاتی ہے تو اس شخص کے گناہ کے مثل وہ تمام حق تلفیاں شامل ہوں گی جو اس کی جھوٹی گواہی کے باعث وجود میں آئیں اگرچہ ان میں اور اس شخص میں بہت بڑا زمانی بعد واقع ہو چکا ہو۔ اس لیے نیکی کے کئی گنا اجر کے مقابلے میں برائی کے ایک مثل گناہ لکھے جانے کی خبر سے برائی پر جری ہوجانا نہایت درجے کی ناعاقبت اندیشی ہے۔

جہاں تک نیکی کے ارادے پر ایک نیکی لکھے جانے کا تعلق ہے یہ بات عین قرین قیاس ہے کیوں کہ نیکی کا ارادہ کر کے بندہ شیطان کو شکست دے کر نیکی کی راہ میں اپنے نفس کی پہلی رکاوٹ کو عبور کر لیتا ہے اور امتحان کے اس

Marfat.com

مرحلے میں کامیاب ہو کر اپنے ارادے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ اس مرحلے کی کامیابی کی اللہ تعالیٰ قدر فرماتا ہے۔ اس نے بندوں کی عملی نیکی پر دس مثل اجر جو مقرر کیا ہے تو یہ بندوں پر اس کا فضل خاص ہے، جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات راز نہیں رہنے دی بلکہ واضح طور پر قرآن مجید میں فرما دی:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ (الانعام: 160)

”جو نیکی کرے گا اس کے لیے اس کے دس مثل اجر ہے اور جو برائی کرے گا تو ایسے لوگوں کا اسی برائی کے برابر بدلہ ہوگا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

یہاں یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ نیکی کے لیے ایک بندے کے عزم راسخ کے باوجود اگر مشیت الٰہی اس کے عمل میں مزاحم ہو جاتی ہے اور بندہ وہ نیکی نہیں کر پاتا تو بندے کو اس کی نیت اور عزم کے مطابق عمل کا پورا پورا صلہ ملتا ہے۔ غزوہ تبوک میں جو صحابہ رضی اللہ عنہ اپنی غربت کے باعث جنگی تیاری میں حصہ نہ لے سکے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انھیں مدینہ ہی میں چھوڑ گئے۔ ان کے شدت تاثر کا یہ حال تھا کہ اپنی محرومی پر ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ افسوس کرتے تھے کہ کاش ان کے پاس بھی کچھ ہوتا جو وہ راہ حق میں قربان کر دیتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی کہ مجاہدین کا لشکر جس جس وادی سے بھی گزرا یہ محروم صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین ان کے ساتھ تھے، اس لیے کہ ان کا تخلف (پیچھے رہ جانا) ان کے اپنے ارادے سے نہ تھا بلکہ اللہ تعالیٰ ہی نے انھیں وسائل سے محروم رکھا جس کے سبب سے وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ لیکن عمل کا جوہر چونکہ نیت اور عزم راسخ ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو بھی شریک جہاد قرار دیا۔ اس واقعے سے یہ نتیجہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ اگر ایک شخص کے دل میں کسی برے عمل کے لیے عزم راسخ ہو اور وہ اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے کوشاں ہو لیکن اس کے عزم اور عمل میں اللہ تعالیٰ کی مشیت حائل ہو کر اسے یہ برا کام نہ کرنے دے تو وہ شخص اس ناکردہ گناہ کا مجرم شمار ہو جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شخص اپنے تمام وسائل بروئے کار لا چکا۔ اگر خدا اسے مہلت عطا کرتا تو اس کا ارادہ برے کام کی تکمیل میں رکاوٹ نہ بنتا۔

Marfat.com

فرائضِ دین کی پابندی کا صِلہ

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ نُهِينَا أَنْ نَسْأَلَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ عَنْ شَيْءٍ فَكَانَ يُعْجِبُنَا أَنْ يَجِيْءَ الرَّجُلُ مِنْ أَهْلِ الْبَادِيَةِ الْعَاقِلُ فَيَسْأَلُهُ وَنَحْنُ نَسْمَعُ فَجَاءَ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْبَادِيَةِ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ أَتَانَا رَسُولُكَ فَزَعَمَ لَنَا أَنَّكَ تَزْعُمُ أَنَّ اللّٰهَ أَرْسَلَكَ قَالَ صَدَقَ قَالَ فَمَنْ خَلَقَ السَّمَاءَ قَالَ اللّٰهُ قَالَ فَمَنْ خَلَقَ الْأَرْضَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى قَالَ فَمَنْ نَصَبَ هٰذِهِ الْجِبَالَ وَجَعَلَ فِيهَا مَا جَعَلَ قَالَ اللّٰهُ قَالَ فَبِالَّذِي خَلَقَ السَّمَاءَ وَخَلَقَ الْأَرْضَ وَنَصَبَ هٰذِهِ الْجِبَالَ آللّٰهُ أَرْسَلَكَ قَالَ نَعَمْ قَالَ وَزَعَمَ رَسُولُكَ أَنَّ عَلَيْنَا خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِي يَوْمِنَا وَلَيْلَتِنَا قَالَ صَدَقَ قَالَ فَبِالَّذِي أَرْسَلَكَ آللّٰهُ أَمَرَكَ بِهٰذَا قَالَ نَعَمْ قَالَ وَزَعَمَ رَسُولُكَ أَنَّ عَلَيْنَا زَكٰوةً فِي أَمْوَالِنَا قَالَ صَدَقَ قَالَ فَبِالَّذِي أَرْسَلَكَ آللّٰهُ أَمَرَكَ بِهٰذَا قَالَ نَعَمْ قَالَ وَزَعَمَ رَسُولُكَ أَنَّ عَلَيْنَا صَوْمَ شَهْرِ رَمَضَانَ فِي سَنَتِنَا قَالَ صَدَقَ قَالَ فَبِالَّذِي أَرْسَلَكَ آللّٰهُ أَمَرَكَ بِهٰذَا قَالَ نَعَمْ قَالَ وَزَعَمَ رَسُولُكَ أَنَّ عَلَيْنَا حَجَّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا قَالَ صَدَقَ قَالَ ثُمَّ وَلّٰى قَالَ وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَا أَزِيدُ عَلَيْهِنَّ وَلَا أَنْقُصُ مِنْهُنَّ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ لَئِنْ صَدَقَ لَيَدْخُلَنَّ الْجَنَّةَ.

(مسلم۔ باب: السوال عن ارکان الاسلام)

''انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ سے کچھ پوچھنے سے روک دیا گیا تو ہمیں اس بات سے بڑی خوشی ہوتی تھی کہ کوئی عقل مند بدو آ کر آپ سے سوال کرے جبکہ ہم سن رہے ہوں۔ چنانچہ ایک بدو آیا اور کہنے لگا: 'اے محمد! ہمارے پاس آپ کا قاصد آیا اور یہ بیان کیا کہ آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔' آپ ﷺ نے فرمایا: 'اس نے سچ کہا۔' بدو نے کہا: 'تب یہ بتائیے کہ آسمان کس نے بنایا؟' آپ ﷺ نے فرمایا: 'اللہ نے۔' اس نے پوچھا: 'زمین کس نے بنائی؟' آپ ﷺ نے فرمایا: 'اللہ نے۔' اس نے سوال کیا: 'کس نے یہ پہاڑ گاڑ دیے اور ان کے اندر طرح طرح کی چیزیں رکھ دیں؟' آپ ﷺ نے فرمایا: 'اللہ نے۔' اس نے کہا: 'اس ذات کی قسم جس نے آسمان بنایا، زمین بنائی اور پہاڑ نصب کیے، بتائیے کیا واقعی اللہ نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا؟' آپ ﷺ نے فرمایا: 'ہاں۔' اس نے کہا: 'آپ کے قاصد کا کہنا یہ ہے کہ ہمارے اوپر

Marfat.com

ایک دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں۔' آپ ﷺ نے فرمایا: 'اس نے ٹھیک بتایا۔' اس نے پوچھا: 'اس ذات کی قسم جس نے آپ ﷺ کو رسول بنا کر بھیجا، کیا واقعی اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے، آپ ﷺ نے جواب دیا: 'ہاں۔' اس نے کہا: 'آپ کے قاصد نے یہ بھی بتایا ہے کہ ہمارے مالوں میں ہم پر زکوٰۃ واجب ہے۔' آپ ﷺ نے فرمایا: 'اس کا کہنا درست ہے۔' اس نے پوچھا: 'اس ذات کی قسم جس نے آپ ﷺ کو رسول بنا کر بھیجا، کیا واقعی اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟' آپ نے جواب دیا: 'ہاں۔' اس نے کہا: 'آپ کے قاصد نے ہمارے ذمہ سال میں ماہ رمضان کے روزے واجب بتائے ہیں۔' آپ ﷺ نے فرمایا: 'اس نے ٹھیک بتایا۔' اس نے کہا: 'اس ذات کی قسم جس نے آپ ﷺ کو رسول بنایا، کیا واقعی اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا؟' آپ ﷺ نے فرمایا: 'ہاں۔' اس نے کہا: 'اور آپ کے قاصد نے یہ بھی بتایا کہ ہم میں سے ہر شخص پر جو سفر کی استطاعت رکھتا ہو، بیت اللہ کا حج فرض ہے۔' آپ ﷺ نے فرمایا: 'اس نے سچ کہا۔' انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس پر وہ شخص مڑا اور کہا: 'اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا، میں ان احکام پر نہ اضافہ کروں گا، اور نہ ان میں کمی کروں گا، اس پر نبی ﷺ نے فرمایا: 'یہ شخص سچا ثابت ہوا تو جنت میں ضرور داخل ہوگا۔''

روایت کے دوسرے طُرق:

امام بخاری رحمہ اللہ کتاب العلم میں ایک روایت لائے ہیں جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

''انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم مسجد نبوی میں نبی ﷺ کے ساتھ بیٹھے تھے۔ اس دوران میں ایک آدمی اونٹ پر سوار مسجد میں داخل ہوا۔ اس نے اونٹ کو مسجد میں بٹھا کر اس کا گھٹنا باندھ دیا پھر لوگوں سے پوچھا: 'تم میں محمد کون ہیں؟' اس وقت نبی ﷺ لوگوں کے درمیان ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ہم نے اسے بتایا کہ ٹیک لگائے ہوئے یہ سرخ وسفید شخص محمد ﷺ ہیں۔ اس آدمی نے کہا: 'اے عبدالمطلب کے بیٹے!' نبی ﷺ نے فرمایا: 'میں تمھاری طرف متوجہ ہوں۔' اس نے کہا: 'میں آپ سے کچھ سوال کروں گا اور اس میں ذرا سخت کلامی کروں گا لیکن اس پر برا نہ ماننا۔' آپ ﷺ نے فرمایا: 'جو تمھارے جی میں آئے پوچھو۔' اس نے کہا: 'میں آپ کے رب اور آپ سے پہلے کے تمام لوگوں کے رب کی قسم لے کر پوچھتا ہوں کیا واقعی اللہ نے آپ کو تمام لوگوں کی طرف رسول بنایا؟' آپ ﷺ نے فرمایا: 'ہاں خدا گواہ ہے۔' اس نے کہا: 'میں اللہ کی قسم لے کر آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا واقعی اس نے آپ کو حکم دیا ہے کہ ہم رات دن میں پانچ نمازیں ادا کریں؟' آپ نے فرمایا: 'ہاں خدا گواہ ہے۔' اس نے پوچھا: 'میں اللہ کا واسطہ دے کر آپ ﷺ سے پوچھتا ہوں کہ کیا واقعی اللہ نے آپ کو حکم دیا کہ ہم سال میں اس ماہ (رمضان) کے روزے رکھیں؟' آپ ﷺ نے فرمایا: 'ہاں! خدا گواہ ہے۔' اس نے کہا: 'میں اللہ کی قسم لے کر آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا واقعی اللہ نے آپ کو حکم دیا کہ یہ صدقہ ہمارے امیروں سے وصول کرو اور ہمارے غریبوں میں اسے تقسیم کرو؟' نبی ﷺ نے فرمایا: 'ہاں خدا گواہ ہے۔'

Marfat.com

اس آدمی نے کہا کہ آپ جو پیغام لے کر آئے ہیں، میں اس پر ایمان لایا، میں اپنی قوم کا قاصد ہوں جو پیچھے آیا چاہتی ہے۔ میں بنی سعد بن بکر کا فرد ضمام بن ثعلبہ ہوں۔'' (بخاری۔ باب : ماجاء فی العلم)

اس روایت اور مذکورہ صدر روایت میں اتنی مشابہت ہے کہ ذہن یہ تسلیم کرتا ہے کہ راوی نے ایک ہی واقعہ کو مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ موخر الذکر روایت میں بدو کے آنے، سواری بٹھانے اور حضور ﷺ کا تعارف حاصل کرنے کا اضافی بیان ہے جبکہ مسلم کی روایت میں یہ تفصیل بیان نہیں ہوئی۔ لیکن مسلم کی روایت میں کائنات کے شواہد سے ذات خداوندی کے بارے میں نبی ﷺ کا نقطۂ نظر جو دریافت کیا گیا ہے اس کا تذکرہ بخاری کی روایت میں نہیں ہے۔ بخاری کی روایت کے مطابق آخر میں بدو نے اپنا تعارف کرایا لیکن اس کا یہ عزم بیان نہیں ہوا کہ میں ان احکام میں کوئی کمی یا بیشی نہ کروں گا۔

جب دو حدیثیں اس قدر مماثل ہوں اور دونوں میں بعض اضافی بیانات موجود ہوں تو ان کو جمع کرنا فہم حدیث کے لیے مفید ہوتا ہے جب تک قرائن سے یہ ثابت نہ ہو جائے کہ یہ دونوں بالکل مختلف مواقع سے متعلق ہیں۔ یہاں اس بات کی کوئی واضح دلیل موجود نہیں کہ یہ دو مختلف واقعات کا بیان ہے۔ لہٰذا دونوں روایتوں کو جمع کرنے سے یہ ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ قرار پائے گا کہ وہ اپنی قوم کے وفد سے پہلے مدینہ پہنچے۔ مسجد میں جا کر پہلے حضور ﷺ سے تعارف حاصل کیا پھر دوٹوک انداز میں بات کرنے کی اجازت چاہی۔ اجازت ملنے پر آسمان، زمین، پہاڑوں اور انسانوں کی تخلیق کا حوالہ دیا اور ان کے پیدا کرنے والے کے متعلق حضور ﷺ کی رائے دریافت کی۔ جب یقین ہو گیا کہ حضور ﷺ اللہ ہی کو اپنا رب مانتے ہیں تب آپ ﷺ سے حلف لے کر پوچھا کہ کیا فی الواقع آپ خدا کے رسول ہیں اور نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے جو احکام دے رہے ہیں کیا وہ واقعی اللہ تعالیٰ کے منشا کے مطابق ہیں۔ جب ضمام نے بقید قسم حضور ﷺ سے جوابات لے لیے تب اپنا تعارف کرایا اور ان احکام پر عملدرآمد کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر واضح کیا، جس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر یہ شخص سچا اور پکا ثابت ہوا تو فلاح پائے گا۔

امام مسلم رحمہ اللہ نے اس سے ملتی جلتی ایک اور روایت بھی بیان کی ہے جو طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ سے وارد ہوئی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

جَآءَ رَجُلٌ اِلٰی رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ مِنْ أَهْلِ نَجْدٍ ثَائِرُ الرَّأْسِ نَسْمَعُ دَوِيَّ صَوْتِهٖ وَلَا نَفْقَهُ مَا يَقُولُ حَتّٰى دَنَا مِنْ رَّسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَإِذَا هُوَ يَسْأَلُ عَنِ الْإِسْلَامِ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ خَمْسُ صَلَوَاتٍ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهُنَّ قَالَ لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ وَصِيَامُ شَهْرِ رَمَضَانَ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهٗ فَقَالَ لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ وَذَكَرَ لَهٗ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ الزَّكٰوةَ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا قَالَ لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ قَالَ فَأَدْبَرَ الرَّجُلُ وَهُوَ يَقُولُ وَاللّٰهِ لَا أَزِيدُ عَلٰى هٰذَا وَلَا أَنْقُصُ مِنْهُ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَفْلَحَ إِنْ صَدَقَ۔ (مسلم۔ باب : بیان الصلوات التی ھی احد ارکان الاسلام)

Marfat.com

''اہل نجد کا ایک پراگندہ بال شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا۔ ہمیں اس کی آواز کی بھنبھناہٹ سی تو سنائی دیتی تھی لیکن باتیں سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ جب وہ رسول اللہ ﷺ کے قریب ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ اسلام کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے بتایا: 'پانچ نمازیں دن رات میں۔' اس نے پوچھا: 'ان کے علاوہ بھی مجھ پر کچھ واجب ہیں؟' آپ ﷺ نے فرمایا: 'نہیں بجز اس کے کہ رضا کارانہ پڑھنا چاہو۔ اور ماہ رمضان کے روزے فرض ہیں۔' اس نے کہا: 'ان کے سوا بھی مجھ پر کچھ روزے واجب ہیں؟' آپ ﷺ نے فرمایا: 'نہیں، بجز اس کے کہ تم اپنی خوشی سے رکھو۔' رسول اللہ ﷺ نے اس سے زکوۃ کا تذکرہ کیا تو اس نے پوچھا: 'اس کے سوا بھی میرے ذمہ کچھ ہے؟' آپ ﷺ نے فرمایا: 'نہیں بجز اس کے کہ تم اپنی خوشی سے انفاق کرو۔' راوی بیان کرتے ہیں وہ آدمی یہ کہتا ہوا واپس ہوا کہ 'اللہ کی قسم میں نہ اس سے زیادہ کروں گا اور نہ اس میں کمی کروں گا۔' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: 'یہ فلاح پا گیا اگر سچا ثابت ہوا۔'''

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہی روایت کتاب الصوم میں طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ ہی سے لی ہے۔ اس میں سائل کے سوالات 'ماذا فرض الله علی' (اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کیا فرض کیا ہے) کے الفاظ کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ اور آدمی کے رخصت ہونے کا کلمہ ان الفاظ میں ہے 'والذی اکرمك لا اتطوع شيئا ولا انقص مما فرض الله علی شيئا' (اس ذات کی قسم جس نے آپ کو عزت بخشی، میں نفلی عبادت تو نہ کرسکوں گا لیکن جتنا کچھ اللہ نے مجھ پر فرض کر دیا ہے اس میں کوئی کمی نہ کروں گا)

یہ روایت بھی مذکورہ صدر روایت کے ساتھ اس قدر مماثلت رکھتی ہے کہ اسی واقعے کا ایک اور بیان معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں سائل کے سوالات کا انداز اور کائنات سے استدلال کا ذکر نہیں آیا۔ اس کی توجیہ راوی طلحہ رضی اللہ عنہ کی اس بات سے بخوبی ہو جاتی ہے کہ وہ پوری بات سن نہیں پائے۔ اس کی وجہ شاید بدو سے دوری تھی یا اس کا لہجہ ان کے لیے ناقابل فہم تھا۔

وضاحت حدیث:

اس حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ممانعت سوال کے حکم کے بعد ہماری یہ خواہش ہوتی تھی کہ کوئی بدو، جو اس پابندی سے بے خبر ہو، آکر حضور ﷺ سے سوال کرے تو وہ ہمارے اشتیاق علم کو پورا ہونے کا سامان کرے۔ ممانعت سوال کے حکم سے مراد قرآن مجید کی آیت:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ﴾ (المائدة: 101)

''اے ایمان والو! ان چیزوں کی بابت سوال نہ کرو جو اگر تمھارے لیے کھول دی جائیں تو تمھیں بری لگیں۔''

کا حکم ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس آیت کے نزول کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین بے حد محتاط ہو گئے اور دین کے بارے میں سوالات کرنے سے گریز کرنے لگے، مبادا وہ اس حکم کی خلاف ورزی کے مرتکب قرار پائیں۔ لیکن شوق علم وجستجو کا یہ

Marfat.com

حال تھا کہ نگاہیں متلاشی رہتی تھیں کہ کوئی اس حکم سے ناواقف آدمی آنحضرت ﷺ کی مجلس میں سوال کر بیٹھے اور ہم اس چشمۂ صافی سے سیراب ہوں۔ اللہ کریم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی اس ضرورت کو پورا کرنے کا سامان فرمایا۔ ایک مرتبہ جبریل امین علیہ السلام سائل کی شکل میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس موقع پر ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ نے یہ ضرورت پوری کی۔

ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ تک حضور ﷺ کی رسالت کا پیغام آپ کے کسی قاصد کے ذریعے پہنچا تھا۔ انھوں نے معاملے کو واقعی اہمیت دی جس کا وہ مستحق تھا۔ انھوں نے ایک بڑی حقیقت کو جس نے عربوں کی صدیوں کی روایات کو پامال کر کے رکھ دیا تھا، بلا تحقیق تسلیم کر لینا مناسب نہیں سمجھا۔ انھوں نے اپنے قبیلے کا وفد تیار کیا لیکن وفد کے آگے آگے خود مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ سواری سے اترتے ہی سیدھے حضور ﷺ کی خدمت میں گئے۔ وہاں بدویانہ سادگی لیکن بے باکی سے نہایت دوٹوک انداز میں حضور ﷺ سے استفسارات کیے۔ تعارف حاصل کرنے کے بعد پہلے تو انھوں نے یہ جانچا کہ کیا حضور ﷺ ان کے اس مسلمہ عقیدے کو مانتے ہیں یا نہیں کہ آسمان، زمین اور پہاڑوں کو پیدا کرنے والا اللہ ہے۔ جب آنحضرت ﷺ نے اقرار کیا کہ کائنات کی تمام چیزوں کا خالق اور رب اللہ ہے تو انھوں نے بقید قسم پوچھا کہ کیا واقعی اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسالت کے منصب پر فائز کیا ہے؟ حضور ﷺ نے جب قسم کھا کر اپنی رسالت کا اقرار فرمایا تو انھوں نے ان بنیادی احکام کے بارے میں جو قاصد کے ذریعے معلوم ہوئے تھے یہ تسلی چاہی کہ کیا وہ واقعی اللہ تعالیٰ کے منشاء کے مطابق ہیں اور اگر ہیں تو ان کا کتنا حصہ لازمی ہے۔

سائل اگر ابھی اسلام سے روشناس ہی ہوا تھا اور محض بنیادی احکام کی تحقیق کے درپے تھا تو اس نے اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں کیسے صحیح نتائج اخذ کر رکھے تھے، یہ بات اس لیے بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتی کہ مشرکین عرب کائنات کے خالق، مالک اور رب کی حیثیت صرف اللہ تعالیٰ کو دیتے تھے۔ ان کا جرم یہ تھا کہ وہ اس بنیادی حقیقت کو ماننے کے بعد ان کاموں میں دوسروں کی حصہ داری کے بھی قائل تھے۔ ان کے خیالات پر قرآن مجید کا تبصرہ سورہ مومنون کی ان آیات میں دیکھیے:

﴿قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝﴾

(المومنون: 84-87)

''پوچھو، زمین اور جو کچھ اس میں ہے کس کا ہے اگر جانتے ہو؟ وہ کہیں گے اللہ کا۔ کہو پھر کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے؟ پوچھو سات آسمانوں اور عرش عظیم کا رب کون ہے؟ کہیں گے اللہ۔ پھر کیا تم ڈرتے نہیں؟''

پس سائل اچھی طرح جانتا تھا کہ آسمان، زمین اور پہاڑوں کا بنانے والا اللہ ہے۔ وہ کسی ایسے شخص کو سچا ماننے کے لیے تیار نہ تھا جو اس حقیقت کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ جب نبی ﷺ کے جواب سے وہ مطمئن ہو گیا کہ آپ اللہ پر ایمان

Marfat.com

رکھتے ہیں تو اسے گویا ایک قدر مشترک اعتماد کے لیے مل گئی۔ اسے یقین ہوگیا کہ آپ بہر حال حقیقت کے منافی کوئی بات نہیں کہیں گے لیکن مزید احتیاط کے لیے اس نے نبی ﷺ کو قسم کھانے کو کہا۔ قسم مخاطب کو سنجیدہ اور محکم بات کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے اب بھی مستعمل ہے اور اس وقت کے عربوں میں بھی تھی۔ بدو کے بقید قسم حضور ﷺ سے سوالات کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر آپ کائنات کے رب اور خالق کو مانتے ہیں تو اس کے حوالے سے جوبات کریں گے اس میں کسی ذاتی رائے کو دخیل نہ ہونے دیں گے بلکہ بے کم و کاست اصل صورت واقعہ بتائیں گے۔

غور کیا جائے تو بدو کا انداز گفتگو نہایت عاقلانہ اور فطری معلوم ہوتا ہے۔ بعض روایات میں اس پر آنحضرت ﷺ کا یہ تبصرہ بھی نقل ہوا ہے کہ فقہ الرجل (آدمی سمجھ دار ہے) اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے 'ما رایت احدا احسن مسألة ولا اوجز من ضمام' (میں نے ضمام سے زیادہ خوبصورت اور مختصر سوال کرنے والا نہیں دیکھا) انسان کو عقل و فہم کا جو شرف حاصل ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کائنات کو کھلی آنکھوں سے دیکھے۔ اس مشاہدے کے نتیجہ میں آسمان کی وسعتیں، زمین کی صلاحیتیں، شمس و قمر کا نظام، لیل و نہار کی گردش، بحر و بر کے عجائبات ایک خالق، مالک اور رب کے حاکم مطلق ہونے کی شہادت دیتے نظر آتے ہیں۔ ایک بندہ جب اپنا حاکم مطلق اسی ایک رب کو مان لے تو اس کا احساس ذمہ داری اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کی مرضیات سے واقف ہونے کی کوشش کرے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مرضی کا شعور ہر بندے کو انفرادی طور پر نہیں دیتا بلکہ اپنے رسولوں کو دیتا ہے جو اس کی تبلیغ کرتے ہیں۔ اس لیے اللہ کا حق بندگی ادا کرنے کے لیے رسول کو واسطہ بنانا لازم ہوتا ہے۔ گویا رسول پر ایمان، اللہ پر ایمان ہی کا ایک تقاضا ہے۔ اللہ سے صحیح تعلق کے لیے جب ایک رسول کی ذات پر انحصار کرنا ضروری ہوا تو یہ امر تحقیق طلب ہو جاتا ہے کہ جو شخص منصب رسالت پر فائز ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے وہ سچا بھی ہے یا نہیں۔ ایسا تو نہیں کہ وہ محض لوگوں کی عقیدت کا مرجع بننے کے لیے قرب خداوندی کا دعویٰ کر رہا ہو۔ کسی شخص کے مزعومات و عقائد، علم و عمل اور اخلاق و کردار کا مشاہدہ اس سے مل کر جس خوبی سے ہوسکتا ہے، کسی دوسرے طریقے سے نہیں ہوسکتا اور تحقیق کے بعد اگر ثابت ہو جائے کہ ایک شخص واقعی خدا کا پیغمبر ہے تو پھر بندۂ مومن کے لیے اس کا فرمایا ہوا حرف آخر ہوتا ہے۔ دین کے معاملے میں ضمام رضی اللہ عنہ کا انداز فکر اور طریقۂ تحقیق ٹھیک یہی تھا۔

مذکورہ تمام روایات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ضمام رضی اللہ عنہ کے پیش نظر اسلام کے ان بنیادی انفرادی فرائض کے بارے میں پوچھنا تھا جن کے وہ مکلّف تھے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے احکام اگر من جانب اللہ ہیں تو ان کا کس قدر حصہ فرض عین ہے جس کو ادا کرنے میں کوتاہی کو راہ نہ دینی چاہیے۔ ایک محتاط اور فرض شناس آدمی کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ اسے اس کی ذمہ داری کی حدود متعین کر کے بتادی جائیں تاکہ وہ اپنے فرض میں کوتاہی کا مجرم نہ گردانا جائے۔ اس کی اس خواہش کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما نہیں ہوتا کہ وہ اس سے زائد کسی ذمہ داری سے جان چھڑانا چاہتا ہے، بلکہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی حق اس کے ذمہ ادا ہونے سے رہ نہ جائے۔ ضمام رضی اللہ عنہ کے

Marfat.com

سوالوں کے جواب میں حضور ﷺ نے یہ واضح فرمایا کہ ایک مومن پر دن رات کے دوران پانچ نمازیں ادا کرنا، سال بھر کے دوران ماہ رمضان کے روزے رکھنا، مال میں سے زکوٰۃ کی معینہ مقدار غرباء ومساکین کو دینا اور اگر استطاعت ہو تو حج کرنا فرض عین ہے، لیکن نمازیں بطور نفل بھی پڑھی جاسکتی ہیں، ماہ رمضان کے سوا نفل روزے رکھے جاسکتے ہیں، زکوٰۃ کی مقدار سے زائد انفاق کیا جاسکتا ہے اور حج کے بعد عمرہ کی نفل عبادت کی جاسکتی ہے۔ البتہ ان عبادات کا انحصار ایک بندۂ مومن کی اپنی خوش دلی پر ہے۔ اسے اس کے لیے مجبور نہیں کیا گیا۔

سائل کے سوالات کے ایک خاص پس منظر اور اس کی افتاد طبع کے لحاظ سے یہ سمجھنا دشوار نہیں کہ اس حدیث میں باقی احکام دین کا تذکرہ کیوں نہیں۔ ظاہر ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سائل کے سوال کی حد تک اپنے جوابات کو محدود رکھا۔ یہ موقع اس مقصد کے لیے غیر موزوں تھا کہ ایک نئے مسلمان کو احکام اسلام کی ایک جامع وکامل فہرست بتائی جاتی جبکہ اس کی ایک ایک بات اس کی سنجیدگی، فرض شناسی اور ذمہ داری کی گواہی دے رہی تھی۔

اصل میں دین کے بنیادی واجبات باقی دین کے آنے کا دروازہ ہیں۔ اگر ان کو کوئی شخص نہ مانے تو اس کے اندر دین کے گھسنے کی کوئی راہ پیدا نہیں ہوتی لیکن جب نماز زندگی میں داخل ہوتی ہے تو اپنے جلو میں مزید بہت سی نیکیاں لاتی ہے۔ زکوٰۃ نیکیوں کے ایک مختلف گروہ کی سربراہ ہے۔ یہ زندگی میں تنہا داخل نہیں ہوتی بلکہ جب ایک بندہ زکوٰۃ پر کاربند ہوتا ہے تو اس گروہ کی تمام نیکیاں ازخود اس کے ہمراہ داخل ہوجاتی ہیں۔ علی ہذا القیاس روزہ اور حج کی عبادات تقویٰ کی وہ آبیاری کرتی ہیں کہ نیکیوں کا باغ لہلہا اٹھتا ہے۔ پس بنیادی واجبات دین ایک بندۂ مومن کی پوری زندگی کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انہی کے راستے سے اس کے اخلاق وکردار اصلاح پذیر ہوتے ہیں۔ ضمام رضی اللہ عنہ کا واجبات دین میں تحقیق وجستجو اور عزم عمل کا رویہ اس بات پر شاہد تھا کہ یہ مرد حق نیکی سے جان چھڑانے والا شخص نہیں، بلکہ جو، جو فرائض دین آگے اس کے علم میں آتے جائیں گے وہ اپنے قلب سلیم کی بدولت ان کی طرف ہدایت پائے گا۔

باقی رہا نبی ﷺ کا نوافل پر اصرار نہ کرنا، تو موقع ومحل اسی کا متقاضی تھا۔ جب سائل سوال ہی فرائض کی حدود جاننے کے لیے کر رہا تھا تو حضور ﷺ کا اسے دوسری طرف متوجہ کرنا ایک بے جوڑ سی بات ہوتی۔ تربیت کے نقطۂ نظر سے بھی عمل میں مناسب ترتیب یہ ہے کہ ایک شخص کو پہلے فرائض پر مستحکم کیا جائے، اس کے بعد اس کے اندر نوافل کے لیے قدم اٹھانا خود بخود آسان ہوجاتا ہے۔ اگر شروع میں نوافل کا بوجھ ڈالنے کی کوشش کی جائے تو طبیعت کی عدم مناسبت کے باعث ہوسکتا ہے کہ فرائض کی طرف میلان میں بھی کمی آجائے۔ یوں بھی آدمی کی عمر، مزاج، دلچسپیاں، ماحول اور زندگی کے تجربات اس کے رویہ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جب وہ صحیح طرز زندگی کو اختیار کرلیتا ہے تو اس کی طبیعت میں نیکی کے ساتھ سازگاری بڑھتی چلی جاتی ہے اور وہ بالآخر ان کاموں میں دلچسپی لینے لگتا ہے جن سے ایک وقت میں اس کی طبعی مناسبت نہ تھی۔

Marfat.com

طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ بات قابل غور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کے رجحان طبع کو جاننے کے باوجود ہر فرض کے بیان کے ساتھ "الا ان تطوع" کے الفاظ فرمائے ہیں۔ایک مرتبہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان الفاظ کے دہرانے سے نہیں چوکے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ادائیگی فرض کے بعد کا تقاضا بہرحال سائل کو بتا رہے تھے تا کہ اسے یہ تاثر نہ ملے کہ بس فلاں فرائض کی حد سے آگے دین کا مقتضیٰ کچھ ہے ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اہتمام آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے کیا ہوگا کہ سائل ہر حکم کے بارے میں جانے کہ دین نے اس کی کم از کم حد متعین کرنے کے بعد بندے کی طرف سے اس میں رضا کارانہ اضافے کو پسند کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرائض پر عمل کے نتیجے میں جنت کی نوید سنائی لیکن "ان صدق" کے الفاظ استعمال فرمائے۔ صدق کا لفظ قول و عمل کی سچائی اور پختہ کاری کے لیے آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک آدمی اگر سچا اور پکا مسلمان ہے اور وہ فرائض کو پوری باقاعدگی اور تندہی سے ادا کرتا ہے تو اس کے لیے بخشش ہے۔ دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نوافل ترقیِ درجات کے لیے ضروری ہیں۔ جوں جوں ایک بندہ نوافل میں بڑھتا ہے، اسے خدا کا قرب زیادہ حاصل ہوتا چلا جاتا ہے۔ گویا نجات اخروی کے لیے تو محض فرائض پر سچے دل سے کاربند ہونا کافی ہے لیکن اہل جنت کے مابین مزید عزت و عظمت حاصل کرنے کے لیے فرائض کے علاوہ اپنی خوشی سے مزید عبادت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فرائض کی کما حقہ تعمیل بہت دشوار ہے۔ عبادات جس اخلاص، توجہ الی اللہ اور آداب کی متقاضی ہیں ان کا حق دنیا کی مشغولیتوں میں ادا کرنا حد درجہ مشکل ہوتا ہے۔ اس طرح فرائض میں جو خامی پیدا ہو جاتی ہے نوافل اس کو دور کرنے یا کمی کی تلافی کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ تاہم اگر کسی کا متعین سوال ہی یہ ہو کہ فلاح کے لیے کم از کم کتنا عمل درکار ہے تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ دین کے فرائض کی پابندی۔

انقلابی فکر

مولانا فراہی نے جو فکر دیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید کلام اللہ ہونے کی حیثیت سے دوسری ہر چیز پر حاکم ہے لہٰذا دوسرے تمام علوم، قرآن کے تابع ہیں وہ علم جس کا تعلق قرآن کے موضوع سے ہے اس سے مستنبط ہونا چاہیے۔ اس کی بنیادیں قرآن کی دی ہوئی ہدایت پر استوار ہونی چاہئیں۔ چنانچہ فقہ ہو یا کلام، فلسفہ ہو یا دوسرے عمرانی علوم مولانا فراہی ہر علم کو اس بنیاد پر جانچتے ہیں جو قرآن مجید نے مہیا کی ہے۔

(علامہ خالد مسعود رحمہ اللہ ، فکر فراہی، رسالہ تدبر، شمارہ: 23، سن اشاعت: دسمبر 1987ء، ص:4)

Marfat.com

عورت کے کردار کے چند قابلِ اصلاح پہلو

عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ اَنَّہٗ قَالَ یَا مَعْشَرَ النِّسَآءِ تَصَدَّقْنَ وَأَکْثِرْنَ الِاسْتِغْفَارَ فَإِنِّی رَأَیْتُکُنَّ أَکْثَرَ أَھْلِ النَّارِ فَقَالَتِ امْرَأَۃٌ مِنْھُنَّ جَزْلَۃٌ وَمَا لَنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ أَکْثَرَ أَھْلِ النَّارِ قَالَ تُکْثِرْنَ اللَّعْنَ وَتَکْفُرْنَ الْعَشِیْرَ وَمَا رَأَیْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَدِیْنٍ أَغْلَبَ لِذِی لُبٍّ مِنْکُنَّ قَالَتْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَمَا نُقْصَانُ الْعَقْلِ وَالدِّیْنِ قَالَ أَمَّا نُقْصَانُ الْعَقْلِ فَشَھَادَۃُ امْرَأَتَیْنِ تَعْدِلُ شَھَادَۃَ رَجُلٍ فَھٰذَا نُقْصَانُ الْعَقْلِ وَتَمْکُثُ اللَّیَالِی مَا تُصَلِّیْ وَتُفْطِرُ فِی رَمَضَانَ فَھٰذَا نُقْصَانُ الدِّیْنِ.

(مسلم۔ باب : بیان نقصان الایمان بنقص الطاعات)

''عبداللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اے گروہ خواتین، صدقہ کیا کرو اور کثرت سے استغفار کیا کرو کیوں کہ میں نے دوزخیوں میں تم عورتوں کی اکثریت دیکھی ہے۔ اس پر اس گروہ کی ایک دانش مند خاتون بولیں: 'یا رسول اللہ ﷺ ! ہماری کیا خطا ہے کہ دوزخیوں میں ہماری اکثریت ہے؟' آپ ﷺ نے فرمایا: 'تم بہت لعن طعن کرتی ہو، شوہر کی ناشکری کرتی ہو اور عقل و دین کی کمی رکھتے ہوئے میں نے تم سے زیادہ بیدار مغزوں کو مغلوب کرنے والا میں نے کسی کو نہیں پایا۔ خاتون نے کہا: 'یا رسول اللہ ﷺ ! عقل و دین کی کمی سے کیا مراد ہے؟' آپ ﷺ نے فرمایا: 'عقل کی کمی پوچھتی ہو تو دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر قرار پاتی ہے، سو یہ عقل کی کمی کی دلیل ہوئی۔ اور یہ جو کئی روز اس حال میں رہتی ہے کہ نماز نہیں پڑھتی اور رمضان میں روزہ چھوڑتی ہے تو یہ دین کا نقصان ہوا۔''

روایت کے دوسرے طُرق:

یہ روایت کئی صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے مروی ہے۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے جو روایت بیان کی ہے وہ خواتین سے آنحضرت ﷺ کے خطاب کے موقع کو بھی واضح کرتی ہے:

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰہِ قَالَ شَھِدْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ الصَّلٰوۃَ یَوْمَ الْعِیْدِ فَبَدَأَ بِالصَّلٰوۃِ قَبْلَ الْخُطْبَۃِ بِغَیْرِ أَذَانٍ وَلَا إِقَامَۃٍ ثُمَّ قَامَ مُتَوَکِّئًا عَلٰی بِلَالٍ فَأَمَرَ بِتَقْوَی اللّٰہِ وَحَثَّ عَلٰی طَاعَتِہٖ وَوَعَظَ النَّاسَ وَذَکَّرَھُمْ ثُمَّ مَضٰی حَتّٰی أَتَی النِّسَآءَ فَوَعَظَھُنَّ وَذَکَّرَھُنَّ فَقَالَ تَصَدَّقْنَ فَإِنَّ

Marfat.com

أَكْثَرُكُنَّ حَطَبُ جَهَنَّمَ فَقَامَتْ امْرَأَةٌ مِنْ سَفِلَةِ النِّسَآءِ سَوْدَآءُ الْخَدَّيْنِ فَقَالَتْ لِمَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ قَالَ لِأَنَّكُنَّ تُكْثِرْنَ الشِّكْوَةَ وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ قَالَ فَجَعَلْنَ يَتَصَدَّقْنَ مِنْ حُلِيِّهِنَّ يُلْقِينَ فِي ثَوْبِ بِلَالٍ مِنْ أَقْرِطَتِهِنَّ وَخَوَاتِمِهِنَّ. (مسلم۔ کتاب : صلوۃ العیدین)

''جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں عید کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز میں حاضر تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ سے پہلے اذان اور اقامت کے بغیر نماز سے آغاز کیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بلال رضی اللہ عنہ کا سہارا لے کر کھڑے ہوئے، اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین فرمائی، خدا کی اطاعت پر ابھارا اور لوگوں کو تنبیہ اور نصیحت کی۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم چلے یہاں تک کہ خواتین کی صفوں کے پاس پہنچے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی تنبیہ اور نصیحت کی اور فرمایا: 'صدقہ کیا کرو کیوں کہ تم خواتین کی اکثریت جہنم کا ایندھن ہوگی'۔ اس پر ایک ملگجے گالوں والی دانش مند خاتون کھڑی ہوئی اور عرض کی: 'یا رسول اللہ! ایسا کیوں ہوگا؟' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: 'یہ اس لیے کہ تم شکایتیں بہت کرتی ہو اور شوہر کی ناشکری کرتی ہو'۔ جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس پر خواتین اپنے زیورات صدقے کے طور پر دینے لگ گئیں۔ وہ اپنے آویزے اور انگوٹھیاں بلال رضی اللہ عنہ کی چادر میں ڈالے جا رہی تھیں۔''

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے واضح ہوا کہ عید کی نماز پڑھانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا تو شاید یہ محسوس فرما کر کہ مسجد کے پچھلے حصے میں خواتین تک آواز نہ پہنچی ہوگی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کی صفوں کے قریب جا کر ان سے خاص طور پر خطاب فرمایا جس میں انھیں صدقے اور استغفار کی کثرت کی تلقین فرمائی۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ حدیث ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے واسطے سے نقل کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عید کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مردوں سے خطاب کا موضوع بھی صدقے کی تلقین ہی تھا اور یہی بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے اجتماع سے بھی کہی جس کے نتیجے میں انھوں نے اپنے زیورات اتار کر بلال رضی اللہ عنہ کی جھولی میں ڈال دیے۔ اس روایت کے مطابق خواتین نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کیے جبکہ مسلم کی روایات صرف ایک خاتون کا دیتی ہیں اور یہی بات قرین قیاس بھی نظر آتی ہے کہ ایک دانش مند خاتون نے جرأت کر کے وضاحت چاہی ہوگی جس کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے جہنم میں جانے کے اسباب کی وضاحت فرمائی۔

وضاحت حدیث:

کتب حدیث میں ایک روایت یوں وارد ہے کہ ایک مرتبہ سورج گرہن ہوا۔ اس موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طویل نماز پڑھائی۔ نماز کے دوران صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ بڑھایا جیسے کوئی چیز پکڑنا چاہتے ہوں۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم پیچھے کو سمٹے جیسے کسی چیز سے بچنا چاہتے ہوں۔ نماز کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے اس کی وجہ دریافت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت مجھے جنت اور دوزخ کی سیر کرائی گئی تھی۔ میں نے جنت کے خوشوں میں سے ایک خوشہ توڑنا چاہا اور اس مقصد کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اسی طرح دوزخ کی سیر کے وقت اس کی

Marfat.com

لپٹ سے اپنے آپ کو دور رکھنے کے لیے میں سمٹ گیا۔ دوزخیوں میں مجھے عورتوں کی اکثریت نظر آئی۔ اس روایت کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ صدر حدیث میں 'رأیتکن اکثر اھل النار' میں جس رؤیت کا ذکر ہے وہ وہی ہے جو صلوٰۃ کسوف میں آپ کو حاصل ہوئی تھی۔ اس مشاہدے کو آپ ﷺ نے بعد میں آنے والی عید کے خطبے میں بیان فرمایا تاکہ خواتین اس سے عبرت حاصل کریں۔

ممکن ہے کسی شخص کو یہ خیال ہو کہ آنحضرت ﷺ کو یہ رؤیت کیسے حاصل ہوگئی جبکہ قیامت ابھی قائم نہیں ہوئی؟ یہاں یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ رسول، اللہ تعالیٰ کی جانب سے لوگوں کی ہدایت پر مامور ہوتا ہے۔ اس کا کام لوگوں کو دین کی حجت تمام کرنا اور مومنین میں امور غیب کا یقین پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یہ کام اسی وقت سہل ہو سکتا ہے جب خود رسول کو ان امور کے بارے میں عین الیقین حاصل ہو۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ عالم مثال میں نبی کو ان حقائق کا مشاہدہ کرا دیتا ہے جو غیب سے تعلق رکھتے ہوں یا ابھی پیش آنے والے ہوں۔ بعض انبیاء کے اس طرح کے مشاہدات کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور آنحضرت ﷺ کا واقعہ معراج بھی اسی تعلیم کی ایک کڑی تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ صلوٰۃ الکسوف کے دوران عالم مثال میں آپ کو جنت اور دوزخ کے حقائق سے باخبر کیا گیا تھا۔

نبی ﷺ کے خطبہ پر جن خاتون نے عورتوں کے بکثرت دوزخ میں جانے کے اسباب کی بابت سوال کیا، ان کا نام شارحین حدیث نے اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا بیان کیا ہے۔ ان کا سوال نہایت برمحل تھا۔ اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ کی زبان سے عورت کی ان کمزوریوں کا خلاصہ سامنے آگیا جو اس کی عاقبت کو خراب کرنے والی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے جواب پر غور کرنے سے تین اسباب متعین ہوتے ہیں:

لعن طعن کی عادت:

پہلا سبب آپ ﷺ نے یہ بتایا کہ تکثرن اللعن (تم بکثرت لعنت کرتی ہو)۔ لعنت سے مراد کسی کو دھتکارنا، مردود قرار دینا اور اس کے لیے خدا کی رحمت سے محرومی کی انتہائی سخت بددعا کرنا ہے۔ یہ معمولی سرزنش کا لفظ نہیں بلکہ کسی سے نفرت کے اظہار کا آخری لفظ ہے۔ جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق حضور ﷺ نے تکثرن الشکاۃ (تم شکایت کی بھر مار کرتی ہو) کے الفاظ فرمائے۔ شکایت اور لعن طعن ایک ہی رویے کی ابتدا اور انتہا کو ظاہر کرتے ہیں اور یہ رویہ مردم بیزاری اور حق تلفی پر مبنی ہے۔ عورتیں عموماً نہایت حساس اور زود رنج ہوتی ہیں۔ وہ اپنے مزاج کے خلاف کسی چیز کو آسانی سے برداشت نہیں کرتیں۔ اپنی برہمی کے اظہار میں وہ پیش وعقب [1] کا خیال نہیں رکھتیں۔ معاملات پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے کے بجائے وہ مخالف فریق پر ہر اینٹ پتھر پھینک کر انتقام لینا چاہتی ہیں۔ وہ نہ صرف اسے بلکہ اس کے اگلے پچھلوں سب کو بددعا کا نشانہ بناتی ہیں جس سے بے گناہ لوگوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ زبان جب لعن طعن سے آشنا ہو جاتی ہے تو اکثر عورتیں اپنی محرومیوں اور مشکلات میں خداوند تعالیٰ کو برا بھلا کہنے

[1] پیش وعقب: آگے اور پیچھے۔

Marfat.com

سے باز نہیں آتیں۔ اس طرح خداوند سے بیزاری اور انسانی حقوق کی ناقدری ان کی عاقبت کو خراب کر دیتی ہے۔

احسان ناشناسی:

عورتوں کی دوسری کمزوری آنحضرت ﷺ نے یہ بیان فرمائی کہ تکفرن العشیر (تم شوہر کی ناشکری کرتی ہو)۔ صلوٰۃ الکسوف کے ضمن میں جو روایت حدیث کی کتابوں میں ہے اس میں ناشکری کی مزید وضاحت بھی حضور ﷺ نے فرمادی۔ روایت کا متعلقہ حصہ یوں ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ .... قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ وَرَأَيْتُ النَّارَ فَلَمْ أَرَ كَالْيَوْمِ مَنْظَرًا قَطُّ وَرَأَيْتُ أَكْثَرَ أَهْلِهَا النِّسَآءَ قَالُوا بِمَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ قَالَ بِكُفْرِهِنَّ قِيلَ أَيَكْفُرْنَ بِاللّٰهِ قَالَ بِكُفْرِ الْعَشِيرِ وَبِكُفْرِ الْإِحْسَانِ لَوْ أَحْسَنْتَ إِلَى إِحْدَاهُنَّ الدَّهْرَ ثُمَّ رَأَتْ مِنْكَ شَيْئًا قَالَتْ مَا رَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ . (موطا۔ باب: العمل فی صلوٰۃ کسوف الشمس)

''عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں...... رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: 'میں نے دوزخ دیکھی اور آج جس قدر ڈراؤنا منظر میں نے دیکھا ویسا منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے دوزخ کے باسیوں میں زیادہ تر عورتوں کو دیکھا۔' صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے پوچھا: 'یا رسول اللہ ﷺ! وہ کیوں؟' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان کی ناشکری کے سبب سے۔'' پوچھا گیا: 'کیا وہ اللہ کی ناشکری کرتی ہیں؟' آپ ﷺ نے فرمایا: 'ہاں اور شوہر کی ناشکری کرتی ہیں، احسان کی ناشکری کرتی ہیں۔ ان میں سے کسی پر زندگی بھر احسان کرتے رہیے، پھر بھی اگر کوئی کوتاہی دیکھے گی تو (شوہر سے) کہہ دے گی میں نے کبھی تجھ سے بھلائی نہیں دیکھی۔''

یعنی بیشتر خواتین احسان ناشناس ہوتی ہیں۔ ان کا یہ رویہ خدا کے ساتھ بھی ہوتا ہے، شوہر کے ساتھ بھی اور ہر احسان کرنے والے کے ساتھ بھی۔ کوئی شخص زندگی بھر ان کے ساتھ حسن سلوک کرتا رہے لیکن اگر کبھی اتفاق سے یا بعض مجبوریوں کے تحت اس سے کوتاہی ہو جائے تو عورتیں اس کی مجبوری کا احساس یا کوتاہی کو نظر انداز نہیں کریں گی بلکہ سیدھے اس کو الزام دے دیں گی، جیسے کبھی انھوں نے اس سے کوئی خیر دیکھی ہی نہیں۔

خواتین شوہر کے ساتھ اپنے اس رویے سے تمکنت کا اظہار کرتی ہیں اور اس میں بہت کچھ دخل اپنی حیثیت پر ناز اور شوہر پر اعتماد کو ہوتا ہے۔ لیکن کوئی بھی جذبہ جب حد سے بڑھ جائے اور اس میں آدمی صحیح و غلط اور حق و ناحق میں تمیز نہ کر سکے تو اس سے مفاسد پیدا ہوتے ہیں، اس لیے اس سے اجتناب ضروری ہے۔ احسان مندی فطرت سلیم کا تقاضا ہے۔ انسان تو اشرف المخلوقات ہے، کتے اور بلی کے ساتھ کوئی احسان کیجیے تو وہ دم ہلا کر اپنی احسان مندی کا اظہار کریں گے۔ انسان کے اندر یہ جذبہ نہ پایا جائے تو وہ انتہائی خود غرض اور مطلب پرست ہوگا۔ پس احسان ناشناسی وہ کمزوری ہے جسے انسان اپنی اچھی فطرت کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے ہی اپنا سکتا ہے۔

زندگی ایک امتحان ہے۔ اس میں نرم و سخت اور سرد و گرم دونوں طرح کے حالات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اللہ

Marfat.com

تعالیٰ کی نعمتیں ہمیں ہر وقت میسر ہوتی ہیں لیکن کبھی کبھار وہ انھیں روک کر ہمارا امتحان لیتا ہے۔ زندگی کا صحیح رویہ یہ ہے کہ بندہ ہر حال میں رب کا شکر گزار ہو اور جب امتحان پیش آجائے تو رب ہی کی طرف مدد کے لیے رجوع کرے، مشکلات پر صبر کرے اور زبان پر حرف شکایت نہ لائے۔ اسی طرح بیوی کے ساتھ شوہر کا عمومی رویہ محبت اور ہمدردی پر مبنی ہوتا ہے، وہ اس کی ضروریات کا لحاظ رکھتا ہے۔ گھر کی آسودگی کی خاطر محنت اور جفاکشی سے کام کرتا ہے۔ کبھی کبھار یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ بیوی کی کوئی تمنا پوری نہ کرسکے یا اسے مناسب نہ سمجھتا ہو یا اس کے وسائل ناکافی ہوں۔ عقل سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ بیوی کے اندر شوہر کے عمومی رویے کے مطابق احسان مندی کے جذبات ہوں اور اگر اس کی مجبوریوں یا کوتاہیوں سے اسے سابقہ پڑے تو ان سے درگزر کرنے میں فراخ دل واقع ہو۔

انسان کی اصل خوبی زندگی میں توازن پیدا کرنا اور ہر معاملے کو اس کی واقعی اہمیت دینا ہے۔ اس میں اگر کوتاہی ہوجائے تو حقوق تلف ہونے لگتے ہیں، خواہ وہ خدا کے ہوں یا بندوں کے۔ قرآن نے سورۃ الفجر میں انسان کی اس کمزوری کو بے نقاب کیا ہے، فرمایا:

﴿فَاَمَّا الۡاِنۡسَانُ اِذَا مَا ابۡتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكۡرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوۡلُ رَبِّىۡۤ اَكۡرَمَنِؕ ۝ وَاَمَّاۤ اِذَا مَا ابۡتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيۡهِ رِزۡقَهٗ فَيَقُوۡلُ رَبِّىۡۤ اَهَانَنِ ۝﴾ (الفجر: 16,15)

''انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا رب اسے آزمائے، اس کو عزت اور نعمت دے تو کہتا ہے میرے رب نے مجھے عزت دی۔ لیکن جب وہ اسے آزمائے اور رزق کی تنگی دے تو کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کردیا۔''

قرآن مجید نے یہ واضح کیا ہے کہ صحیح رویہ اس شخص کا ہے جو نعمت ملنے پر شکر گزار اور تنگی ترشی کی حالت میں قانع وصابر ہو۔ اسی شخص کو اطمینان قلب نصیب ہوسکتا ہے اور اسی کے لیے بشارت ہے کہ وہ خدا کے پسندیدہ بندوں میں ہوگا اور جنت میں داخل ہوگا۔ ناشکرے اور بے صبرے انسان اس بشارت کے لائق نہیں اور یہی حقیقت حضور ﷺ نے عورتوں سے ارشاد فرمائی۔

فتنہ سامانی:

عورتوں کی اکثریت کے جہنم میں جانے کا تیسرا سبب آنحضرت ﷺ نے یہ بیان فرمایا کہ: عقل ودین کی کمی کے ساتھ تم عورتوں سے زیادہ بیدار مغز مردوں کو مغلوب کرنے والا میں نے کسی کو نہیں پایا۔ بخاری رحمہ اللہ کی روایت کے الفاظ ہیں: مارایت من نا قصات عقل ودین اذھب للب الرجل الحازم من احدا کن (میں نے تم سے زیادہ کسی کو عقل ودین میں ناقص ہونے باوجود ایک محتاط مرد کی عقل کو سلب کرنے والا نہیں دیکھا) آنحضرت ﷺ نے اس جملے میں عورت کی زبردست صلاحیتوں اور قوت تسخیر کا اعتراف کیا ہے کہ وہ اپنی تدبیر، طبیعت، ناز، وفاداری، محبت اور نہ جانے کن صفات کو بروئے کار لاکر بڑے سے بڑے ہوشیار اور محتاط وبیدار مغز مرد کی رائے پر اثر انداز ہوکر اسے اپنے ڈھب پر لے آتی ہے کیوں کہ بقول اقبال:

کہ مرد سادہ ہے، بے چارہ زن شناس نہیں

Marfat.com

عورت کی قوت تسخیر بذات خود بری چیز نہیں بلکہ ایک اعلیٰ صلاحیت ہے۔ بری چیز اس قوت کا غلط استعمال اور اس کی فتنہ سامانی ہے۔ عورت جب اس قوت کے نشے میں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا لحاظ نہیں کرتی، اس قوت کو باطل کے لیے صرف کرتی ہے اور اپنی مطلب براریوں کے لیے دوسروں کو آلہ کار بنالیتی ہے تو وہ نہ صرف اپنے لیے بلکہ اپنے شوہر اور عزیزوں کے لیے بھی جہنم کا سامان کر لیتی ہے۔ اس کے اس کردار کی طرف قرآن مجید نے بھی توجہ دلائی جب فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ﴾ (التغابن: 14)

''اے ایمان والو! تمھاری بیویوں اور اولاد میں تمھارے دشمن بھی ہیں ان سے بچ کر رہو۔''

اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

"ما ترکت بعدی فی الناس فتنة اضر علی الرجال من النساء ."(مسلم۔ کتاب: الرفاق)

''میں نے اپنے بعد لوگوں میں مردوں کے لیے عورتوں کے فتنے سے زیادہ ضرر رساں فتنہ نہیں چھوڑا۔''

جس طرح ہر جسمانی بیماری کا اللہ تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی علاج پیدا کر رکھا ہے، اسی طرح اخلاقی کمزوریوں کو دور کرنے کے طریقے بھی اس نے پیدا کیے ہیں۔ چنانچہ نبی ﷺ نے خواتین کو ان کی کمزوریوں سے آگاہ کرنے کے بعد دو باتوں کی تلقین فرمائی جس سے وہ اپنی کمزوریوں کا علاج کر سکتی اور اپنی عاقبت کو سنوار سکتی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کثرت سے استغفار اور صدقہ کرو۔ استغفار بندے کو اس کی کوتاہیوں کی طرف متوجہ اور اس بات کی یاد دہانی کراتا ہے کہ ایک اعلیٰ و برتر ذات ایسی ہے جو بندے کی کمزوریوں سے آگاہ ہے اور اس کو ان کی سزا دے سکتی ہے۔ لہٰذا استغفار اس غرور، تمکنت اور ناز کا علاج ہے جو عورت کو بے اعتدالی، ناشکری اور حق تلفی کی راہ پر ڈالتا ہے۔ صدقہ بندے کو دین کی تعلیمات پر جمائے رکھتا اور نیکی کی راہ پر چلنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے خواتین کو استغفار اور صدقے کے ذریعے اپنی اصلاح کرنے کی تلقین فرمائی اور روایت میں ہے کہ انھوں نے فی الفور اس پر عمل کیا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی چادر میں اپنے زیورات ڈالنے لگیں۔

عورت کی مذکورہ بالا کمزوریاں، جیسا کہ واضح کیا گیا، اس کی فکر مندی، زودرنجی، تمکنت، ناز اور قوت تسخیر وغیرہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی ان صفات کا اس کے فرائض زندگانی سے عہدہ برآ ہونے میں بڑا دخل ہے اور وہ ان کے ذریعے سے بڑے اعلیٰ مقاصد کو پورا کرتی ہے بشرطیکہ ان کو صحیح محل پر استعمال کرے۔ اچھی سے اچھی صفت جب غلط محل پر بروئے کار لائی جائے تو وہ فتنہ بن جاتی ہے۔ اس غلطی پر رسول اللہ ﷺ نے متنبہ فرمایا اور عورتوں کو توجہ دلائی کہ وہ ان صفات کو اپنی کمزوری نہ بننے دیں کیونکہ اس کے نتیجے میں وہ اسفل سافلین [1] میں جا گریں گی اور اگر وہ ان صفات کو ان کی حدود میں رکھیں گی اور اپنی اصلاح کرتی رہیں گی تو آخرت میں اپنے درجات بلند کر سکتی ہیں۔

---

[1] اسفل السافلین: دوزخ کا سب سے نچلا طبقہ۔

Marfat.com

عقل و دین کا نقصان:

رسول اللہ ﷺ کا عورتوں کو ناقصات العقل والدین فرمانا یہ واضح کرنے کے لیے تھا کہ اپنی فطری ساخت اور خصوصیات کے لحاظ سے مرد کے بالمقابل ایک کمزور جنس ہونے کے باوجود عورت یہ صلاحیت رکھتی ہے کہ دانا سے دانا مرد کو رام کر لے۔ کمزور جنس ہونے کی دلیل کے طور پر آپ ﷺ نے جو وضاحت فرمائی اس سے آپ ﷺ کا اشارہ عقل اور دین دونوں میدانوں میں اس کی کم تر ذمہ داریوں کی طرف تھا جو شریعت نے اس پر ڈالی ہیں۔ اسی لیے جب خاتون نے وضاحت چاہی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''دیکھتی نہیں ہو کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے اور ہر مہینے میں کتنے ایام ایسے آتے ہیں جن میں اسے نماز روزے کا پابند نہیں کیا گیا۔'' اول الذکر میں اشارہ قرآن مجید کے اس حکم کی طرف ہے جس میں فرمایا ہے کہ قرض کے لین دین پر دو مردوں کو گواہ کر لیا کرو۔ اگر دو مرد میسر نہ ہوں تو ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کو گواہ کر لو تا کہ وہ معاملے کی نوعیت ایک دوسری کو یاد دلا کر گواہی کی ضرورت کو پورا کر سکیں۔ موخر الذکر میں حیض کے دنوں کی ان سہولتوں کی طرف اشارہ ہے جو شریعت نے عورت کو دی ہیں۔

ہمارے نزدیک حضور ﷺ کا یہ انداز بیان عورت کی تحقیر کے لیے نہیں ہے:

اولاً، عورت کی دماغی اور جسمانی ساخت جیسی کچھ ہے اس کے خالق کی عطا کردہ ہے۔ اس میں عورت کو خود کوئی دخل نہیں کہ اسے مورد الزام ٹھہرایا جا سکے، چنانچہ حجتہ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی زوجہ محترمہ کو عین ایام حج میں حیض آنے لگا تو وہ اس پر بہت آزردہ خاطر ہوئیں۔ نبی ﷺ نے دیکھا تو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ حالت تو بنات آدم کو ایک نس کے جاری ہونے سے پیش آجاتی ہے۔ یہ عورت کے اپنے اختیار کی چیز نہیں کہ وہ اپنے کو قصور وار سمجھے، لہٰذا تم ایام حیض سے فارغ ہو کر عمرہ کر لینا۔ اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے اپنی زوجہ محترمہ سے حقارت کا کوئی سلوک نہیں کیا۔

ثانیاً، عورت کو جو ساخت عطا ہوئی ہے وہ اس کے فرائض اور ذمہ داریوں سے پوری پوری مطابقت رکھتی ہے، اس لیے یہ اس کی کمزوری ہے بھی نہیں جس پر اسے مطعون کیا جا سکے۔ اولاد پیدا کرنا اور اس کی پرورش اور تربیت کرنا عورت کے فرائض میں شامل ہے۔ اس کا جسم، طبیعت اور مزاج خالق کائنات نے ان فرائض کے لیے موزوں بنایا ہے۔

اس ذمہ داری کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا دائرۂ عمل گھر تک محدود ہو اور بازار، تھانہ، کچہری وغیرہ کی ذمہ داری اصلاً اس کی نہ ہو۔ یہ مرد کا کام ہے کہ زندگی کی جدوجہد میں حصہ لے، اپنے اور گھر والوں کے لیے روزی کمائے اور گھر سے باہر کے معاملات کو سنبھالے۔ مرد اور عورت میں فرائض کی یہ تقسیم اتنی فطری ہے کہ زمانۂ قدیم سے انسان نے اسے تسلیم کیا ہے اور عملاً آج بھی وہ اس پر قائم ہے۔ انتہائی ترقی یافتہ ممالک میں بھی عورت کی ہر شعبے میں کارکردگی کو تسلی بخش نہیں سمجھا جاتا اور اس کا مشاہرہ مردوں کی نسبت کم مقرر کیا جاتا ہے۔ خود اسلام نے فطرت کا لحاظ رکھا اور عورت کو گھر کی نگران قرار دیا۔ المرأة راعية على بيت زوجها (عورت اپنے

Marfat.com

شوہر کے گھر کی ذمہ دار ہے) لہٰذا فرائض کی یہ تقسیم عورت کی تحقیر پر نہیں بلکہ فطرت پر مبنی ہے۔

ثالثاً، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ عورتیں اپنی نسوانی خصوصیات کی حفاظت کریں اور مردان سے معاملہ کرتے وقت ان خصوصیات کا لحاظ رکھیں تا کہ خواتین کی دل شکنی نہ ہو۔ چنانچہ نبی ﷺ نے فطرت کو بگاڑنے والی ان عورتوں کو لعنت کا مستحق قرار دیا جو اپنی فطرت کے برعکس مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ نے عورت کو پسلی سے تشبیہ دیتے ہوئے اس کی مزاجی خصوصیات پر روشنی ڈالی اور یہ تعلیم دی کہ اس کے ساتھ سازگاری پیدا کی جائے نہ کہ اس کو بدلنے کی کوشش کی جائے۔

"عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ الْمَرْاَةُ كَالضِّلَعِ اِنْ اَقَمْتَهَا كَسَرْتَهَا وَ اِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِهَا اِسْتَمْتَعْتَ بِهَا وَ فِیْهَا عِوَجٌ." (بخاری۔ باب: المدارة بالنساء)

"ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: عورت ایک پسلی کے مانند ہے۔ اگر تم اسے سیدھا کرنے کے درپے ہو جاؤ گے تو اسے توڑ دو گے اور اگر اس کے ٹیڑھے پن کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھاؤ گے تو فائدہ اٹھاتے رہو گے۔"

پسلی کے ساتھ تشبیہ میں آنحضرت ﷺ نے یہ حقیقت واضح فرمائی کہ جسم کے نظام میں ہر ساخت کو ہڈی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض ہڈیاں سیدھی ہیں اور وہ اپنا کام اسی ساخت میں کر سکتی ہیں۔ پسلی کی ساخت میں گولائی ہے اور جسم کو صحیح شکل دینے اور نازک اعضاء کی حفاظت کے لیے اسی ساخت کی ہڈی کی ضرورت تھی۔ اگر کوئی شخص پسلی کی گولائی کو اس کا عیب سمجھ لے اور اس کو سیدھا کرنے کے درپے ہو جائے تو وہ اسے توڑ دے گا لیکن اسے سیدھا کر کے کوئی مقصد حاصل نہ کر سکے گا۔ ٹھیک اسی طرح عورت کی اپنی مزاجی خصوصیات ہیں اور وہ ان کے ساتھ ہی اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔ کوئی مرد اگر اس میں ہر وقت مین میکھ نکالتا رہے اور عورت کو اپنی طبیعت کے بدلنے پر مجبور کرے تو اس کے نتائج خطرناک نکل سکتے ہیں۔

خلاصہ بحث:

پس ہمارے نزدیک رسول اللہ ﷺ نے خواتین میں زود رنجی اور لعن طعن کے رجحان، احسان ناشناسی اور کفران نعمت کی عادت اور مردوں کے لیے فتنہ سامانی کی اہلیت کو ان کے کردار کے خطرناک پہلوؤں کی حیثیت سے گنایا جو ان کی عاقبت کو خراب کر سکتے ہیں۔ آپ ﷺ نے انھیں تعلیم دی کہ وہ ان پہلوؤں کو اپنے لیے گراوٹ اور گمراہی کا ذریعہ نہ بننے دیں بلکہ اپنی اصلاح کریں جس کا ذریعہ آپ ﷺ نے استغفار اور صدقہ تجویز فرمایا۔ اگر عورت اپنے کردار کے ان پہلوؤں پر قابو پا لے اور اپنی صلاحیتوں کو اچھے مصرف میں لائے تو وہ اپنا مقام ان نیک بیبیوں میں بنا سکتی ہے جو خدا کے ہاں بلند درجات پانے والی ہیں۔

☆......☆......☆

Marfat.com

امانت اور رفع امانت

عَنْ حُذَیْفَةَ قَالَ حَدَّثَنَا رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ حَدِیثَیْنِ قَدْ رَأَیْتُ أَحَدَھُمَا وَأَنَا أَنْتَظِرُ الْآخرَ حَدَّثَنَا أَنَّ الْأَمَانَةَ نَزَلَتْ فِی جَذْرِ قُلُوبِ الرِّجَالِ ثُمَّ نَزَلَ الْقُرْآنُ فَعَلِمُوا مِنَ الْقُرْآنِ وَعَلِمُوا مِنَ السُّنَّةِ ثُمَّ حَدَّثَنَا عَنْ رَفْعِ الْأَمَانَةِ قَالَ یَنَامُ الرَّجُلُ النَّوْمَةَ فَتُقْبَضُ الْأَمَانَةُ مِنْ قَلْبِهٖ فَیَظَلُّ أَثَرُھَا مِثْلَ الْوَکْتِ ثُمَّ یَنَامُ النَّوْمَةَ فَتُقْبَضُ الْأَمَانَةُ مِنْ قَلْبِهٖ فَیَظَلُّ أَثَرُھَا مِثْلَ الْمَجْلِ کَجَمْرٍ دَحْرَجْتَهٗ عَلٰی رِجْلِكَ فَنَفِطَ فَتَرَاهُ مُنْتَبِرًا وَلَیْسَ فِیهِ شَیْءٌ ثُمَّ أَخَذَ حَصًی فَدَحْرَجَهٗ عَلٰی رِجْلِهٖ فَیُصْبِحُ النَّاسُ یَتَبَایَعُونَ لَا یَکَادُ أَحَدٌ یُؤَدِّی الْأَمَانَةَ حَتّٰی یُقَالَ إِنَّ فِی بَنِی فُلَانٍ رَجُلًا أَمِینًا حَتّٰی یُقَالَ لِلرَّجُلِ مَا أَجْلَدَهٗ مَا أَظْرَفَهٗ مَا أَعْقَلَهٗ وَمَا فِی قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ إِیمَانٍ وَلَقَدْ أَتٰی عَلَیَّ زَمَانٌ وَمَا أُبَالِی أَیُّکُمْ بَایَعْتُ لَئِنْ کَانَ مُسْلِمًا لَیَرُدَّنَّهٗ عَلَیَّ دِینُهٗ وَلَئِنْ کَانَ نَصْرَانِیًّا أَوْ یَهُودِیًّا لَیَرُدَّنَّهٗ عَلَیَّ سَاعِیهِ وَأَمَّا الْیَوْمَ فَمَا کُنْتُ لِأُبَایِعَ مِنْکُمْ إِلَّا فُلَانًا وَفُلَانًا .

(مسلم۔ کتاب : الایمان، باب : رفع الامانة والایمان من بعض القلوب)

''حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے دو باتیں فرمائیں جن میں سے ایک کی حقیقت تو میں دیکھ چکا، دوسری کے لیے منتظر ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ امانت مردوں کے دلوں کی اساس میں نازل ہوئی، پھر قرآن نازل ہوا تو وہ قرآن سے واقف ہوئے اور سنت سے واقف ہوئے۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے امانت کے اٹھ جانے کے بارے میں ہم سے فرمایا کہ آدمی نیند کی جھپکی لے گا تو اس کے دل سے امانت کھینچ لی جائے گی اور اس کا نشان دھبے کی طرح رہ جائے گا۔ وہ نیند کی اور جھپکی لے گا تو امانت پھر اس کے دل سے نکال لی جائے گی اور اس کا نشان آبلے کی مثال ہو جائے گا۔ جیسے تم اپنے پاؤں پر ایک انگارہ لڑھکاؤ تو آبلہ بن جائے گا۔ تم اسے ابھرا ہوا دیکھو گے لیکن حقیقت میں اس کے اندر کچھ نہیں ہوگا۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے ایک سنگ ریزہ اٹھایا اور اسے اپنے پاؤں پر لڑھکایا، پھر فرمایا کہ لوگوں کی حالت ایسی ہو جائے گی کہ وہ باہم لین دین کریں گے لیکن کوئی امانت ادا کرتا دکھائی نہیں دے گا۔ یہاں تک کہ کہا جائے گا کہ فلاں قبیلے میں ایک امانت دار آدمی ہے۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچے گی کہ ایک آدمی کی تعریف میں کہا جائے گا کہ وہ کتنا

Marfat.com

توانا، کتنا مہذب اور کتنا دانش مند ہے حالانکہ اس کے دل میں رائی کے ایک دانے کے برابر بھی ایمان نہ ہوگا۔

حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ میرے اوپر ایک دور تو ایسا آیا کہ مجھے یہ پروا نہیں ہوتی تھی کہ میں کس کے ساتھ لین دین کا معاملہ کر رہا ہوں۔ اگر معاملہ مسلمان سے ہوتا تو اس کا دین اسے میرے پاس واپس لے آتا، اگر معاملہ کسی نصرانی یا یہودی سے ہوتا تو اس کا تحصیل دار اسے میری طرف لوٹا دیتا، لیکن اب وہ دور آ گیا ہے کہ میں تمھارے اندر بس فلاں فلاں ہی کے ساتھ لین دین کر سکتا ہوں۔''

روایت کی حیثیت:

یہ روایت متفق علیہ ہے اور بخاری رحمہ اللہ نے اسے کتاب 'الفتن ـ باب: اذا بقی فی حُثالة من الناس' میں اور کتاب الرقائق باب 'رفع الامانة' میں بیان کیا ہے۔ یہ ایک ایسی خبر واحد ہے کہ جس کی سند کے پہلے تین واسطوں میں صرف ایک ایک راوی ہے یعنی حذیفہ رضی اللہ عنہ، زید بن وہب رحمہ اللہ اور اعمش رحمہ اللہ ۔ گویا اصل میں یہ روایت اعمش رحمہ اللہ سے پھیلی ہے جن کی حیثیت بطور راوی کچھ زیادہ مضبوط نہیں سمجھی گئی اور محدثین نے ان کی روایتوں پر کلام کیا ہے۔ اس طرح کی خبر واحد میں چوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی غلط بات کے منسوب ہو جانے کے احتمالات بہت بڑھ جاتے ہیں، اس لیے اس کو لینے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔

بخاری رحمہ اللہ اور مسلم رحمہ اللہ کی روایتوں میں کوئی قابل ذکر اختلاف نہیں۔ روایت کا ایک بڑا حصہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے ذاتی تاثرات پر مشتمل ہے اور اصطلاحی معنی میں یہ حدیث نہیں، کیوں کہ حدیث صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل یا تصویب [1] کا نام ہے۔ روایت زیر نظر میں حدیث کا حصہ بس اتنا ہی ہے جس میں حذیفہ رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دو باتیں نقل کرتے ہیں۔ ایک نزول امانت سے متعلق اور دوسری رفع امانت سے متعلق، لہٰذا ہمیں روایت کے اسی حصے پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

وضاحت حدیث:

امانت کا مفہوم:...... یہ روایت چوں کہ امانت کے بعض پہلوؤں کو واضح کرتی ہے، اس لیے پہلے امانت کا مفہوم سمجھنا چاہیے۔ محدود معنی میں یہ لفظ اس مال کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو کسی دوسرے شخص کا ہو لیکن وقتی طور پر ایک شخص کی تحویل و حفاظت میں ہو، چنانچہ رہن کے احکام بیان کرتے ہوئے قرآن مجید نے امانت کا لفظ رہن کردہ مال کے لیے استعمال کیا ہے اور ہدایت کی ہے کہ اعتماد کی صورت میں یہ امانت اصل مالک کو لوٹا دو۔ جیسا کہ قرآن میں بیان ہوا ہے:

﴿فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ﴾ (البقرة: 283)

''جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے وہ اس کی امانت ادا کرے۔''

اس لفظ کا ایک وسیع مفہوم بھی ہے۔ جس میں یہ قرآن مجید میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ اس مفہوم میں اس سے

---

[1] تصویب: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی کے عمل کو صائب یا درست قرار دینا۔

Marfat.com

مراد وہ ذمہ داری ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو زمین میں اپنا خلیفہ مقرر کرتے وقت سونپی یعنی یہ کہ وہ اختیار پا کر مطلق العنان نہ ہو جائے گا بلکہ اپنے مالک کا وفادار بندہ بن کر زندگی گزارے گا۔ ہر معاملے میں اس کی رضا کو ملحوظ رکھے گا اور اس کے تفویض کردہ فرائض کو ٹھیک ٹھیک ادا کرے گا۔ اس وسیع مفہوم میں تمام حقوق و فرائض، خواہ وہ انفرادی نوعیت کے ہوں یا اجتماعی نوعیت کے، وہ مالی معاملات کی قسم کے ہوں یا سیاسی معاہدات کی قسم کے، وہ خدا کے متعلق ہوں یا بندوں سے متعلق، سب شامل ہیں۔ گویا خدا کی توحید کا اقرار اور اس کے تقاضوں کی نگہداشت، والدین اور اقربا کے ساتھ حسن سلوک، حق کی شہادت، خدا کی دی ہوئی صلاحیتوں کا صحیح استعمال، عہد و پیمان کی حفاظت، دیانت داری اور نیکی سب امانت کے مفہوم میں شامل ہیں۔

زیر نظر روایت میں امانت کا لفظ اسی وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے کیوں کہ جس امانت کا نزول دلوں پر ہوا وہ یہی ہے، ہر پہلو سے اس کی وضاحت قرآن وسنت کا اصل موضوع ہے اور قرب قیامت میں اس امانت کے ضیاع کی کئی احادیث نبی ﷺ سے مروی ہیں۔

نزول امانت:

حدیث کا پہلا حصہ ہمیں بتاتا ہے کہ امانت دلوں کی اساس میں نازل کی گئی۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ مذکورہ ذمہ داری کا شعور اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں رکھا ہے۔ اس کا دل گواہی دیتا ہے کہ اس کا خالق و مالک اللہ ہے اور اس کے سوا کسی کی یہ حیثیت نہیں، یہی وجہ ہے کہ مصیبت میں وہ اس ایک خدا کو پکارتا اور دوسرے عارضی سہاروں کو بھول جاتا ہے۔ دل کے اندر نیکی اور بدی کا صحیح شعور موجود ہے۔ انسان نیکی سے اطمینان پاتا ہے، جبکہ بدی کے ارتکاب پر اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے۔ انسانوں میں ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ کرنے کی روایت ہمیشہ سے چلی آرہی ہے اور بگڑے ہوئے معاشرے میں بھی لوگ اس کا خیال رکھتے ہیں۔ ہر شخص اس وقت سراپا احتجاج بن جاتا ہے جب کوئی دوسرا شخص اس کے حقوق پر ڈاکہ ڈالے۔ انسان دل میں اس ذمہ داری کی مسئولیت کا احساس بھی رکھتا ہے۔ اس کے ذہن پر یہ بات مرتسم ہے کہ ایک دن اسے اپنے مالک کے آگے حاضر ہو کر اپنے اعمال کا جواب دینا ہوگا، اور اس کے نتیجے میں وہ اچھا یا برا بدلہ پائے گا۔ کرۂ ارضی پر بسنے والے ہر شخص کی فطرت کی اٹھان اسی طرح کی ہے خواہ وہ کسی بھی قوم و قبیلہ اور کسی بھی زمانے سے تعلق رکھتا ہو، تعلیم یافتہ ہو یا ان پڑھ، مذہبی شعور رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ انسان کی فطرت کا یہ شعور حدیث کے اس بیان کی بھرپور تائید کرتا ہے کہ امانت دلوں کی اساس میں نازل کی گئی ہے۔

گرد و پیش نظر ڈالنے سے یہ حقیقت بھی کھلتی ہے کہ امانت اور ذمہ داری کا یہ شعور صرف انسان ہی کے اندر ہے۔ دوسری مخلوقات کی اٹھان بالکل مختلف طور سے ہوئی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے یہ شرف صرف انسان کو بخشا ہے کہ وہ اپنے اختیار اور ارادے سے اس کی خلافت کی ذمہ داریوں کو ادا کرے۔ اس باب میں قرآن کریم نے یہ وضاحت فرمائی ہے کہ آسمان، زمین اور پہاڑ اس ذمہ داری کو نہ اٹھا سکے، صرف انسان نے جرأت کے ساتھ اسے قبول کیا۔

Marfat.com

﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ أَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْإِنْسَانُ﴾ (الاحزاب : 72)

''ہم نے اپنی امانت کی پیش کش آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کو کی تو انھوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس ذمہ داری سے ڈرے، لیکن انسان نے اسے اٹھالیا۔''

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس پیش کش کو باقاعدہ معاہدے کی شکل اس وقت دی جب اس نے ذریت آدم کی ارواح سے اس پر عہد لیا کہ وہ صرف اسی کو اپنے رب کی حیثیت سے مانیں گے اور اس کی اطاعت کریں گے۔

حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ فطرت کی اسی اساس پر قرآن نازل ہوا اور سنت کی تعلیم ہوئی۔ یعنی جس طرح ایک بنیاد تیار ہوتی ہے پھر اس پر عمارت تعمیر کی جاتی ہے اور آخر میں اس کو آراستہ و پیراستہ کر کے قابل رہائش بنالیا جاتا ہے، اسی طرح فطرت کے شعور کو تقویت دینے کے لیے قرآن نازل ہوا جس نے امانت کی تمام حدود متعین کر دیں اور ہر ضروری امر میں رہنمائی دے دی تا کہ انسان کو حقیقت کی تلاش کے لیے محض اپنے دل کے نور ہی پر قناعت نہ کرنی پڑے بلکہ حق اس پر دو ٹوک طریقے سے واضح ہو جائے۔ اس حق کو نبی ﷺ نے عملاً قائم کر دیا جس کے نتیجے میں زندگی کے ہر دائرے میں ذمہ داری کی تفصیلات آشکارا ہو گئیں اور ہر ہدایت کی عملی شکل واضح ہو گئی۔

اس تفصیل سے یہ نتیجہ بآسانی اخذ ہو سکتا ہے کہ وحی آسمانی اور رسول کی رہنمائی سے صحیح فائدہ انہی لوگوں کو ہوتا ہے جو فطرت کی روشنی کو ضائع نہیں ہونے دیتے۔ جو لوگ اس روشنی کو غائب کر دیتے ہیں وہ فیض کے ان سرچشموں سے سیراب نہیں ہو سکتے کیوں کہ وہ اساس موجود نہیں ہوتی جس پر عمارت تعمیر ہو سکے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی طرف ہر زمانے کے انبیاء نے اپنے مخاطبین کو متوجہ کیا ہے۔ مثلاً حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يٰقَوْمِ أَرَءَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ اٰتٰنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ أَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ أَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ﴾ (ھود : 28)

''اے میری قوم! بتاؤ اگر میں اپنے رب کی جانب سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور پھر اس نے خاص اپنی رحمت سے بھی مجھے نوازا ہے اور وہ تم سے پوشیدہ رہی تو کیا ہم اس کو تم پر چپکا دیں جبکہ تم اس سے بیزار بھی ہو!''

آخرت میں جب لوگ دوزخ میں ڈالے جائیں گے تو ان پر کھلے گا کہ یہ سزا انھیں اس بنا پر دی جا رہی ہے کہ انھوں نے اپنی فطرت کی آواز سے کان بند کر لیے، آسمانی صحائف کی ناقدری کی اور رسولوں سے اکتساب فیض نہ کیا:

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْ اٰيٰتِ اللّٰهِ أَنّٰى يُصْرَفُوْنَ ○ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَا أَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ○ إِذِ الْأَغْلٰلُ فِيْ أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ يُسْحَبُوْنَ ○﴾

(المومن : 69۔ 71)

Marfat.com

''ذرا ان کو تو دیکھو جو اللہ کی آیات کے باب میں کٹ حجتی کر رہے ہیں، وہ کہاں پھیر دیے جاتے ہیں! جنھوں نے اللہ کی کتاب کو جھٹلایا اور ان چیزوں کو بھی جن کے ساتھ ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا۔ پس وہ عنقریب جان لیں گے جبکہ ان کی گردنوں میں طوق اور (پاؤں میں) زنجیریں ہوں گی۔''

حدیث میں 'قلوب الرجال' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ امانت کے شعور کو صرف مردوں کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں۔ یہاں راوی کا تسامح [1] معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے اس باب میں نہایت صراحت کے ساتھ لفظ ''انسان'' استعمال کر کے عورتوں اور مردوں دونوں کو اس ذمہ داری میں شریک ٹھہرایا ہے۔ عہد الست کے بیان میں یہ وضاحت موجود ہے کہ یہ ذریت آدم سے لیا گیا ہے، اور ذریت میں مرد اور عورت دونوں شامل ہوتے ہیں۔ نیز سورہ احزاب میں جہاں بار امانت کی پیش کش کا ذکر آیا ہے وہاں امانت کا حق ادا کرنے میں ناکام رہنے والوں میں مشرک مردوں اور منافق مردوں کے ساتھ مشرک عورتوں اور منافق عورتوں کو بطور خاص شمار کیا گیا ہے (احزاب:73) پس نزول امانت مردوں اور عورتوں دونوں کے دلوں پر ہوا اور قرآن وسنت کے مخاطب بھی یہ دونوں ہی ہیں۔

رفع امانت:

حدیث زیر نظر کا دوسرا حصہ رفع امانت یعنی امانت کا شعور ختم ہونے کی خبر دیتا ہے۔ اوپر کے مباحث کو ذہن میں رکھیے تو رفع امانت کی حقیقت کو سمجھنے میں زحمت نہ ہوگی۔ انہی الفاظ کو مستعار لیجیے تو اس کا مفہوم یہ قرار پائے گا کہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی سنت سے بے تعلق ہو جائیں گے اور ان کے لیے اسوہ حسنہ کسی اور چیز میں ہوگا، قرآن کو پس پشت ڈال دیا جائے گا اور اس کا علم ناپید ہو جائے گا، لوگوں کا ضمیر مردہ ہو جائے گا اور فطرت بگڑ جائے گی۔ اس کے نتیجے میں لوگ اپنی ذمہ داریوں کو ادا نہیں کریں گے، اللہ کی توحید کے تقاضوں کو نظر انداز کریں گے اور دوسروں کے حقوق سے صرف نظر کریں گے۔ قرآن مجید کی رو سے ضیاع امانت کی سب سے سنگین شکل یہ ہے کہ بندہ نفاق اور شرک میں مبتلا ہو جائے۔

حدیث کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ رفع امانت کا عمل درجہ بدرجہ ہوگا۔ پہلے مرحلے میں امانت کی حالت 'وکت' کی مانند ہو جائے گی۔ جب گدرائی ہوئی کھجور میں پکنے کی علامات ظاہر ہوتی ہیں اور کہیں کہیں اس کی رنگت بدل جاتی ہے تو بدلی ہوئی رنگت کے نشانات کو 'وکت' کہتے ہیں۔ وکت کے ساتھ تشبیہ سے مراد یہ ہے کہ آدمی کا دل امانت کے بارے میں یکسو نہیں رہ جائے گا۔ اس کے کردار میں دورنگی پیدا ہو جائے گی۔ وہ اپنی سہولت کے مطابق کبھی اس ذمہ داری کو نبھا بھی لے گا، لیکن بیشتر اس سے پہلو تہی کرے گا۔ اسی حالت کا نام نفاق ہے۔

دوسرے مرحلے میں امانت کا تصور بالکل مٹ جائے گا، احساس ذمہ داری ختم ہو جائے گا، آدمی بظاہر اپنی ذمہ

[1] تسامح: نظر انداز کرنا، درگزر کرنا۔

Marfat.com

داریاں ادا کر رہا ہوگا لیکن حقیقت میں امانت کے شعور سے بالکل عاری ہوگا۔ آنحضرت ﷺ نے اسے آبلے کی مثال سے سمجھایا کہ اس میں جلد ابھری ہوئی نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں اس کے اندر خالی جگہ میں صرف پانی ہوتا ہے۔ ٹھیک یہی حال آدمی کے کردار کا بھی ہوگا۔

رفع امانت کے اسباب:

حدیث کے الفاظ سے بظاہر یہ تاثر ملتا ہے کہ رفع امانت کا سبب آدمی کی نیند بنے گی۔ وہ سو کر اٹھے گا تو درجہ بدرجہ امانت سے عاری ہوتا جائے گا۔ یہ تاثر صحیح نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ راوی نے بالمعنی روایت کی ہو جس میں وہ مفہوم کو ٹھیک ادا نہ کرسکا ہو۔ نیند ہر شخص کی ایک جبلی ضرورت ہے۔ اس طرح کی جبلی ضروریات کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کی ہدایت وضلالت کو منسلک نہیں کیا۔ ہدایت وضلالت کا انحصار آدمی کے ضمیر، اس کی عقل اور اختیار وارادہ کے صحیح استعمال پر ہے۔ ہمارے نزدیک حدیث کا اصل مضمون یہ ہے کہ دلوں سے امانت کا شعور اس قدر تیزی سے محو ہوگا کہ یہ تبدیلی صبح وشام کا قصہ معلوم ہوگی۔ اس مفہوم کی تائید حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے ہوتی ہے جو ابوداؤد میں ہے:

عَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنَّ بَیْنَ یَدَیِ السَّاعَةِ فِتَنًا کَقِطَعِ اللَّیْلِ الْمُظْلِمِ یُصْبِحُ الرَّجُلُ فِیْهَا مُؤْمِنًا وَ یُمْسِیْ کَافِرًا وَ یُمْسِیْ مُؤْمِنًا وَ یُصْبِحُ کَافِرًا، اَلْقَاعِدُ فِیْهَا خَیْرٌ مِنَ الْقَائِمِ وَ الْمَاشِیْ فِیْهَا خَیْرٌ مِنَ السَّاعِیْ.

(ابوداؤد۔ کتاب : الفتن، باب : النھی عن السعی فی الفتنه)

''ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت سے پہلے فتنے اس طرح چھا جائیں گے جیسے ایک تاریک رات چھا جاتی ہے۔ آدمی صبح کو مومن ہوگا تو شام کو کافر ہوگا اور شام کو مومن ہوگا تو صبح کو کافر ہوگا۔ ان فتنوں میں بیٹھ رہنے والا کھڑے آدمی سے اچھا رہے گا اور چلنے والا شخص دوڑنے والے سے اچھا رہے گا۔''

اوپر نزول امانت کی کیفیت پر غور کیجیے تو اس کے مقابلے میں رفع امانت کے اصل اسباب معین کرنے میں دشواری نہ ہوگی۔ کتاب وسنت کے علم کا فقدان اس کا اولین سبب ہونا چاہیے اور فطرت کا بگاڑ آخری سبب۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ سے اس مضمون کی احادیث مروی ہیں کہ آخری زمانے میں دین کا علم اٹھ جائے گا اور جہالت ڈیرے ڈال لے گی۔ من اشراط الساعة ان یرفع العلم ویثبت الجھل۔ لوگ خیر سے عاری ہوجائیں گے اور قیامت ان لوگوں پر آئے گی جو بدترین انسان ہوں گے۔ لا تقدم الساعته الاعلی شرار الناس۔

(مسلم۔ باب : قرب الساعة

آنحضرت ﷺ نے یہ حقیقت بھی بیان فرمادی کہ علم دین کے اٹھ جانے کی شکل یہ نہیں ہوگی کہ قرآن اٹھالیا

Marfat.com

جائے گا یا لوگوں کے ذہنوں سے خدا علم دین کو کھرچ کھرچ کر نکال لے گا بلکہ اس کی شکل یہ ہوگی کہ رفتہ رفتہ دین کے حقیقی عالم ناپید ہو جائیں گے۔ لوگوں کی فکری رہنمائی جاہلوں کے ہاتھ میں ہوگی جو خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دیں گے:

"عَنْ عُرْوَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَنْتَزِعُ الْعِلْمَ مِنَ النَّاسِ انْتِزَاعًا وَلٰکِنْ یَقْبِضُ الْعُلَمَآءَ فَیَرْفَعُ الْعِلْمَ مَعَهُمْ وَیُبْقِی فِی النَّاسِ رُؤُسًا جُهَّالًا یُفْتُوْنَهُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ فَیَضِلُّوْنَ وَیُضِلُّوْنَ ." (مسلم۔ کتاب: العلم، باب: رفع العلم وقبضہ)

''عروہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ علم کو لوگوں کے اندر سے کھینچ نہیں لے گا، بلکہ علماء کو اٹھالے گا تو ان کے ساتھ علم بھی اٹھ جائے گا۔ لوگوں کے اندر ان کے جاہل سربراہ رہ جائیں گے جو علم کے بغیر ہی ان کو فتوے بتائیں گے۔ وہ خود گمراہ ہوں گے اور ان کو بھی گمراہ کریں گے۔''

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت جو اوپر نقل کی گئی ہے فتنوں کی کثرت کو رفع امانت کا سبب بتاتی ہے جبکہ یہاں ہم رفع علم کو رفع امانت کا سبب قرار دے رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ باتیں متضاد نہیں ہیں۔ حقیقت میں ہر چھوٹے بڑے فتنے میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ایک بندے کو گمراہ کر دے۔ فتنے کی کمیت خواہ کتنی ہو، اس کا مقابلہ اگر ہو سکتا ہے تو وہ علم صحیح اور عمل صحیح ہی سے ہو سکتا ہے۔ جب علم صحیح ناپید ہو جائے گا تو نتیجتاً عمل بھی صحیح ناپید ہو جائے گا اور بالآخر بندہ اس فتنے کا شکار ہو جائے گا۔ فتنے ہر دور میں رہے ہیں اور رہیں گے۔ پہلے لوگ علم دین سے واقف تھے تو فتنوں کی گھٹاؤں کا رخ پھیرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ آخری زمانے میں صرف فتنے ہی رہ جائیں گے، راہ کو روشن کرنے والی ہدایت سے لوگ محروم ہوں گے، اس لیے فتنے شب دیجور [1] کی طرح مسلط ہو جائیں گے اور جو شخص زندگی کی جدوجہد میں جتنا زیادہ چست اور چالاک ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ آسانی سے فتنے کا شکار ہو جائے گا۔

معاشرہ افراد کے مجموعے کا نام ہے۔ افراد اسی کردار کے حامل ہوتے ہیں جس کردار کا حامل معاشرہ بھی ہوتا ہے۔ رفع امانت کے جو اثرات معاشرے پر پڑیں گے، آنحضرت ﷺ نے ان کی طرف بھی توجہ دلائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ پہلے درجے میں معاشرے کا عام چلن امانت کی ذمہ داریوں سے بے زاری اور خیانت کا ہوگا، اس کا حق ادا کرنے والے خال خال کہیں نظر آئیں گے، یہاں تک کہ لوگ بتائیں گے کہ ہزاروں انسانوں کی بھیڑ میں فلاں قبیلے کا ایک شخص امانت کا شعور رکھتا ہے۔ اس کے بعد ایک مرحلہ آئے گا جب معاشرے کی اقدار بالکل بدل جائیں گی۔ اس شخص پر لوگ رشک کریں گے جو دنیا کے معاملات میں زیرک، سوسائٹی کے آداب سے واقف اور ہم عصروں میں مضبوط و توانا ہوگا اگرچہ ایمان اس کے اندر رتی بھر بھی نہ ہو اور امانت کے شعور سے وہ بالکل بے بہرہ ہو۔

[1] شب دیجور: سیاہ رات۔

Marfat.com

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں رفع امانت کے بارے میں حدیث کی پیش گوئی کے پورا ہونے کا منتظر ہوں۔ یہ مرحلہ ابھی پیش تو نہیں آیا، لیکن اس کے آثار پیدا ہو چکے ہیں۔ پہلے میں لین دین کا معاملہ کرتا تھا تو یہ پڑتال کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی کہ جس آدمی کے ساتھ معاملہ ہو رہا ہے وہ کیسا ہے۔ اگر وہ مسلمان ہوتا تو اس سے کسی خیانت کی توقع ہی نہ ہوتی۔ اس کا ایمان اتنا محکم ہوتا ہے کہ وہ حق تلفی کا راستہ اختیار ہی نہ کرتا۔ معاملہ غیر مسلم سے ہوتا تو یہ یقین ہوتا کہ حکومت کے کارندے اتنے بیدار اور فرض شناس ہیں کہ وہ رعیت میں سے کسی فرد کا حق ضائع نہ ہونے دیں گے، لیکن اب لوگ اس قدر بدل چکے ہیں کہ سوچنا پڑتا ہے کہ معاملہ کس شخص کے ساتھ کیا جائے۔

روایت کا یہ حصہ جیسا کہ اوپر گزرا، حدیث نہیں بلکہ ایک صحابی کا احساس ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا انتقال حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے تھوڑا عرصہ بعد ہوا۔ لہٰذا یہ بات آپ نے سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں فرمائی ہوگی جب اسلامی حکومت بہت وسعت اختیار کر چکی تھی۔ اس زمانے میں کتاب وسنت کا علم خوب پھیل رہا تھا اور اس کے عالم بکثرت موجود تھے۔ نومسلموں کے سوا لوگوں کے کردار میں بھی ابھی قابل ذکر خامی پیدا نہ ہوئی تھی، لہٰذا یا تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نہایت ذکی الحس رہے ہوں گے کہ انھیں معیار مطلوب سے ذرا سے تجاوز پر بھی پریشانی ہوتی رہی ہوگی یا یہ تبصرہ انھوں نے لوگوں کے اندر علم دین اور امانت و دیانت کا شوق پیدا کرنے کے لیے فرمایا ہوگا تاکہ ان کے زیر تربیت لوگ اعلیٰ کردار کو اپنائیں۔

خلاصۂ حدیث:

اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ امانت کا خزینہ ہر شخص کے دل میں ودیعت ہے۔ اس کے شعور کو بیدار رکھنے، اس کی ذمہ داریوں کو واضح کرنے اور اس پر عمل کو سہل بنانے کے لیے قرآن وسنت موجود ہیں۔ جیسے جیسے لوگ قرآن وسنت کے حقیقی علم سے عاری ہوتے جائیں گے ان کے اندر امانت کا شعور کم ہوتا چلا جائے گا، یہاں تک کہ معاشرے کی اقدار بالکل تلپٹ ہو جائیں گی۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ دین کے حقیقی علم کو زندہ رکھنے اور لوگوں کو ان کی منصبی ذمہ داریوں کی یاد دہانی کا باقاعدہ اہتمام کیا جائے ورنہ معاشرہ بڑی تیزی سے تاریکی کی لپیٹ میں آجائے گا اور دنیا میں اس کے وجود کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جائے گا۔

Marfat.com

جھوٹی قسم اور حق تلفی کا انجام

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ حَلَفَ عَلَى يَمِينِ صَبْرٍ يَقْتَطِعُ بِهَا مَالَ امْرِءٍ مُسْلِمٍ هُوَ فِيْهَا فَاجِرٌ لَقِىَ اللّٰهَ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ قَالَ فَدَخَلَ الْأَشْعَثُ بْنُ قَيْسٍ فَقَالَ مَا يُحَدِّثُكُمْ أَبُوعَبْدِالرَّحْمٰنِ قَالُوا كَذَا وَكَذَا قَالَ صَدَقَ أَبُو عَبْدِالرَّحْمٰنِ فِيَّ نَزَلَتْ كَانَ بَيْنِى وَبَيْنَ رَجُلٍ أَرْضٌ بِالْيَمَنِ فَخَاصَمْتُهُ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ هَلْ لَكَ بَيِّنَةٌ فَقُلْتُ لَا قَالَ فَيَمِينُهُ قُلْتُ إِذَنْ يَحْلِفُ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عِنْدَ ذٰلِكَ مَنْ حَلَفَ عَلَى يَمِينِ صَبْرٍ يَقْتَطِعُ بِهَا مَالَ امْرِءٍ مُسْلِمٍ هُوَ فِيهَا فَاجِرٌ لَقِىَ اللّٰهَ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ فَنَزَلَتْ إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا إِلَى آخِرِ الْآيَةِ. (صحيح مسلم۔ کتاب: الايمان۔ باب: وعيد من اقتطع حق مسلم بيمين فاجرة بالنار)

''عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: 'جس شخص نے پابند قسم کے ساتھ ایسا حلف اٹھالیا جس کے سبب سے وہ کسی مسلمان کا مال ہتھیا لے لیکن اس حلف میں وہ جھوٹا ہو تو اللہ سے وہ اس حال میں ملے گا کہ وہ اس پر غضبناک ہوگا۔' راوی بیان کرتے ہیں کہ اس موقع پر اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ داخل ہوئے اور پوچھا: 'ابوعبدالرحمٰن! آپ لوگوں سے کون سی حدیث بیان کر رہے تھے؟' لوگوں نے بتایا: 'فلاں حدیث'۔ انھوں نے کہا: 'ابوعبدالرحمٰن نے ٹھیک بیان کیا۔ میرے ہی معاملے میں یہ بات ارشاد ہوئی۔ یمن میں کچھ زمین میرے اور ایک اور آدمی کے درمیان مشترک تھی۔ میں اس کا مقدمہ لے کر نبی ﷺ کی خدمت میں آیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: 'تمھارے حق میں کوئی ثبوت ہے؟' میں نے عرض کی: 'نہیں'۔ آپ ﷺ نے فرمایا: 'اس صورت میں اس آدمی کی قسم پر فیصلہ ہوگا۔' میں نے عرض کی: 'تب تو وہ شخص قسم کھالے گا۔' اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: 'جس شخص نے پابند قسم کے ساتھ ایسا حلف اٹھالیا جس کے سبب سے وہ کسی مسلمان آدمی کا مال ہتھیالے لیکن ہو اس میں وہ جھوٹا تو اللہ سے وہ اس حال میں ملے گا کہ وہ اس پر غضبناک ہوگا۔' چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی: اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِاللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا..... آخر آیت تک۔''

روایت کے دوسرے طرق:

اس حدیث کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں اور ابوعبدالرحمٰن انہی کی کنیت ہے۔ صحیح مسلم میں ان سے

Marfat.com

یہ روایت ابووائل رحمہ اللہ کے واسطے سے اعمش رحمہ اللہ نے بیان کی ہے اور کم وبیش انہی الفاظ میں اسے امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری کی کتاب التفسیر سورہ آل عمران اور کتاب الایمان والنذور میں اور ابوداؤد نے باب التغلیظ فی الایمان الفاجرہ میں روایت کیا ہے۔

یہی حدیث ابووائل رحمہ اللہ کے واسطے سے اعمش رحمہ اللہ کے بجائے منصور رحمہ اللہ نے بھی بیان کی ہے۔ ان کے الفاظ ذرا مختلف اور حسب ذیل ہیں:

❀ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ مَنْ حَلَفَ عَلٰی یَمِینٍ یَسْتَحِقُّ بِهَا مَالًا هُوَ فِیهَا فَاجِرٌ لَقِیَ اللّٰهَ وَهُوَ عَلَیْهِ غَضْبَانُ ثُمَّ ذَکَرَ نَحْوَ حَدِیثِ الْأَعْمَشِ غَیرَ اَنَّهٗ قَالَ کَانَتْ بَیْنِی وَبَیْنَ رَجُلٍ خُصُومَةٌ فِی بِئْرٍ فَاخْتَصَمْنَا اِلٰی رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ شَاهِدَاكَ أَوْ یَمِینُهٗ.

(صحیح مسلم: بحوالہ مذکور)

''عبداللہ نے بیان کیا کہ جس شخص نے ایک ایسی قسم کے ساتھ حلف اٹھایا جس سے وہ کسی مال کا حق دار بن بیٹھے لیکن ہو وہ جھوٹا تو اللہ سے وہ اس حال میں ملے گا کہ وہ اس پر غضبناک ہوگا۔ اس کے بعد راوی نے اعمش کی روایت کے مطابق ہی حدیث بیان کی البتہ اس فرق کے ساتھ کہ اشعث نے یوں بیان کیا کہ میرے اور ایک آدمی کے درمیان ایک کنویں کے بارے میں جھگڑا تھا۔ ہم یہ قضیہ لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: 'تمھارے دو گواہ ہوں ورنہ پھر اس کی قسم پر فیصلہ ہوگا۔''

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ روایت بھی ذرا تغیر الفاظ کے ساتھ باب فی الشرب، باب الخصومۃ فی البئر و القضا فیھا میں لی ہے۔ اس میں اشعث رضی اللہ عنہ کا قضیہ کسی غیر معروف آدمی کے بجائے ان کے چچازاد بھائی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس روایت میں زیر بحث روایت سے کوئی قابل لحاظ فرق نہیں۔ زمین اور کنواں ایک ہی چیز کی دو تعبیریں ہیں۔ اسی طرح دو گواہوں کی گواہی بھی مقدمہ کے ثبوت ہی کا ایک پہلو ہے۔

امام مسلم رحمہ اللہ نے ایک روایت ابوامامہ حارثی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی مضمون کی بیان کی ہے۔ اس میں الفاظ ومعنی کا اختلاف نمایاں ہے جس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ روایت اس موقع کی نہیں جس کا ذکر ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے بلکہ اسی تعلیم پر مبنی یہ آنحضرت ﷺ کا دوسرا ارشاد ہے۔ یہ روایت حسب ذیل ہے:

عَنْ أَبِی أُمَامَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنِ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِءٍ مُسْلِمٍ بِیَمِینِهٖ فَقَدْ أَوْجَبَ اللّٰهُ لَهُ النَّارَ وَحَرَّمَ عَلَیْهِ الْجَنَّةَ فَقَالَ لَهٗ رَجُلٌ وَإِنْ کَانَ شَیْئًا یَسِیرًا یَارَسُولَ اللّٰهِ قَالَ وَإِنْ قَضِیبًا مِنْ أَرَاكٍ.

(صحیح مسلم: بحوالہ مذکور)

''ابوامامہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے اپنی قسم سے کسی مسلمان شخص کا حق چھین لیا تو اس پر اللہ نے دوزخ واجب اور جنت حرام کر دی۔ ایک شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! اگر وہ کوئی معمولی چیز ہو تب بھی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر چہ وہ پیلو کی ایک شاخ ہی ہو تب بھی۔''

Marfat.com

اس روایت میں اتنا مضمون اضافی ہے کہ جھوٹی قسم پر یہ وعید صرف بڑی حق تلفیوں ہی کے لیے نہیں بلکہ معمولی حق چھیننے والے کے لیے بھی ہے۔ اس روایت میں اللہ تعالیٰ کے غضبناک ہونے کے تذکرے کے بجائے جھوٹی قسم کھانے والے کی سزا کا بیان ہے۔

وضاحت حدیث:

زیر نظر روایت میں جو واقعہ بیان ہوا ہے وہ سادہ الفاظ میں یوں ہے کہ اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ کی زمین اپنے چچا زاد بھائی (یا کسی اور شخص) کے ساتھ مشترک تھی جس میں انھوں نے آب پاشی کے لیے کنواں بھی کھدوا رکھا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شریک صاحب نے ان کی زمین (یا کنواں) دبا لیا اور ان کی ملکیت کا انکار کر دیا۔ اشعث رضی اللہ عنہ کے پاس موقع کے گواہ نہ تھے، جو کچھ طے ہوا وہ باہمی اعتماد پر طے ہوا تھا۔ اس لیے اس صورت حال سے یہ پریشان ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مقدمہ پیش کیا۔ چوں کہ یہ مدعی تھے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوے کا ثبوت مانگا اور معاملے کے دو گواہ طلب کیے۔ انھوں نے گواہ پیش کرنے یا کوئی ثبوت مہیا کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ جب حق کو متعین کرنے کا کوئی ذریعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں پایا تو آپ نے فرمایا کہ مدعا علیہ سے قسم لی جائے گی اور اس پر فیصلے کا انحصار ہوگا۔ یہ سن کر اشعث رضی اللہ عنہ نے خدشہ ظاہر کیا کہ آدمی قابل اعتماد نہیں، وہ قسم کھا کر میری جائیداد ہضم کر جائے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو قسم کھانے کا پابند کیا جائے اور اس کی قسم ہی پر فیصلے کا انحصار ہو لیکن وہ جھوٹی قسم کھا کر ناحق مال کا مالک بن بیٹھے تو آخرت میں اللہ تعالیٰ اس پر غضبناک ہوگا اور اس کے لیے جہنم واجب ہو جائے گی۔

اس روایت میں بیان کردہ صورت حال لوگوں کے ساتھ بکثرت پیش آتی ہے۔ پنچایتوں اور عدالتوں کے بہت سارے فیصلوں میں قسم پر انحصار کیا جاتا ہے لیکن لوگ عموماً اسے نہایت معمولی بات سمجھتے ہیں اور جھوٹی سچی شہادت دے کر اپنے حق میں فیصلہ کروا لینے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے۔ عدالتی ٹاؤٹوں کا ایک مستقل طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو چند روپوں کے عوض ایسے معاملات میں حلفی بیان دے دیتے ہیں جن کے بارے میں انھیں کچھ بھی معلومات نہیں ہوتیں۔ اس رائج تصور کے برعکس حدیث میں قسم کا معاملہ نہایت خطرناک نظر آتا ہے اور لوگ جب اس کی سنگینی کو دیکھتے ہیں تو یہ سوچنے لگتے ہیں کہ آخر ایک چھوٹی سی غلطی پر اتنی بڑی سزا کا کیا جواز ہے جس کی خبر یہ حدیث دے رہی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ قسم کی حقیقت کو سمجھنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی جائے۔

قسم کی اہمیت:

اہل تحقیق کی رائے میں قسم انسان کی ایک تمدنی ضرورت ہے۔ بعض اوقات آدمی مخاطب کو مطمئن کرنے کے لیے ضرورت محسوس کرتا ہے کہ اپنے کسی بیان یا دعوے کو زور اور تاکید کے ساتھ پیش کرے تا کہ مخاطب کے دل میں اس کی بات پر اعتماد پیدا ہو اور وہ اسے قبول کر لے۔ اہم معاشرتی، سماجی اور اجتماعی معاملات و معاہدات میں اس طرح بتاکید بیان

Marfat.com

دینے کے مواقع اکثر پیش آتے ہیں۔ انسان کی اس تمدنی ضرورت نے طرح طرح کے طریقے اور خاص خاص الفاظ پیدا کر دیے جن سے لوگ اس تاکید کا اظہار کرنے لگے مثلاً ہاتھ میں ہاتھ دے کر معاملہ کرنا، اپنی محبوب چیزوں کو بددعا دے کر کوئی دعویٰ کرنا یا اللہ کے نام کے ساتھ کوئی بات کرنا اعتماد و استحکام کا ایک ذریعہ بن گیا۔ یہیں سے قسم کا آغاز ہوا۔

تمام انسانی حقوق کا دارومدار چوں کہ گواہی پر ہے اس لیے قسم گواہی کے ساتھ خاص طور پر منسلک ہوگئی اور اس میں تقدس کا رنگ نمایاں کرنے کے لیے لوگ خدا کی قسم کھانے لگے جس کا مطلب یہ ہوتا کہ قسم کھانے والا کوئی سنی سنائی بات بیان نہیں کر رہا بلکہ اپنے علم، واقفیت اور تجربہ کی بنا پر ایسا کہہ رہا ہے اور وہ خدا کو گواہ ٹھہرا کر ایسا کرتا ہے۔ اسے یہ یقین ہے کہ اگر اس نے غلط بیانی سے کام لیا یا کوئی بدعنوانی کی تو اسے خدا کے قہر و غضب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

گواہی کی ذمہ داریاں ہر شخص کی فطرت میں رچی بسی ہوئی ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ گواہی میں جھوٹ بولنا نہایت مذموم اور گناہ کی بات ہے۔ تمام مذاہب میں صراحت کے ساتھ اس کی ممانعت آئی ہے۔ تورات کے احکام عشرہ میں اس کا ذکر ہے اور قرآن مجید نے نیکوکاروں کی صفات میں بیان کیا ہے کہ وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔ نبی ﷺ نے جس صراحت کے ساتھ اسے ایک سنگین جرم قرار دیا ہے اس کے تیور مندرجہ ذیل حدیث میں دیکھیے:

> ''ابوبکرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی ﷺ نے تین مرتبہ یہ سوال کیا کہ کیا میں تمھیں بڑے گناہوں میں سب سے بڑے گناہوں کے بارے میں نہ بتاؤں؟ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے عرض کی: یا رسول اللہ فرمایئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: خدا کے ساتھ شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا...... آپ ﷺ ٹیک لگائے ہوئے تھے، چنانچہ اس موقع پر سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا...... اور سنو جھوٹی گواہی دینا۔ ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اس بات کو اتنا زیادہ دہرایا کہ ہمارے دل میں یہ خواہش ہوئی کہ کاش! اب آپ خاموش ہو جائیں۔''

(صحیح بخاری۔ کتاب: الشھادات، باب: ما قیل فی شھادۃ الزور)

یمین صبر یا پابند قسم:

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، ہاتھ میں ہاتھ دے کر معاملہ کرنے سے تاکید مقصود ہوتی تھی۔ داہنے ہاتھ کو عربی میں یمین کہتے ہیں چونکہ باہم اعتماد پیدا کرنے کے لیے یہی ہاتھ ملایا جاتا ہے اس لیے یہی لفظ قسم کے لیے بھی استعمال ہونے لگا۔ حدیث میں ''یمین صبر'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ''صبر'' کے اندر روکنے اور پابند کرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے، لہٰذا 'یمین صبر' سے مراد وہ قسم ہے جس کے کھانے کا کسی شخص کو پابند کر دیا جائے اور معاملہ کا فیصلہ اس قسم کے ساتھ معلق کر دیا جائے۔

قرآن مجید میں قسم کا حکم:

قرآن مجید نے اصولی طور پر لغو قسموں اور بالارادہ قسموں میں فرق کیا ہے اور قسم کے صحیح اور غلط استعمال کو واضح کر دیا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿وَ لَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَیْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَ تَتَّقُوْا وَ تُصْلِحُوْا بَیْنَ النَّاسِ وَ اللّٰهُ

Marfat.com

سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝﴾
(البقرة: 224,225)

''اور اللہ کو اپنی ایسی قسموں کا ہدف نہ بناؤ کہ احسان نہ کرو گے یا حدود الٰہی کا احترام نہ کرو گے یا لوگوں کے درمیان صلح نہ کراؤ گے، اور اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔ اللہ تم سے تمھاری عادی قسموں کے باب میں تو کوئی مواخذہ نہیں کرے گا لیکن ان قسموں کے باب میں تم سے ضرور مواخذہ کرے گا جو تمھارے دل کے ارادے کا نتیجہ ہیں، اور اللہ بخشنے والا اور حلیم ہے۔''

یعنی قسمیں دو طرح کی ہیں: ایک وہ قسمیں ہیں جو عادتاً بعض لوگوں کی زبان پر جاری ہوتی ہیں۔ نہ دل کے ارادے کو ان میں کوئی دخل ہوتا ہے اور نہ وہ کسی نفع ونقصان کو پیش نظر رکھ کر کھائی جاتی ہیں۔ فرمایا کہ ایسی قسموں پر اللہ تعالیٰ گرفت نہیں کرے گا کیوں کہ وہ بہت حلیم ہے اور بندوں کی ایسی غیر ارادی کوتاہیوں پر غضبناک نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس جو قسمیں دل کے قصد وارادہ کا نتیجہ ہوتی ہیں، جن کا کوئی قریب یا بعید اثر آدمی کے اپنے یا دوسروں کے حقوق اور مفادات پر پڑنے والا ہوتا ہے اور جن کے لیے آدمی کو سوچنے کی مہلت ملتی ہے، ان قسموں کو اللہ تعالیٰ نظر انداز نہیں کرے گا بلکہ ان پر ضرور مواخذہ کرے گا۔ لہٰذا آدمی کو قسم کھانے میں ہمیشہ بہت محتاط ہونا چاہیے اور ان کاموں پر ہرگز قسم نہیں کھانی چاہیے جو نیکی وتقویٰ، اصلاح اور ادائے حقوق کے منافی ہوں۔ ایسی قسمیں خدا کے نام کے ساتھ مذاق کے ہم معنی ہیں اور ایسی حرکت کرنے والے اپنی اس گستاخی کی سزا پائیں گے۔

جھوٹی قسم پر خدا کے غضب کی وجوہ:

(ا) زیر نظر روایت کے الفاظ پر غور کیجیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کے لیے خدا کے غضب کی وعید آئی ہے وہ ایک مسلمان کی حق تلفی کرتا ہے اور اس کی املاک پر قابض ہو جاتا ہے۔

(ب) املاک پر حق ثابت کرنے کے لیے اس کو قسم کھانے کا پابند کیا جاتا ہے اور فیصلہ اس کی قسم پر چھوڑا جاتا ہے۔

(ج) یہ شخص جھوٹی قسم کھا لیتا ہے اور اس طرح املاک کا حق دار بن بیٹھتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ شخص حق تلفی اور بالا رادہ جھوٹی قسم کھانے کا مجرم ٹھہرا اور مذکورہ آیات کی رو سے آخرت میں مواخذہ کا مستحق ہوا۔ اگرچہ مواخذہ کا لفظ بھی کچھ کم سنگین نہیں لیکن حدیث یہ خبر دیتی ہے کہ خدا ایسے شخص پر غضبناک ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عام مواخذہ سے بڑھ کر کوئی سنگین معاملہ ہوگا۔ ہمارے نزدیک اس سزا کی وجوہات موجود ہیں جو غور کرنے پر سمجھ میں آجاتی ہیں:

اولاً حق اور ناحق، سچ اور جھوٹ، امانت اور خیانت، سب کا شعور انسان کی فطرت میں ودیعت ہے جس کے سبب سے لوگ اپنی اور پرائی چیز میں فرق کرتے ہیں۔ اگر ان کے پاس کسی دوسرے کا حق سلب کرتا ہے تو اس کا ضمیر اسے جھنجوڑتا اور فطرت پکار پکار کر اسے متنبہ کرتی ہے کہ وہ گناہ کر رہا ہے۔ اچھا آدمی اس تنبیہ سے فائدہ اٹھا کر اپنی اصلاح کر لیتا ہے اور خدا

Marfat.com

کے ہاں اس کا گناہ معاف ہوجاتا ہے کیوں کہ قابل معافی گناہ کے بارے میں خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ گناہ بھول چوک یا کسی وقتی انگیخت سے جذبات کی رو میں بہہ کر صادر ہوگیا ہو۔ ارتکاب گناہ کے بعد آدمی نادم ہو اور خدا کی طرف متوجہ ہوجائے۔ حدیث میں بیان کردہ صورت حال میں جو آدمی دوسرے کا حق غصب کر کے اپنی فطرت سے بغاوت کرتا ہے۔ وہ ضمیر کی عدالت کا مجرم تو ہوتا ہی ہے، اس کے بعد جب معاملہ انسانوں کی عدالت میں جاتا ہے تو وہ ناحق کو حق اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنا چاہتا ہے۔ یہ چیز ظاہر کرتی ہے کہ اسے گناہ پر اصرار ہے۔ گناہ پر اصرار کرنے والے شخص کا معاملہ ظاہر ہے کہ آخرت میں بالکل الگ ہوگا۔ سنت الٰہی کے مطابق ایسا شخص خدا کی رحمت وعنایت کا ہرگز مستحق نہیں ہوگا۔

ثانیاً انسانوں کی عدالت جب ایک آدمی سے حلف لیتی ہے اور معاملے کا فیصلہ اس کے حلف پر موقوف کردیتی ہے تو یہ شخص گویا اسی دنیا میں خدا کی عدالت میں پیش ہوجاتا ہے۔ اگر اس کے اندر ذرہ بھر بھی خدا اور آخرت کا خوف ہوگا تو اس عدالت میں وہ کوئی ناحق بات نہ کرے گا۔ ایک بندۂ مومن اس طرح رب کے آگے کھڑا ہونے سے ہمیشہ ڈرتا ہے۔ حلف کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر آدمی کسی وقتی مفاد سے مغلوب ہے تو وہ شعوری طور پر اپنے معاملے پر نظر ثانی کرے، اس کے اندر خدا کے حاضر وناظر ہونے کا احساس بیدار ہوجائے اور آخرت میں اسے جس طرح جوابدہ ہونا ہے اس کی ریہرسل اسے کرادی جائے۔ اس صورت حال میں جو شخص جھوٹ بولتا ہے وہ گویا خدا کے سامنے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور اس کے قدوس نام کو تختۂ مشق بنا کر ایسا کرتا ہے۔ وہ بندوں کے حقوق غصب کرنے والا تو تھا ہی، وہ خدا کا بھی نہایت ڈھیٹ باغی ثابت ہوجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کا معاملہ عام مجرم سے الگ ہونا چاہیے کیوں کہ اس نے خدا کو خود خدا کے خلاف اور شیطان کے حق میں گواہ بنا دیا۔

ثالثاً حق تلفی اور جھوٹی گواہی کی حرکت جب کسی مسلمان سے سرزد ہوتی ہے تو اس کی سنگینی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ مسلمانوں کی ایک ذمہ داری شہادت حق کی بھی ہے۔ امت کے ہر فرد کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سچ بولے، حق کی شہادت دے اور اپنی جان پر کھیل کر بھی حق ہی کو قائم کرے۔ ایک مسلمان جب جھوٹی گواہی دیتا ہے تو وہ شہادت حق کی اس بنیاد ہی کو ڈھانے کی کوشش کرتا ہے جو اس امت کی بعثت کی اصل غایت ہے۔ یہ وہ گناہ ہے جس کی تحریک دل کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے اور دل کے فساد کی غمازی کرتی ہے۔ ایسا نام نہاد مسلمان اپنے ملی وجود کے تقاضوں ہی کو پس پشت ڈالے ہوئے ہے۔ اس کی کوتاہی معمولی کوتاہی نہیں بلکہ اپنے فرض منصبی کی خلاف ورزی ہے۔ اسی لیے غصب کیے ہوئے مال کی مالیت اس بارے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

رابعاً جو شخص کسی کا حق سلب کر کے اس پر جھوٹی قسم کھالیتا ہے، وہ طبعاً اور عملاً ایک یہودی ہے۔ قرآن مجید نے یہود کا کردار یہ بتایا ہے کہ وہ دنیا کی حقیر اور ناپائیدار پونجی حاصل کرنے اور اپنی دنیا بنانے کے لیے دین کے تقاضوں اور اعلیٰ اخلاق سے پہلو تہی کرتے، حق کو چھپاتے اور اس مقصد کے لیے جھوٹی قسموں کو آلۂ کار بناتے۔ یہود کے اس کردار کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن مجید نے یہ واضح کیا ہے کہ ان کی بدعہدی اور حب دنیا کے باعث خدا قیامت کے

Marfat.com

روز نہ ان کی طرف دیکھنا گوارا کرے گا اور نہ ان سے کلام کرے گا لہٰذا وہ خدا کے غضب کا نشانہ بنیں گے اور دردناک عذاب سے دوچار ہوں گے۔ زیرنظر حدیث قرآن مجید کے اس مضمون کا مصداق جھوٹی گواہی دینے والے شخص کو بھی قرار دے رہی ہے چونکہ اس کا کردار یہود سے مشابہ ہے، اس لیے اسے یہود ہی کے انجام سے دوچار ہونا ہوگا۔

عدالتی طریق کار:

اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ نے اپنے مقدمہ کی جو تفصیل بیان کی ہے اس میں انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والوں کے لیے یہ رہنمائی ہے کہ وہ:

- مدعی کا دعویٰ سن کر فوراً اپنا فیصلہ صادر نہ کریں بلکہ اس سے دعویٰ پر ثبوت طلب کریں۔
- اگر مدعی ثبوت مہیا کردے یا اپنے دعوے کے حق میں دو گواہ پیش کردے اور فریقین کو سننے کے بعد عدالت مدعی کے حق میں فیصلہ دے تو اس کا حق اسے لوٹایا جا سکتا ہے۔
- اگر مدعی کے پاس ثبوت یا دو گواہ نہ ہوں لیکن وہ مصر ہو کہ مدعا علیہ نے اس کا حق سلب کر رکھا ہے تو عدالت مدعی کی دادرسی کے لیے مدعا علیہ سے حلف لے گی کہ اس نے مدعی کا کوئی حق سلب نہیں کیا اور مال حقیقتاً اسی کا ہے۔
- اگر مدعا علیہ اپنے حق میں قسم کھا لیتا ہے خواہ وہ جھوٹی ہو تو عدالت اسی کے حق میں فیصلہ کرے گی۔ جھوٹا ہونے کی صورت میں اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہوگا۔

ہماری عدالتیں بالعموم دعوے کے ثبوت یا عدم ثبوت پر عدالتی کارروائی ختم کردیتی ہیں اور حق کو متعین کرنے کے لیے حلف کا طریقہ استعمال نہیں کرتیں۔ اس طرح مدعی کی اگر واقعی حق تلفی ہو چکی ہو تو اس کی دادرسی کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اگر حلف کا طریقہ اپنا لیا جائے تو اول تو بہت سارے لوگ جھوٹے حلف سے بچنے کے لیے حق دار کو حق لوٹا دینے کی طرف مائل ہو جائیں گے لیکن اگر وہ نہ بھی مائل ہوں تو کم از کم مظلوم یہ سمجھے گا کہ عدالت نے اس کی دادرسی کی پوری کوشش کی اور ظالم کا آخر تک تعاقب کیا۔

شان نزول اور احادیث:

حدیث کا آخری حصہ یہ تاثر دیتا ہے کہ اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ کے اس مقدمے کے بعد سورہ آل عمران کی آیت:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَ لَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾

(آل عمران: 77)

''جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو ایک حقیر قیمت کے عوض بیچتے ہیں ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور اللہ نہ ان سے بات کرے گا نہ ان کی طرف قیامت کے روز دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔''

Marfat.com

نازل ہوئی۔ گویا اس آیت کا شانِ نزول یہی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کو کتاب التفسیر سورہ آل عمران میں بیان کیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ رائے صحیح نہیں۔

قرآن مجید میں اس آیت کا سیاق وسباق دیکھئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اہل کتاب کا وہ کردار بیان ہوا ہے جو وہ مسلمانوں کے مقابلے میں روا رکھے ہوئے تھے لیکن اس کا جواز نہ ان کی شریعت سے ملتا تھا نہ اعلیٰ انسانی اخلاق سے۔ وہ مسلمانوں کو نیچا دکھانے کے لیے بڑی آسانی سے احکام شریعت کو نظر انداز کر دیتے اور جھوٹی قسمیں کھا لیتے۔

اس ضمن میں قرآن نے یہ خبر دی کہ یہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو خریدنی وفروختنی چیز بنائے ہوئے ہیں اور دنیوی مفادات انھیں زیادہ عزیز ہیں تو یہ فلاں فلاں انجام سے دوچار ہوں گے۔ گویا اس آیت کا شانِ نزول یہود کی ریشہ دوانیاں تھیں نہ کہ اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ کا مذکورہ واقعہ اور اس شانِ نزول پر خود سیاق وسباق حجت ہے۔

صحیح مسلم کی ایک اور روایت نے یہ واضح کر دیا ہے کہ زیرِ نظر روایت میں کسی راوی نے تعبیر کو غلط کر دیا ہے۔

شفیق بن مسلمہ رحمہ اللہ سے روایت ہے فرماتے ہیں:

سَمِعْتُ ابْنَ مَسْعُودٍ يَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ مَنْ حَلَفَ عَلٰى مَالِ امْرِءٍ مُّسْلِمٍ بِغَيْرِ حَقِّهٖ لَقِيَ اللّٰهَ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ قَالَ عَبْدُاللّٰهِ ثُمَّ قَرَأَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ مِصْدَاقَهٗ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا إِلٰى آخِرِ الْآيَةِ. (مسلم۔ باب: وعید من اقتطع حتی مسلم بیمین فاجرہ بالنار)

''میں نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو بیان کرتے سنا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جس شخص نے اپنا حق نہ رکھتے ہوئے کسی مسلمان آدمی کے مال پر حلف اٹھالیا تو وہ اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ وہ اس پر غضبناک ہوگا۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے کتاب اللہ میں اس صورت حال کی مصداق آیت 'ان الذین یشترون....' ہمیں پڑھ کر سنائی۔''

اس روایت نے آیت کی شانِ نزول اس واقعہ کو نہیں قرار دیا بلکہ یہ بتایا ہے کہ حضور ﷺ کا یہ فرمان اس آیت کا مصداق ہے۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے استدلال کی خاطر یہ آیت پڑھی۔ دوسرے الفاظ میں حضور ﷺ کا ارشاد اس آیت ہی سے ماخوذ ومستنبط ہے اور یہ بات ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ جھوٹی گواہی کے ذریعے کسی کا حق سلب کر لینا یہودیت کا کردار ہے، لہٰذا جو حشر یہود کا اس آیت میں بتایا گیا وہی حشر ان لوگوں کا بھی ہوگا جو اس کردار کو اپنائیں گے۔

شفیق بن مسلمہ رحمہ اللہ کی اس روایت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ راوی حضرات جب کسی بات کا مصداق کسی آیت کو بتاتے ہیں تو وہ 'فَنَزَلَتْ' سے اس کو تعبیر کر دیتے ہیں حالانکہ آیت کا شانِ نزول کوئی اور ہوتا ہے جو آیت کے سیاق وسباق سے خود واضح ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ امر حدیث فہمی میں ممد ہوگا کہ 'فَنَزَلَتْ' کو ہم مصداق کے مفہوم میں لیں جب تک کہ قرائن وشواہد اس کے حق میں موجود نہ ہوں کہ آیت کا شانِ نزول بعینہٖ وہی واقعہ ہے جو روایت میں مذکور ہوا۔

☆......☆......☆

Marfat.com

ستاروں کی تاثیر کا عقیدہ

عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدِ الْجُهَنِيِّ قَالَ صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ صَلٰوةَ الصُّبْحِ بِالْحُدَيْبِيَةِ فِي إِثْرِ سَمَآءٍ كَانَتْ مِنَ اللَّيْلِ فَلَمَّا انْصَرَفَ أَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ فَقَالَ هَلْ تَدْرُوْنَ مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ قَالَ قَالَ أَصْبَحَ مِنْ عِبَادِي مُؤْمِنٌ بِي وَكَافِرٌ فَأَمَّا مَنْ قَالَ مُطِرْنَا بِفَضْلِ اللّٰهِ وَرَحْمَتِهِ فَذٰلِكَ مُؤْمِنٌ بِي كَافِرٌ بِالْكَوْكَبِ وَأَمَّا مَنْ قَالَ مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا وَكَذَا فَذٰلِكَ كَافِرٌ بِي مُؤْمِنٌ بِالْكَوْكَبِ.

”زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حدیبیہ کے مقام پر رات بارش ہونے کے بعد فجر کی نماز پڑھائی۔ جب آپ ﷺ نے سلام پھیرا تو نمازیوں کی طرف رخ کیا اور پوچھا: جانتے ہو تمھارے رب نے کیا فرمایا ہے؟ لوگوں نے کہا: اللہ اور اللہ کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے فرمایا ہے کہ میرے بعض بندے مجھ پر ایمان لانے والے بنے اور بعض کفر کرنے والے۔ جن لوگوں نے یہ کہا کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہم پر بارش ہوئی وہ تو مجھ پر ایمان لانے والے اور ستاروں کا انکار کرنے والے ہوئے۔ لیکن جن لوگوں نے یہ کہا کہ فلاں ستارے کے طلوع کے باعث بارش ہوئی تو وہ میرا انکار کرنے والے اور ستاروں پر ایمان لانے والے بنے۔“

یہ روایت اصلاً موطا امام مالک رحمہ اللہ کی ہے جسے امام مسلم رحمہ اللہ نے کتاب الایمان باب کفر من قال مطرنا بالنوء میں اور امام بخاری رحمہ اللہ نے باب الاذان، باب الاستسقاء اور باب غزوۃ الحدیبیہ میں بیان کیا ہے۔ اس کے واحد راوی حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ ہیں اور انہی کی روایت مفصل ہے۔ مسلم رحمہ اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ روایت نقل کی ہے جو مضمون میں مشترک ہے لیکن اس میں وہ تفصیل نہیں جو زید بن خالد رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔ لہٰذا زید بن خالد رضی اللہ عنہ ہی کی روایت اس مسئلے میں اصل روایت ہے۔

وضاحت حدیث:

”سماء“ کا لفظ جس طرح آسمان کے لیے آتا ہے اسی طرح یہ بارش کے لیے بھی معروف ہے۔

Marfat.com

"نوء "ناء ینوء سے ہے، جس کے معنی "بمشکل اٹھنا" ہیں۔اس معنی میں یہ لفظ قرآن مجید میں سورۃ القصص میں آیا ہے:

﴿إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوٓأُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ﴾ (القصص : 76)

"قارون کے خزانوں کی کنجیاں ایک طاقت ور جماعت سے بمشکل اٹھتی تھیں۔"

جب ستارہ افق سے اٹھتا اور مطلع پر نمودار ہوتا ہے تو اس کے طلوع کے لیے بھی "نـــوء" کا لفظ آتا ہے۔ یہیں سے یہ لفظ آسمان پر ستاروں کی منزلوں کے لیے استعمال ہونے لگا کیوں کہ ہر منزل کا تعین کسی خاص ستارے کے طلوع ہونے سے کیا جاتا۔ یہ منزلیں ہندی فلکیات میں پچھتروں سے موسوم کی جاتی ہیں۔عربی میں انھیں بروج کہتے ہیں۔

روایت میں جس واقعہ کا بیان ہے معلوم ہوتا ہے یہ صلح حدیبیہ کے ایام میں پیش آیا۔رات بارش ہوئی، صبح لوگ فجر کے لیے جمع ہوئے تو نماز کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان کو اس حقیقت سے آگاہ فرمایا کہ بارش اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہوتی ہے۔جو لوگ اس کو ستاروں اور پچھتروں کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ خدا پر ایمان کے منافی بات کرتے ہیں۔ان کا عمل ستارہ پرستوں کا عمل ہے۔خدا کے باایمان بندے بارش کو اللہ ہی کا فضل سمجھتے ہیں۔وہ ستاروں اور پچھتروں کی تاثیر کے قائل نہیں ہوتے۔

روایت میں یہ بیان نہیں ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے کسی نے بارش کو پچھتروں کی طرف منسوب کیا تو آنحضرت ﷺ نے اس پر تنبیہ فرمائی۔اگرچہ اس طرح کے مواقع پر لوگوں کی زبان پر مشہور عوامی طرز تعبیر کا آجانا بعید نہیں ہوتا لیکن زیادہ قرین قیاس یہ بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو بارش سے متعلق ایک مشرکانہ عقیدہ سے برسر موقع خبردار کیا ہوگا تاکہ ان کی تربیت ہو اور وہ اس طرح کی باتوں کو سہل انگاری سے نہ لیں اور مشرکانہ تعبیروں کو زبان پر نہ لے آئیں۔آپ ﷺ کی عادت یہ تھی کہ صحابہ کی تعلیم و تربیت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے اور دین کے رموز سے برابر انہیں آگاہ فرماتے رہتے۔

ستاروں کی تاثیر کا تصور:

پچھتروں کو کواکب پرستوں اور مشرکین کے ہاں ہمیشہ بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔انھوں نے نہ صرف ان کو زمینی معاملات میں موثر گردانا بلکہ ان کے ساتھ دیوی دیوتاؤں کے تصورات بھی منسلک کر لیے۔ماہرین عمرانیات اس کی توجیہ یوں کرتے ہیں کہ زمانۂ قدیم میں انسان نے یہ دیکھا کہ اس کی زندگی پر اثر انداز ہونے والی بہت سی اشیاء کا تعلق آسمان سے ہے۔سورج روشنی اور حرارت مہیا کرتا ہے، چاند خنک روشنی فراہم کرتا ہے، ستارے رات بھر جگمگ جگمگ کرتے اور ایک خاص رخ پر برابر سفر کرتے ہیں، بادل فضا میں بنتے اور بارش لاتے ہیں، بعض ستارے اس سے آزاد ہیں کہ وہ کسی خاص ہیئت ہی میں ہمیشہ رہیں بلکہ وہ اپنی جگہ برابر بدلتے رہتے ہیں۔اس پر انسان نے یہ

Marfat.com

سوچا کہ ہو نہ ہو عالم بالا میں اصل قوت یہ شمس وقمر اور ثوابت اور سیارے [1] ہیں۔

جب انسان نے آسمان کا مزید مشاہدہ کیا تو اسے ستاروں کی مختلف ہیئتیں نظر آئیں جن کے پس منظر میں کبھی سورج گزرتا کبھی چاند۔ اس نے دیکھا کہ ان ہیئتوں کے ساتھ موسموں کا تغیر وتبدل وابستہ ہے۔ اس نے اپنی معلومات کو منضبط کرنے کے لیے ستاروں کی بارہ ہیئتیں یا منزلیں متعین کیں جن میں سے گزر کر سورج کا ایک چکر مکمل ہوتا۔ اس طرح سال کے بارہ مہینے وجود میں آئے۔ اسی طرح اس نے چاند کی حرکت کو منضبط کرنے کے لیے ستاروں کی اٹھائیس منزلیں مقرر کیں، ستائیس تیرہ دن کی اور ایک چودہ دن کی۔ اس طرح شمسی سال کے پورے دن حساب میں آ گئے۔ یہ منزلیں پچھتر کہلائیں۔

جب موسموں کے تغیر وتبدل، سردی، گرمی، برسات وغیرہ کو اجرام فلکی کی تاثیر مان لیا گیا تو مشرکانہ ذہن نے ان کے ساتھ دیوی دیوتا وابستہ کر لیے اور ان کی پوجا ہونے لگی۔ کوئی ستارہ زرخیزی کا دیوتا ٹھہرا تو کوئی زور وقوت کا۔ کسی کی طرف محبت منسوب کی گئی اور کسی کی طرف دولت۔ اسی بنیاد پر علم نجوم وضع کر لیا گیا جس میں ستاروں اور شمس وقمر کی پوزیشنیں معلوم کر کے یہ قیاس آرائی کی جاتی کہ فلاں گھڑی میں کسی کام پر کس کس ستارے کے اثرات پڑ رہے ہیں اور اس کی تاثیر کیا ہو سکتی ہے۔ اجرام فلکی میں سے بعض کو نحس اور بعض کو سعد قرار دے کر مستقبل کے بارے میں رائے زنی کی جاتی۔ اس زمانے میں اگرچہ انسان کی معلومات میں بے حد اضافہ ہو گیا ہے اور وہ اجرام فلکی کی ماہیت سے واقف ہو چکا ہے لیکن اس قدیم دیومالائی نظام میں اتنی کشش ہے کہ جدید دور کی عقلیت پسندی بھی اس کے اثرات کو محو نہیں کر سکی اور ہمارے اخبارات ورسائل آج بھی اپنے قارئین کو یہ خبر دیتے ہیں کہ 'آپ کے ستارے کیا کہتے ہیں؟' اور 'آپ کا یہ ہفتہ کیسے گزرے گا؟''

زمانہ جاہلیت کے عربوں میں ستاروں کے بارے میں مشرکانہ عقائد پائے جاتے تھے۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ ستارہ شعریٰ (Sirius) جو موسم بہار میں طلوع ہوتا ان کے ہاں خوشحالی کا ستارہ سمجھا جاتا۔ بارش کو بھی وہ بعض ستاروں یا پچھتروں سے منسوب کرتے اور یہ تعبیر اختیار کرتے کہ فلاں پچھتر کی بدولت بارش ہوئی یا فلاں پچھتر دغا دے گیا۔ اسلام نے ان تصورات کو ختم کیا اور یہ تعلیم دی کہ کائنات کا اصل مالک اور حاکم اللہ تعالیٰ ہے۔ ہر چیز اس کے تصرف میں ہے۔ سورج، چاند اور ستارے اس کی اہم نشانیاں ہیں۔ شعریٰ کے طلوع کے زمانے میں اگر خوشحالی آتی ہے تو شعریٰ کا مالک وہی ہے۔ یہ اسی کا بنایا ہوا نظام ہے کہ تمام ثوابت اور سیارے وہ فرائض سرانجام دے رہے ہیں جو خداوند نے ان کو تفویض کر دیے ہیں۔ یہ سب اس کے آگے مسخر ہیں اور اس کے حکم سے سرِ مو انحراف نہیں کر سکتے۔ یہ اپنے مالک کے آگے ہمیشہ سرفگندہ [2] رہتے ہیں۔ ان کی حرکات کو اس نے زمین پر اثرات

---

[1] ثوابت: یہ ثابت (Star یا ستارہ) کی جمع ہے۔ سیار یا سیارہ (Planet) کسی ستارے (Star) کے گرد گردش کرتا ہے۔

[2] سرفگندہ: سر جھکائے ہوئے، مطیع۔

Marfat.com

ڈالنے کا ذریعہ بنایا ہے تو یہ خداوند تعالیٰ کی منصوبہ بندی ہے نہ کہ ان ثوابت اور سیاروں کی تاثیر۔ زیرِ نظر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ میں بارش کے موقع پر یہی تعلیم دی کہ اجرام فلکی کی تاثیر کا عقیدہ اسلام کے منافی ہے، موسموں کے تغیرات کو خدا ہی کی طرف منسوب کرنا چاہیے۔ یہی ایمان باللہ کا تقاضا ہے۔

اسباب ووسائل پر انحصار:

اللہ تعالیٰ نے جس طرح اجرام فلکی کی حرکات اور ستاروں کی ہیئتوں کے ساتھ زمین کی کیفیات میں تغیر کو وابستہ کر دیا ہے اسی طرح وہ تمام دنیا کے کام اسباب کے پردے ہی میں کرتا ہے۔ بارش وہی برساتا ہے لیکن اسباب میں نم آلود ہوائیں اور بادل شامل ہوتے ہیں۔ رزق کے خزانے وہی فراہم کرتا ہے لیکن اس کے ظاہری اسباب میں زمین کی زرخیزی، کسانوں کی محنت اور فصلوں کی حفاظت نظر آتی ہے۔ انسانوں کو وجود میں لانے والا وہی ہے لیکن ماں باپ کو اس نے اولاد کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ بیماری اسی کے حکم سے آتی ہے لیکن اس کے اسباب کے طور پر بعض غذائیں یا جراثیم نمایاں ہوتے ہیں۔ بیماری سے شفا وہی دیتا ہے اگرچہ بظاہر ادویہ اس کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے یہ چاہتا ہے کہ ان کی نظر اسباب ہی میں الجھ کر نہ رہ جائے بلکہ وہ ان اسباب کو پیدا کرنے اور ان کو نتیجہ خیز بنانے والے خداوند تک پہنچیں، نعمت ملنے پر اس کا شکر بجا لائیں، اس کے احسان کے معترف ہوں اور اس کی نعمت کا چرچا کریں۔ قرآن مجید نے ہمیں انسان کی اس کمزوری سے بھی آگاہ کر دیا ہے کہ جب تک وہ حقیقی احتیاج اور فقر وفاقہ سے دوچار نہیں ہوتا اس کی آنکھوں پر پردہ پڑا رہتا ہے اور وہ کبھی اپنی قابلیت اور ذہانت کو اور کبھی اسباب ووسائل کو اپنی کامیابیوں میں اصل موثر قوت قرار دیتا ہے۔ قرآن نے اس کو شرک قرار دیا ہے۔ زیرِ نظر حدیث بھی اسی تعلیم کی حامل ہے۔

یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر بارش کو پچھتروں یا برجوں کے ساتھ منسوب کرنا یا اسباب کو موثر سمجھنا کفر وشرک کی تعریف میں آتا ہے تو ہماری بہت ساری روزمرہ کی گفتگو تو اسی ذیل میں آجائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر پچھتروں، ستاروں یا اسباب کو بذاتہ موثر مان لیا جائے تو اس کی حیثیت ایک عقیدہ کی ہوگی جو یقیناً کفر وشرک ہی کی تعریف میں آتا ہے اور ہر بندۂ مومن کو ایسے عقیدے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ہمارے روزمرہ کے بہت سے امور میں ہم عقیدے کے طور پر نہیں بلکہ ایک مستقل عادت کے طور پر بھی بعض اسباب کا نام لیتے ہیں۔ ہمارا تجربہ یا علمی تحقیق اس بات کی شاہد ہوتی ہے کہ فلاں آثار کے بعد فلاں نتائج رونما ہوتے ہیں۔ مثلاً آگ چیزوں کو جلا دیتی ہے، مون سون ہوائیں ایک خاص موسم میں چلتی اور بارش برساتی ہیں۔ حبس کے بعد بارش ہونے یا تیز ہوا چلنے کا امکان ہوتا ہے۔ اس طور پر اسباب کا نام لینے میں کوئی قباحت نہیں کیوں کہ اس میں عقیدہ کو دخل نہیں ہوتا بلکہ تجربہ یا عادت یا تحقیقات علمی کو دخل ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ بھی اس طرح کے معاملات میں تجربے پر مبنی کوئی بات فرما دیا کرتے تھے۔ مثلاً موطا میں یہ خبر نقل ہوئی کہ:

Marfat.com

عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَقُوْلُ اِذَا اَنْشَاَتْ بَحْرِيَةٌ ثُمَّ تَشَاءَ مَتْ فَتِلْكَ عَيْن عذيقة۔

''مالک رحمہ اللہ کو یہ خبر پہنچی کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ جب سمندر سے ہوا اٹھے اور شام کا رخ اختیار کر لے تب ہوتی ہے دھوم کی بارش۔''

معلوم ہوا کہ یہ بات حضور ﷺ کے مشاہدے اور تجربے پر مبنی تھی کہ سمندر کی طرف سے شام کے رخ پر چلنے والی ہوا بارش برساتی ہے۔ اگر اسباب وعوامل کا ذکر کرنا مطلقاً جائز نہ ہوتا تو آپ ﷺ ہرگز ایسا نہ فرماتے۔

البتہ مشاہدہ وتجربہ پر مبنی باتیں بھی بسا اوقات غلط ثابت ہوتی ہیں۔ قرائن بارش کے حق میں ہوتے ہیں، لیکن عین وقت پر کسی جانب ہوا کا دباؤ کم یا زیادہ ہوجانے سے نم آلود ہوا کا رخ بدل جاتا ہے اور توقع یا پیشین گوئی پوری نہیں ہوتی۔ اس لیے عقیدہ یہی ہونا چاہیے کہ مستقل عادت پر بھی اللہ تعالیٰ کی ذات متصرف ہے۔ اسی کے حکم اور اذن سے دنیا کے تمام امور طے پا رہے ہیں اور زبان سے بھی وہی بات ادا کرنی چاہیے جو صحیح عقیدے پر مبنی ہے۔

فکر فراہی

قرآن فہمی اور قرآن مجید کی تفسیر کے موضوعات پر بیسویں صدی عیسوی میں جو کام ہوا ہے اس میں امام حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کا کام سرفہرست رکھنے کے لائق ہے، انھوں نے قرآن مجید کو اپنے غور وفکر کا محور بنایا، اس سے متعلق علوم سیکھنے پر غیر معمولی محنت صرف کی۔ تفسیر قرآن کی چودہ صدیوں کی خدمات کا جائزہ لے کر تفسیر کی مشکلات کو سمجھا۔ ان دانشوروں کے طریقۂ کار کا مطالعہ کیا جو قرآن کو اپنے افکار کے تابع بنا کر پیش کرتے ہیں اور ان کے فکر کی غلط بنیادوں سے آگاہ ہوئے، قرآن پر معاصر مستشرقین کے حملوں کو دیکھ کر غور کیا کہ امت کیوں ان کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ مسلمانوں میں فرقہ بندی اور انتشار فکری کے اسباب کی تحقیق کی تو ان کی تہہ میں انھیں قرآن مجید سے بے اعتنائی اور اس کے مطالعہ کے اصولوں سے ناواقفیت کا سراغ ملا۔

(پیشِ لفظ، تفسیر قرآن کے اصول، امام حمید الدین فراہی رحمہ اللہ (ترتیب وجمع: علامہ خالد مسعود)، نومبر 1999ء)

Marfat.com

مماثل کردار کی یکساں سزا

عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ وَهٰذَا حَدِیثُ أَبِی بَکْرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ ثَلَاثٌ لَا یُکَلِّمُهُمُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَلَا یَنْظُرُ إِلَیْهِمْ وَلَا یُزَکِّیْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِیمٌ رَجُلٌ عَلٰی فَضْلِ مَاءٍ بِالْفَلَاةِ یَمْنَعُهُ مِنِ ابْنِ السَّبِیلِ وَرَجُلٌ بَایَعَ رَجُلًا بِسِلْعَةٍ بَعْدَ الْعَصْرِ فَحَلَفَ لَهُ بِاللّٰهِ لَأَخَذَهَا بِکَذَا وَکَذَا فَصَدَّقَهُ وَهُوَ عَلٰی غَیْرِ ذٰلِکَ وَرَجُلٌ بَایَعَ إِمَامًا لَا یُبَایِعُهُ إِلَّا لِدُنْیَا فَإِنْ أَعْطَاهُ مِنْهَا وَفٰی وَإِنْ لَمْ یُعْطِهِ مِنْهَا لَمْ یَفِ . (صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب: بیان الثلاثة الذین لایکلمهم الله)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین شخص ایسے ہیں جن سے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ نہ کلام کرے گا، نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ ایک وہ شخص جو بیابان میں ہو اور اس کے پاس اپنی ضرورت سے زائد پانی ہو اور وہ اسے مسافر سے روکے۔ دوسرا وہ شخص جو عصر کے بعد کسی دوسرے آدمی کے ساتھ سامان کا سودا کرے تو اس کے سامنے اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ اس نے یہ سامان اتنے میں لیا تھا اور آدمی اس کو سچا جان لے، حالاں کہ حقیقت میں ایسا نہ ہو۔ تیسرا وہ شخص جو امام کی بیعت کرے لیکن یہ بیعت صرف دنیاوی اغراض کے لیے ہو۔ اگر امام ان کو پورا کردے تو یہ شخص بیعت کو نبھائے اور اگر وہ اسے کچھ نہ دے سکے تو بیعت کا حق ادا نہ کرے۔''

روایت کے دوسرے طُرق:

صحیح مسلم میں یہ روایت اعمش، ابوصالح، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے واسطے سے آئی ہے۔ اسی واسطے سے امام بخاری رحمہ اللہ نے اسے کتاب الاحکام اور کتاب الشہادات میں لیا ہے۔ ان کی روایت میں بـالـفلاة (بیابان) کی جگہ بالطریق (راستے میں) کے الفاظ آئے ہیں۔ اعطاہ منها (اس میں سے اسے دے) کی جگہ اعطاہ ما یرید (جو کچھ وہ چاہتا ہو اسے دے) کے الفاظ ہیں اور اشخاص کے بیان کی ترتیب بدلی ہوئی ہے۔ بنیادی طور پر روایت ایک ہی ہے۔ البتہ امام بخاری رحمہ اللہ نے یہی روایت سفیان، عمرو، ابوصالح اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے واسطے سے یوں بیان کی ہے:

❀عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلَاثَةٌ لَا یُکَلِّمُهُمُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَلَا یَنْظُرُ إِلَیْهِمْ رَجُلٌ حَلَفَ عَلٰی سِلْعَةٍ لَقَدْ أَعْطٰی بِهَا

Marfat.com

أَكْثَرَ مِمَّا أَعْطَى وَهُوَ كَاذِبٌ وَرَجُلٌ حَلَفَ عَلَى يَمِينٍ كَاذِبَةٍ بَعْدَ الْعَصْرِ لِيَقْتَطِعَ بِهَا مَالَ رَجُلٍ مُسْلِمٍ وَرَجُلٌ مَنَعَ فَضْلَ مَاءٍ فَيَقُولُ اللّٰهُ الْيَوْمَ أَمْنَعُكَ فَضْلِي كَمَا مَنَعْتَ فَضْلَ مَا لَمْ تَعْمَلْ يَدَاكَ .

(صحیح بخاری، کتاب التوحید)

''نبی ﷺ نے فرمایا: تین شخص ایسے ہیں جن سے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ نہ کلام کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا۔ ایک وہ شخص جس نے مال تجارت پر قسم کھائی کہ اس نے قیمت خرید اس سے زیادہ دی تھی جو گاہک اسے دینا چاہتا ہے حالاں کہ وہ اس بیان میں جھوٹا تھا۔ دوسرا وہ شخص جس نے عصر کے بعد کسی مسلمان کا مال ہتھیانے کے لیے جھوٹی قسم کھالی۔ تیسرا وہ شخص جس نے اپنی ضرورت سے زائد پانی روک لیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس سے کہے گا کہ آج میں اپنا فضل تم سے اسی طرح روکتا ہوں جس طرح تم نے ایک ایسی فاضل چیز روکی تھی جو تمھاری بنائی ہوئی نہ تھی۔''

یہ روایت اوپر والی روایت سے کئی اعتبارات سے مختلف ہوگئی ہے۔ اس میں پہلے دونوں شخص جھوٹے حلف ہی کے مجرم بتائے گئے ہیں جبکہ زیر بحث روایت میں صرف ایک شخص جھوٹے حلف کا مجرم ہے جبکہ دوسرا امام کی بیعت میں غداری کا مجرم بتایا گیا ہے۔ تیسرے شخص کے بارے میں یہ وضاحت اس میں نہیں کہ اس نے پانی کس سے اور کن حالات میں روکا۔ ہمارے نزدیک یہ روایت نا تمام ہے۔ اس میں وہ تفصیلات نظر انداز ہوگئی ہیں جو روایت کو سمجھنے کے لیے ضروری تھیں۔ دوسرے شخص کے بیان میں بھی کسی راوی سے تسامح ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اعمش، ابووائل اور عبداللہ رضی اللہ عنہ کی سند والی اس روایت کے الفاظ اس میں ڈال دیے ہیں جو امام مسلم رحمہ اللہ نے الگ روایت کی حیثیت سے کتاب الایمان باب وعید من اقتطع حق مسلم بیمین فاجرة بالنار اور امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب التوحید میں بیان کی ہے۔ الفاظ کی یکسانی سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے۔

وضاحت حدیث:

''اللہ تعالیٰ ان سے نہ کلام کرے گا، نہ ان کی طرف دیکھے گا۔'' ان تین اشخاص سے اللہ تعالیٰ کی نفرت اور بیزاری کی تعبیر کے لیے ہے۔ کسی کو مخاطب کرنا اور اس کی طرف توجہ کرنا محبت، عنایت اور مہربانی کے لیے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے بڑا رؤف و رحیم ہے لیکن ان تین اشخاص کو اس کی رافت و رحمت میں سے کوئی حصہ نہ ملے گا جس کا سبب ان کا وہ کردار ہے جو آگے بیان ہوا۔ ''نہ وہ ان کو پاک کرے گا'' کا مفہوم یہ ہے کہ اس دن اس بات کا کوئی امکان نہ ہوگا کہ یہ لوگ اپنی اس اخلاقی کثافت کو دور کر لیں جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث بنی۔ اخلاق و کردار کو سنوارنے کا مقام یہ دنیا ہے۔ جو شخص یہاں اپنی اصلاح پر قادر نہ ہو سکا، قیامت کے روز اس کو یہ موقع نہیں دیا جائے گا کہ وہ اپنی اصلاح کر کے خدا کو راضی کر لے۔ قرآن مجید میں یہ حقیقت بیان ہوئی ہے کہ مجرمین قیامت کے روز یہ درخواست کریں گے کہ اللہ تعالیٰ اگر ان کو ایک مرتبہ دنیا میں واپس جانے دے تو وہ اپنے

Marfat.com

گناہوں کی تلافی کر لیں گے لیکن ان کو بتایا جائے گا کہ وہ اپنی مہلت حیات وعمل ختم کر چکے، اپنی کھیتی میں جو کچھ بونا تھا بو چکے، قیامت کا دن صرف اعمال کی فصل اٹھانے اور اپنے کیے کا مزا چکھنے کے لیے ہے۔ چنانچہ یہ مجرمین دردناک عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے۔

ان بد نصیب لوگوں میں پہلا شخص وہ ہوگا جس کے پاس بیابان میں اپنی ضرورت سے زائد پانی تھا لیکن کسی حاجت مند مسافر سے اس نے اسے روک لیا۔ بیابان میں بسا اوقات میلوں تک پانی میسر نہیں ہوتا۔ اگر اس کا کہیں ذخیرہ ہو بھی تو ہر مسافر یہ نہیں جانتا کہ وہ اسے کہاں سے پا سکتا ہے۔ بعض مسافر پانی کی جستجو میں سراب کے پیچھے چلتے ہوئے اپنی راہ کھو بیٹھتے ہیں اور پیاس سے ان کی جان پر بن جاتی ہے۔ اس حالت میں کوئی مسافر پانی کی تلاش میں ناکام اور پیاس سے ہلکان ہو کر اگر ایسے شخص کے پاس پہنچ جاتا ہے جس کے پاس اپنی ضرورت سے وافر پانی موجود ہے تو خداوند تعالیٰ کی نعمت کے شکر اور انسانی ہمدردی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس مسافر کو پانی مہیا کرے۔ اگر وہ اس کی پیاس بجھانے سے انکار کر دیتا ہے تو یہ انتہائی خست، کنجوسی، خود غرضی اور سنگ دلی کی دلیل ہے۔ ایسا شخص اس بات کا مستحق نہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس پر ترس کھائے۔

خدا کے غضب کا مستحق دوسرا شخص وہ ہوگا جس نے عصر کے بعد سودا بیچتے ہوئے اپنے گاہک کے سامنے جھوٹی قسم کھائی کہ مال کی قیمت خرید اس قیمت سے زیادہ ہے جتنی وہ گاہک دینے کو تیار ہے لہٰذا وہ اس کو معقول منافع دے کر چیز خریدے۔ عصر کے بعد کا وقت بتانے میں یہ حقیقت مضمر ہے کہ یہ وقت بازار بند ہونے اور دکانیں بڑھانے کا تھا۔ گاہک اس پوزیشن میں نہ تھا کہ وہ بازار میں گھوم پھر کر صحیح نرخ کی تحقیق کر سکتا۔ دکاندار کا قسم کھانا اس بات پر دلیل ہے کہ گاہک کو اس کی بیان کردہ قیمت زیادہ معلوم ہوئی اور وہ اس پر سودا کرنے کے لیے تیار نہ تھا لیکن دکاندار نے جھوٹی قسم کھا کر اس کو آمادہ کر لیا کہ وہ مطلوبہ چیز خرید لے۔ اللہ تعالیٰ کا مقدس نام بیچ میں آجانے پر گاہک کو اطمینان ہو گیا اور اس نے منہ مانگی قیمت ادا کر دی۔

ہر دکان دار کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے سرمایے پر زیادہ سے زیادہ منافع کمائے اور ہر گاہک چاہتا ہے کہ وہ اپنی ضرورت کم سے کم قیمت پر پوری کرے۔ عام حالات میں مارکیٹ میں مقابلہ ہوتا ہے اور گاہک گھوم پھر کر موزوں قیمت کا اندازہ کر کے جائز منافع دے کر ہی چیز خریدتا ہے۔ روایت میں بیان کردہ صورت حال میں مارکیٹ کے ان فطری عوامل کو بروئے کار نہیں آنے دیا گیا اور اس عمل کو روکنے کے لیے دکاندار نے خدا کے نام پر قسم کو بطور حربہ استعمال کیا۔ اللہ عالم الغیب والشہادہ ہے۔ وہ خود حق ہے اور باطل کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ وہ اس لالچی اور جھوٹے دکاندار کی اس حرکت سے قیامت کے روز اپنی بیزاری کا اظہار فرمائے گا۔

خدا کے غضب کا مستحق تیسرا شخص وہ ہوگا جس نے دنیا کی خاطر امام سے بیعت لی۔ اگر یہ مقاصد پورے ہو گئے تو بیعت کے تقاضوں کو نبھاہا لیکن اگر امام کے ہاتھوں دنیا کا مفاد حاصل نہ ہوا تو بیعت کی ذمہ داریوں سے دست کش ہو گیا۔

Marfat.com

مسلمانوں کی ریاست کا امیر ان کا امام ہوتا ہے۔ سربراہ مملکت کی حیثیت سے جب اس کا تقرر ہوتا ہے تو وہ ریاست کے باشندوں سے اس بات کا عہد لیتا ہے کہ وہ اس کے ان احکام کو جو شریعت سے متصادم نہ ہوں گے دل وجان سے سنیں گے اور ان کی اطاعت کریں گے۔ اس عہد کا نام بیعت ہے جو شرعاً ہر مسلمان پر واجب ہے۔ یہ بیعت ریاست کی بقا، اس کے امن وامان اور ترقی ورفاہیت ❶ کے لیے ضروری ہے۔ نبی ﷺ کا حکم ہے کہ ہر مسلمان اپنی پوری طاقت کے مطابق اس کا حق ادا کرے۔ یہ بیعت کوئی مسلمان اپنی شرائط پر کرنے کا مجاز نہیں۔ امیر کے احکام پسند ہوں یا ناپسند، ان کی اطاعت ضروری ہوگی الا یہ کہ امیر خدا کی نافرمانی کا کوئی حکم دے۔ صحاح کی روایت ہے نبی ﷺ نے فرمایا:

عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ فِيمَا اَحَبَّ وَكَرِهَ اِلَّا اَنْ يُؤْمَرَ بِمَعْصِيَةٍ فَاِنْ اُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ. (صحیح مسلم۔ کتاب: الامارۃ۔ باب وجوب طاعته الامراء)

''ہر مسلمان پر سمع وطاعت واجب ہے ہر معاملے میں جو اس کو پسند ہو یا ناپسند، الا یہ کہ اسے خدا کی نافرمانی کا حکم دیا جائے۔ اگر نافرمانی کا حکم دیا جائے تو نہ سننا ضروری ہے نہ ماننا۔''

اسی مضمون کو حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ یوں بیان کرتے ہیں:

بَايَعْنَا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ وَعَلَى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا. (صحیح مسلم۔ کتاب: الامارۃ۔ باب: وجوب طاعة الامراء)

''ہم نے رسول اللہ ﷺ سے سمع وطاعت پر بیعت کی، تنگی وآسودگی، خوشی وبیزاری تمام حالتوں میں اور ہم پر دوسروں کو ترجیح دینے کی صورت میں بھی۔''

ایک ایسی شرعی ذمہ داری پر امت مسلمہ کی فلاح و بہبود کا انحصار ہے، اپنے دنیوی مفادات پر اس طرح قربان کر دینا کہ امیر کی اطاعت صرف اس وقت تک کی جائے جب تک اس سے مفادات وابستہ ہوں اور اگر یہ تمنا پوری نہ ہو سکے تو اس کی اطاعت کے عہد سے دست کش ہو جائے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ آدمی کو اپنی ملت اور اس کی اجتماعی بہبود سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ اپنا تشخص ملت کے حوالے سے قائم کرنے کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ وہ کسی بھی وقت اس سیاسی بنیاد ہی کو ڈھا سکتا ہے جس پر اسلامی ریاست کی تعمیر ہوتی ہے۔ ایسا مارِ آستیں ❷ کسی بھی وقت ملت کے دشمنوں کے ہاتھوں میں بک سکتا ہے۔ جو شخص ملت کے مفاد سے اس قدر بے نیاز ہو اور اپنی دنیا کے پیچھے اندھا ہو رہا ہو وہ یہودی یا نصرانی ہو جائے تو بھی کوئی فرق نہ پڑے گا، اور اگر اس کا انجام انہی کے ساتھ ہو تو یہ اس پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔

---

❶ رفاہیت: رفاہ (بہبود/Welfare) کا باعث ہونا، بہبودی۔

❷ مارِ آستیں: آستین کا سانپ، چھپا دشمن۔

Marfat.com

صورت واقعہ کی تفصیلات کی حیثیت:

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حدیث کا مصداق وہی تین اشخاص ہوں گے جن کے احوال کی تفصیل الفاظ حدیث میں کر دی گئی ہے یا اس کا اطلاق انھی جیسے اور اشخاص پر بھی ہوگا؟ ہمارے نزدیک ان تفصیلات کی حیثیت ایسی شرائط کی نہیں جن کا پورا ہونا بیان کردہ انجام سے دوچار ہونے کے لیے لازمی ہو بلکہ یہ تفصیلات صورت واقعہ کی تعبیر اور ان اشخاص کے کردار کے گھناؤنے پن کو واضح کرنے کے لیے بیان ہوئی ہیں۔ یہ اسلوب بیان قرآن مجید نے متعدد مواقع پر اختیار کیا ہے لیکن آیات کا حکم صورت واقعہ کی تفصیلات سے مجرد ہو کر نکلتا ہے۔ لہٰذا ہمارے نزدیک ہر وہ شخص اس حدیث کا مصداق ہوگا جس کے اندر وہ کردار پایا جائے گا جو ان تین اشخاص کا تھا۔ مثلاً پانی مہیا نہ کرنے کے معاملے ہی میں نہیں بلکہ قحط سالی اور ضروریات زندگی کی کمیابی کے زمانے میں ذخیرہ اندوزی اور خلق خدا کی پریشانیوں میں اضافہ کرنے والا شخص بھی خدا کے غضب کا سامنا کرے گا۔ ہر وہ شخص جو دنیا کے چند ٹکوں کی خاطر دوسروں کا مال ہتھیانے کے لیے خدا کو حاضر و ناظر کر کے جھوٹ بول دے گا یا جھوٹی اشتہار بازی کو اپنی مصنوعات کی فروخت کا ذریعہ بنائے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس سے بھی بیزاری فرمائے گا اور جو شخص بھی ملت کے اجتماعی مفادات کو اپنی ذاتی اغراض کی بھینٹ چڑھا دے گا اس کا انجام بھی اس حدیث کے مطابق ہوگا۔

حدیث کا قرآن مجید سے استنباط:

روایت میں تین مجرموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نفرت اور اظہار بیزاری کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے وہ قرآن مجید کی سورہ بقرہ آیت 74 اور سورہ آل عمران آیت 77 سے لیے گئے ہیں۔ ان دونوں مواقع پر یہ یہود کا انجام بیان کرنے کے لیے وارد ہوئے ہیں۔ لہٰذا یہ نتیجہ اخذ کرنا بالکل درست ہوگا کہ نبی ﷺ نے ان تین اشخاص کو یہود کے کردار کا حامل قرار دیا ہے۔ حب دنیا، بخل اور سنگ دلی ہمیشہ سے یہود کے کردار کا خاصہ رہی ہیں۔ دنیا کی خاطر انھوں نے کتمان حق [1] سے کام لیا، خدا اور بندوں کے ساتھ کیے گئے معاہدوں کو حقیر دنیوی متاع پر قربان کر دیا۔ اپنے جھوٹ پر پردہ ڈالنے کے لیے خدا کا مقدس نام استعمال کرنا ان کے ہاں معمولی بات تھی۔ ان کا بخل اور سنگ دلی تو ضرب المثل ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی رقم کے بدلے اپنے قرض دار کا گوشت کاٹنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ روایت میں بیان کردہ تین آدمیوں کے کردار میں یہود کے کردار کی نمایاں جھلک نظر آ رہی ہے، اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ کردار کی پوری پوری مطابقت کے بعد ان کا انجام یہود کے انجام سے مختلف ہو۔

یہود کی دوسری صفات کے حامل اشخاص کا انجام:

آخرت کا مذکورہ انجام اگر کردار کی خصوصیات پر مبنی ہے تو یہود کے کردار میں تو کئی دوسری باتیں بھی نمایاں ہیں، پھر کیا ان کی مماثلت کے باعث بھی لوگ یہود کے انجام سے دوچار ہوں گے؟ اس سوال کا جواب اثبات میں ہے۔

[1] کتمانِ حق: حق کو چھپانا۔

Marfat.com

امام مسلم رحمہ اللہ نے باب بیان الثلاثہ...... ہی میں دو روایات نقل کی ہیں۔ ان میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت میں جن تین شخصوں کو خدا کے غضب کا مستحق بتایا گیا ہے وہ ہیں: المسبل، المنان، المنفق سلعته بالحلف الکاذب۔

مسبل سے مراد وہ شخص ہے جو تفاخر کے لیے اپنا لباس اپنے قد وقامت سے بڑا رکھتا ہے اور اس کو زمین پر گھسیٹتا ہوا چلتا ہے تاکہ لوگوں کے دلوں پر اس کی امارت اور بڑائی کی دھاک بیٹھ جائے۔ ایام جاہلیت میں یہ 'شہدوں' کا لباس ہوا کرتا تھا اور ہمارے ہاں بعض لوگ اپنی چودھراہٹ کا اظہار اسی طریقہ سے کرتے ہیں۔ یہ لباس' پہننے والے کے باطن کی غمازی کرتا ہے کہ وہ متکبر اور دوسروں کو حقیر سمجھنے والا ہے۔

منان وہ شخص ہوتا ہے جو کسی کو دے دلا کر یا اس کے ساتھ کوئی نیکی کر کے برابر اسے اپنا احسان جتاتا رہتا ہے۔ اس طرز عمل کے پیچھے اپنے لیے احساس برتری اور دوسروں کے لیے حقارت اور توہین کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ یہ دونوں جذبے لئیم ❶، کم ظرف اور ناشکرے لوگوں میں ہوتے ہیں۔

تیسرا شخص اپنے مال تجارت کی فروخت کے لیے جھوٹی قسم کو ذریعہ بنانے والا ہے۔ اس کردار پر اوپر بحث ہوچکی ہے۔ اس روایت کے لحاظ سے متکبر، ناشکرے اور جھوٹی قسمیں کھانے والے طالب دنیا خدا کے غضب کا نشانہ بنیں گے۔ قرآن مجید کے مطابق کردار کے یہ پہلو بھی یہود کے اندر بہت نمایاں تھے۔

دوسری روایت میں جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، زانی بڈھے، جھوٹے بادشاہ اور متکبر حاجت پسند کو بھی خدا کی نفرت کا مستحق بتایا گیا ہے۔ زانی بڈھے سے مراد وہ شخص ہے جس کی گھٹی میں زناکاری اس طرح پڑ گئی ہو کہ بڑھاپے میں بھی جب قویٰ مضمحل ہوجاتے ہیں وہ اس فعل شنیع ❷ سے باز نہ آئے۔ جھوٹے بادشاہ سے مراد وہ حکمران ہے جھوٹ بولنا جس کی عادت ثانیہ بن گئی تھی حتیٰ کہ اقتدار پا کر جب وہ ہر معاملے میں خودمختار تھا اور اسے اس بات کی قطعاً ضرورت نہ تھی کہ وہ جھوٹ کا سہارا لے، وہ اپنی اس عادت سے نجات حاصل نہ کرسکا۔ متکبر حاجت مند سے مراد اکڑفوں رکھنے والا ایک ایسا آدمی ہے جس کے حالات کی دگرگونی نے اسے اس صورت حال میں لا ڈالا کہ وہ دوسروں سے مدد لینے پر مجبور ہوگیا لیکن پھر بھی اس کی اکڑفوں ختم نہ ہوئی، وہ اپنے لیے برتری کا احساس رکھتا رہا۔

غور کیجیے تو ان تینوں اشخاص میں یہ بات مشترک نظر آتی ہے کہ ان کی بدطینتی ان پر اس طرح مسلط ہوگئی کہ اس نے ان کا پیچھا اس وقت بھی نہ چھوڑا جب ان کے اندر اس کا داعیہ کمزور یا بالکل ختم ہوچکا تھا۔ یہ وہ کیفیت ہے جس کے حامل لوگوں کے متعلق قرآن مجید نے اپنا فیصلہ یوں سنایا ہے:

﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۝﴾

(البقرة: 81)

❶ لئیم: وہ کنجوس جو آپ کھائے نہ دوسروں کو دے۔
❷ فعل شنیع: گھناؤنا کام۔

Marfat.com

''ہاں، جس نے کوئی بدی کمائی اور اس کے گناہ نے اس کو اپنے گھیرے میں لے لیا تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

اس آیت کا سیاق وسباق بتاتا ہے کہ یہ یہود کے اس دعوے کی تردید کے لیے آئی کہ دوزخ کی آگ اول تو ان کو چھوئے گی نہیں اور اگر کچھ سزا دینا ضروری ہی سمجھا گیا تو چند روز کی سزا کے بعد ان کو جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ اس آیت میں فرمایا کہ جو شخص کسی گناہ کا عادی ہو جائے اور وہ گناہ اس کی زندگی کا احاطہ کر لے تو اس کے لیے اللہ کے ہاں دائمی عذاب ہوگا۔ یہود کے جرائم ایسے ہیں کہ انھوں نے ان کی زندگی کا احاطہ کر لیا ہے اس لیے وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوں، دائمی عذاب ان کا مقدر بن چکا ہے۔ گویا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں بیان کردہ تین اشخاص بھی یہود کے کردار کے اس خاص پہلو کے ساتھ مماثلت کی وجہ سے انہی کے انجام سے دوچار ہوں گے۔

خلاصۂ بحث:

اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ روایت زیر بحث کے الفاظ کے مطابق صرف تین مخصوص اشخاص ہی نہیں بلکہ ان کے مماثل کردار رکھنے والے دوسرے اشخاص بھی حدیث کا مصداق ہوں گے اور قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان سے بیزاری ظاہر فرمائے گا۔ نیز آخرت میں معاملہ ناموں، شکلوں اور وابستگیوں کی بنا پر نہیں بلکہ طرز عمل اور اخلاق وکردار کی بنیاد پر ہونے والا ہے۔ ایک آدمی اس گروہ کا فرد قرار پائے گا جن کے کردار کا وہ حامل ہوگا، لہٰذا جو لوگ اپنے کردار میں یہود کے پیروکار ہیں، ان کے ساتھ وہاں وہی معاملہ ہوگا جو یہود کے لیے مقدر ہے۔

یہ وہی حقیقت ہے جس کو قرآن مجید نے سورہ تکویر میں بیان فرمایا ہے:

﴿وَاِذَا النُّفُوۡسُ زُوِّجَتۡ۝﴾ (التکویر: 7)

''اور جب نفوس کی جوڑیاں ملائی جائیں گی۔''

یعنی لوگوں کی درجہ بندی اس دن ان کے ایمان، اخلاق اور کردار کی بنیاد پر ہوگی اور وہ ایک جیسے انجام سے دوچار ہوں گے۔

Marfat.com

سبعۃ اَحرف کی روایت

عَنِ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ حَدَّثَنِی عُرْوَةُ بْنُ الزُّبَيْرِ أَنَّ الْمِسْوَرَ بْنَ مَخْرَمَةَ وَعَبْدَالرَّحْمٰنِ بْنَ عَبْدِالْقَارِیِّ حَدَّثَاهُ أَنَّهُمَا سَمِعَا عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ يَقُولُ سَمِعْتُ هِشَامَ بْنَ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ يَقْرَأُ سُورَةَ الْفُرْقَانِ فِی حَيَاةِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاسْتَمَعْتُ لِقِرَائَتِهِ فَإِذَا هُوَ يَقْرَأُ عَلَى حُرُوفٍ كَثِيرَةٍ لَمْ يُقْرِئْنِيهَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكِدْتُ أُسَاوِرُهُ فِی الصَّلَاةِ فَتَصَبَّرْتُ حَتَّى سَلَّمَ فَلَبَّبْتُهُ بِرِدَائِهِ فَقُلْتُ مَنْ أَقْرَأَكَ هَذِهِ السُّورَةَ الَّتِی سَمِعْتُكَ تَقْرَأُ قَالَ أَقْرَأَنِيهَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ كَذَبْتَ فَإِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ أَقْرَأَنِيهَا عَلَى غَيْرِ مَا قَرَأْتَ فَانْطَلَقْتُ بِهِ أَقُودُهُ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ إِنِّی سَمِعْتُ هَذَا يَقْرَأُ بِسُورَةِ الْفُرْقَانِ عَلَى حُرُوفٍ لَمْ تُقْرِئْنِيهَا فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَرْسِلْهُ اقْرَأْ يَا هِشَامُ فَقَرَأَ عَلَيْهِ الْقِرَائَةَ الَّتِی سَمِعْتُهُ يَقْرَأُ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَذَلِكَ أُنْزِلَتْ ثُمَّ قَالَ اقْرَأْ يَا عُمَرُ فَقَرَأْتُ الْقِرَائَةَ الَّتِی أَقْرَأَنِی فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَذَلِكَ أُنْزِلَتْ إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ أُنْزِلَ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ فَاقْرَئُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۔ (صحیح بخاری، کتاب : فضائل القرآن، باب : انزال القرآن علی سبعة احرف)

''ابن شہاب سے روایت ہے کہ عروہ بن الزبیر نے مجھے بتایا کہ مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ اور عبدالرحمٰن بن عبدالقاری نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے سنا، وہ بیان کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں، میں نے ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہ کو سورۃ الفرقان پڑھتے سنا۔ میں نے ان کی قراءت پر کان لگایا تو معلوم ہوا کہ وہ متعدد ایسی طرزوں سے پڑھ رہے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نہیں پڑھائی تھیں۔ میں نماز ہی میں ان پر جھپٹنا چاہتا تھا لیکن میں نے بمشکل ضبط کیا یہاں تک کہ انھوں نے سلام پھیرا۔ میں نے انہی کی چادر ان کے گلے میں ڈالی اور پوچھا کہ یہ سورت جو میں نے تجھے پڑھتے سنی، تمھیں کس نے پڑھائی ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ یہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی تھی۔ میں نے کہا: تم جھوٹ بولتے ہو، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ اس طرز سے مختلف انداز سے پڑھائی جس طرز سے تم نے پڑھی ہے۔ پھر میں ان کو کھینچتا ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

Marfat.com

خدمت میں لے گیا اور عرض کی: اس شخص کو میں نے سورۃ الفرقان ایسی طرزوں سے پڑھتے سنا جو آپ ﷺ نے مجھے نہیں پڑھائی تھیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس شخص کو کھول دو۔ ہشام! تم سناؤ۔ ہشام نے اسی طرح پڑھا جس طرح میں نے ان کو پڑھتے سنا تھا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ سورت اسی طرح نازل ہوئی۔ پھر فرمایا: عمر! تم سناؤ۔ میں نے آپ ﷺ کو اس طرح پڑھ کر سنایا جیسا آپ ﷺ نے مجھے پڑھایا تھا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ سورت اسی طرح نازل ہوئی۔ یہ قرآن سات حرفوں پر نازل کیا گیا ہے۔ اس میں جتنا میسر ہو سکے پڑھ لیا کرو۔''

مشکل الفاظ:

"اساورہ" میں اچھل کر اس پر جا پڑوں، میں اس پر حملہ کروں۔

"تصبرت" بمشکل صبر کیا۔ بمشکل اپنے کو روکے رکھا۔

"لببت" میں نے گلے میں رسی یا کپڑا ڈالا۔ میں نے گریبان سے پکڑا۔ یہاں چادر کے قرینے سے کپڑا گردن میں ڈال کر پکڑنے کے ہیں۔

"حروف و احرف" :حرف کی جمع۔ لغت میں حرف کے اصل معنی کسی چیز کے کنارے، سرے، حاشیے، منڈیر اور دھار کے ہیں۔ قرآن میں یہ اسم صرف ایک جگہ استعمال ہوا ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ﴾ (الحج: 11)

''اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو خدا کی بندگی ایک کنارے پر کھڑے ہوئے کرتے ہیں۔''

مجازاً اس کا اطلاق پہلو، حالت اور طرز پر ہوتا ہے۔ اس روایت میں یہ بظاہر اسی آخری معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے حقیقی معنی کا تعین، جیسا کہ آگے کے مباحث سے اندازہ ہوگا، نہایت مشکل ہے۔ حروف تہجی یا اسم و فعل کے بالمقابل حرف کے اصطلاحی معانی میں استعمال کا اس روایت میں کوئی موقع نہیں۔

اسناد:

یہ روایت اسی سند کے ساتھ صحیح بخاری کی کتاب التوحید: باب: قول اللہ تعالیٰ فاقرء واما تیسر من القرآن ،کتاب: فضائل القرآن۔ باب: من لم یر بأسا أن یقول سورۃ البقرۃ اور کتاب: استتابۃ المرتدین۔ باب: ماجاء فی المتاولین میں اور صحیح مسلم کی کتاب صلوٰۃ المسافرین۔ باب: بیان القرآن علی سبعۃ احرف میں آئی ہے۔ ترمذی میں بھی اس کی سند یہی ہے۔ دوسری کتب حدیث جو عام طور پر کمزور سند کے ساتھ روایت کے مویدات جمع کر دیتی ہیں، وہ بھی کسی دوسرے واسطے سے روایت کو تقویت نہیں پہنچاتیں۔ حیرت کا مقام یہ ہے کہ مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ صحابی اور عبدالرحمٰن بن عبدالقاری رحمہ اللہ تابعی روایت کرنے والے ہیں لیکن ان کے شاگردوں میں سے بس حضرت عروہ بن الزبیر ہی کو یہ شرف حاصل ہوتا ہے کہ وہ روایت میں بیان کردہ واقعہ کو

Marfat.com

آگے منتقل کریں لیکن ان کی احتیاط کا یہ عالم ہے کہ وہ صرف ابن شہاب ہی کو اپنا محرم راز بناتے ہیں اور کسی دوسرے کے کانوں میں اس کی بھنک نہیں پڑنے دیتے۔ البتہ ابن شہاب کے تمام معتمد علیہ شاگرد عقیل، شعیب، یونس، مالک، معمر اس روایت کو عام کرنے کا باعث بنے ہیں اور ان کے ذریعے یہ روایت تمام اہم کتب حدیث میں جگہ پا کر معتبر قرار پا چکی ہے۔ تاہم یہ خبر عن واحد ہے۔ اس کا مضمون بعض قابل اعتراض پہلوؤں کا حامل ہے جن سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی مذمت مقصود ہے اور واحد راویوں حضرت عروہ اور ابن شہاب میں سے موخر الذکر راوی معمولاً حضرات شیخین رضی اللہ عنہم اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو مطعون کرنے کے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ ان کے شیعی مسلک کا تقاضا ہے اور اس کی متعدد مثالیں معتبر کتب حدیث میں موجود ہیں۔ اس لیے ہمارے نزدیک اس روایت کی ساخت و پرداخت کے ذمہ دار ابن شہاب رحمہ اللہ ہیں اور ان کے شاگردوں نے بھی اپنی اپنی ذہنی اپج کے مطابق اس میں تصرفات کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مالک رحمہ اللہ کی روایت جو امام مسلم رحمہ اللہ نے لی ہے، بعض ان تفصیلات سے خالی ہے جو زیر نظر روایت میں موجود ہیں۔

روایت کی وضاحت:

یہ روایت دو حصوں میں ہے۔ آخری حصہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نقل ہوئی ہے جبکہ پہلا حصہ اس واقعے کے بیان پر مشتمل ہے جس کے نتیجے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے استفتا ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول مبارک سامنے آیا۔ پہلے ہم روایت کے ابتدائی حصہ پر بحث کریں گے۔

صورت واقعہ یوں بیان ہوئی ہے کہ ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہ نماز میں سورۃ الفرقان کی تلاوت کر رہے تھے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس میں کچھ اجنبیت محسوس کی۔ انھوں نے کان لگا کر تلاوت کو سنا تو معلوم ہوا کہ ہشام سورت کو کئی مختلف طرزوں سے ادا کر رہے ہیں جن سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ واقف ہی نہ تھے۔ اس پر وہ غضبناک ہو گئے۔ شدت جذبات میں چاہا کہ ہشام کو نماز ہی میں دبوچ لیں لیکن پھر نہ جانے کس طرح اپنے آپ کو قابو میں کیا۔ ہشام کے سلام پھیرنے کے انتظار میں تو تھے ہی، ان کے سلام پھیرتے ہی ان پر جھپٹے، ان کی چادر چھین کر ان کے گلے میں ڈالی اور ان کو جکڑ لیا۔ اس تمام کارروائی کے دوران ہشام غریب کو نہ انھوں نے ان کا جرم بتایا اور نہ وہ خود ان سے پوچھ سکے۔ اس حفاظتی انتظام کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے تلاوت کے بارے میں وضاحت طلب کی۔ جب ہشام نے ان کو یہ بتایا کہ میں نے یہ سورت خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھی ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بیان کو تسلیم نہیں کیا۔ انھیں جھوٹا قرار دیا اور مزید تحقیقات کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے چلے۔ ہشام کے گلے میں چادر تو ڈال ہی رکھی تھی اس لیے ان کو کھینچ کر لے جانے ہی کا کام باقی تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ کر مسئلہ پیش کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہشام کی گلو خلاصی کا حکم دیا اور پھر دونوں کی قراءت سن کر دونوں تلاوتوں کو درست قرار دے دیا اور فرمایا کہ قرآن سات طرزوں پر نازل ہوا ہے۔

Marfat.com

اس قصے پر غور کرنے والے ہر شخص کے ذہن میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا کوئی معقول جواب سامنے نہیں آیا:

ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہ قریش میں سے ہیں۔ تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ یہ فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے۔ فتح مکہ کے بعد ہجرت کرنا ضروری نہ تھا۔ لہٰذا اگر انھوں نے خاص اہتمام کیا ہوگا تو بس چند مہینے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنے کا موقع پا سکے ہوں گے۔ ان کے مقابلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ قدیم الاسلام صحابی ہیں جن کے شب وروز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بسر ہوتے رہے۔ یہ بھی قرشی ہیں۔ اس لیے ہشام رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان میں کوئی خاص فرق نہیں ہوسکتا تھا۔

روایت کی رو سے اسلام کے نامور فرزند حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس قدر جذباتی واقع ہوئے تھے کہ وہ اپنی بات سے اختلاف کو کسی طرح قبول نہ کرتے تھے۔ وہ ایک نومسلم کی تلاوت سن کر اس طرح آگ بگولا ہوگئے کہ نماز کے آداب کا خیال بھی انھیں نہیں رہا اور انھوں نے اس شخص پر نماز کی حالت ہی میں حملہ کرنا چاہا۔ پھر بمشکل اپنے جذبات کو ضبط کر سکے اور جونہی اس شخص نے سلام پھیرا، انھوں نے بغیر وجہ بتائے اور اس سے باز پرس کیے اس کو چادر سے جکڑ لیا۔ آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ تمام تعلیم بھول گئی جس میں دوسرے مسلمان کے ساتھ حسن سلوک اور ہاتھ اور زبان سے اس کو نقصان نہ پہنچانے کی تلقین کی گئی تھی اور معاملات میں ہمیشہ حسن ظن سے کام لینے کا حکم دیا گیا تھا۔ لہٰذا انھوں نے نومسلم کی اس وضاحت کو درخور اعتنا [1] نہیں سمجھا کہ انھوں نے سورت الفرقان نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھی بلکہ اس کے منہ پر اس کو جھوٹا کہہ دیا اور اس کو باندھے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے۔ وہاں جا کر بھی انھیں اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ اب وہ ملزم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا کر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوچکے ہیں۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہشام رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے شکنجے سے آزاد کرایا۔

اس قصے سے یہ تاثر بھی قائم ہوتا ہے کہ قدیم الاسلام ہونے کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سبعۃ احرف پر قرآن پڑھنا سیکھا اور نہ آپ اس حقیقت ہی سے واقف تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے تلاوت کی اجازت دے رکھی ہے جبکہ ایک نومسلم نے چند ماہ کی رفاقت میں متعدد طریقوں (علی حروف کثیرۃ) سے پڑھنا سیکھ لیا۔

بیک وقت "علی حروف کثیرۃ" کی تلاوت کے معنی بھی سمجھ میں نہیں آتے۔ اگر تو سبعہ احرف امت کے مختلف طبقات یا گروہوں کی بولیوں کی رعایت سے تھے تو ایک قرشی شخص کے لیے قرشی طرز پر قراءت سیکھ لینا کافی تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ چوں کہ ہشام رضی اللہ عنہ کی طرح خود بھی قرشی تھے اور اس لیے ان کی اور ہشام کی قراءت کی طرز میں کوئی اختلاف نہ ہوتا۔ اگر ہشام رضی اللہ عنہ نے قرشی طرز کے علاوہ دوسری طرزیں بھی سیکھ لی تھیں اور یہ کوئی مستحب کام

---

[1] درخورِ اعتناء: توجہ کے قابل۔

Marfat.com

تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کے ساتھ طویل وابستگی کے باوصف کیسے اس شرف سے محروم رہ گئے حتی کہ ان کو اس کی خبر تک نہ ہوئی۔ اگر ان کو یہ معلوم ہوتا کہ قرآن متعدد طرزوں پر سکھایا جا رہا ہے تو ان کو ہشام رضی اللہ عنہ کی قراءت پر اعتراض ہی کیوں ہوتا اور ان کو جھوٹا کیوں قرار دیتے؟

ہمارے نزدیک یہ قصہ کسی طرح سمجھ میں آنے والا نہیں۔ یہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، ابن شہاب کے ذہن کی اختراع ہے۔ اگر ایسا واقعہ پیش آیا ہوتا تو متعدد لوگ اس کی روایت کرنے والے ہوتے اور اس کا راز حضرت عروہ اور ابن شہاب تک ہی محدود نہ رہتا۔ اگر اس طرح کا کوئی واقعہ فی الواقع پیش آیا تھا تو اس کی صورت کو بیان کرنے میں خیال آرائی کو دخل ہے اور حقیقی تفاصیل پیش نہیں کی گئیں۔

اب روایت کے آخری حصے کی طرف آئیے۔ اس میں آنحضرت ﷺ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ قرآن سات حرفوں پر نازل کیا گیا۔ اس میں سے جتنا میسر ہو سکے پڑھ لیا کرو۔ دوسری احادیث سے قرآن مجید کے سات حرفوں پر نازل ہونے کی تائید ہوتی ہے، اگرچہ ان کے الفاظ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ترمذی میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت میں فاقرء واما تیسر منہ کے الفاظ نہیں ہیں۔ البتہ حدیث کے ابتدائی الفاظ اسی طرح ہیں۔ یہ ابتدائی الفاظ مسند احمد کی روایت میں بھی موجود ہیں جبکہ ان کے ساتھ متفرق اضافے کیے گئے ہیں۔ یہ اضافے عموماً غیر مربوط قسم کے ہیں۔ روایت زیر بحث میں یہ اضافہ ابتدائی حصے سے کوئی ایسا تعلق نہیں رکھتا جس کا تقاضا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ کر رہا ہے۔ اگر 'منہ' کی بجائے 'منھا' کا لفظ استعمال ہوا ہوتا تو کہا جا سکتا تھا کہ ضمیر سات حرفوں کی طرف راجع ہے اور ان میں سے کسی حرف کو بھی پڑھنے کی رخصت دیتی ہے۔ لیکن استعمال شدہ الفاظ حقیقت میں سورہ مزمل کی ایک آیت کا حصہ ہیں۔ وہاں 'منہ' کی ضمیر قرآن مجید کے لیے ہے اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن میں سے جتنا میسر ہو پڑھ لیا کرو۔ گویا الفاظ حدیث میں اشارہ قرآن مجید ہی کی سات جہتوں کی طرف ہے اور تلقین فرمائی گئی ہے کہ اس میں سے اپنی سہولت کے مطابق پڑھتے رہا کرو تا کہ اس کی ہدایت سے مستفید ہو سکو۔

سبعہ احرف کے معنی کے تعین پر علماء میں بڑا اختلاف ہوا ہے۔ بعض اس سے مراد عرب میں بولی جانے والی سات زبانیں لیتے ہیں حالانکہ نزول قرآن کی زبان کے لیے خود قرآن میں بِلِسَانِكَ (تیری زبان پر) کہہ کر یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ قرآن کا نزول حضرت محمد ﷺ کی زبان، یا دوسرے الفاظ میں قریش کی زبان پر ہوا۔ اسی دلیل کی بنا پر جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کے سرکاری نسخے تیار کروائے تو ان کو قریش کے طرز ادا کے مطابق لکھنے کا حکم دیا اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کی رہنمائی کے لیے تین قرشی ادیبوں کو ان کے ساتھ رکھا۔ آپ نے پوری امت کو اسی ایک طرز ادا پر جمع کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔

بعض علماء سبعہ احرف سے سات کیفیتیں مراد لیتے ہیں جن کے مطابق قرآن مجید پڑھتے ہوئے الفاظ ادا ہوتے ہیں مثلاً ادغام، اظہار، تفخیم، ترقیق، مد، امالہ وغیرہ۔ بعض کے نزدیک مراد اسالیب کلام

Marfat.com

کے پہلو ہیں مثلاً اعراب کے وجوہ، مفرد و جمع کا استعمال، تقدیم و تاخیر کلمات، حذف کلمات وغیرہ۔ دوسرے ان سے مراد قرآن مجید کے مضامین کا سات انواع پر مشتمل ہونا لیتے ہیں مثلاً امر، نہی، وعدو وعید، حرام وحلال، قصص، امثال، محکم ومشابہ۔ ان سب آراء میں باہم اختلاف پایا جاتا ہے، تاہم ان میں مشترک بات یہ ہے کہ یہ سب اقوال احرف کو قرآن مجید کے اندر ہی محصور کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک احرف کا قرآن مجید ہی کے اندر محصور ہونا ضروری ہے۔

الزرکشی نے البرھان فی علوم القرآن میں بتایا ہے کہ سبعۃ احرف کی تاویل میں پینتیس یا چالیس اقوال ہیں۔ چنانچہ بعض علماء کو یہ کہنا پڑا ہے کہ سبعۃ احرف کا تعلق متشابہات سے ہے، ان کا حقیقی علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے کہ معتبر علماء کے مابین اس امر میں کوئی نزاع نہیں کہ سبعۃ احرف سے سات معروف قراء تیں مراد نہیں ہیں۔ یہ قراء تیں سب سے پہلے امام ابوبکر بن مجاہد نے تیسری صدی میں جمع کیں اور سبعۃ احرف کی حدیث کے ساتھ مطابقت قائم رکھنے کے لیے انھوں نے سات روایتیں لیں۔ اسی لیے ایک مشہور قاری کو یہ کہنا پڑا کہ اگر ابن مجاہد نے قراء کا تعین نہ کر دیا ہوتا تو میں سات قراء میں حمزہ کی جگہ یعقوب الحضرمی کو شامل کرتا۔ امام صاحب کے نزدیک اس امر میں بھی کوئی نزاع نہیں کہ سات حروف میں کوئی تناقض یا معنی کا تضاد نہیں ہے۔ (فتاویٰ شیخ الاسلام، جزو 13) چنانچہ اہل تحقیق کے نزدیک ان الفاظ سے سات قراء تیں مراد لینا "اضعف الاقوال بلاریب" (بلاشبہ کمزور ترین تاویل) ہے۔ یوں بھی اہل قراءت کا اتفاق ہے کہ قرآن مجید کی کوئی مکمل سورت تو کجا، کسی ایک حرف کا بھی سات طرزوں پر پڑھنا ممکن نہیں۔ علماء نے سورت الفرقان میں جس کا سات حرفوں پر پڑھنا اس روایت میں بیان ہوا ہے، اہل قراءت کے اختلافات کو جمع کر کے دکھا دیا ہے کہ یہ بس معدودے چند ہی ہیں اور ان کی وجہ سے کسی بھی سننے والے کو اس طرح کا اچنبھا نہیں ہوسکتا جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ہشام رضی اللہ عنہ کی قراءت سن کر ہوا حالاں کہ وہ خود اہل زبان اور انہی کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔

''سبعۃ احرف'' پر قرآن مجید کے نزول کی تائید ان روایات سے بھی ہوتی ہے جن میں نبی ﷺ کا اس مفہوم کا ارشاد نقل ہوا ہے کہ پہلے پہل قرآن مجید کا نزول ایک حرف پر ہوا۔ میں نے جبریل علیہ السلام سے مراجعت کی کہ میری امت کے لیے مزید عنایت ہو، میں برابر درخواست کرتا رہا یہاں تک کہ قرآن سات احرف پر نازل ہوگیا۔ اب لوگ ان میں سے جس حرف کو بھی پڑھیں گے، وہ درست ہوں گے۔ اس مفہوم کی حامل احادیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور حضرت ام ایوب رضی اللہ عنہا سے مروی ہیں۔

قرآن مجید کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نبی ﷺ کو نزول وحی کا بڑا انتظار رہتا تھا۔ آپ اس میں اضافے کے لیے برابر "رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا" کی دعا مانگا کرتے تھے جو خود وحی کے ذریعے آپ کو سکھائی گئی تھی۔ ہر مشکل میں آپ کی نگاہیں جبرئیل امین علیہ السلام کی منتظر رہتیں اور جب وحی آتی تو آپ کے شرح صدر اور اطمینان قلب کا باعث بنتی۔ قرآن مجید سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نزول وحی کے ابتدائی دور میں قرآن مجید کی جو سورتیں

Marfat.com

نازل ہوئیں وہ نہایت مختصر لیکن نہایت بلیغ انداز میں تھیں۔ بعد میں اجمال کی جگہ تفصیل نے لے لی۔ پھر کفار کی طرف سے بحث و تمحیص کا آغاز ہوا تو ایسی سورتیں نازل ہوئیں جنھوں نے بحثوں کا تسلی بخش جواب مرحمت فرمایا۔ امت مسلمہ کو مدینہ منورہ میں استحکام حاصل ہوا تو شریعت کے احکام نازل ہوئے۔اس طرح درجہ بدرجہ حالات کی ضرورت کے لحاظ سے قرآن مجید کی طرزیں بدلتی گئیں، یہاں تک کہ تیئس برس میں اس کی تکمیل ہوگئی۔ ہمارے نزدیک جبرئیل امین علیہ السلام سے مراجعت کی روایات کی روشنی میں سبعۃ احرف کا صحیح مفہوم قرآن مجید کے مضامین ہی کے سات پہلو اور اس کی جہتیں ہیں۔ یہ مفہوم مراد لینے سے نہ صرف لفظ 'حرف' سے بُعد پیدا نہیں ہونے پاتا بلکہ قرآن مجید سے اس کی تائید حاصل ہو جاتی ہے۔

قرآن مجید کی یہ تمام جہتیں قرآن کی ترتیب وتدوین میں سمودی گئیں۔اس کی سورتیں سات ایسے زمروں میں تقسیم کردی گئیں جن میں سے ہر زمرہ قرآن مجید کے معانی کے ایک خاص پہلو کا حامل ہے۔ان میں رد اہل کتاب وقیام امت مسلمہ، رد مشرکین، کشمکش حق و باطل، نبوت و رسالت، توحید، آخرت اور تنبیہات کے مضامین کو بطور خاص بیان کیا گیا ہے۔ ان میں بیان کلام کی خوبی یہ ہے کہ ہر زمرہ ہدایت کے مقصد کے لیے کفایت کرتا ہے کیوں کہ اس میں اپنے زمرے کا خاص مضمون ہی بیان نہیں ہوتا بلکہ دوسرے زمروں کے مضامین بھی اس قدر بیان ہوگئے ہیں کہ قرآن مجید کو جہاں سے پڑھیے اس کو ہدایت کا کامل ذریعہ پائیں گے۔اس طرح قرآن مجید اپنی ظاہری حالت میں بھی سبعۃ احرف کا نمونہ ہے۔

خلاصۂ بحث:

اوپر کے مباحث کی روشنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد میں قرآن مجید کی اس صفت کو بیان فرمایا ہے کہ یہ ہفت جہات ہے۔ اس کے مضامین سات زمروں میں بیان ہوئے ہیں جن میں سے ہر ہر زمرہ ہدایت کے مقصد کے لیے موزوں ہے۔ لہٰذا لوگ اس سے بقدر سہولت وامکان فیض یاب ہوں۔

باقی رہا حضرت عمر صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعہ تو یہ جس انداز سے بیان ہوا ہے اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مذمت مقصود ہے۔ اس میں حدیث کے مفہوم کو ایک غلط رخ دینے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ سننے والے کی توجہ مختلف قراءتوں کی طرف پھیری جاسکے حالانکہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس فتنے کا اپنے دور خلافت ہی میں قلع قمع کردیا تھا۔

Marfat.com

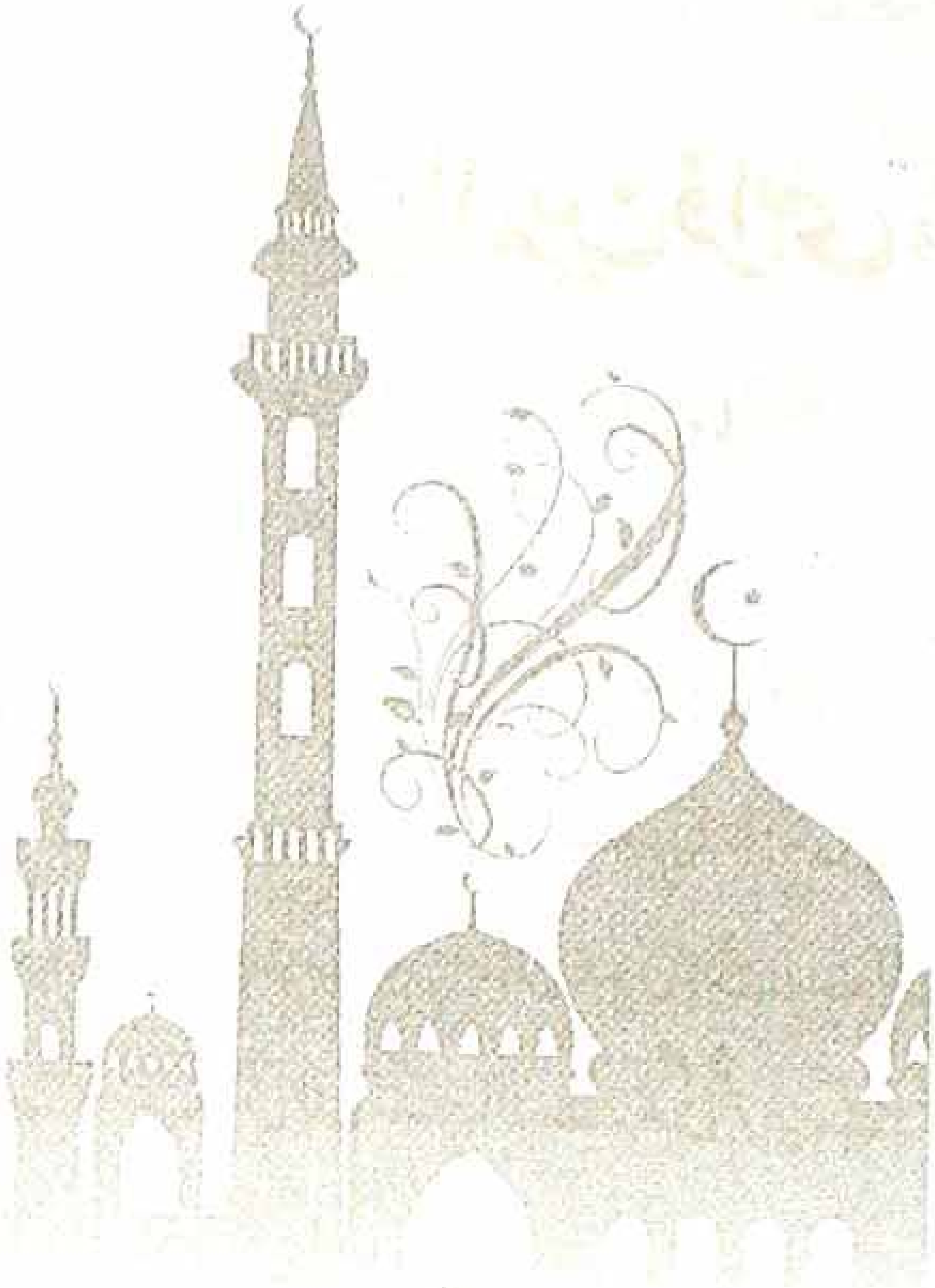

فکرِ فراہی

بابِ سوم

علامہ حمید الدین فراہیؒ

امامِ فراہیؒ کی علمی خدمات

فکرِ فراہی

امامِ فراہیؒ کا تصورِ حکمت

حدیث وسنت کی تحقیق کا فراہی منہاج

فکرِ فراہی اور خدمتِ حدیث

Marfat.com

علامہ حمید الدین فراہی رحمہ اللہ

(1863ء......1930ء)

اصل نام عبدالحمید ہے جو ان کی مطبوعہ تصانیف پر بطور مصنف لکھا ہوا ملتا ہے، لیکن شہرت دوسرے نام حمید الدین کو حاصل ہے جو ان کی ذاتی دستاویزات یا ان اداروں کے ریکارڈ میں پایا جاتا ہے جن میں انھوں نے کام کیا۔ وہ خطوط میں یہی دوسرا نام اختیار کرتے ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے ان کی کتاب "امعان فی اقسام القرآن" مطبوعہ قاہرہ میں ترجمۂ مصنف یعنی ان کے حالات زندگی تحریر کیے تو ان کا نام یوں لکھا: حمید الدین ابو احمد عبدالمجید الانصاری الفراہی۔

فراہی رحمہ اللہ کا خاندان اپنی نسبت انصار مدینہ کی طرف بتاتا ہے۔ اولاد انصار ہندوستان آئی تو پہلے پانی پت میں اور پھر جون پور میں آباد ہوئی۔ وہاں سے آگے بڑھ کر انھوں نے یوپی کے ضلع اعظم گڑھ میں سکونت اختیار کی۔ فراہی رحمہ اللہ کے دادا نے اعظم گڑھ سے بارہ میل دور ایک گاؤں "پھریہا" میں جائداد خریدی اور وہیں آباد ہو گئے۔ اسی گاؤں کے نام کو معرب کر کے حمید الدین رحمہ اللہ اپنے نام کے ساتھ فراہی لکھتے تھے۔

فراہی رحمہ اللہ کا سلسلہ نسب یوں ہے: عبدالحمید فراہی ولد عبدالکریم ولد قربان قنبر ولد تاج علی۔ قربان قنبر اعظم گڑھ کے ایک نامور وکیل اور علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ کے نانا تھے۔ ان کے بیٹے عبدالکریم نے بھی وکالت پڑھی، لیکن اس کو بطور پیشہ اختیار نہ کیا بلکہ زمینداری کرتے اور بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے۔ ان کے دو بیٹوں میں بڑے حمید الدین رحمہ اللہ تھے جن کی ولادت پھریہا میں 6۔ جمادی الآخرہ 1280ھ مطابق 18۔ نومبر 1863ء چہار شنبہ کے روز ہوئی۔

تعلیم:

فراہی رحمہ اللہ نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ دس سال کی عمر میں حافظ احمد علی ساکن سکرور سے قرآن مجید حفظ کیا۔ فارسی زبان مولوی محمد مہدی چناروی سے سیکھی جو فارسی کے ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ (یادرفتگاں، 28)۔ عربی زبان اور دینی علوم کی تحصیل کے لیے اعظم گڑھ میں اپنے پھوپھی زاد بھائی علامہ شبلی رحمہ اللہ کے ہاں چلے گئے۔ ان سے درس نظامی کی اکثر کتابیں پڑھیں۔ اسی دوران علامہ شبلی رحمہ اللہ کے استاذ مولانا فاروق چریاکوٹی کی عالمانہ صحبتوں سے مستفیض ہونے کا موقع ملتا رہا۔ فقہ میں درک حاصل کرنے کے لیے لکھنو میں مولانا ابوالحسنات عبدالحی فرنگی محلی کے

Marfat.com

حلقۂ درس میں شرکت کی، نیز معقولات میں مولانا فضل اللہ بن نعمۃ اللہ انصاری سے استفادہ کیا۔ (نزہۃ الخواطر 8، 229)۔ 18 سال کی عمر میں لاہور چلے گئے جہاں اورینٹل کالج کے پروفیسر اور نامور عربی ادیب مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے دیوان حماسہ، سبعة معلقات اور ادب جاہلی کی کتابیں پڑھیں۔ قرآن مجید کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کی نکتہ شناسی کا ملکہ ان کے اندر اپنے انہی استاد کے فیضان سے پیدا ہوا۔ (حیات شبلی، 83)۔ فراہی رحمہ اللہ عربی ادب اور علوم اسلامیہ کی تحصیل سے فارغ ہوئے تو ان کی عمر 20 برس تھی۔

فراہی رحمہ اللہ کو انگریزی زبان اور عصری علوم کی اہمیت کا اندازہ تھا۔ لاہور سے وطن لوٹ کر انھوں نے باقاعدہ تعلیم کے لیے کرنل گنج سکول الہ آباد میں داخلہ لے لیا۔ انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد 1891ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ کالج میں فلسفہ جدید میں ان کے استاذ پروفیسر ٹامس آرنلڈ تھے جن کی صحبت نے فراہی رحمہ اللہ کی طبیعت میں فلسفہ سے مناسبت پیدا کردی۔ اس وقت علی گڑھ کالج کا الحاق الہ آباد یونیورسٹی سے تھا چناں چہ فراہی رحمہ اللہ نے اسی یونیورسٹی سے 1895ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ بعد میں دو سال قانون پڑھا لیکن اس کا امتحان نہیں دیا۔ فراہی رحمہ اللہ کی عصری تعلیم کا سلسلہ 1897ء میں منقطع ہوا۔

فراہی رحمہ اللہ نے دوران تعلیم قرآن مجید کو مرکز نگاہ بنائے رکھا۔ اس پر تدبر و تفکر کرتے اور اس کی مشکلات کا حل تلاش کرتے رہے۔ ان کو سورتوں کا ربط و نظام سمجھنے میں اولین کامیابی علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں حاصل ہوئی۔ قرآن فہمی کا یہی اسلوب بعد میں ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ اب ان کی اصل پہچان قرآنیات کے ایک ماہر اور علم تفسیر کے ایک نئے اسلوب کے بانی کے طور پر ہے۔

کسب معاش:

1897ء میں فراہی رحمہ اللہ نے مدرسۃ الاسلام کراچی میں عربی اور فارسی کے معلم کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ اس مدرسہ میں انھوں نے 1907ء تک کام کیا۔ تدریسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ انھوں نے قرآن پر تدبر و تفکر کے نتائج کو بھی قلم بند کرنا شروع کر دیا۔ 1907ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر عربی تعینات ہوئے۔ ان کے شعبے کے سربراہ مشہور مستشرق جوزف ہاروٹز (Joseph Horovitz) تھے۔ وہ فراہی رحمہ اللہ کی عربی دانی سے بہت متاثر تھے۔ وہ خواست گار ہوئے کہ فراہی رحمہ اللہ ان کو اعلیٰ عربی پڑھائیں اور وہ اس کے بدلے میں ان کو عبرانی زبان سکھائیں گے۔ فراہی رحمہ اللہ نے یہ تجویز مان لی اور عبرانی زبان میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ عہد نامہ عتیق کے عبرانی نسخوں کو پڑھنے پر قادر ہو گئے۔ آگے چل کر ان کو اس علم نے بعض اہم تحقیقات میں بڑی مدد دی۔ کالج میں ڈیڑھ سال ملازمت کرنے کے بعد ان کا تقرر میور سینٹرل کالج الہ آباد میں بطور پروفیسر عربی ہوا۔ اس عہدہ پر انھوں نے چھ سال کام کیا۔

1914ء میں فراہی رحمہ اللہ کی خدمات نظام دکن کی حکومت نے الہ آباد یونیورسٹی سے مستعار لے لیں اور ان کو

Marfat.com

حیدر آباد کی اعلیٰ ترین درس گاہ دارالعلوم کا صدر مقرر کیا۔ حکومتی منصوبے کی رو سے دارالعلوم کے نصاب کو نئی تشکیل دینا، اس میں عصری علوم کا اضافہ کرنا اور ترقی دے کر اس کو ایک مشرقی علوم کی یونیورسٹی بنانا پروگرام میں شامل تھا۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے موزوں ترین شخصیت حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کی پائی گئی اور ان کو گرانقدر مشاہرے پر الہ آباد سے حیدر آباد لایا گیا۔ انھوں نے دارالعلوم کے حالات کی بہتری کے لیے ضروری اقدامات کیے، نصاب تعلیم میں تبدیلیاں کیں، سائنسی علوم کا اضافہ کیا اور حکومت کے سامنے عثمانیہ یونیورسٹی کا منصوبہ پیش کیا جس میں دو باتیں ملحوظ تھیں۔ ایک یہ کہ قدیم وجدید علوم دونوں کے نظام تعلیم اور طریق تعلیم کی خوبیوں کو جمع کرنے کی اس طرح کوشش کی جائے کہ اس سے ایک مسلمان معاشرے کی جملہ ضرورتیں بطریق احسن پوری ہوں، دوسری یہ کہ اس میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ (ذکر فراہی۔ 293)۔ یونیورسٹی کے قیام کی جانب ایک قدم کے طور پر فراہی رحمہ اللہ نے دارالعلوم کو ایک کالج اور ایک مدرسہ فوقانیہ میں تقسیم کر دیا۔ اردو ذریعہ تعلیم کے ساتھ سائنسی علوم کی تعلیم میں ایک بڑی رکاوٹ فنی اصطلاحات کا مسئلہ تھا۔ اس مشکل کے حل کے لیے سر اکبر حیدری کی سربراہی میں جو مجلس وضع اصطلاحات قائم ہوئی اس کے ایک رکن فراہی رحمہ اللہ بھی تھے۔ انھوں نے اس مجلس میں بھرپور کردار ادا کیا۔

حکومت کے محکمہ تعلیم میں مغرب زدہ افسران دارالعلوم کو ترقی دینے کے حق میں نہ تھے، البتہ عثمانیہ یونیورسٹی کے لیے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی حمایت کرتے تھے۔ یونیورسٹی کا آغاز عثمانیہ یونیورسٹی کالج کے قیام سے کیا گیا اور فراہی رحمہ اللہ کو اس کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ دارالعلوم اس کالج کا شعبہ دینیات قرار پایا، لیکن فراہی رحمہ اللہ دینی تعلیم کے ساتھ افسروں کی مخاصمت سے بددل ہوگئے۔ ادھر ان کا تحقیقات قرآنی کا منصوبہ نظر انداز ہو رہا تھا لہٰذا انھوں نے حکومت کو اپنا استعفا پیش کر دیا اور اگست 1919ء میں واپس اپنے وطن چلے گئے۔

نومبر 1914ء میں علامہ شبلی رحمہ اللہ کا جب انتقال ہوا تو وہ اعظم گڑھ میں ایک علمی وتحقیقی مرکز دارالمصنفین کے قیام کے لیے کوشاں اور اعظم گڑھ سے بیس میل دور ایک قصبہ سرائے میر میں قائم ایک چھوٹے سے مدرسے کے معاملات کی نگرانی کر رہے تھے۔ ان کے ادھورے کاموں کی تکمیل کے لیے ایک مجلس تشکیل دی گئی جس کے صدر حمید الدین فراہی رحمہ اللہ اور ناظم سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ منتخب ہوئے۔ اسی مجلس نے دارالمصنفین کی تجویز کو عملی شکل دی اور یہ ادارہ آج تک کام کر رہا ہے۔

1916ء میں سرائے میر کے مدرسہ کے ناظم کے طور پر فراہی رحمہ اللہ کا انتخاب ہوا لیکن حیدر آباد میں مقیم ہونے کے باعث وہ اس ذمہ داری کو ادا کرنے سے قاصر تھے۔ 1919ء میں وطن واپس آکر انھوں نے مدرسہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا، اس کا نظام تعلیم جدید خطوط پر وضع کیا، نصاب میں تبدیلیاں کیں، مدرسہ کے قواعد وضوابط بنائے اور اس میں منفرد طریقہ درس کی طرح ڈالی جس کا منصوبہ تو ان کے ذہن میں تھا، لیکن اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سازگار حالات میسر نہیں آئے تھے۔

Marfat.com

زندگی کے آخری پانچ برسوں میں انھوں نے مدرسہ کے اساتذہ اور آخری درجے کے طلبہ پر انفرادی توجہ صرف کر کے ان کو قرآن مجید کا تحقیقی درس دیا اور ان کی فکری تربیت کی تا کہ وہ ان کے سرمایۂ علمی میں اضافے اور ان کے قرآنی فکر کی اشاعت کی تدبیریں کر سکیں، چناں چہ آج بھی مدرسۃ الاصلاح سرائے میرا نہی کے تجویز کردہ نہج پر دینی تعلیم دے رہا ہے اور اس فکر کے حاملین نے جہاں جہاں مدرسے قائم کیے وہ اسی فکر کو مشعلِ راہ بنائے ہوئے ہیں۔

فراہی رحمہ اللہ کو سر درد اور گردے کی خرابی کے عارضے لاحق تھے۔ وہ گردے کے آپریشن کے لیے متھرا کے ہسپتال میں داخل ہوئے۔ وہیں 19۔ جمادی الآخرہ 1349ھ بمطابق 11۔ نومبر 1930ء کو ان کی وفات ہوئی۔ تخلی الی المولی المجید حمید رحمہ اللہ سے سال وفات برآمد ہوتا ہے۔

فراہی رحمہ اللہ کی اولاد میں تین لڑکے تھے۔ سب سے بڑے بیٹے محمد حماد کا انتقال کراچی میں ہوگیا۔ باقی دو بیٹوں محمد سجاد اور محمد عباد سے ان کی نسل چلی۔

تلامذہ:

فراہی رحمہ اللہ جہاں بھی رہے درس قرآن کا بالعموم اہتمام کرتے رہے جس سے وقتاً فوقتاً استفادہ کرنے والوں اور ان کے عقیدت مندوں میں عبداللہ العمادی رحمہ اللہ (م 1366ھ)، سیّد سلیمان ندوی رحمہ اللہ (م 1373ھ)، مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ (م 1375ھ)، ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ (م 1377ھ) اور عبدالماجد دریا بادی رحمہ اللہ (م 1397ھ) جیسے بڑے نام شامل ہیں۔ علامہ شبلی رحمہ اللہ ان کے استاذ تھے، لیکن علمی مسائل میں مسلسل ان کی رائے اور تحقیقات جاننے کا اہتمام کرتے رہے جس پر فراہی رحمہ اللہ کے نام ان کے 77 خطوط گواہ ہیں۔ (مکاتیب شبلی بنام حمید الدین)۔ دو تلامذہ جن پر فراہی رحمہ اللہ نے خصوصی توجہ دی اور انھوں نے بھی استاذ کی خدمت اور ان سے استفادہ کا حق ادا کر دیا، وہ اختر احسن اصلاحی رحمہ اللہ (م 1378ھ) اور امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ (م 1418ھ) ہیں۔ اول الذکر مدرسہ سے فارغ التحصیل ہو کر مدرسۃ الاصلاح سرائے میر ہی میں تفسیر اور عربی ادب کی تعلیم دینے لگے اور یہ سلسلہ ان کی وفات تک جاری رہا۔ انھوں نے استاذ کے مسودات کی ترتیب وتخریج پر کام کیا اور ان کو قابل اشاعت بنایا۔ امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ بھی 1944ء تک مدرسہ سے بطور استاذ وابستہ رہے۔ انھوں نے استاذ کے بہت سے عربی مسودات کا اردو ترجمہ کیا اور ان کے اصولوں کی روشنی میں تفسیر تدبر قرآن لکھی۔ انھوں نے اپنی متعدد تصانیف نیز کئی جرائد کو استاذ کے فکر کی اشاعت کا وسیلہ بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ آج فراہی طریقۂ تفسیر کو ایک الگ مکتب فکر کے طور پر بین الاقوامی سطح پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔

تصانیف:

فراہی رحمہ اللہ نے جو کچھ لکھا قرآن مجید کو محور بنا کر لکھا اور عربی کو ذریعہ بنایا۔ ان کا طریقۂ تصنیف بھی اپنا تھا۔ قرآنیات کے مختلف موضوعات اور اشکالات ان کے سامنے رہتے۔ وہ ان پر برابر غور وفکر کرتے رہتے۔ جونہی کسی

Marfat.com

مسئلے کا حل سمجھ میں آتا، وہ کاغذ پر اس کو لکھ کر متعلقہ موضوع کی فائل میں رکھ لیتے، چناں چہ بیک وقت متعدد کتابیں زیر تصنیف رہتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بہت کم کتابیں مکمل ہوسکیں۔ باقی سب کے ناتمام مسودات موجود ہیں اور وہ تعداد میں ان کی تکمیل یافتہ تصانیف سے بہت زیادہ ہیں۔ مطبوعہ کتب کی فہرست حسب ذیل ہے:

1۔ تفسیر نظام القرآن وتاویل الفرقان بالفرقان — اس میں آیت بسم اللہ، الفاتحہ، الذاریات، التحریم، القیامہ، المرسلات، عبس، الشمس، التین، العصر، الفیل، الکوثر، الکافرون، اللھب اور الاخلاص کی تفاسیر شامل ہیں۔ ان کا اردو ترجمہ مجموعہ تفاسیر فراہی کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

2۔ تفسیر سورہ البقرہ (62 آیات تک) — شائع کردہ: دائرہ حمیدیہ سرائے میر (1420ھ)

3۔ امعان فی اقسام القرآن — شائع کردہ: دارالقلم دمشق، الدار الشامیہ بیروت 1415ھ۔ اس کا اردو ترجمہ اقسام القرآن کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

4۔ الرای الصحیح فی من ھوالذبیح — شائع کردہ: دارالقلم دمشق 1420ھ (اس کا اردو ترجمہ ''ذبیح کون ہے؟'' کے نام سے دستیاب ہے)

5۔ مفردات القرآن — شائع کردہ: دارالغرب بیروت (1422ھ)

6۔ دلائل النظام — شائع کردہ: دائرہ حمیدیہ، سرائے میر 1968ء

7۔ التکمیل فی اصول التاویل — ....ایضاً............

8۔ اسالیب القرآن — ....ایضاً............(1969ء)

(نمبر 6، 7، 8 کے جزوی تراجم اردو میں ''تفسیر قرآن کے اصول'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ شائع کردہ: ادارہ تدبر قرآن وحدیث، لاہور)

9۔ جمھرۃ البلاغہ — شائع کردہ: مطبوعہ معارف اعظم گڑھ 1360ھ

10۔ فی ملکوت اللہ — شائع کردہ: دائرہ حمیدیہ، سرائے میر (1971ء)

11۔ القائدالی عیون العقائد — ....ایضاً............(1975ء)

Marfat.com

12۔ امثال آصف الحکیم — شائع کردہ: دائرہ حمیدیہ، سرائے میر (1393ھ)
(یہ کتاب Aesops Fables کے منتخب قصص کا عربی ترجمہ ہے)۔

13۔ دیوان ابی احمد (عربی کلام) — شائع کردہ: دائرہ حمیدیہ، سرائے میر (1967ء)

14۔ نوائے پہلوی (فارسی کلام) — ....ایضاً............

15۔ خرد نامہ بہ زبان دری منظوم — ......ایضاً......(1916ء)

16۔ آنحضرت ﷺ کا سلسلہ نسب اور اہل کتاب — مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی (1991ء)

17۔ اسباق النحو، اسم اور فعل کے بیان میں — شائع کردہ: دائرہ حمیدیہ، سرائے میر (1384ھ)

18۔ تحفۃ الاعراب (نحو کی منظوم کتاب اردو میں) — مطبع: معارف اعظم گڑھ (1971ء)

19۔ ترجمہ قرآن (اردو) سورہ قیامہ تا سورہ الناس — شائع کردہ: دائرہ حمیدیہ، سرائے میر (1990ء)

20۔ طبقات ابن سعد (دو اجزا کا فارسی ترجمہ) — یہ ترجمہ علی گڑھ کالج کی نصابی ضرورت کے تحت کیا گیا۔

21۔ تاریخ بدء الاسلام — (علامہ شبلی کی کتاب کا فارسی ترجمہ)

فراہی رحمہ اللہ کی حسب ذیل کتب ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں:

1۔ حکمۃ القرآن — (اس کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے)

2۔ النظام فی الدیانتہ الاسلامیہ — (اس کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے)

3۔ حجج القرآن

4۔ الرائع فی اصول الشرائع

5۔ احکام الاصول باحکام الرسول

ان کے علاوہ مختلف موضوعات پر ناتمام مسودے کثرت سے لکھے گئے۔

اصل میدان عمل:

فراہی رحمہ اللہ کا اصل میدان عمل جس میں ان کی جولانیٔ فکر اپنی معراج پر نظر آتی ہے قرآن فہمی کے لیے ان کی کاوشیں ہیں۔ قرآن مجید کے بارے میں اس عام خیال کو ان کا ذہن کسی طرح قبول نہ کرتا تھا کہ یہ متفرق مضامین کی حامل آیات کا مجموعہ ہے اور اس کی یہی خصوصیت اس کا حسن ہے۔ اصولی طور پر وہ جانتے تھے کہ ربط و نظم کسی بھی معقول کلام کا ایک لازمی خاصہ ہوتا ہے، لہٰذا اگر اس سے صرف نظر کر لیا جائے تو کلام کے معنی و مفہوم کے ایک حصے سے محروم ہونا پڑے گا کیوں کہ ترکیب میں ایک زائد حقیقت مستور ہوتی ہے جو الگ الگ اجزا میں مفقود ہوتی ہے،

Marfat.com

لہٰذا قرآن میں بے ترتیبی اور بے نظمی کا تصور قلت تدبر یا اسالیب کلام سے ناواقفیت کے باعث پیدا ہوا ہے۔ فراہی رحمہ اللہ نے کتاب اللہ پر غور وخوض اور تفکر وتدبر کو اپنا مقصد حیات بنا لیا۔ بالآخر ایک وقت آیا جب اللہ تعالیٰ نے ان پر معارف کے فہم کی راہیں کھول دیں اور ان اصولوں تک ان کی رہنمائی ہوئی جن کی مدد سے قرآن فہمی کی مشکلات حل کی جاسکتی ہیں۔

فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک قرآن فہمی کے اصول ومبادی میں اساسی اہمیت ان کے تصور نظم قرآن اور تاویل القرآن بالقرآن کو حاصل ہے۔ کئی مفسرین ان دونوں اصولوں کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن ان کے ہاں ان کا اطلاق نہایت محدود اور بالکل جزوی طور پر ہوتا ہے۔ فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک قرآن مجید اپنی ہیئت، ترتیب، ترکیب، معنی اور موضوع ہر لحاظ سے ایک مربوط ومنظّم کلام ہے۔ ہر سورہ ایک وحدت ہے جس کا ایک مرکزی مضمون ہوتا ہے۔ اس کو وہ عمود کا نام دیتے ہیں۔ سورہ کے تمام مباحث براہ راست یا بالواسطہ عمود سے متعلق ہوتے ہیں۔ سورتیں بھی باہم دگر مربوط ہیں اور ان میں کلام کا ارتقا ہوتا ہے، یہاں تک کہ پورا قرآن ایک منظّم کلام کا جلوہ پیش کرتا ہے۔

تاویل القرآن بالقرآن کو بھی فراہی رحمہ اللہ نہایت وسیع تناظر میں لیتے ہیں۔ وہ الفاظ واسالیب کے نظائر قرآن ہی میں تلاش کرتے ہیں۔ وہ مضامین سورہ کا تقابل دوسری سورتوں کے مضامین سے کرتے اور ایک جامع مضمون کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک اگر نظم اور سیاق کلام کو ملحوظ رکھا جائے تو اس بات کا احتمال ہی ختم ہوجاتا ہے کہ کسی آیت کی دو یا دو زائد تاویلیں ہوں۔ کثرت تاویلات نے امت کے اندر اختلافات کو جنم دیا ہے اور اس سے دشمنانِ دین کو موشگافیوں کا موقع ملتا ہے۔ قرآن قطعی الدلالہ ہے لہٰذا اس کی وہی ایک تاویل قابل قبول ہوگی جو نظم سورہ اور سیاق وسباق سے مطابقت رکھنے والی ہو۔

قرآن چوں کہ عربی مبین میں نازل ہوا، اس لیے کسی لفظ کی تفسیر شاذ، منکر اور غریب معانی کے مطابق قابل قبول نہیں ہوگی۔ اسی طرح کسی آیت کے اصل مخاطب کو پہچاننے میں کوتاہی کی جائے تو تاویل بالکل غلط ہوجائے گی۔ یہ سورہ کے داخلی اشارات اور اس کے بیانات ہیں جو اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ اس میں اصلاً کس گروہ یا کن گروہوں سے خطاب کیا گیا ہے اور کس ذہن وفکر کی اصلاح کی گئی ہے۔

فراہی رحمہ اللہ نے اپنے ان اصولوں کا استعمال واضح کرنے کے لیے بعض مشکل سورتوں کی تفسیر لکھی۔ انھوں نے الفاظ کی تحقیق، اسالیب زبان، نحو، بلاغت، نظم وسیاق، نظائر قرآن غرض ہر پہلو سے بحث کی اور دکھایا کہ قرآن پر تدبر کا حق ادا کیا جائے اور صحیح اصول سامنے ہوں تو کلام اللہ کا ایک ایک جز کس طرح معانی سے لبریز ہوتا ہے۔ ان تفسیری نمونوں کے علاوہ انھوں نے دوسرے طالبان قرآن کے لیے ایسی کتب تحریر کیں جن کو سمجھ لیا جائے تو قرآن کے بیسیوں مقامات کو سمجھنے کی کلید ہاتھ آجاتی ہے۔ مثال کے طور پر امعان فی اقسام القرآن میں انھوں نے قسم کی حقیقت وضرورت، الفاظ قسم اور قسم کھانے کے طریقوں پر روشنی ڈالنے کے بعد عرب وعجم کے کلام سے فراہم کردہ شواہد کی مدد سے

Marfat.com

ثابت کیا ہے کہ قسم کا مقصود استدلال واستشہاد ہوتا ہے۔قرآن کی قسموں کا حقیقی مقصد بھی سورہ کے مضامین کے حق میں شہادت فراہم کرنا ہے۔ان میں تقدیس کا پہلو بہت کم ہے اور جہاں ہے وہ بالکل اتفاقی ہے۔کتاب مفردات القرآن میں دکھایا گیا ہے کہ الفاظ قرآن پر کس انداز سے تحقیق ہونی چاہیے۔انھوں نے کلام عرب کے علاوہ عبرانی زبان کے ہم معنی الفاظ سے دلیل اخذ کر کے بعض الفاظ کے معنی متعین کرنے میں اصحاب لغت کی غلطی واضح کی ہے۔ کتاب جمھرة البلاغه میں انھوں نے دقیق مباحث کے بعد ثابت کیا ہے کہ کلام کی فصاحت وبلاغت جانچنے کے لیے اہل فن کے متعین کردہ اصول ناتمام ہیں۔ان کی روشنی میں قرآن کی فصاحت وبلاغت کو جانچنا کوئلے تولنے کی ترازو سے ہیروں کا وزن کرنے کے مترادف ہے۔فراہی رحمہ اللہ نے اس فن کو نئی ترتیب دے کر جدید اصول قائم کیے ہیں۔ کتاب الرای الصحیح فی من ھو الذبیح اہل کتاب کے اس دعویٰ کے رد میں لکھی گئی ہے کہ ذبیح اللہ اسماعیل علیہ السلام نہیں بلکہ اسحاق علیہ السلام ہیں۔فراہی رحمہ اللہ نے کمال دقیقہ رسی اور لطافت استدلال کا ایک ایسا اسلوب روشناس کرایا ہے جس کی مدد سے قدیم صحف آسمانی اور قرآن مجید پر غور وفکر کرنے سے مسائل پر تحقیق کا ایک نیا انداز ہاتھ آتا ہے۔

تفسیر قرآن میں روایت کو رد یا قبول کرنے میں فراہی رحمہ اللہ کے پیش نظر حسب ذیل اصول تھے:

- اصل واساس کی حیثیت قرآن کو حاصل ہے۔
- سنت ثابتہ منصب رسالت کا قدرتی جز اور شریعت کی ایک مستقل بنیاد ہے، لہٰذا قرآن اور سنت میں تفریق کرنا ایک ملحدانہ روش ہے۔
- حدیث کی حیثیت ایک فرع کی ہے۔اس کا سبب روایت میں ظن کا دخل ہے۔
- ان روایات کو قبول کرنا جائز نہیں جو اصل کے خلاف اور نصوص قرآنی کی تکذیب کرتی ہوں۔
- قرآن اور حدیث کے درمیان اختلاف کی صورت میں حکم قرآن ہوگا۔
- خبر اگرچہ متواتر ہو، قرآن کو منسوخ نہیں کرسکتی۔ظن کی بنیاد پر نسخ کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔

امت مسلمہ کے زوال کو روکنے کا طریقہ:

فراہی رحمہ اللہ نے امت مسلمہ کے عروج وزوال کے اسباب کا نہایت باریک بینی کے ساتھ تجزیہ کیا اور اس نتیجے تک پہنچے کہ امت کے فکری انحطاط کی بڑی وجہ وہ غیر اسلامی فکر اور تہذیبی عناصر ہیں جو غیر محسوس طور پر ماضی میں اس کے فکری دھارے میں نفوذ کرتے رہے۔اس وقت ان سے نجات حاصل کرنے کی واحد شکل یہ ہے کہ علوم کو بے آمیز قرآنی تعلیمات پر ازسرنو استوار کیا جائے۔ یہ وہی کام ہے جس کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے اس زمانے میں کئی ادارے قائم ہوئے ہیں جو عصری علوم کو اسلامیانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔فراہی رحمہ اللہ نے اس کام کا آغاز ایک صدی قبل ہی کر دیا تھا۔انھوں نے متعدد موضوعات پر بنیادی کام کیا۔ان کے مسودات حجج القرآن، فقه القرآن، القائد فی عیون العقائد، المنطق الجدید، العقل ومافوق العقل اور الاکلیل فی شرح الانجیل علوم کی تشکیل جدید میں ان کی پیش رفت پر شاہد ہیں۔

Marfat.com

فراہی رحمہ اللہ امت کی اصلاح کے لیے دینی تعلیمی اداروں کو ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ وہ تعلیم سے خود وابستہ تھے اس لیے رائج الوقت نظام تعلیم کی خوبیوں اور خامیوں سے واقف تھے۔ ان کے نظریہ تعلیم کا مطمح نظر قرآن مجید کو مرکزی حیثیت دینا تھا تاکہ دوسرے تمام علوم اسی آفتاب سے روشنی وتوانائی حاصل کریں۔ اس کے لیے علماء اور اساتذہ کے اندر سے جمود کو دور کرنا ضروری تھا، چناں چہ انھوں نے علوم کی تشکیل جدید کا جو کام کیا اور قرآنیات پر جو کچھ لکھا، وہ سب عربی میں تھا تاکہ علماء اس سے استفادہ کر سکیں۔ اسی طرح جہاں کہیں موقع ملا انھوں نے نظام تعلیم کو نئے خطوط پر استوار کرنے کی جدوجہد کی۔ اس میں وہ جہاں دینی نصاب میں تبدیلیاں لاتے وہیں، انگریزی زبان اور عصری علوم کو بھی شجر ممنوعہ نہ سمجھتے۔ انھوں نے دارالعلوم حیدرآباد (دکن) کے نصاب تعلیم میں اپنے تصور کے مطابق تبدیلیاں کیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے منصوبے میں دینیات کو اہم مقام دلوانے کی کوشش کی جس میں ریاست کی مغرب زدہ انتظامیہ آڑے آگئی۔ جب حکومت نے دینیات کو ثانوی حیثیت دے دی اور یونیورسٹی کو جدید خطوط پر قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا تو فراہی رحمہ اللہ کی دلچسپی اس ادارے سے ختم ہوگئی۔ انھوں نے وطن واپس آکر ایک معمولی سے دینی مدرسہ کو اپنی توجہ کا مرکز بنالیا اور بقیہ زندگی اس کو اپنے ذہن کے مطابق ایک اعلیٰ دینی ادارہ بنانے میں صرف کردی۔ انھوں نے مدرسہ الاصلاح کے اغراض ومقاصد متعین کیے۔ نصاب تعلیم میں بنیادی تبدیلیاں کیں جن کے بعد مدرسہ کے ایک طالب علم کے لیے ضروری ہوگیا کہ وہ سات برسوں میں پورا قرآن اس طرح پڑھ لے کہ وہ اس کو ایک محقق کی طرح سمجھتا اور اس سے استدلال کر سکتا ہو، کتب حدیث کی تعلیم اس طرح حاصل کرے کہ اس کا ذہن گروہی عصبیتوں سے پاک ہو، فقہ میں کسی ایک مسلک کی فقہ کے بجائے فقہ اسلامی پڑھے، وہ چاروں ائمہ فقہ کو اپنا امام سمجھے اور ان کے مکتب فکر سے آگاہی حاصل کرے۔ مقصد یہ تھا کہ طلبہ میں وسعت نظر اور رواداری پیدا ہو اور ان کے اندر دوسرے مسلمانوں کی تکفیر وتفسیق کا ولولہ نہ ابھرے۔ صرف ونحو اور عربی زبان کی تعلیم کا انداز عملی تھا تاکہ طلبہ اس زبان کو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے سیکھیں اور تحریر وتقریر میں اظہار خیال پر قادر ہوں۔ فراہی رحمہ اللہ نے عربی گرائمر کے بوجھ کو کم کرنے کے لیے پہلے ہی اسباق النحو کے نام سے اسم اور فعل کے مباحث کو نئے انداز سے منضبط کر دیا تھا۔ اس طریقہ میں طلبہ کو "مأة عامل" سے نجات دلوادی تھی۔ ان کا گرائمر پڑھانے کا طریقہ نہایت سہل تھا جس کے باعث عربی سیکھنے میں طلبہ کو غیر معمولی سہولت ملی اور وہ گرائمر سیکھنے کی وہ مسافت چند ماہ میں طے کر لیتے جس کے طے کرنے پر پہلے کئی سال صرف ہوتے تھے۔ مدرسہ میں فنون کی تعلیم، امہات فن پڑھ کر حاصل کرنے کو رواج دیا گیا اور اصول فن سکھانے پر خاص توجہ دی گئی۔ طلبہ کو زندگی کی جدوجہد کے لیے تیار کرنے کی خاطر بقدر ضرورت انگریزی، ریاضی اور سائنس پڑھائی جاتی، نیز ان کو مفید صنعتیں سکھائی جاتیں۔

فکر فراہی کے پھیلنے کے امکانات:

فراہی رحمہ اللہ کے اصول تفسیر اور قرآنیات پر ان کے مباحث کو علمی حلقوں تک پہنچنے میں بڑا وقت لگا کیوں کہ یہ تمام

Marfat.com

سرمایۂ علمی عربی زبان میں تھا۔ مجموعہ تفاسیر فراہی میں شامل سورتوں کی تفاسیر کا اردو ترجمہ اگرچہ ان کی وفات کے بعد کے عشرہ میں ہو چکا تھا، تاہم یہ بھی اشاعت کی مشکلات کے باعث عمومی توجہ حاصل نہ کر سکا، البتہ جب فراہی رحمہ اللہ کے عزیز شاگرد امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ نے استاذ کے اصولوں پر پورے قرآن کی تفسیر "تدبر قرآن" کے نام سے شائع کر دی تو اس کا انداز و اسلوب اس قدر دلآویز اور منفرد تھا کہ اس کا تذکرہ ملکی سطح ہی پر نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی ہونے لگا۔ آج مغرب میں تفسیر قرآن پر جو کتابیں تصنیف کی جارہی ہیں ان میں فراہی مکتب فکر کا خاص تذکرہ کیا جاتا ہے۔ پاکستان اور بھارت کے علاوہ مصر، سعودی عرب، انگلستان اور امریکا کی یونیورسٹیوں میں حمید الدین فراہی رحمہ اللہ اور ان کے اصول تفسیر پر تحقیقی کام ہو رہا ہے اور متعدد طلبہ ایم فل اور ڈاکٹریٹ کر چکے ہیں۔ اہل علم اس انداز تفسیر میں عصر حاضر کے مسائل کا مواجہہ کرنے کے نئے امکانات دیکھ رہے ہیں۔

کتابیات

1۔ مختصر حیات حمید — مشتمل بر مقالات سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ و امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ
مرتبہ: عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر (1973ء)

2۔ علامہ حمید الدین فراہی رحمہ اللہ (اہل علم و دانش کی نظر میں) دائرہ حمیدیہ، سرائے میر

3۔ علامہ حمید الدین فراہی رحمہ اللہ۔ حیات و افکار مقالات فراہی سیمینار منعقدہ سرائے میر اکتوبر 1991ء
(دائرہ حمیدیہ، سرائے میر 1992ء) مرتبہ: ڈاکٹر عبید اللہ فراہی

4۔ یاد رفتگاں — دار المصنفین، اعظم گڑھ 1986ء

5۔ ذکر فراہی — ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، دائرہ حمیدیہ، سرائے میر (2001ء)

6۔ کتابیات فراہی — ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ (1991ء)

Marfat.com

امامِ فراہیؒ کی علمی خدمات

انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک برصغیر ہندوستان میں انگریز کا اقتدار نہایت مستحکم ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کے جذبہ حریت اور شوق سلطانی کو اس نے اپنے پنجۂ استبداد سے بڑی حکمت عملی سے دبا دیا تھا۔ یہ عمل خالصتاً سیاسی نہ تھا بلکہ سیاسی کے ساتھ ساتھ عقلی بھی تھا۔ برطانوی حکومت نے جو استعماری پالیسی اختیار کی اس کے تحت انھوں نے ایک طرف عیسائی مبلغین کو ہر قسم کی مراعات دیں کہ وہ ہندوستان کے لوگوں کو ان کے دین و مذہب سے برگشتہ کریں، چناں چہ وہ مسلمان علماء سے آئے دن مناظرے کرتے اور عقل کے نام پر ایسی باتیں پھیلاتے جن کے نتیجے میں مخالفین کو ان کے دینی تصورات کے بارے میں شک وشبہ میں مبتلا کیا جا سکے اور ذہنی الجھاؤ پیدا کر کے انھیں اپنے ڈھب پر لایا جا سکے۔ دوسری طرف انھوں نے مغربی تہذیب وتمدن کو بطور ایک برتر تہذیب کے پیش کیا اور اس بات کی سعی کی کہ لوگ اس کو اختیار کریں۔ جو لوگ اس تہذیب وتمدن کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتے ان کے لیے مادی ترقیوں کا میدان وسیع تھا اور جو لوگ اس سے نفرت کرتے ان کو مرعوب کرنے کے مواقع پیدا کیے گئے تاکہ وہ اپنے موقف پر قائم رہنے کی جرأت نہ کر سکیں۔ اس تہذیبی استیلاء کے لیے انگریزوں نے تعلیمی نظام کو ذریعہ بنایا۔ انھوں نے مسلمانوں میں رائج تعلیم کی جگہ مغربی علوم کی تعلیم کی سرپرستی کی تاکہ ہندوستان کے لوگوں کو مغربی افکار کے ساتھ وابستہ کر کے انھیں اپنے علمی ورثے سے بیگانہ کر دیا جائے۔ ان اقدامات کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان جو پہلے ہی انحطاط پذیر تھے جدید فکر وفلسفہ سے یکسر مرعوب ہو گئے۔ ان کے ایک طبقے نے عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ بہت ساری ان حقیقتوں کا سرے سے انکار کر دیں جن کو وہ اپنے باپ دادا یا مذہبی رہنماؤں سے سن کر مانتے آ رہے تھے لیکن اب ان کو عقلی معیار پر ثابت کرنا ان کے بس میں نہ تھا۔ نتیجتاً وہ تشکیک والحاد کی وادیوں میں کھو گئے۔

مسلمانوں میں ایک ایسا طبقہ بھی پیدا ہو گیا جس نے اپنے دین کی اساسات کو جدید فکر و فلسفہ سے ہم آہنگ کرنے کے شوق میں اگر قرآن حکیم کو مزاحم سمجھا تو خود قرآن کے مفہوم ہی کو بدلنے کی کوشش کی تاکہ اس کی بناء پر لوگوں کے اندر جدید تصورات سے بیگانگی نہ رہے۔ سرسید احمد خاں کی تفسیر قرآن اسی ذہنیت کی غماز ہے جس سے متاثر ہو کر انکار سنت اور تفسیر بالرائے کا ایک مستقل مدرسۂ فکر وجود میں آ گیا۔ انگریزی حکومت کے استیلاء کے اس دور میں مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ نے آنکھیں کھولیں۔ اپنے طلب علم کے زمانے میں انھیں مسلمان قائدین کے رجحانات

Marfat.com

سے واقف ہونے کا موقع ملا اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلہ لے کر انھیں ان فتنوں سے روشناس ہونے کا موقع بھی میسر آ گیا جو نئی تعلیم میں پنہاں تھے۔ مولانا فراہی رحمہ اللہ جیسا ذکی و فطین شخص اس صورت حال سے بے تعلق نہیں رہ سکتا تھا، چناں چہ یونیورسٹی کی تعلیم کے زمانے ہی میں انھوں نے اپنے مستقبل کے لائحہ عمل پر غور و فکر شروع کر دیا۔

مولانا فراہی رحمہ اللہ ان نابغہ لوگوں میں سے تھے جو خواہ کسی بھی میدان کو اپنا لیں وہ اس میں انتہائی بلندیوں کو چھوتے ہیں۔ زمانۂ طالب علمی ہی میں ان کا علمی پایہ مسلم تھا۔ عربی اور فارسی کے علاوہ انگریزی ادب اور فلسفۂ جدید میں بھی ان کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ ان کے یورپین پروفیسروں تک کو ان کی رائے کے آگے جھکنا پڑتا تھا۔ اس لیے اگر وہ ادبیات عالیہ، عمرانیات، سیاسیات یا منطق و فلسفہ میں سے کسی بھی مضمون کو اپنے لیے منتخب کر لیتے تو بلاشبہ اس کو زمین سے اٹھا کر ثریا تک پہنچا دیتے لیکن اس سے ان کی نیکی پسند طبیعت اور دین سے والہانہ تعلق خاطر کی تسکین نہ ہو سکتی۔ لہٰذا وقت کے دھارے کے بالکل برعکس انھوں نے مسلمانوں کی زبوں حالی کا بنظر غائر مطالعہ کیا اور ان کو نہ صرف پیش آمدہ مشکلات کے سبب سے آگاہ کیا بلکہ ان کا ایک ایسا حل پیش کیا جو ان کو تمام فتنوں سے بچا کر لے جائے اور تشکیک کی تنگنائیوں سے نکال کر یقین و اذعان کی دولت سے مالا مال کر دے۔

غور و فکر کے بعد مولانا فراہی رحمہ اللہ اس نتیجے تک پہنچے کہ مسلمانوں کی زبوں حالی دراصل قرآن مجید سے بعد کا نتیجہ ہے۔ جس دور میں مسلمانوں نے قرآن کو اپنایا اور اپنے اخلاق اور عمل کا انحصار اسی پر رکھا تو انفرادی اور اجتماعی طور پر وہ مستحکم رہے۔ جسد ملی کو کامل صحت حاصل رہی اور اسلام کا علم سرنگوں نہیں ہونے پایا لیکن جوں ہی وہ اس کتاب سے غافل ہوئے انھوں نے نور و حکمت کے خزانے اپنے اوپر بند کر لیے، ان پر فساد غالب آ گیا، عقائد خراب ہو گئے، دل بگڑ گئے، بدعت اور ہوائے نفس کو در آنے کا موقع ملا۔ اس کے نتیجے میں ملت کا نظام منتشر اور شریعت کا نظم پارہ پارہ ہو گیا۔ مسلمانوں نے عملاً قرآن مجید کو اپنی کامل رہنمائی کا ذریعہ نہ بنایا بلکہ اس کے صرف چند پہلوؤں ہی کو لائق اعتنا سمجھا، اس لیے وہ سابقہ امتوں کی طرح کتاب اللہ کا ایک حصہ بھلا بیٹھے۔ اس جرم کے قدرتی نتائج ان کے سامنے آ کر رہے۔ مولانا فراہی رحمہ اللہ نے اس بگاڑ کی اصلاح کا طریقہ یہ بتایا کہ مسلمان مشرق و مغرب کی طرف رہنمائی کے لیے دیکھنے کے بجائے خدا کی غلامی پر مطمئن ہوں، عہد فطرت کو پورا کریں اور رضائے خداوندی کے حصول کے لیے خدا کی ہدایت ہی کو رہنما بنائیں۔ اس سعادت کو حاصل کرنے کا وسیلہ قرآن مجید سیکھنا اور سکھانا، اس پر خود عمل کرنا اور دوسروں کو اس کی ترغیب دینا ہے۔ مولانا فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک انسان کی ذہنی و قلبی صفات کی تکمیل کا یہ تقاضا ہے کہ قرآن مجید سے تعلق قائم کیا جائے۔ انسان کا قرآن سے یہ تعلق جس قدر زیادہ مضبوط ہو گا وہ اتنا ہی اچھا انسان ہو گا۔ نبی کریم ﷺ نے قرآن چوں کہ خدا سے سیکھا اور امت کو اس کی تعلیم دی، اس لیے حضور ﷺ بلاشک و شبہ سب سے بہتر انسان تھے۔ حضور ﷺ کے بعد لوگوں میں سب سے اچھے وہ ہیں جنھوں نے حضور ﷺ سے قرآن سیکھا اور آگے کی نسلوں تک اس کا علم پھیلایا۔ علیٰ ہذا القیاس فرق مراتب، اسباب و وسائل کی کثرت و قلت، خلوص نیت اور

Marfat.com

صفت استقلال کی کمی بیشی کے مطابق ان کے بعد آنے والے لوگوں کا درجہ ہے۔ چوں کہ پروردگار کی تعلیم قبول کرنے اور اس کے بندوں تک پہنچانے سے بڑھ کر کوئی بھلائی نہیں ہوسکتی، اس لیے قرآن ہی عبادت کی بنیاد، اس کا محور اور عبودیت کا مغز اور جوہر ہے۔ اس نقطۂ نظر کے تحت مولانا رحمہ اللہ نے اپنے لیے زندگی کا جو لائحہ عمل تجویز کیا اور جس کو اختیار بھی کیا وہ قرآن کو سمجھنا اور اس کے بعد اس کی تعلیم دوسروں تک پہنچانا تھا۔

جب سرسید احمد خان کی تفسیر سامنے آئی تو مولانا رحمہ اللہ غور وفکر کے بعد اس نتیجے تک پہنچے کہ علماء میں تفسیر قرآن کے رائج اصولوں کے ساتھ اس فکر وفلسفہ کا مقابلہ مشکل ہے جس سے مرعوب ہو کر سید صاحب نے اپنی تفسیر لکھی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن مجید کو سمجھنے اور اس سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ایسے اصول وضع کیے جائیں جو خود قرآن ہی سے ماخوذ اور فطری ہوں۔ متضاد روایتوں کے انبار میں سے حقیقت کو تلاش کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں اور اگر لوگوں پر فہم قرآن کا صحیح نہج واضح نہ کیا گیا تو ایک سرسید ہی نہیں بلکہ ان کے طرز فکر کے حامل بیسیوں سرسید اور پیدا ہو جائیں گے جو اپنی اوٹ پٹانگ تاویلوں سے قرآن مجید کو ایک گورکھ دھندا بنادیں گے۔ اس نتیجے تک پہنچتے ہی مولانا فراہی رحمہ اللہ نے اصول تفسیر پر کام کرنا شروع کیا۔ علی گڑھ کی تعلیم سے فارغ ہوتے ہی گو انھوں نے متعدد تعلیمی اداروں میں تدریس کی ذمہ داریاں ادا کیں اور رہینِ ستم ہائے روزگار رہے لیکن جس مقصد کو انھوں نے عزیز جانا اس کے خیال سے کبھی غافل نہیں رہے۔ اس کا ثبوت ان کے وہ رسائل ہیں جو قرآن مجید کے مختلف پہلوؤں پر ان کے قلم سے نکلے اور ان کی زندگی ہی میں بعض شائع بھی ہو گئے۔

جہاں تک دوسرے مقصد یعنی قرآن کی تعلیم کو پھیلانے کا تعلق ہے، مولانا فراہی رحمہ اللہ مدرسہ کی تعلیم وتدریس اسلوب سے مطمئن نہ تھے۔ رائج الوقت نظام تعلیم میں ایک تو قرآن مجید کی تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی جب کہ فقہ وحدیث کے علاوہ منطق، فلسفہ اور نہ جانے دوسرے کون کون سے مضامین کو بڑی تفصیل سے پڑھایا جاتا تھا۔ دوسرے اس میں تمام تر زور فقہ کی تعلیم اور اس کے اصولوں پر تھا۔ مولانا رحمہ اللہ کے نزدیک دین کے اہم مقاصد اخلاق، عقائد اور قوانین کی اصلاح ہیں اور قرآن مجید نے ان سب کی طرف رہنمائی دی ہے۔ یہ سب اجزا باہم دگر مل کر تزکیۂ نفس کے مقصد کو حاصل کرتے ہیں۔ انھی تینوں کی بناء پر تین علوم پیدا ہوتے ہیں یعنی علم اخلاق، علم کلام اور علم فقہ۔ اگر مدارس میں علم فقہ کو اصل مان کر تعلیم دی جائے تو علم اخلاق اور علم کلام اس کے دائرے سے نکل جاتے ہیں جس کے باعث قرآن کا مدعا سمجھنے اور دین سیکھنے کے مقصد کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر مولانا رحمہ اللہ اس بات کی ضرورت محسوس کرتے تھے کہ دین کی تعلیم کا طریق کار بدلا جائے اور اس میں قرآن کو اصل قرار دے کر حدیث، فقہ، اخلاقیات، کلام وغیرہ کی تعلیم دی جائے۔

اس کا لازمی تقاضا یہ تھا کہ عربی پڑھانے کے بعد پہلے قرآن مجید پڑھایا جائے اور اس کی ہدایت کی روشنی میں باقی علوم پڑھائے جائیں۔ مولانا رحمہ اللہ نے اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کا

Marfat.com

انتخاب کیا جہاں مروج نصاب کو چھوڑ کر قرآن کی بنیاد پر دوسرے علوم پڑھانے کی طرح ڈالی۔ انھوں نے مدرسہ کا تخیل خود متعین کیا اور اس تخیل کے مطابق نصاب درس بنایا۔ مدرسین کو اپنے خیال سے متفق کیا اور ذہین طلبہ کو خصوصی اہتمام سے خود ہی تعلیم دی جس میں قرآن مجید کے علاوہ جدید علوم کی تعلیم بھی شامل تھی۔ مقصد یہ تھا کہ یہ طلبہ آگے چل کر کتاب الٰہی کے حامل اور اس ذہنی وفکری انقلاب کے علم بردار بنیں جو مولانا رحمہ اللہ کے پیش نظر تھا۔ مولانا فراہی رحمہ اللہ مدرسہ کی تعلیم میں جس طرح کی تبدیلی چاہتے تھے اور اس سے جن مقاصد کا حصول ان کے پیش نظر تھا، ان کا اندازہ اس تحریر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جو مولانا نے مدرسۃ الاصلاح کا انتظام سنبھالتے وقت لکھی۔ انھوں نے لکھا:

''مدرسۃ الاصلاح کا دعویٰ ہے کہ اس نے مذہبی تعلیم کی صراط مستقیم کو پالیا ہے۔ اس کو اپنا مقصد اساسی قرار دیا ہے۔ وہ مقصد اساسی اور وہ صراط مستقیم کیا ہے؟ وہی ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو چھوڑا تھا اور جس کی آخری خطبہ میں وصیت فرمائی تھی کہ میں تمھارے لیے کتاب اللہ چھوڑے جاتا ہوں۔ جب تک اسے مضبوطی سے پکڑے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ مدرسۃ الاصلاح کا دعویٰ ہے کہ مسلمانوں کے انحطاط وتنزل کا اصلی سبب یہی ہے کہ وہ قرآن مجید کی تعلیم کو آہستہ آہستہ کم کرتے گئے اور وہ علوم جو قرآن کے لیے آلہ اور وسیلہ ہو سکتے تھے ان کی تحصیل میں اس قدر مصروف ہوگئے کہ وہ خود مقصود بالذات بن گئے۔ ہوتے ہوتے قرآن مجید کے درس وتدریس کے لیے انھوں نے بالکل جگہ نہ چھوڑی اور اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ محض تلاوت وحفظ الفاظ پر اکتفا کر لیا گیا اور ہم پر رسول خدا کی یہ شکایت منطبق ہونے لگی:

((یارب ان قومی اتخذو اهذا القرآن مهجورا.))

''اے میرے پروردگار! میری قوم نے اس قرآن کو ایک چھوڑی ہوئی چیز سمجھ لیا ہے۔''

لیکن اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مدرسۃ الاصلاح نے یہ راز پالیا اور قرآن مجید کو سرچشمۂ ہدایت وترقی تسلیم کر کے جملہ علوم کی تعلیم اس کی تعلیم کے ماتحت کر دی۔ وہ ادب، فقہ، حدیث، تاریخ، سیر اور منطق وحکمت کی تعلیم دیتا ہے لیکن اس طور پر کہ جس علم کی طرف قدم بڑھے، قرآن کی روشنی میں اور جو دروازہ کھلے، قرآن ہی کے اندر سے کھلے۔''

علم کی اصلاح کے اس نصب العین کی خاطر مولانا رحمہ اللہ نے دارالعلوم حیدرآباد (دکن) کا گراں بہا معاوضہ، اعلیٰ اعزاز اور دنیاوی منصب چھوڑا اور سادگی، قناعت اور گم نامی کے ساتھ اپنی عمر کا آخری حصہ مدرسہ کی خدمت میں گزار دیا۔

اہل علم سے یہ بات مخفی نہیں کہ قرآن مجید جہاں اپنے مدعا میں بالکل واضح کتاب ہے وہیں ایک صاحب فہم کے لیے اس میں اتنی مشکلات ہیں جن کے سامنے طالب کی ہمت جواب دے جاتی ہے۔ مولانا فراہی رحمہ اللہ نے قرآن فہمی کے اصولوں کی تحقیق پر اپنا وقت صرف کیا اور اپنے نتائج فکر کو مدون بھی کرتے رہے جس کے نتیجے میں

Marfat.com

مفردات القرآن، اسالیب القرآن، التکمیل فی اصول التاویل، دلائل النظام اور جمهرة البلاغہ، پانچ کتابیں مرتب ہوگئیں۔ ان میں مولانا نے وہ اصول وضع کر دیے جن کے مطابق غور کر کے قرآن کا ایک طالب علم کتاب اللہ کے جواہر ریزوں سے اپنا دامن بھر سکتا ہے اور اس عمل میں ہر قدم پر وہ خود قرآن ہی کو اپنا عناں گیر پاتا ہے۔ اسی کے سہارے اور اعتماد پر وہ فکر کی راہوں میں دور تک بڑھتا چلا جاتا ہے اور شک اس کا دامن گیر نہیں ہوتا۔

مولانا فراہی رحمہ اللہ اس کلیہ کو مانتے ہیں کہ فہم قرآن کی راہ کا پہلا قدم مفرد الفاظ کی صحیح معرفت ہے۔ اگر مفرد لفظ کے معانی سمجھنے میں غلطی ہو جائے تو غلط مفروضات قائم ہو جانے کی وجہ سے قرآن مجید سے وہ فلسفہ گھڑا جا سکتا ہے جو فی الحقیقت اس کی مراد نہیں ہوتی۔ چوں کہ عربی الفاظ بسا اوقات کئی معنی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں یا ان کے معانی بہت جامع ہوتے ہیں اس لیے ان کا مفہوم متعین کرنے میں بڑی مشکل پیش آسکتی ہے۔ قرآن مجید کی صحیح تاویل کا یہ تقاضا ہے کہ مفرد الفاظ کے معانی کے تمام پہلوؤں پر تحقیقی نظر ہو اور سیاق کلام کا خیال کر کے وہ معانی لیے جائیں جو موقع کلام میں صحیح بیٹھتے ہوں۔ کتاب مفردات القرآن الفاظ کی تحقیق کا راستہ کھولتی ہے۔

مفرد الفاظ جب جملوں میں استعمال ہوتے ہیں تو مفہوم کلام کا بہت کچھ انحصار ان الفاظ کے موقع محل پر ہوتا ہے۔ ہر زبان کی طرح عربی کے اپنے الگ اسالیب بیان ہیں جن سے واقفیت نہ ہو تو قرآن کا بہت سا مدعا نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ مولانا فراہی رحمہ اللہ کی رائے میں اسالیب سے لاعلمی کے ساتھ قرآن کے معانی پر گرفت ممکن نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ خطاب میں چوں کہ دل کے جذبات واحساسات کا اظہار بھی ہوتا ہے، رحمت، غضب، افسوس، سختی اور نرمی کا ہر جذبہ الفاظ کے دروبست سے ابل پڑتا ہے، اس لیے اسالیب سے ناواقفیت کے باعث ایک شخص کلام کا رخ اور اس کا مزاج نہیں سمجھ سکتا۔ مولانا فراہی رحمہ اللہ نے اسالیب کے اس اہم بیان کو اپنی کتاب اسالیب القرآن کا موضوع بنایا ہے۔

"التکمیل فی اصول التاویل" مولانا فراہی رحمہ اللہ کی وہ کتاب ہے جس میں انھوں نے تدبر قرآن کے اصول پیش کیے ہیں۔ ان کی رائے میں تاویل قرآن کا علم علماء نے حاصل تو کیا لیکن اس کا استعمال صرف فقہ کی خدمت تک محدود رکھا جس سے دین سیکھنے کے مقصد کو بڑا نقصان پہنچا۔ اس علم پر اس طرح کا کام نہ ہو سکا جو ایک مستقل فن کے لیے ہونا چاہیے تھا۔ پھر چوں کہ اس کا استعمال ایک محدود دائرے میں ہوتا رہا، اس لیے اس میں وہ احتیاط بھی نہ ہو سکی جو اصول دین کے لیے کی جاتی ہے۔ اصول تاویل مدون نہ ہونے کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہر شخص نے اپنی سمجھ کے مطابق قرآن کا ایک مفہوم فرض کر لیا اور اس کے سوا ہر دوسرے مفہوم کو غلط قرار دے دیا، چناں چہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک آیت پر اختلاف رائے پیدا ہو گیا اور امت کئی گروہوں میں بٹ گئی۔ اگر تاویل قرآن کے قواعد وضوابط طے کر لیے جاتے تو فکر ورائے کا یہ انتشار نہ ہونے پاتا اور امت ایک وحدت ہوتی۔ مولانا فراہی رحمہ اللہ نے

Marfat.com

تاویل قرآن کے جو اصول منضبط کیے ہیں ان میں سرفہرست کلام کا نظم و ربط ہے جو کلام کی صحیح سمت کو متعین کرنے والی واحد چیز ہے جس سے اہل بدعت وضلالت کی کج رویوں کی اصلاح ہو سکتی ہے اور خدا کا کلام غلط تاویلوں اور تحریفوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ جس طرح رنگ رنگ کے بکھرے ہوئے پھول وہ تاثر نہیں دیتے جو ایک خوبی سے گوندھے ہوئے ہار سے ملتا ہے یا متفرق اعضاء کو الگ الگ دیکھ کر اس کامل انسان کا قیاس نہیں کیا جا سکتا جو ان اعضاء کے جڑنے سے بنتا ہے، اسی طرح جب تک قرآن مجید کی آیات کو باہم مربوط کر کے نہ پڑھا جائے، وہ حکمت حاصل نہیں ہوتی جو اسے مربوط کلام کی حیثیت سے پڑھنے پر حاصل ہوتی ہے۔ مولانا رحمہ اللہ کی تحقیق میں قرآن مجید کی ہر سورہ ایک وحدت ہے اور وہ کسی خاص مضمون کو ادا کرتی ہے۔ اس کی تمام آیات اس مرکزی مضمون ہی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں۔ اسی نظم کلام کے علمی و عملی پہلوؤں کو مولانا رحمہ اللہ نے اپنی تصنیف دلائل النظام میں واضح کیا ہے۔

قرآن مجید کے مطالعہ میں درپیش آنے والی بعض اور مشکلات کو حل کرنے کے لیے مولانا فراہی رحمہ اللہ نے چند دوسری کتابیں بھی لکھیں جن میں اقسام القرآن سرفہرست ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے قسم کی حقیقت اور اس کی مختلف قسموں پر اصولی بحث کرنے کے بعد قرآن مجید کی قسموں کا استدلالی پہلو واضح کیا ہے اور ایک ایسا قاعدہ مرتب کیا ہے جس سے قسموں پر مشتمل آیات کے ایک صحیح محمل تک رسائی حاصل ہو سکے۔ قصوں اور تاریخی حوالوں پر غور کرنے کے لیے مولانا رحمہ اللہ نے اپنا طریق کار اپنی تصنیف الرای الصحیح فی من ھو الذبیح میں واضح کیا۔ اس کتاب میں استنباط مسائل کے دقیق قاعدے بیان ہوئے ہیں۔ قرآن کی فصاحت و بلاغت کو جانچنے کے لیے مولانا فراہی رحمہ اللہ نے کتاب جمھرۃ البلاغۃ لکھی جس میں مروجہ علم بلاغت کو یونانیوں سے ماخوذ ثابت کیا اور یہ دکھایا کہ عربی ادب اور خصوصاً قرآن حکیم کی خوبیوں کو جانچنے کے لیے یہ فن بلاغت کسی طرح کسوٹی کا کام نہیں دے سکتا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے فصحائے عرب کے کلام سے بلاغت کے وہ اصول بھی متعین کر دیے جو بلاغت قرآن کو پرکھنے کے لیے معیار کا کام دے سکتے ہیں۔

مولانا فراہی رحمہ اللہ کا یہ کام صرف اصولی نوعیت کا تھا اور وہ تدبر قرآن کے ان اصولوں کی تخریج کے امام ہیں جو ان کتابوں میں زیر بحث آئے ہیں۔ آگے کا مرحلہ ان اصولوں سے عملاً استفادے کا تھا۔ ان کے عملی پہلوؤں کو واضح کرنے کے لیے مولانا فراہی رحمہ اللہ نے قرآن مجید کی متعدد سورتوں کی تفسیر لکھی، جن میں سے آخری پاروں کی چودہ سورتوں کی تفسیر "مجموعہ تفاسیر فراھی" کے نام سے مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔ ان سورتوں کے مطالعہ سے ایک قاری پر جو نمایاں اثرات پڑتے ہیں، وہ یہ ہیں:

- قرآن مجید کی ہر سورہ اول تا آخر بالکل مربوط ہے۔ اس لیے قرآن مجید پر یہ اعتراض کہ اس کی آیات بے ربط ہیں، بالکل بے بنیاد ہے۔ تمام سورتیں نہ صرف اندرونی طور پر مربوط آیات پر مشتمل ہیں بلکہ اپنی سابق ولاحق سورتوں کے ساتھ مربوط ہیں۔ مضمون کا ایک پہلو اگر کسی سورہ میں بیان ہوا ہے تو اس کا دوسرا پہلو دوسری ملحقہ سورہ میں ہے۔

Marfat.com

❀ متعدد متواتر سورتیں کسی ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرتی ہیں، اس لیے اگر مجموعی طور پر ان سب پر غور کیا جائے تو حکمت قرآن کے بعض ایسے پہلو نگاہ میں آتے ہیں جن کی طرف الگ الگ ان سورتوں کو پڑھنے سے ذہن منعطف نہیں ہوتا، گویا قرآن میں سورتوں کے ہم مضمون مجموعوں کی تلاش بھی ایک ضروری کام ہے۔

❀ قرآن کے مطالعہ میں سہل انگاری نہایت مہلک ہے۔ قرآن مجید کا ایک ایک لفظ اہم اور داد تحقیق چاہتا ہے۔ ہر لفظ کے اندر معانی کا ایک دفتر پوشیدہ ہے، اس لیے وہ شخص قرآن سے مستفید نہیں ہوسکتا جو آب رواں کے مانند آیات کے اندر سے گزر جانے کا عادی ہو۔

❀ دین اسلام بڑا منظم دین ہے، اس کی تمام عبادات باہم متعلق اور کچھ مقاصد کی حامل ہیں۔ عبادات کا باہمی تعلق نظم قرآن پر تدبر سے واضح ہوتا ہے۔

مجموعہ تفاسیر فراہی پڑھ کر قرآن مجید میں ان کے غور و تدبر اور اس سے استنباط مطالب کا طریقہ سمجھ میں آتا ہے۔ عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ مصنف نے تدبر کے صحیح اصول اپنا کر حکمت دین کے کیسے کیسے جواہر ریزوں تک رسائی حاصل کی ہے۔

مولانا فراہی رحمہ اللہ قرآن مجید کے مطالعہ و تدبر کی حد پر رک جانے کے قائل نہیں۔ ان کے نزدیک تدبر کا اصل فائدہ قرآن کی حکمت تک رسائی حاصل کرنے میں ہے۔ یہ رسائی اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک ہر مسئلے کو پورے قرآن کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے۔ قرآن مجید میں ایک ہی مسئلہ مختلف پہلوؤں سے مختلف سورتوں میں سامنے آتا ہے۔ اگر ان سب مقامات پر صحیح اصولوں کی روشنی میں غور کیا جائے تو قرآن مجید کی حکمت روشن ہو کر سامنے آتی ہے۔ اس حکمت قرآن کے بعض مباحث تو مولانا فراہی رحمہ اللہ کی تفاسیر میں بھی آگئے ہیں لیکن اس کے علاوہ بھی انھوں نے کئی مستقل موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔

مولانا نے دین کے بنیادی عقائد پر اپنی کتاب القائد الی عیون العقائد میں قرآن کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ اس کتاب میں ذات و صفات باری تعالیٰ، انسان کی غایت تخلیق، دنیا میں خیر و شر کا وجود، ہدایت و ضلالت کے بارے میں سنت اللہ اور مسئلہ جبر و اختیار جیسے اہم مسائل زیر بحث آئے ہیں اور علم کلام کو جن اصولوں پر مرتب ہونا چاہیے، ان کی طرف رہنمائی دی گئی ہے۔

دنیا میں مصائب و تکالیف کے نزول اور قوموں کے عروج و زوال کے بارے میں حکمت قرآن کو جمع کر کے مولانا رحمہ اللہ نے ایک کتاب "ملکوت اللہ" تصنیف کی ہے۔ انھوں نے یہ دکھایا ہے کہ قوموں کی شکست و ریخت کا سبب خدا کی صفت رحمت و عدل کا ظہور ہے۔ اسی ذیل میں مولانا فراہی رحمہ اللہ نے اس کتاب میں اسلامی اصول

Marfat.com

سیاست اور منصب خلافت پر بھی بحث کی ہے اور خلیفہ اور اولوالامر کے اوصاف اور فرائض وحقوق پر روشنی ڈالی ہے، نیز یہ بتایا ہے کہ سلب خلافت کی وجوہ کیا ہوتی ہیں۔

مولانا فراہی رحمہ اللہ کی ایک اہم کتاب "الرائع فی اصول الشرائع" ہے۔ اس میں انھوں نے شریعت کے احکام کی درجہ بندی اور ان کے مقاصد متعین کیے ہیں۔ احکام کی حکمتوں کو واضح کرنے کے لیے نماز، روزہ اور جہاد کے احکام پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

مولانا فراہی رحمہ اللہ حکمت قرآن پر اس تحقیق کے ذریعہ سے یہ چاہتے تھے کہ تمام دینی علوم کو قرآن مجید کی بنیاد پر مرتب کرنے کی کوشش کی جائے اور اس ضمن میں جن بنیادی اصولوں کی ضرورت ہے ان کو قائم کر دیا جائے تا کہ مسلمانوں کا کوئی علم قرآن سے بے گانہ نہ ہو بلکہ اسی کی ہدایت کی روشنی میں ہو۔ مولانا رحمہ اللہ کے اسی عزم کی آئینہ دار وہ کاوشیں ہیں جو انھوں نے اپنی تصنیف "حجج القرآن" میں کی ہیں۔ اس کتاب میں مولانا رحمہ اللہ نے منطق اور فلسفۂ قدیم وجدید کی خامیوں سے بحث کی ہے اور اس کے بالمقابل قرآن مجید سے ماخوذ فلسفہ کے اصول بیان کر کے ان کی عقلی قدر و قیمت واضح کی ہے۔ اسی طرح اصول فقہ کی طرف ایک نیا قدم ان کی تصنیف "احکام الاصول باحکام الرسول" میں نظر آتا ہے۔ اس کتاب میں مولانا فراہی رحمہ اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور ہدایات کو قرآن مجید سے مستنبط ثابت کیا ہے۔ قرآن مجید کی حکمت پر مولانا رحمہ اللہ نے ایک مستقل کتاب حکمة القرآن کے نام سے لکھی ہے۔

مذکورہ تفصیل سے ہر شخص یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ مولانا فراہی رحمہ اللہ نے اس دور میں قرآن کے فہم کی ایک نہایت قابل اعتماد اور بے خطر راہ کھولی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگ اس سرچشمۂ فیض سے سیراب ہوں اور کتاب الٰہی کی حکمتوں کے خزانوں سے اپنے دامن بھریں۔ اس عمل میں مولانا رحمہ اللہ کے پیش نظر یہ بات تھی کہ قرآن حکیم کو مرکز بنا کر تمام اسلامی علوم کو از سر نو مرتب کر دیا جائے تا کہ آدمی پر جو دروازہ بھی کھلے وہ قرآن کی رو سے کھلے اور وہ جس راہ پر بھی چلے قرآن کی روشنی اس کی رہنمائی کرے۔ مولانا رحمہ اللہ کے نزدیک یہی راستہ مسلمانوں کے علم کی درستی کا ہے اور اسی کے نتیجے میں ایک صحیح قسم کا فکری انقلاب بپا ہونے کی توقع ہے۔ اگرچہ مولانا رحمہ اللہ کی زندگی نے اتنی وفا نہ کی کہ وہ یہ سارے کام از سر نو خود انجام دے سکتے لیکن انھوں نے اس بارے میں واضح اشارات چھوڑے ہیں اور کام کا خاکہ تک ترتیب دے دیا ہے۔ اب یہ ان کے بعد آنے والوں کا کام ہے کہ وہ ان کے فکر کو نہ صرف زندہ رکھیں بلکہ ترقی دے کر دنیا میں علم صحیح کے علم بردار بنیں۔ اس کے نتیجے میں یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ زمانہ اسلام کی حقانیت اور برتری کا قائل ہو سکے اور مسلمان اپنا کھویا ہوا وقار پھر حاصل کر لیں۔

Marfat.com

فکرِ فراہی

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اس نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے اتارا۔ یہ آسمانی ہدایت کے سلسلہ کی آخری اور مکمل کتاب ہے اس لیے خداوند تعالیٰ نے اسے ہر تحریف یا شیطانی دسترس سے محفوظ و مصئون فرمایا ہے۔ یہ کتاب اسی شکل میں ہمارے ہاتھوں تک پہنچی ہے جس شکل میں نبی کریم ﷺ نے امت کے حوالے کی تھی۔ یوں تو یہ کتاب پوری انسانیت کی ہدایت کے لیے آئی ہے لیکن امت مسلمہ اس کی حامل امت ہونے کی وجہ سے اس سلسلے میں گوناگوں ذمہ داریاں رکھتی ہے۔ قرآن مجید نے خود نہایت واضح طور پر اس امت کو خبردار کیا ہے کہ اس کی سرفرازی اسی میں ہے کہ وہ اس کتاب کو زندگی کے ہر معاملے میں اپنا رہنما بنائے، اس کی وحدت کو قائم رکھے اور یہود و نصاریٰ کی طرح اس کو پارہ پارہ نہ کردے، اس کتاب کو اللہ کا عہد سمجھتے ہوئے پوری امت یکسوئی کے ساتھ اسے نبھائے تاکہ اس کے اپنے اتحاد میں کوئی رخنہ نہ پڑنے پائے اور وہ اپنے اور اللہ کے دشمنوں کے لیے لقمۂ تر نہ بن جائے۔

امت اپنے دور زوال میں کتاب اللہ کی طرف سے عائد ہونے والی اپنی ذمہ داریوں کو بالکل بھلا بیٹھی ہے۔ قرآن مجید کو ایک کتاب ہدایت کی حیثیت سے پڑھنے کی ضرورت کا تو احساس ہی جیسے ختم ہو چکا ہے۔ اگر اسے پڑھا جاتا ہے تو عموماً ثواب کی خاطر، نہ کہ اس کی تعلیم سے واقف ہونے کی خاطر۔ جہاں تک دینی مدارس کا تعلق ہے ان میں طلبہ کو سالہا سال فقہ و کلام کی تعلیم دی جاتی ہے، حدیث کی تمام امہات کتاب کا دورہ کرایا جاتا ہے لیکن قرآن مجید کی طرف سے غفلت برتی جاتی ہے۔ اس کی تعلیم محض برائے بیت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نصاب میں سے گزرنے والے کسی شخص پر اور چیزوں کی اہمیت واضح ہونا تو ممکن ہے لیکن قرآن مجید کی عظمت اس پر واضح نہیں ہو سکتی۔ پھر لوگوں نے اپنی اپنی جماعتی و سیاسی ضرورتوں کے تحت جس طرح قرآن مجید میں سے منتخب نصاب ترتیب دے لیے ہیں اس سے یہ تاثر ملنا ناگزیر ہے کہ قرآن کا عطر تو انھوں نے نکال ہی لیا ہے، لہٰذا باقی قرآن میں کوئی چیز قابل توجہ نہیں۔ جن لوگوں کے ہاتھوں میں زمام اقتدار ہے وہ انفرادی زندگیوں میں نیکی کی کسی بات کو رواج دینے کے خواہش مند ہوں تو ہوں، اجتماعی زندگی میں وہ قرآنی ہدایت کے دخیل ہونے کو پسند نہیں کرتے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ امت گروہوں میں بٹ گئی ہے۔ ہر گروہ کی اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ ہے، اتحاد پارہ پارہ ہو گیا ہے اور وحدت کی جگہ بغض و عناد اور تعصبات نے لے لی ہے۔ قرآن مجید نے ہمیں خبردار کیا تھا کہ یہود و نصاریٰ نے اپنی کتاب کے

Marfat.com

بعض حصوں کو نظر انداز کیا تو ان کے اندر اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے عداوت و بغض ڈال دیا، تم یہ غلطی نہ کرنا۔ لیکن افسوس ہمارے ہاں بھی یہی غلطی کی گئی ہے اور اس کی اصلاح سے لوگ غافل ہیں۔

مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ نے زوال امت کے اس بڑے سبب کو سمجھا اور اصلاح احوال کے لیے یہ کوشش کی کہ قرآن مجید کو ہر معاملے میں اس کا صحیح مقام دیا جائے۔ ہماری بد قسمتی یہ ہے کہ اول تو لوگ ان کے نام اور کام ہی سے واقف نہیں اور اگر ان کے بارے میں کچھ سن رکھا ہے تو گروہی عصبیتوں کے باعث ان سے بد کے ہوئے ہیں۔ مولانا فراہی رحمہ اللہ نے جو فکر دیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید کلام اللہ ہونے کی حیثیت سے دوسری ہر چیز پر حاکم ہے، لہٰذا دوسرے تمام علوم قرآن کے تابع ہیں۔ ہر وہ علم جس کا تعلق قرآن کے موضوع سے ہے، اسی سے مستنبط ہونا چاہیے۔ اس کی بنیادیں قرآن کی دی ہوئی ہدایت پر استوار ہونی چاہئیں، چناں چہ فقہ ہو یا کلام، فلسفہ ہو یا دوسرے عمرانی علوم، مولانا فراہی ہر علم کو اسی بنیاد پر جانچتے ہیں جو قرآن مجید نے مہیا کی ہے۔ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے نزدیک دین کی بنیادوں میں سے ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے احکام خود قرآن ہی سے مستنبط ہیں۔ علم روایت حدیث میں محدثین کی خدمات کو مولانا فراہی رحمہ اللہ قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ البتہ روایت میں چوں کہ انسانی کوششوں کو دخل ہے، یہ قرآن کی طرح محفوظ نہیں اور محدثین کے اصول کے مطابق اس میں صدق و کذب دونوں کا احتمال ہوتا ہے، اس لیے مولانا فراہی رحمہ اللہ اس بات کے قائل ہیں کہ روایت کو قرآن پر پرکھنا چاہیے اور قرآن پر حاکم نہیں بلکہ اس کا محکوم ہونا چاہیے۔ ان کی مطبوعہ کتابوں یا غیر مطبوعہ مسودات میں قرآن کی بالاتری کا پیغام نہایت واضح ہے۔

فکر فراہی کو مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ نے جس طرح اپنایا اور وسیع دائروں میں اس کا اطلاق کیا ہے وہ ان کی تفسیر تدبر قرآن اور دوسری تصنیفات سے واضح ہے۔ ہر موضوع میں قرآنی تعلیمات سے انھوں نے جس طرح بنیادیں فراہم کی ہیں اس سے اس موضوع کو ایک نیا اور محکم قالب ملا ہے۔ ان کی کتاب تزکیہ نفس اور فلسفہ کے مضامین دیکھیے، ہر ایک میں قرآنی بنیادوں کو مان کر جو عمارت تعمیر ہوئی ہے وہ کتنی عالی شان ہے۔ اگر اسی طرز پر دوسرے جدید علوم پر کام کیا جائے تو بعید نہیں کہ مسلمان دنیا کو قرآن سے ماخوذ وہ متبادل علم مہیا کر دیں جس کے میدان میں موجود نہ ہونے کے باعث یہ علوم انسان کے لیے فتنہ اور خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ تفسیر تدبر قرآن نے قرآن کے استدلال کو جس طرح واضح کیا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ گروہی تعصبات اس تفسیر کی راہ میں مزاحم تو ہو سکتے ہیں لیکن اس کے دل نشین مباحث کے اثر کو کالعدم نہیں کر سکتے۔

ہمارے ہاں عموماً علمی بیداری نہیں پائی جاتی اس لیے بعض لوگ مولانا فراہی رحمہ اللہ کے فکر کو بالکل غلط طور پر پیش کرتے ہیں اور اس کو ماضی کے معتزلہ سے خوشہ چینی یا حال کے پرویزی فکر کی طرح کا کوئی فتنہ سمجھتے ہیں۔ انھیں یہ یاد نہیں رہتا کہ معتزلہ کے افکار سے واقف ہونے کا کوئی معتبر ذریعہ ہم تک منتقل نہیں ہوا۔ ایک تفسیر کشاف موجود ہے۔

Marfat.com

اس کا تقابل تدبر قرآن سے کیجیے تو کسی بھی پہلو سے دونوں میں کوئی مماثلت نہیں پائی جاتی۔ پرویزی فکر انکار سنت اور خود قرآن کے مسلمات سے انحراف پر مبنی ہے جب کہ تدبر قرآن کی ہر چیز قرآن کے الفاظ، اسلوب بیان، نظائر اور سیاق و سباق کے ساتھ اتنے گونا گوں واسطوں سے مربوط ہے کہ اس کو تفسیر بالرائے قرار دینے والوں کے علم کے کھوکھلے پن پر حیرت ہوتی ہے۔ اس تفسیر میں سنت کا اثبات ہے اور روایات حدیث کو قرآن کے تابع رکھ کر سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن کی عظمت کا تقاضا یہی ہے کہ ایسا کیا جائے۔ یہ بات صرف ان لوگوں کو کھلتی ہے جن کا اصل مدار روایت پر ہے۔ اول تو قرآن کو وہ کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں۔ اگر ہوں بھی تو روایت ان کے نزدیک قرآن پر حاکم ہوتی ہے، خواہ اس سے قرآن کا منشا بدل رہا ہو یا اس کی حفاظت مخدوش قرار پاتی ہو یا رسول اللہ ﷺ کی معصومیت پر حرف آتا ہو۔

فکر فراہی دین کی تمام بنیادوں کو مانتے ہوئے قرآن وحدیث، فقہ، کلام ہر چیز کو اس کی صحیح جگہ دینے کی ایک کوشش کا نام ہے۔ اس میں ہر بات دلیل سے کرنے کا رواج ڈالا گیا ہے۔ اس کی مخالفت اسی طرح کی جا سکتی ہے جس طرح ہر علمی چیز کی کی جا سکتی ہے۔ آپ دلیل کا جواب دلیل سے دیجیے، بحث کے لیے نکات اٹھائیے تو یہ اختلاف علم کی ترقی کا باعث اور ان شاء اللہ امت کے لیے باعث رحمت ہوگا۔ اس فکر کو غلط معنی پہنا کر اوچھا پروپیگنڈہ کیا جائے گا تو یہ وہ حرکت ہے جس کے لیے ہماری قوم کو متعصب اور تنگ نظر ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔

اسوۂ حسنہ

نبی ﷺ کفار کے لیے ایک چٹان کی طرح مضبوط، بھاری، ناقابل شکست اور سخت تھے، لیکن اہل ایمان کے لیے نہایت شفیق و مونس، نرم خو، ہر پہلو سے لچک قبول کرنے والے تھے۔ آپ ﷺ کی زندگی کے شب و روز خدا کی رضا طلبی میں گزرتے۔ خالق کے ساتھ تعلق نہایت محکم و استوار تھا۔ سجدوں کے نشان آپ کے چہرہ مبارک پر نمایاں تھے۔ یہی صفات ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں بھی اپنا پورا اثر ظاہر کرتی تھیں جو حضور ﷺ کی تربیت میں تھے۔ ظاہر ہے کہ یہی صفات ہر صاحب ایمان کی زندگی میں نمایاں نظر آنی چاہئیں جو حضور ﷺ کا نام لیوا ہے۔

(حیات رسول امی ﷺ، خالد مسعود رحمہ اللہ تلمیذ مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ، ص:596)

Marfat.com

امامِ فراہی رحمہ اللہ کا تصوّرِ حکمت

حکمت کا لفظ دانائی کی باتوں کے لیے ایک معروف لفظ ہے اور نہایت کثیر الاستعمال ہے لیکن مختلف علوم کے ماہرین اور اہل لغت اس کی تعبیر اتنے مختلف طریقوں سے کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ ایک عام لفظ کے اندر کتنا جہان معانی آباد ہے۔ اہل فلسفہ اور صوفیاء اپنی کاوشوں کو حکمت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اہل لغت اس کا مفہوم کچھ اور بیان کرتے ہیں۔ اہل تاویل کے مابین قرآن کے اندر لفظ حکمت کے معانی کے تعین میں بڑا اختلاف نظر آتا ہے۔ قرآن مجید میں یوں تو لفظ حکمت متعدد مقامات پر آیا ہے لیکن رسول اللہ ﷺ کے فرائض منصبی کے بیان میں تعلیم حکمت کی تکرار اس قدر نمایاں ہے کہ آدمی اس کی اہمیت سے صرف نظر نہیں کرسکتا۔ قرآن مجید کے ایک طالب علم کے لیے حکمت کے مفہوم کو سمجھنا از بس ضروری ہے۔

امام حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کا موضوع فکر قرآن حکیم تھا۔ اس کے ہر پہلو پر ان کی نظر تھی اور کسی بھی اہم لفظ یا مضمون پر سے وہ بلا تحقیق گزر جانے کے قائل نہ تھے۔ انھوں نے لفظ حکمت کی اہمیت کے پیش نظر اس کو بھی اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ اس کی لغوی تحقیق ان کی کتاب مفردات القرآن میں ہے جب کہ قرآن مجید میں اس لفظ کے استعمال پر انھوں نے اپنی ایک مستقل تصنیف حکمۃ القرآن میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ امام فراہی رحمہ اللہ کے نتائج تحقیق نہایت وقیع، فکر آفریں اور قرآنی مباحث کو سمجھنے کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

لفظ حکمت کے معنی:

لفظ حکمت مادہ ح ک م سے مشتق ہے۔ اسی مادے سے دوسرا اسم حکم ہے۔ لسان العرب میں حکم کے معنی العلم والفقہ والقضاء بالعدل یعنی علم، سوجھ بوجھ اور عدل کے مطابق فیصلہ کے آئے ہیں۔ تاج العروس میں اس کے معنی ہیں: القضاء فی الشی یعنی کسی معاملے کا فیصلہ کرنا۔ اس میں یہ وضاحت بھی آئی ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک اس لفظ کا اطلاق صرف اس فیصلے پر ہوتا ہے جو عدل کے ساتھ کیا جائے۔ امام فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک الفاظ کے لغوی معانی کے تعین کے لیے مرجع کی بہترین کتاب خود قرآن مجید ہے۔ اس کے استعمالات کی روشنی میں انھوں نے لفظ حکم کا اطلاق محض فیصلہ کرنے پر کیا ہے، خواہ یہ فیصلہ حق ہو یا باطل۔ اس معنی کے لیے ان کی رہنمائی جن آیات سے ہوئی وہ یہ ہیں:

Marfat.com

﴿مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ o﴾ (یونس: 35)

''تمہیں کیا ہوا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو۔''

﴿اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ﴾ (المائدہ: 50)

''کیا یہ جاہلیت کے فیصلہ کے طالب ہیں؟''

اول الذکر آیت مشرکین کی اس غلط رائے پر تعجب کا اظہار کرتی ہے جو وہ آخرت کے بارے میں ظاہر کرتے تھے۔ موخر الذکر آیت میں جاہلیت پر مبنی فیصلے پر لفظ حکم کا اطلاق کیا ہے۔ یہ فیصلہ، ظاہر ہے حق کے مطابق نہ تھا۔ امام فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک لفظ کا اصل مفہوم یہی تھا لیکن پھر اس کا اطلاق اس قوت پر بھی ہونے لگا جس کی بدولت آدمی صحیح فیصلے کرتا ہے۔

لفظ حکمة بھی مادہ ح ک م سے اسم ہے جس کے معانی لسان العرب میں معرفته افضل الاشیاء بافضل العلوم کے آئے ہیں یعنی اعلیٰ چیزوں کی پہچان بہترین علوم کے ذریعہ سے حاصل کرنا، دوسرے معنی عدل کے بتائے گئے ہیں۔ تاج العروس میں اس سے مراد العلم بحقائق الاشیاء علی ماهی علیه والعمل بمقتضاها یعنی اشیاء کی حقیقت کو ان کی اصلیت کے مطابق جاننا اور اس علم کے تقاضوں کے مطابق عمل کرنا ہے۔ حق کو علم وعمل دونوں کے لحاظ سے درست قرار دینا اور عدل سے فیصلہ کرنا بھی حکمت قرار دیا گیا ہے۔ جرجانی کے نزدیک ہر وہ بات جو حق کے موافق ہو حکمت کہلاتی ہے اور اس لفظ کا اطلاق اس علم پر بھی ہوتا ہے جس کے ساتھ عمل پایا جائے۔ راغب اصفہانی علم اور عقل سے حق کی مطابقت کو حکمت قرار دیتے ہیں۔ امام رازی رحمہ اللہ نے اس کی تعبیر قول وعمل کی درستی اور ہر شے کو اس کا مقام دینے سے کی ہے۔ امام فراہی رحمہ اللہ نے لفظ کے معانی کا تعین اولاً اہل عرب کے استعمالات کی روشنی میں کیا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق اہل عرب حکمت کا اطلاق اس قوت پر کرتے تھے جو عقل ورائے کی درستی اور اس سے پیدا ہونے والی اخلاقی شرافت کی جامع ہو۔ اسی لیے وہ ایک دانش مند اور مہذب آدمی کو حکیم کہتے تھے۔ لہٰذا امام فراہی رحمہ اللہ نے حکمت کی تعبیر اس قوت سے کی ہے جس کے باعث آدمی حق کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ اس قوت کے اثرات کلام کی حقانیت، اخلاق کی پاکیزگی اور حسن ادب کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ثانیاً امام فراہی رحمہ اللہ کے پیش نظر قرآن مجید کی وہ آیات بھی ہیں جن میں حکمت کے معانی کا تعین کیا گیا ہے مثلاً قرآن مجید میں حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا:

﴿وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ﴾ (ص: 20)

''اور ہم نے اس کو حکمت اور معاملات کے فیصلے کی صلاحیت عطا کی۔''

مولانا فراہی کے نزدیک الفاظ فصل الخطاب میں حکمت کا ایک اثر یہ بیان ہوا ہے کہ جہاں حکمت موجود ہوتی ہے وہاں حق پر مبنی دوٹوک بات کہی جاتی ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں بعض اخلاقی ہدایات دینے کے بعد فرمایا گیا ہے:

Marfat.com

﴿ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰی اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ﴾ (بنی اسرائیل: 39)

”یہ ان باتوں میں سے ہیں جو تمھارے رب نے حکمت میں سے، تمھاری طرف وحی کی ہیں۔“

اس سے معلوم ہوا کہ اعلیٰ اخلاق اور شریفانہ کردار بھی حکمت ہی کا ایک پرتو ہے۔ ان آیات کی روشنی میں امام فراہی رحمہ اللہ کی بتائی ہوئی حکمت کی تعریف کی تائید ہوتی ہے۔

حکمت کی خصوصیات:

مولانا رحمہ اللہ نے حکمت کی بعض خصوصیات بیان کر کے اس کے تصور کو قریب الفہم بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حکمت کی بات عقل و دل کے نزدیک نہایت بدیہی اور واضح ہوتی ہے۔ یہ اس قدر دل میں اتر جانے والی ہوتی ہے کہ اس کو ثابت کرنے کے لیے مزید دلائل کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ حکمت ایک نور ہے۔ جس طرح روشنی سے اردگرد کی تمام چیزیں جگمگا اٹھتی ہیں اسی طرح حکمت کے نور سے آدمی کا علم منور ہو جاتا ہے۔ پھر جس طرح آگ کا اثر حرارت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور ہر شخص اس کو محسوس کر لیتا ہے، اسی طرح حکمت بھی اپنے اثرات سے پہچانی جاتی ہے۔ جب یہ کسی شخص کے اندر پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے اندر حق شناسی کا ایک ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی زبان سے جو بات نکلتی ہے حق نکلتی ہے اور اس سے جو فعل صادر ہوتا ہے ٹھیک صادر ہوتا ہے، چناں چہ ایک حکیم آدمی کا دل اپنے اندر رفعت محسوس کرتا ہے، اس کا کلام نہایت دلنشین ہوتا ہے، اس کا عمل نیکی پر مبنی ہوتا ہے اور وہ اعلیٰ اخلاق کا مجسمہ ہوتا ہے۔

لوگوں میں عام طور پر یہ تصور پایا جاتا ہے کہ اہل فلسفہ حکمت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کو حکیم کہا بھی جاتا ہے لیکن امام فراہی رحمہ اللہ اس نقطۂ نظر کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک فلسفیوں نے علم اور عالم کو موضوع فکر تو ضرور بنایا لیکن بالعموم ان کے فکر کی کوئی مضبوط اساس نہ تھی۔ وہ اوہام کا شکار رہے اور علم کے اصل سرچشموں تک ان کی رسائی نہیں ہوئی۔ ارسطو تمام علوم کا احاطہ کر لینے کو حکمت کا نام دیتا تھا، حالاں کہ علوم کا احاطہ کسی بھی انسان کے بس میں نہیں۔ اس مخمصے سے نکلنے کے لیے اس نے علم کو کلیات کے علم تک محدود کرنے کی کوشش کی اور مابعد الطبیعیات کے علم کو اعلیٰ حکمت قرار دیا لیکن اس کے باوجود وہ ابتدائی وہم سے نہ نکل سکا۔ امام فراہی رحمہ اللہ عام علوم کو حکمت کا موضوع سمجھتے ہی نہیں۔ اس لیے مسلمان فلسفیوں...... اخوان الصفا، ابن سینا، الفارابی، الخوارزمی، الغزالی اور ابن خلدون...... کی علوم کی وہ تقسیم جس میں وہ پائیدار علوم کو حکمت کا نام دیتے ہیں، صحیح نہیں ہے۔

امام فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک ایک حکیم کے اندر حق کی جستجو کا مادہ اور جانچ پرکھ کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ باطل میں سے حق کو چھانٹ لیتا ہے۔ حق میں جو نورانیت ہوتی ہے اس کو حکیم کی فطرت کی بصیرت فوراً محسوس کر لیتی ہے۔ چوں کہ اس کائنات کا سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر بندے کا ایمان لانا ہے، اس لیے مولانا فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک ایک حکیم کی پہلی شناخت اس کا ایمان ہے۔ وہ اس حق کو پہچانے، اس پر اس کا دل مطمئن

Marfat.com

ہو جائے، وہ ہر باطل سے دست کش ہو جائے اور عمل صالح کو اختیار کرلے تو وہ بلاشبہ ایک حکیم ہے۔ اگر وہ ایمان تک نہ پہنچ سکا تو دوسرے علوم وفنون میں اس کی مہارت کی بدولت اس کو حکیم قرار نہیں دیا جاسکتا۔

سلف میں حکمت کے مفہوم پر اختلاف کی وجہ:

سلف صالحین کے دور میں حکمت کے قرآنی مفہوم کے تعین میں اختلاف واقع ہوا ہے جس کی تفصیل تفسیر کی کتابوں میں ملتی ہے۔ امام فراہی رحمہ اللہ کے پیش نظر یہ اختلاف تھا اور انھوں نے اس کو رفع کرنے کی نہایت عمدہ کوشش کی ہے۔ روایات میں آیا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ اور ابو رزین کی رائے میں حکمت سے مراد دین کی سوجھ بوجھ اور ایسا فہم ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور ہوتا ہے۔ مجاہد نے اس کو قرآن کے فہم کے لیے مخصوص کیا ہے۔ یحییٰ بن معاذ کی رائے میں حکمت اللہ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے جس کو وہ عارفین کے دلوں کی طرف بھیجتا ہے تاکہ ان پر دنیا کے مضر اثرات کا ازالہ کرے۔ ابن زید کے نزدیک ہر وہ بات حکمت کی بات ہے جو آدمی کو تنبیہ کرے، اس کو کسی نیکی کی طرف بلائے یا کسی برے کام سے روکے۔ ابو جعفر بن یعقوب ہر اس بات کو حکمت قرار دیتے ہیں جس سے صحیح فعل پیدا ہو۔ مقاتل کی رائے میں علم اور اس کے مطابق عمل کا نام حکمت ہے۔ امام فراہی رحمہ اللہ نے ان تمام اقوال کا حوالہ دے کر ان کو ایک ہی حقیقت کی مختلف انداز سے ترجمانی قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک حکمت سب سے پہلے انسان کے دل میں بطور بصیرت وتوفیق ظاہر ہوتی ہے۔ دل منور ہوتا ہے تو اس کا اثر کلام پر پڑتا ہے، چناں چہ حکمت کا اظہار انسان کے کلام سے ہونے لگتا ہے۔ وہ حق بات کہتا، نیکی کی تعلیم دیتا اور بدی سے روکتا ہے۔ اس کے بعد حکمت انسان کے عمل سے ظاہر ہوتی ہے تو وہ اخلاق فاضلہ کو اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح اس کے علم اور عمل میں کامل مطابقت ہو جاتی ہے۔ امام فراہی رحمہ اللہ کی اس تقریر کی روشنی میں مالک، ابو رزین، مجاہد اور یحییٰ بن معاذ حکمت کے اولین مقام دل کے حوالے سے اس کی وضاحت کرتے ہیں، ابن زید اور محمد بن یعقوب نے کلام میں اس کے اثر کو نمایاں کیا ہے اور مقاتل نے علم وعمل دونوں میں حکمت کے اثرات کا حوالہ دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے فرائض میں تعلیم حکمت:

قرآن مجید میں نبی ﷺ کے فرائض منصبی کے ضمن میں تعلیم کتاب وحکمت کا ذکر بہت نمایاں ہے۔ اس کی تفسیر میں تعلیم کتاب کے لیے بالعموم مفسرین کا ذہن قرآن مجید کی طرف گیا ہے لیکن تعلیم حکمت کے لیے وہ کسی بات پر اتفاق نہیں کرتے۔ بہت سے لوگ، جن میں امام شافعی رحمہ اللہ سرفہرست ہیں، یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہاں حکمت سے مراد سنت رسول اللہ ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جب کتاب اور حکمت کے الفاظ ساتھ ساتھ آ رہے ہیں تو لازم ہے کہ ان سے دو مختلف چیزیں مراد لی جائیں۔ چوں کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور آپ ﷺ کے احکام کا اتباع فرض ہے، اس لیے آنحضرت ﷺ کی سنت ہی ایسی چیز ہو سکتی ہے جس کا ذکر کتاب اللہ کے ساتھ کیا جائے، لہٰذا حکمت سے مراد سنت رسول اللہ ہے۔ امام فراہی رحمہ اللہ نے اس نقطہ نظر سے اختلاف کیا ہے اور اس کو بحث کا موضوع

Marfat.com

بنایا ہے۔ انھوں نے قرآن مجید کی دو آیات ایسی پیش کی ہیں جن میں کتاب اور حکمت کے الفاظ ایک ساتھ آئے ہیں لیکن وہاں حکمت سے مراد سنت کو ہرگز نہیں لیا جاسکتا۔ وہ آیات یوں ہیں:

﴿وَ اَنۡزَلَ اللّٰہُ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ عَلَّمَکَ مَا لَمۡ تَکُنۡ تَعۡلَمُ﴾ (النساء: 113)

''اور اللہ نے تم پر کتاب وحکمت نازل فرمائی اور تمھیں وہ چیز سکھائی جو تم نہیں جانتے تھے۔''

﴿وَاذۡکُرۡنَ مَا یُتۡلٰی فِیۡ بُیُوۡتِکُنَّ مِنۡ اٰیٰتِ اللّٰہِ وَ الۡحِکۡمَۃِ﴾ (الاحزاب: 34)

''اور تمھارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت کی جو تعلیم ہوتی ہے اس کا چرچا کرو۔''

ان آیات میں حکمت کے لیے فعل انزل اور یُتْلٰی استعمال ہوئے ہیں جو قرآن میں صرف وحی آسمانی کے لیے آئے ہیں۔ آنحضرت ﷺ پر وحی نازل ہوتی اور اسی کی تلاوت آپ کی ازواج مطہرات کے گھروں میں ہوا کرتی تھی۔ یہ دونوں فعل کہیں بھی نبی ﷺ کے ارشادات وافعال کے لیے استعمال نہیں ہوئے۔ مولانا فراہی رحمہ اللہ کا مزید استدلال یہ ہے کہ حدیث رسول ﷺ دانش وموعظت کے مضامین کے لیے خاص نہیں بلکہ احکام شریعت کی حامل بھی ہوسکتی ہے۔ اگر اس کا تعلق قانون سے ہو تو اس صورت میں اس پر حکمت کے لفظ کا اطلاق بالکل نامناسب ہوگا۔ مزید برآں قرآن مجید نے اپنی تعلیم کے اندر پائے جانے والے اصول دین کو سورہ بنی اسرائیل آیت 39 میں خود حکمت سے موسوم کیا ہے، لہٰذا یہ ہرگز ضروری نہیں کہ حکمت سے مراد قرآن سے باہر کی کوئی چیز سمجھی جائے۔ مولانا رحمہ اللہ کے نزدیک ''کتاب'' سے قرآن مجید کے ایک ضابطۂ شریعت ہونے کا مفہوم نکلتا ہے اور حکمت یہ اس اعتبار سے ہے کہ اس میں شریعت کی حکمت، صحیح عقائد اور عمدہ اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس مضمون کی دلیل سورہ آل عمران میں ہے۔ فرمایا:

﴿وَ یُعَلِّمُہُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ التَّوۡرٰىۃَ وَ الۡاِنۡجِیۡلَ﴾ (آل عمران: 48)

''اور اللہ اس کو کتاب اور حکمت، تورات اور انجیل سکھائے گا۔''

اس آیت میں کتاب اور حکمت کی تفسیر تورات اور انجیل سے کی گئی ہے۔ تورات ایک ضابطۂ شریعت تھی جس کی تعلیم ایک ایسی قوم کے لیے مناسب تھی جو ابھی عالم طفولیت میں تھی۔ اس کی ذہنی وقلبی استعداد اس سے زیادہ کی متحمل نہ ہوسکتی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے تو ان کو انجیل عطا کی گئی جس کے متعلق خود انھوں نے یہ وضاحت کر دی کہ یہ صحیفۂ حکمت ہے۔

﴿وَلَمَّا جَآءَ عِیۡسٰی بِالۡبَیِّنٰتِ قَالَ قَدۡ جِئۡتُکُمۡ بِالۡحِکۡمَۃِ﴾ (الزخرف: 63)

''اور جب عیسیٰ کھلی نشانیوں کے ساتھ آیا تو اس نے دعوت دی کہ میں تمھارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تعلیم حکمت کے لیے تمثیلات کے اسلوب کا سہارا لیا۔ تاہم انجیل کی تعلیم بھی ادھوری تھی کیوں کہ بنی اسرائیل کی ذہنی استعداد ابھی تک کامل حکمت کے تحمل کے لائق نہ ہوئی تھی، چناں چہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے

Marfat.com

اپنی قوم کو یہ واضح پیغام دیا کہ مجھے تم سے بہت سی باتیں کہنی ہیں لیکن تم ان سب کا تحمل نہ کرسکو گے۔ لہٰذا اب میں جاتا ہوں اور میرے بعد جو آئے گا وہ تمھیں ان باتوں کی تعلیم بھی دے گا جن کی تعلیم میں تمھیں نہ دے سکا۔ یہ بعد میں آنے والے محمد رسول اللہ ﷺ تھے اور آپ کے پاس وہ صحیفۂ ہدایت تھا جو ضابطۂ شریعت اور حکمت دین دونوں کا جامع ہے۔ اس میں ایک طرف حرام وحلال کی تمام حدود نہایت واضح اور متعین ہیں تو دوسری طرف یہ ایک عمیق فلسفہ اور گہری حکمت بھی رکھتا ہے۔ مولانا فراہی کے نزدیک کتاب وحکمت کے الفاظ استعمال کرنے سے قرآن مجید کی اسی حیثیت کو واضح کرنا مقصود ہے۔

اس استدلال کی روشنی میں امام فراہی رحمہ اللہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ کی رائے خطا پر مبنی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ حدیث رسول ﷺ نہ صرف حکمت کی حامل ہوتی ہے بلکہ قرآن کی حکمت کی وضاحت بھی کرتی ہے۔ مولانا فراہی رحمہ اللہ جہاں اسلاف میں سے کسی کو تنقید کا نشانہ بنائیں تو ان کا رجحان طبع یہ ہوتا ہے کہ وہ ان سے حسن ظن کو مجروح نہ ہونے دیں۔ چناں چہ امام شافعی رحمہ اللہ کی رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امام صاحب کے زمانہ میں لوگ قرآن کی تاویل غلط عقلیات کی روشنی میں کرنے لگ گئے تھے جس سے آیات کا مفہوم کہاں سے کہاں سے جانکلتا تھا۔ امام صاحب نے ایسے لوگوں پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی کہ فہم کتاب سنت رسول ﷺ کی پیروی سے حاصل ہوتا ہے کیوں کہ سنت ہی کتاب اللہ کی تبیین کرتی ہے، ورنہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اسی کتاب الرسالة میں جہاں یہ بحث لکھی ہے، مقدمہ کتاب میں علم کو قرآن مجید کے علم پر منحصر مانا اور بتایا ہے کہ دل اگر منور ہوتا ہے تو حکمت کے نور سے منور ہوتا ہے اور یہ حکمت کتاب اللہ کے علم اور اس کے مطابق عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

تحصیل حکمت کی تدابیر:

مولانا فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک انسان کی دو بنیادی صفات، اس کی قوت فکر اور قوت ارادہ ہیں۔ قوت فکر کے ذریعے وہ ان نشانیوں سے استدلال کرسکتا ہے جن سے آفاق وانفس بھرے پڑے ہیں اور قوت ارادہ کی بدولت وہ خیر وسعادت کے کاموں کو اختیار کرتا ہے۔ حکمت اس شخص کو حاصل ہوتی ہے جو غور وفکر کے ذریعے حاصل ہونے والے علم اور ارادے کی قوتوں میں موافقت پیدا کرلے۔ حکمت کا منبع انسان کے خارج میں نہیں ہوتا بلکہ اس کی ذات کے اندر اور اس کی فطرت میں ہوتا ہے۔ اس لیے حکمت کے طالب کو اپنے نفس کی طرف رجوع کرنا ضروری ہوتا ہے۔ حکمت کا تحمل یک بارگی نہیں ہوتا بلکہ بتدریج ہوتا ہے۔ یہ عمل بالکل اسی طرح کا ہوتا ہے جس طرح ایک نقشے کے مطابق کسی عمارت کی تعمیر درجہ بدرجہ مکمل ہوتی ہے۔

مولانا فراہی رحمہ اللہ دل کے خشوع کو وہ دروازہ قرار دیتے ہیں جس کے راستے حکمت دل میں داخل ہوکر اس کو زندگی بخشتی ہے۔ خشوع رکھنے والے شخص کو یہ احساس ہوتا ہے کہ دنیا ایک مقصد کے تحت وجود میں آئی ہے، اس کو پیدا

Marfat.com

کرنے والا عادل اور پاکیزہ رب ہے جب کہ انسان غلطی کا ارتکاب کرنے والا، بھٹک جانے والا اور سرکشی اختیار کرنے والا ہے۔ اس احساس سے آدمی میں خشیت پیدا ہوتی ہے، وہ خلوت وجلوت میں حدود الٰہی کی پابندی اختیار کرتا اور خواہشات نفس کی پیروی سے باز رہتا ہے۔ ان صفات سے اس کا قلب صاف اور حکمت کے نور سے مستنیر ہونے کے لیے تیار رہتا ہے۔

حصول حکمت کے لیے جو چیزیں نہایت اہم ہیں وہ ذکر الٰہی، تلاوت قرآن، اللہ کے بندوں پر شفقت اور ان کے لیے جذبہ ترحم ہیں۔ قرآن حکیم حکمت کا سب سے بڑا خزانہ ہے لیکن اس کے اندر حکمت کے موتی تلاش کرنے کے لیے غور وتدبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ حصول حکمت کی تگ ودو کے لیے انسان جو ذرائع بھی اختیار کرے لیکن مولانا فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک اس کے حصول میں کامیابی اللہ تعالیٰ کی توفیق پر منحصر ہے۔ حکمت اللہ تعالیٰ کی وہ عطائے خاص ہے جس کے سیکھنے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں۔

کتاب حکمت القرآن:

مولانا فراہی رحمہ اللہ کی کتاب حکمة القرآن ابھی تک طبع نہیں ہوئی۔ اس کا غیر مرتب مسودہ موجود ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا رحمہ اللہ اس کو شاید چار حصوں میں لکھنا چاہتے تھے مگر کام صرف تین حصوں پر ہو سکا۔ مسودے کے پہلے حصے میں حکمت کا مفہوم اور اس کی خصوصیات، حکمت اور ایمان کا تعلق، حکمت کی تعلیم اور اس کے حصول کا طریقہ پر چند فصلیں لکھی گئی ہیں۔ دوسرے حصے میں مولانا رحمہ اللہ نے واضح کیا ہے کہ قرآن حکمت کا سب سے بڑا خزانہ اور اس کا اصل منبع ہے لیکن حکمت اس کے نظم میں پوشیدہ ہے۔ نظم قرآن تک رسائی کے لیے وسیلہ بھی حکمت ہی ہے۔ حکمت کے بغیر آدمی یا تو نظم قرآن کا انکار کر دیتا ہے یا اس سے بعد محسوس کرتا ہے۔ کتاب کے اسی حصے میں مولانا رحمہ اللہ نے واضح کیا ہے کہ ایک حکیم آدمی کی صفات کیا ہوتی ہیں۔ تیسرے حصے میں امام فراہی رحمہ اللہ دین اسلام کا مبنی بر حکمت نظام بیان کرنا چاہتے تھے چنانچہ انھوں نے اس کا الگ نام تجویز کیا۔ النظام فی الدیانة الاسلامیة۔ اس میں دین کا اندرونی نظام، مختلف اجزاء کی باہمی موافقت اور خارج کے ساتھ اس کا تعلق بتایا گیا ہے۔ ان تینوں حصوں میں انھوں نے اپنے طریقہ کے مطابق فصلیں تو سپرد قلم کر دیں لیکن بعض نا تمام چھوڑی ہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ حکمت قرآن کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

Marfat.com

حدیث وسنّت کی تحقیق کا فراہی منہاج

امام حمید الدین فراہی رحمہ اللہ نے قرآن حکیم کو اپنے فکر کا مرکز ومحور بنایا اور اس صحیفۂ آسمانی پر راست طریقے سے غور وتدبر کے اصول وضع کیے جن میں اصل اہمیت لغت کے تتبع، نظائر قرآنی کی تلاش، آیات کے سیاق وسباق اور سورتوں کے نظم کو دی گئی۔ ان کے نزدیک ان اصولوں پر مبنی تفسیر قرآن کے حقیقی مدعا سے قریب تر ہوتی ہے اور اس کے ذریعے تاویل قرآن کے اختلاف کو بے حد کم کیا جاسکتا ہے۔ امت اگر اس طریقۂ تفسیر کو اختیار کرلے تو اس کے نتیجے میں فرقہ پرستی کی لعنت کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس روایت پر مبنی طریقۂ تفسیر مفہوم کی کثرت تعبیر کے سبب سے ذہنوں کو پراگندہ کرتا اور امت کے اختلافات کو مہمیز دیتا ہے۔ چوں کہ برصغیر پاک وہند میں جن تفاسیر پر زیادہ اعتماد ہے، ان کا انحصار روایات پر ہے اور انھی کی مدد سے اردو کی بیشتر تفسیریں لکھی گئیں، اس لیے ہمارے دینی طبقوں میں یہ مفروضہ راہ پا گیا کہ تفسیر وہی معتبر ہے جو روایات پر مبنی ہو، چناں چہ مولانا فراہی رحمہ اللہ کا طریقہ یہاں کے علماء کو بیگانہ نظر آیا۔ رائج طریقے سے ہٹ کر کسی نئے طریقے کو اپنانا آسان نہیں ہوتا، اس لیے فراہی طریقۂ تفسیر کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا ہونا بالکل قرین فہم ہے۔ البتہ جو بات ناروا ہے وہ بعض طبقوں کا نہایت بے جا اور بلاجواز یہ الزام ہے کہ مولانا فراہی رحمہ اللہ کا مسلک انکار حدیث سے قریب ہے، چناں چہ اس کے بارے میں وہی لب ولہجہ اختیار کیا گیا جو فتنۂ انکار حدیث کے لیے اختیار کیا گیا۔

1941ء میں رسالہ البیان امرتسر نے مقدمہ نظام القرآن کی بعض فصلوں کی روشنی میں مولانا فراہی رحمہ اللہ پر انکار سنت کا الزام عائد کیا۔ اس تحریر کو مزید رنگ دے کر رسالہ طلوع اسلام دہلی نے ایک مضمون ''شاہ ولی اللہ اور قرآن وحدیث'' میں سمویا اور اس الزام کی تائید میں مولانا فراہی رحمہ اللہ کی مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ کے ساتھ حدیث کے موضوع پر ایک تکرار کا حوالہ دیا۔ اس مضمون سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ خدانخواستہ مولانا فراہی رحمہ اللہ بھی انکار سنت میں ان لوگوں کے ہم مسلک تھے۔ اس مضمون کا مفصل جواب مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ نے ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کے فروری 1942ء کے شمارے میں شائع شدہ اپنے مضمون ''مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ اور علم حدیث'' میں دیا۔ اس مضمون میں انھوں نے دکھایا کہ البیان نے کس طرح مولانا فراہی رحمہ اللہ کی تحریروں کو مسخ کرکے اپنے معانی پہنائے اور ضعیف تفسیری روایات پر ان کے تبصرے کو پورے ذخیرۂ حدیث پر تبصرے کی حیثیت سے پیش کیا جو ایک

Marfat.com

خلاف حقیقت بات تھی۔ اس مضمون میں مولانا اصلاحی رحمہ اللہ نے مولانا سندھی رحمہ اللہ کے ساتھ مولانا فراہی رحمہ اللہ کی بحث کے بارے میں بھی واضح کیا کہ یہ بحث حدیث کے انکار و قبول سے متعلق نہ تھی بلکہ اخبار احاد کی حیثیت کے بارے میں تھی جس میں بالآخر مولانا سندھی رحمہ اللہ نے مولانا فراہی رحمہ اللہ کا موقف سمجھ لیا تھا اور بحث ختم ہوگئی تھی۔ مجموعہ تفاسیر فراھی میں اپنے استاذ گرامی کے حالات میں مولانا اصلاحی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ معارف میں شائع شدہ ان کے مضمون کی اشاعت کے بعد جب ان کی ملاقات مولانا سندھی رحمہ اللہ سے ہوئی تو ان سے اس مضمون کا ذکر بھی ہوا جس پر انھوں نے بار بار اس بات پر تاسف کا اظہار کیا کہ طلوع اسلام کی روایت سے ان کے محبوب دوست کے متعلق بدگمانی پیدا ہوئی۔

مولانا امین احسن رحمہ اللہ کی تفسیر تدبر قرآن کی اشاعت کے بعد جہاں متعدد اہل علم نے مولانا رحمہ اللہ کو قرآن کی اس خدمت پر مبارک باد دی کہ انھوں نے مولانا فراہی رحمہ اللہ کے طریقے پر عصر حاضر کی ایک عظیم تفسیر لکھ ڈالی جو ہر غور و تدبر کرنے والے شخص کے لیے بہت بڑی نعمت ہے، وہیں بعض حلقوں میں اسی قدیم الزام کی بازگشت سنی گئی کہ فراہی فکر کے ڈانڈے فتنۂ انکار حدیث کے ساتھ جا ملتے ہیں۔ اس الزام کا ایک جواب تو مولانا اصلاحی رحمہ اللہ کی کتاب "مبادی تدبر حدیث" اور ان کے وہ دروس ہیں جو موطا امام مالک رحمہ اللہ اور صحیح بخاری کی شرح کی صورت میں مسلسل شائع ہو چکے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ فکر فراہی کے خوشہ چیں حدیث کا انکار نہیں کرتے بلکہ ان کی مشکلات کو حل کرنے کی اسی طرح راہ ہموار کر رہے ہیں جس طرح انھوں نے قرآن کی تفسیر کے معاملے میں کی ہے۔ تاہم ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس فکر کے امام، مولانا فراہی رحمہ اللہ کے نقطۂ نظر کو وضاحت کے ساتھ بیان کر کے ان کے دامن پر سے انکار حدیث کے الزام کا داغ دھو دیا جائے۔

چوں کہ مولانا فراہی رحمہ اللہ ہمہ تن قرآن مجید کی غواصی میں مشغول رہے، انھوں نے علم حدیث پر کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی۔ اگر وہ حدیث کو موضوع بناتے تو اپنے طریقے کے مطابق وہ اس کے مطالعے کے لیے بھی یقیناً نہایت اہم نشان راہ متعین کر دیتے۔ اس وقت ہمیں ان کے نقطۂ نظر کی تحقیق کے لیے ان کتابوں کا سہارا لینا ہوگا جن میں انھوں نے ضمناً حدیث پر کچھ لکھا ہے۔ اس میں کچھ مدد ہمیں مقدمہ نظام القرآن سے مل سکتی ہے، چند اشارات بعض سورتوں کی تفسیر میں ملتے ہیں اور کچھ مباحث ان کی دو کتابوں...... اصول التاویل اور احکام الاصول...... میں آ گئے ہیں۔

سنت کی حیثیت:

کتاب احکام الاصول میں مولانا فراہی رحمہ اللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریعی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شریعت کی تعلیم کے لیے مبعوث فرمایا تو حکمت اور اسرار شریعت کی تعلیم بھی آپ کے فرائض منصبی میں داخل کر دی تا کہ امت اجتہاد کے قابل ہو سکے۔ اپنی عقلوں کو استعمال کرنا سیکھے اور ظاہری

Marfat.com

وباطنی دلائل سے استدلال کر سکے۔ پس حضور ﷺ ہمارے لیے کتاب اللہ کی تبیین کرتے تھے تاکہ ہم پر قرآن کے اشارات پر تفکر وتدبر کا منہاج واضح ہو۔''

مقدمہ نظام القرآن کی فصل بعنوان ''معروف ومنکر'' میں لکھتے ہیں:

''نبی کی روح بیدار خود بھی معروف ومنکر کی شناخت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ جن چیزوں کے بارے میں وحی کی رہنمائی موجود نہیں ہوتی ان میں وہ اپنے الہام سے امت کو کوئی حکم اس وقت تک کے لیے دے دیتا ہے جب تک وحی نہ آجائے اور یہ کام اس کے منصب کا ایک قدرتی جزو ہوتا ہے۔''

احکام الاصول میں انھوں نے نبی ﷺ کی اس روح بیدار کا سرچشمہ اس خاص نور وحکمت کو قرار دیا ہے جس کا حوالہ سورہ شوریٰ میں آیا ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾

(الشوری: 52)

''اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف بھی وحی کی ہے ایک روح...... اپنے امر میں سے۔ نہ تم یہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہے، لیکن ہم نے اس کو ایک نور بنایا جس سے ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں۔ اور بے شک تم ایک سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کر رہے ہو۔''

مولانا رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو قرآن مجید کی جہت مکنون کی طرف بھی رہنمائی فرمائی تھی۔ اس نے اس روح سے نبی ﷺ کے قلب کو زندگی بخشی اور اس نور کی ہدایت دے کر آپ کو وہ علم بخشا جو آپ کو پہلے حاصل نہ تھا۔ اس لیے آپ نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس کو سنت کی مستقل بنیاد سمجھا جائے گا۔''

''رسول اللہ ﷺ کا حکم یکساں طور پر پراز حکمت ہوتا ہے، خواہ وہ کتاب اللہ کی بنیاد پر ہو یا اس نور وحکمت کے مطابق جس سے خدا نے آپ ﷺ کا سینہ بھر دیا تھا۔''

ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کا منصب قرآن حکیم کی تبیین تھا۔ اس منصب کا تقاضا یہ بھی تھا کہ آپ ﷺ اپنی روح بیدار اور اس نور وحکمت کے باعث، جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی تھی، قرآن حکیم کے احکام کے علاوہ اپنے طور پر احکام دے سکتے تھے اور ان کی حیثیت وہی ہوتی جو وحی کے احکام کی ہوتی۔ یہی احکام ہیں جن سے سنت رسول ﷺ عبارت ہے۔ معلوم ہوا کہ مولانا فراہی رحمہ اللہ، رسول اللہ ﷺ کی تشریعی حیثیت کے اسی طرح قائل ہیں جس طرح امت کے اسلاف اور ائمہ دین قائل ہیں۔

امام فراہی رحمہ اللہ کا ایک نہایت اہم نکتہ جو سنت کے بارے میں ان کے نظریے کو واضح کرتا ہے، یہ ہے کہ اللہ

Marfat.com

تعالیٰ نے حفاظت قرآن کا جو ذمہ لے رکھا ہے اس میں وہ تمام اصطلاحات شرعیہ جن کا ذکر قرآن میں ہے، مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد، طواف صفا ومروہ، مسجد حرام وغیرہ شامل ہیں اور ان کا مفہوم نبی ﷺ کی سنت سے واضح ہوا ہے اور وہ تواتر وتوارث کے ساتھ سلف سے خلف کو منتقل ہوا ہے۔ لہٰذا ان اصطلاحات کے معانی اسی طرح محفوظ ہیں جس طرح حضور ﷺ نے ان کی تعلیم دی تھی۔ جو نماز دین میں مطلوب ہے وہ وہی نماز ہے جو مسلمان آج پڑھتے ہیں۔ حج کا مفہوم دین میں وہی ہے جو آج مسلمانوں میں رائج ہے۔ ہر چند کہ نماز کی ہیئت یا حج کے فرائض وسنن میں بعض جزوی اختلافات نظر آتے ہیں لیکن یہ اختلافات نا قابل لحاظ ہیں۔ ان کا باعث یہ ہے کہ قرآن مجید میں ان اعمال کی پوری تعریف اور تصویر بیان نہیں ہوئی، اور لوگوں نے اخبار احاد پر بے جا اصرار کر کے ان اعمال کی الگ الگ شکلیں اختیار کر لیں۔

احکام الاصول میں اسی ضمن میں کہتے ہیں:

''سلف اور ائمہ نے اپنے مذہب کی صحت کی بدولت کتاب اور سنت دونوں کو مضبوطی سے پکڑا۔ یہ نہیں کیا کہ باطل پسندوں اور ملحدوں کی طرح ان میں تفریق کر کے ایک چیز کو ترک کر دیتے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ مولانا فراہی رحمہ اللہ سنت کے منکرین کو باطل پر سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک دین کا صحیح تقاضا یہ تھا کہ کتاب اور سنت دونوں کو لازم پکڑا جائے۔ ان میں تفریق پیدا کرنا یا سنت کا انکار کرنا ایک ملحدانہ روش ہے۔ ایک ایسے متقی شخص کو جس کے نزدیک انکار سنت ایک ملحدانہ روش ہو، انکار سنت کا الزام دینا انہی لوگوں کو زیب دیتا ہے جن کے دل خوف خدا سے خالی ہو چکے ہوں۔

حدیث کی حیثیت:

مولانا فراہی رحمہ اللہ کا نقطۂ نظر حدیث کے بارے میں یہ ہے کہ وہ قرآن کو اصل اور حدیث کو ایک فرع کی حیثیت دیتے ہیں اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ قرآن کی صحت قطعیت کے ساتھ ثابت ہے جب کہ روایت حدیث میں اس بات کا احتمال ہے کہ وہ صحیح طور پر محفوظ نہ کی گئی ہو۔ مقدمہ نظام القرآن میں تفسیر کے خبری ماخذ کے تحت لکھتے ہیں:

''اصل واساس کی حیثیت قرآن کو حاصل ہے، اس کے سوا کسی چیز کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ باقی فروع کی حیثیت سے تین ہیں۔ اول وہ احادیث نبویہ جن کو علمائے امت نے پایا، دوم قوموں کے وہ ثابت شدہ احوال جن پر امت نے اتفاق کیا، سوم گزشتہ انبیاء کے صحیفوں میں جو کچھ محفوظ رہ گیا ہے۔ اگر ان تینوں میں ظن اور شبہ کو دخل نہ ہوتا تو ہم ان کو فرع کے درجے میں نہ رکھتے بلکہ سب کی حیثیت اصل کی قرار پاتی۔''

''ایک اور قابل لحاظ حقیقت یہ ہے کہ قرآن سے جو کچھ ثابت ہے اس میں اور فروع سے جو کچھ معلوم ہو اس میں فرق کرنا چاہیے، دونوں کو خلط ملط نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ قرآن میں جو کچھ ہے وہ قطعی ثابت ہے اور فروع میں وہم وظن کی بہت کچھ گنجائش ہے۔''

Marfat.com

اس سے معلوم ہوا کہ ارشادات نبویہ کو دین وشریعت کی بنیاد ماننے اور سنت کی تشریعی حیثیت کے قائل ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا فراہی رحمہ اللہ روایت حدیث کو یہ حیثیت دینے کو اس لیے تیار نہیں کہ روایت میں غلطی کا احتمال ہوتا ہے اور اس طرح اس میں وہم وظن کو دخل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس سے ائمہ محدثین کو بھی انکار نہیں۔ اسی لیے تو انھیں روایات کو پرکھنے کے لیے روایت ودرایت کے اصول وضع کرنا پڑے اور راویوں کی جرح وتعدیل کے لیے فنون وجود میں آئے۔ اگر روایت حدیث میں ظن وشبہ کو دخل نہ ہوتا تو ان علوم وفنون میں سے کسی کی ضرورت نہ ہوتی۔

ائمہ محدثین کے نہایت ذمہ دارانہ نقطۂ نظر کے برعکس موجودہ زمانے کے بعض علماء حدیث کے بارے میں جو غلو کرتے ہیں اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا فراہی رحمہ اللہ مقدمہ نظام القرآن میں لکھتے ہیں:

''یہ ہمارے بعض بھائیوں کا غلو ہے کہ وہ حفاظت قرآن کی طرح حفاظت حدیث کے قائل ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ بخاری اور مسلم میں جو کچھ روایت ہوگیا ہے اس میں شک کرنے کی گنجائش نہیں، حالاں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی طرف منسوب متعدد روایتوں میں نہایت بھونڈا اختلاف نقل ہوا ہے۔''

''بعض روایات ایسی بھی نقل ہوگئی ہیں جو قرآن مجید کی اصل کو ڈھانے والی ہیں۔ ایسی روایات کو قبول کرنا خود قرآن کا انکار کرنا ہے۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ بہت سے لوگ قرآن کو اس کی اصل سے پھیر دیں گے لیکن روایت کی تاویل کی جرات نہیں کریں گے۔ اس کی خاطر بسا اوقات وہ صرف آیت کی غلط تاویل ہی پر بس نہیں کرتے بلکہ اس کے نظام کی قطع وبرید بھی کر ڈالتے ہیں، حالاں کہ جب اصل وفرع میں تعارض ہو تو کاٹنے کی چیز فرع ہوتی ہے نہ کہ اصل۔''

''بعض لوگ ایسی روایات تک کو قبول کر لیتے ہیں جو نصوص قرآنی کی تکذیب کرتی ہیں، مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تین جھوٹ بولنے کی روایت یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف وحی قرآن پڑھ دینے کی روایت۔''

ان اقتباسات کو جو شخص بھی غیر متعصب ہو کر پڑھے گا وہ یہ رائے قائم کرے گا کہ مولانا فراہی رحمہ اللہ جس چیز پر معترض ہیں وہ حقیقی ارشادات نبویہ نہیں بلکہ وہ روایات ہیں جو قرآن مجید سے متناقض یا اس کے منافی اور اس اصل کو ڈھانے والی یا اس کو جھٹلانے والی ہیں۔ وہ حدیث کی کتابوں میں نقل ہو جانے والی ہر روایت کے قرآن کی طرح محفوظ ہونے کے تصور کو غلو پر مبنی سمجھتے ہیں۔ یہ بات کہ بخاری اور مسلم کی تمام روایات ظن سے بالاتر نہیں ہیں کوئی نئی بات نہیں جو صرف مولانا فراہی رحمہ اللہ نے کہی ہو بلکہ یہ تمام ائمہ فن کے ہاں مسلم امر ہے۔ اس آسمان کے نیچے ظن سے بالاتر واحد کتاب قرآن مجید ہے۔

اسی طرح کے غلو کا نتیجہ بعض فقہاء متکلمین کا یہ خیال بھی ہے کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ اس خیال پر تبصرہ کرتے ہوئے احکام الاصول میں لکھتے ہیں:

''امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور محدثین بالعموم حدیث کو قرآن کے لیے ناسخ نہیں مانتے اگرچہ

Marfat.com

حدیث متواتر ہو۔ جب یہ ائمہ حدیث جو حدیث کے معاملے میں صاحب البیت کی حیثیت رکھتے ہیں اس بات کے قائل نہیں ہوئے تو ہم اس کے خلاف فقہاء و متکلمین کی رائے کو کوئی وزن نہیں دیتے۔ یہ ماننا کہ رسول، اللہ کے کلام کو منسوخ کرسکتا ہے، ایک فتنہ ہے جس سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔ اس طرح کے مواقع میں تمام تر دخل راویوں کے وہم اور ان کی غلطی کو ہے۔''

حدیث کے بارے میں یہ تو مولانا فراہی رحمہ اللہ کی اصولی آراء ہیں۔ جب وہ ان اصولوں پر روایات کو جانچتے ہیں تو بکثرت ایسی ضعیف روایات کو جن کی صحت پر محدثین کو کلام ہے، اس بنا پر قبول کر لیتے ہیں کہ وہ قرآن سے مطابقت رکھتی اور اس کی تصدیق و تائید کرتی ہیں، چناں چہ سورہ کوثر کی تفسیر میں حوض کوثر اور کثرتِ امت سے متعلق متعدد روایات کو انھوں نے بعینہ قبول کرلیا ہے۔ آیت ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ﴾ کے موقع نزول کے متعلق جس روایت میں امام سیوطی رحمہ اللہ نے غرابت ظاہر کی ہے، مولانا فراہی نے اس کو صحیح تسلیم کیا ہے اور لکھا ہے کہ امام سیوطی رحمہ اللہ کو جن اسباب کی بدولت یہ وہم ہوا، وہ غور و تامل کے بعد بے حقیقت ثابت ہوتا ہے۔ سورہ کافرون کی تفسیر میں ایک مستقل فصل اس موضوع پر لکھی ہے کہ ہجرت کے بعد جنگ اور براءت [1] ہونے کا ثبوت احادیث سے بھی ملتا ہے اور یہ موافقت قرآن کے اصول کے عین مطابق ہے۔

مولانا فراہی رحمہ اللہ کی کتابوں میں جابجا ایسی تحریریں ملتی ہیں جن سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ حدیث کی تحقیق میں کن اصولوں کو مدنظر رکھتے تھے۔ ہم اس کی وضاحت کے لیے ان اصولوں کو چار عنوانات کے تحت لا سکتے ہیں:

(الف) احکام کی احادیث　　(ب) تفسیری روایات

(ج) اسرائیلیات　　(د) اخبار آحاد

الف۔ احکام کی احادیث:

سورہ نساء کی آیت 105

﴿إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ الْكِتَٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ اللَّهُ﴾ (النساء: 105)

''ہم نے یہ کتاب تم پر حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تمھیں دکھایا ہے۔''

کی روشنی میں مولانا فراہی رحمہ اللہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ قرآن مجید میں جس معاملہ میں کوئی حکم موجود ہوتا نبی ﷺ مامور تھے کہ اسی کی روشنی میں فیصلہ فرماتے۔ یہ جائز نہ تھا کہ آپ کتاب اللہ کی رہنمائی کے بغیر کوئی فیصلہ صادر کریں، چناں چہ احکام کی بہت سی حدیثیں آیات قرآنی سے ماخوذ و مستنبط ہیں۔ وہ قرآن پر اضافہ نہیں کرتیں بلکہ کسی ایسے گہرے معاملے کی تصریح کردیتی ہیں جو اگرچہ قرآن کی آیت میں موجود تھا لیکن تدبر نہ کرنے والے پر مخفی رہ سکتا تھا۔

[1] براءت: بری یا الگ ہونا۔ غرابت: غریب یا اجنبی ہونا۔

Marfat.com

مولانا فراہی رحمہ اللہ نے اس موضوع پر اپنی مستقل تصنیف احکام الاصول میں یہ دکھایا ہے کہ قیامت کے دن رویت باری تعالیٰ کے اثبات، ترکہ میں وصیت کا حکم باقی ہونے، مقدار وصیت کے ایک ثلث مال تک محدود ہونے، خالہ اور پھوپھی کے محرمات میں سے ہونے اور ماں کے حقوق باپ سے زیادہ ہونے کی احادیث قرآنی نصوص سے کس طرح مستنبط ہیں۔ اسی طرح حضور ﷺ نے ماعز اسلمی کو جو رجم کروایا، وہ سورہ مائدہ کی آیت محاربہ سے مستنبط تھا۔ مولانا رحمہ اللہ پورے اطمینان سے لکھتے ہیں کہ مجھے احکام کی بیشتر احادیث کی بنیادیں قرآن میں تلاش کرنے میں کامیابی ہوئی ہے۔ اس کی مزید وضاحت وہ یوں کرتے ہیں کہ بسا اوقات حضور ﷺ خود اس بات کی تصریح فرما دیا کرتے کہ میرا یہ حکم فلاں آیت سے ماخوذ ہے۔ جہاں آپ ﷺ نے اس طرح کی تصریح نہیں فرمائی وہاں غور وتدبر سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ ﷺ نے کن آیات کی روشنی میں کوئی حکم دیا۔ اس کے بعد مولانا فراہی رحمہ اللہ یہ اصول قائم کرتے ہیں کہ اگر کسی حکم کا ماخذ قرآن میں متعین نہ کیا جا سکے اور حدیث کا حکم قرآن کے خلاف نہ ہو بلکہ اس پر اضافہ ہو تو یہ اضافہ اس بنا پر قبول کر لیا جائے گا کہ وہ اس نور وبصیرت کا نتیجہ ہے جو حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور خاص عطا ہوئی تھی۔ ایسے احکام کو سنت میں مستقل اصل قرار دیا جائے گا کیوں کہ ہمیں اطاعت رسول ﷺ کا حکم دیا گیا ہے۔ احکام کی ایسی روایات جن کی بنیاد نہ قرآن میں ملتی ہو اور نہ اس اضافے کا قرآن متحمل ہوتا ہو اور وہ قرآن کے نصوص کے خلاف ہوں یا ان کے ماننے سے قرآن کا جلی یا خفی نسخ لازم آتا ہو، ان کو ترک کرنا ضروری ہوگا کیوں کہ ان کی نسبت نبی ﷺ کے ساتھ درست نہیں۔ ان احکام کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں۔

ب۔ تفسیری روایات:

مولانا فراہی رحمہ اللہ قرآن کی تفسیر میں حدیث رسول ﷺ اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو وہی اہمیت دیتے ہیں جو ہمیں دیگر ائمہ کے ہاں نظر آتی ہے لیکن تفسیری روایات کے ضعف کے بھی وہ اسی طرح قائل ہیں جس طرح خود محدثین قائل ہیں اور یہ بات تو زبان زد عام ہے کہ تفسیر مغازی اور فضائل کی حدیثوں پر اس طرح کام نہیں ہوا جیسا کہ محدثین نے باقی ذخیرۂ حدیث پر کیا ہے۔

مولانا رحمہ اللہ اپنا موقف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''آنحضرت ﷺ کتاب اللہ کے مبین ومفسر تھے۔ اس لیے شرائع ہوں یا عقائد، آپ کی تاویلات ایک مفسر کے لیے علم کی مضبوط ترین بنیاد ہیں۔''

''پہلی چیز جو قرآن کی تفسیر میں مرجع کا کام دے سکتی ہے، خود قرآن ہے۔ اس کے بعد نبی ﷺ اور آپ کے اصحاب کا فہم ہے۔ پس میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے سب سے زیادہ محبوب وہی تفسیر ہے جو پیغمبر ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے مروی ہو۔''

اس کے بعد وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول آثار کو بالعموم نظم قرآن سے قریب تر بتاتے ہیں۔ پھر اپنے

Marfat.com

طریقۂ تفسیر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں یقین رکھتا ہوں کہ صحیح احادیث اور قرآن میں کوئی تعارض [1] نہیں ہے، تاہم میں روایات کو بطور اصل نہیں بلکہ بطور تائید پیش کیا کرتا ہوں۔ پہلے آیت کی تاویل مماثل آیات سے کرتا ہوں، اس کے بعد تبعاً احادیث صحیحہ کا ذکر کرتا ہوں تاکہ ان منکرین کو معارضہ کی راہ نہ ملے جنھوں نے قرآن کو پس پشت ڈال دیا ہے۔''

حدیث کو اصل نہ ماننے کی وجہ، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، مولانا رحمہ اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ احادیث میں صحیح و سقیم کی تمیز ایک مشکل کام ہے اور دین کی بنیاد کسی غلط روایت پر رکھنا بے حد خطرناک ہے۔ لہٰذا وہ مصر ہیں کہ دین کے ہر معاملے کی بنیاد قرآن کی نصوص پر قائم کرنی چاہیے۔ کتاب اصول التاویل میں لکھتے ہیں:

''قرآن کو سمجھے بغیر اگر آپ حدیث کی طرف دیوانہ وار رجوع کریں جب کہ اس میں صحیح و سقیم [2] دونوں طرح کی روایات ملی ہوئی ہیں تو دل میں کوئی ایسی رائے بیٹھ جاتی ہے جس کی قرآن میں کوئی اصل نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی وہ قرآن کی ہدایت کے مخالف بھی ہوتی ہے۔ اس کی بنا پر آپ تاویل قرآن میں کسی سقیم حدیث پر اعتماد کر لیتے ہیں اور اس طرح حق باطل کے ساتھ گڈمڈ ہو جاتا ہے۔ سیدھا راستہ یہ ہے کہ آپ قرآن سے ہدایت حاصل کریں، اسی پر اپنے دین کی بنیاد رکھیں۔ اس کے بعد احادیث پر غور کریں۔ اگر بادی النظر میں ان کو قرآن سے بیگانہ پائیں تو ان کی تاویل کتاب اللہ کی روشنی میں کریں۔ اگر مطابقت پیدا ہو جائے تو اس سے آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی، اگر تطبیق ممکن نہ ہو تو قرآن پر عمل کرنا اور حدیث کے معاملے میں توقف کرنا ضروری ہے۔ اس طرز عمل کی بنیاد یہ ہے کہ ہمیں پہلے اللہ ہی کی اطاعت کا اور پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم ہوا ہے۔ اگرچہ یہ بات صحیح ہے کہ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے لیکن اگر اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے کلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی کلام پر مقدم رکھا جائے تو اس نے حکم میں ترتیب کیوں قائم کی؟''

مولانا رحمہ اللہ کے نزدیک تفسیری روایات کا باہم اختلاف ان کو بے سوچے سمجھے قبول کرنے میں مانع ہے۔ دور صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں تاویل کا جو اختلاف ہوا اس کی نوعیت تو یہ تھی کہ ایک ہی مضمون کو مختلف پیرایوں میں ادا کر دیا گیا، لہٰذا آدمی ان میں سے جس تاویل کو لے لے وہ حقیقی مدعا سے دور نہیں ہونے پاتا۔ بعد کے ادوار میں ضعیف روایات کی کثرت ہوئی اور لوگوں نے تفسیر میں ان پر اعتماد کر لیا تو کتب تفسیر یہود اور وضع حدیث کرنے والے دجالوں کی روایات سے بھر گئیں۔ (اصول التاویل)۔ تفسیری روایات کے اختلاف کی وضاحت مقدمہ نظام القرآن میں یوں کرتے ہیں:

''مثال کے طور پر فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ کی تفسیر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ ان کے نزدیک نحر سے مراد نماز کی حالت میں سینے پر ہاتھ رکھنا ہے۔ انہی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بھی منقول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل سے نحر کی بابت پوچھا کہ یہ قربانی کیسے کرنی ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ

---

[1] تعارض یا معارضہ: بُعد۔ مقابلہ۔ [2] سقیم: سُقم والی۔ عیب دار۔

Marfat.com

قربانی کا حکم نہیں بلکہ نماز میں رفع یدین کا حکم ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول روایات میں یوں آیا ہے کہ اس آیت میں عیدالاضحیٰ کے دن واجب نماز اور قربانی کا ذکر ہے جب کہ ابن مردویہ نے انہی ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ نحر سے مراد نماز میں رفع یدین کرنا ہے۔''

''لفظ کوثر اور لفظ فلق کے معانی میں بھی اسی طرح کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایسی متناقض [1] روایات نقل ہوئی ہیں جن سے اطمینان حاصل ہونے کی کوئی سبیل نہیں۔ جو پیاسا ان سے اپنی پیاس بجھانا چاہے گا یہ اس کی تشنگی میں اور اضافہ کریں گی اور جو ان کی طرف مائل ہوگا اس کی پریشانی دوچند کردیں گی۔''

ج: اسرائیلیات:

اہل کتاب کی جو روایات حدیث کی کتابوں میں آگئی ہیں ان کے بارے میں مولانا فراہی رحمہ اللہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مفسرین نے بالعموم ان کو ایسے لوگوں سے نقل کیا ہے جو بنی اسرائیل اور ان کے انبیاء کی تاریخ سے بہت کم واقف تھے۔ ان میں بیشتر بے اصل افسانے ہیں جو اہل کتاب کی معتبر کتب سے ثابت نہیں ہوتے، لہٰذا اہل کتاب سے متعلق امور کا حوالہ دینے کے لیے اسرائیلیات پر اعتماد کرنے سے بہتر ہے کہ ان کی معتبر کتابوں کو ماخذ بنایا جائے۔ اگر وہ قرآن کے موافق ہوں تو ان کو قرآن کی تائید میں پیش کیا جائے اور اگر مختلف ہوں تو ان کو نظرانداز کر دیا جائے کیوں کہ یہ بات قطعی طور پر معلوم ہے کہ ان کتابوں میں حق کو چھپایا گیا ہے۔ لازم ہے کہ جو کچھ قرآن میں ہے اسی کو اصل مانا جائے۔

د۔ اخبار آحاد:

مولانا فراہی رحمہ اللہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور تعامل صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی پیروی پر زیادہ زور دیتے ہیں اور خبر واحد کی بنا پر غلو، افراط وتفریط اور فرقہ آرائی کو پسند نہیں کرتے۔ مقدمہ نظام القرآن میں لکھتے ہیں:

''پس جب ایسے الفاظ مصطلحہ کا معاملہ پیش آئے جن کی پوری حد اور تصویر قرآن میں بیان نہ ہوئی ہو تو اخبار آحاد پر جامد نہیں ہونا چاہیے ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شک میں پڑو گے، دوسروں کے اعمال کو غلط ٹھہراؤ گے، ان سے جھگڑو گے اور تمھارے درمیان کوئی ایسی چیز نہ ہوگی جو اس جھگڑے کا فیصلہ کر سکے۔ ایسی صورتوں میں راہ عمل یہ ہے کہ جتنے حصے پر امت متفق ہے اتنے پر قناعت کرو اور جن چیزوں کے بارے میں کوئی نص صریح اور متفق علیہ عمل ماثور موجود نہیں ہے ان میں اپنے دوسرے بھائیوں کا تخطیہ [2] نہ کرو۔''

شرح موطا کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:

(سنت سلف متصل است تا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ومتواتر است۔ وآحاد خبر محتمل صدق وکذب وخطاء فہم وتبدیل درادائے خبرست وطریق امام مالک وابوحنیفہ اعتماد برسنت است کہ

---

[1] متناقض: متضاد۔ [2] تخطیہ: خطاوار ٹھہرانا۔ الفاظ مصطلحہ: اصطلاحی الفاظ۔

Marfat.com

زمان تابعین را دریافته بودند۔ بعدازاں سنت خود تغیر یافت واعتماد علماء براخبار و روایات باقی ماند.)

''سنت سلف متصل ہے، نبی ﷺ تک متواتر ہے، اور خبر آحاد میں صدق وکذب اور خطائے فہم اور خبر دینے میں تغیر کا احتمال ہوتا ہے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ اور ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا طریقہ سنت پر قائم ہے کہ انھوں نے تابعین کا زمانہ پایا تھا۔ بعد میں سنت کے معاملے میں تبدیلی آئی اور علماء کا انحصار اخبار وروایات پر رہ گیا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ مولانا فراہی خبر واحد پر انحصار کو اس لیے صحیح نہیں سمجھتے کہ اس میں صدق وکذب دونوں کا احتمال موجود ہوتا ہے۔ نیز یہ معلوم نہیں ہوتا کہ راوی نے بات کو ٹھیک سمجھا یا نہیں، یا وہ مفہوم کو درست طور پر ادا کر پایا یا نہیں۔ اس کے برعکس تعامل صحابہ وتابعین پر اعتماد جو امام مالک رحمہ اللہ کا طریقہ ہے یا اجتہاد کی راہ اختیار کرنا جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک ہے، مولانا کے نزدیک زیادہ قرین صواب تھا۔ اور یہی وہ موضوع تھا جس پر مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ کے ساتھ ان کی وہ بحث ہوئی جس کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے۔

تحقیق حدیث کا منہاج:

روایت کو رد یا قبول کرنے میں مولانا فراہی رحمہ اللہ کے پیش نظر جو اصول ہوتے وہ حسب ذیل ہیں:

- اصل واساس کی حیثیت قرآن کو حاصل ہے۔
- سنت ثابتہ منصب رسالت کا ایک قدرتی جزو اور شریعت کی ایک مستقل بنیاد ہے۔ قرآن اور سنت میں تفریق کرنا ایک ملحدانہ روش ہے۔
- حدیث کی حیثیت ایک فرع کی ہے جس کا باعث اس کی روایت میں ظن کا دخل ہے۔
- ان روایات کو قبول کرنا جائز نہیں جو اصل کے خلاف اور نصوص قرآنی کی تکذیب کرتی ہوں۔
- قرآن کی تصدیق وتائید کرنے والی تمام روایات قابل قبول ہیں۔
- قرآن اور حدیث کے درمیان اختلاف کی صورت میں حکم [1] قرآن ہوگا۔
- خبر اگرچہ متواتر ہو، قرآن کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ ظن کی بنیاد پر نسخ کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ کرنے کا اصل کام قرآن کے ساتھ سنت کی تطبیق ہے۔

تحقیق حدیث کے لیے مولانا فراہی رحمہ اللہ روایت کو ان اصولوں پر پرکھتے اور روایت اور درایت دونوں کے لحاظ سے حدیث کا درجہ متعین کرتے اور اس کے رد وقبول کا فیصلہ کرتے۔ مثال کے طور پر سورہ عبس کے شان نزول کی روایات میں سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت انس رضی اللہ عنہ، مجاہد رحمہ اللہ اور ضحاک رحمہ اللہ کی روایات پر انھوں نے جو تبصرہ کیا ہے اس میں حسب ذیل پہلوؤں سے تحقیق کی ہے:

[1] حَکَم: فیصلہ کرنے والا، حکم جاری کرنے والا۔

Marfat.com

- ان سب روایات کی سند ضعیف ہے۔
- ان کا دیا ہوا تاثر قرآن کے اشارات کے منافی ہے۔
- روایات میں باہم اس قدر اختلاف ہے کہ ان کی حیثیت اوہام کی ہو کر رہ گئی ہے۔
- ابتدائی راویوں میں سے کوئی بھی خود شریک واقعہ نہ تھا، لہٰذا یہ روایات خبر کا فائدہ نہیں دیتیں۔
- ان کو قبول کرنے سے اللہ تعالیٰ کی غیب دانی اور نبی ﷺ کے بارے میں بدگمانی پیدا ہوتی ہے۔ روایت اگر صحیح ہوتی تو اس سے غلط نتائج پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔

اس بحث کے بعد مولانا نے مجاہد رحمہ اللہ کی ایک روایت کو اختیار کیا ہے جس پر یہ اعتراضات وارد نہ ہوتے تھے۔

سورہ فیل کی تفسیر میں ابرہہ سے عبدالمطلب کی ملاقات کی روایات پر مولانا رحمہ اللہ نے یوں تبصرہ کیا ہے:

- یہ روایات از روئے سند قابل اعتماد نہیں۔ یہ ابن اسحاق پر جا کر ختم ہو جاتی ہیں اور ابن اسحاق یہود اور غیر ثقہ راویوں سے روایت لے لیتے ہیں۔
- اس موضوع پر موجود دوسری روایات سے ان روایات کی تردید ہوتی ہے۔
- عربوں کا معروف کریکٹر وہ نہیں ہے جو ان روایات سے سامنے آتا ہے۔
- یہ روایات دشمنوں کی وضع کردہ معلوم ہوتی ہیں کیوں کہ ان میں عربوں کی غیرت وحمیت کی تحقیر اور سردار قریش عبدالمطلب کی توہین پائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس ابرہہ کا کریکٹر نہایت شان دار بتایا گیا ہے جو حقیقت کے خلاف ہے۔

ان تبصروں سے معلوم ہوا کہ مولانا فراہی رحمہ اللہ تحقیق روایت میں سند کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ یہ پہلو لازماً دیکھتے کہ وہ قرآن کے اشارات کے موافق ہے یا مخالف۔ وہ راوی کے متعلق یہ تحقیق کرتے کہ وہ خود شریک واقعہ تھا یا محض شنید پر مبنی معلومات دے رہا ہے۔ وہ درایت کے اصولوں کو استعمال کرتے ہوئے دیکھتے کہ روایت معروفات کے خلاف تو نہیں اور اس سے قرآن کے کسی اصول پر توزد نہیں پڑتی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حدیث کے ساتھ مولانا رحمہ اللہ کا معاملہ کسی درجہ میں بھی سوءِ ظن اور انکار کا نہیں ہے بلکہ اہل تحقیق کے عام طریقے کے مطابق وہ روایت پر تنقید کرتے ہیں۔ اس کی تاویل قرآن کے موافق کرنے کی کوشش کرتے ہیں، قرآن کے ساتھ اس کو تطبیق دینے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ روایات میں تضاد ہو تو ان میں بعض کو بعض پر ترجیح دیتے ہیں۔ اگر کسی روایت کو قرآن کے نصوص کے متناقص سمجھتے ہیں تو اس کو بکثرت دلائل دے کر رد کرتے ہیں ورنہ اس کے بارے میں توقف کرتے ہیں کیوں کہ بہر حال قرآن اصل اور حدیث اس کی فرع کے درجے میں ہے۔

Marfat.com

فکر فراہی اور خدمت حدیث

علامہ حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کی معروف حیثیت قرآن حکیم کے ایک منفرد طریقۂ تفسیر کے بانی کی ہے۔ انھوں نے زندگی بھر کلام الٰہی کو اپنے فکر کا مرکز ومحور بنائے رکھا اور اس پر راست طریقہ سے غور وتدبر کے اصول وضع کیے جن میں اصل اہمیت لغت کے تتبع، نظائر قرآنی کی تلاش، آیات کے سیاق وسباق اور سورتوں کے نظم کو دی گئی۔ اس کے بعد انھوں نے انہی اصولوں کی بنیاد پر کچھ سورتوں کی تفسیر لکھ کر دکھایا کہ اس طریقے سے قرآن کی کثرت تاویلات پر قابو پا کر اس واحد تاویل تک پہنچا جا سکتا ہے جو قرآن کے حقیقی مدعا سے قریب تر ہوتی ہے۔ فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک قرآن کے صحیح فہم کی کلید نظم قرآن میں پوشیدہ ہے۔ وہ ہر سورہ کا ایک مرکزی مضمون متعین کر کے اس کے تحت آیتوں کا باہمی ربط واتصال اس طرح واضح کرتے ہیں کہ ایک آیت کو بھی بیچ سے نکال دیا جائے تو پوری سورہ کا نظم درہم برہم ہو جاتا ہے۔ فکر فراہی کے شارح اور حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کے شاگرد رشید امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر "تدبر قرآن" میں نظم قرآن کا نہایت دلآویز مرقع علمی دنیا کے سامنے پیش کیا اور اس میں واحد تاویل تک پہنچنے کی بھرپور کاوش کی ہے۔ یہ تفسیر فکر فراہی کی نمائندہ کامل تفسیر کہی جاتی ہے۔ [1]

فراہی رحمہ اللہ کے علمی اصلاح کے پروگرام کا دوسرا جزو دینی علوم کی ان غیر اسلامی عناصر سے تطہیر پر مشتمل تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ ان میں نفوذ کر گئے تھے۔ اس عظیم کام کے خدوخال ان کی تصانیف جمهرة البلاغه، القائد الی عیون العقائد، فی ملکوت الله اور مفردات القرآن کے مطالعہ سے بخوبی واضح ہو جاتے ہیں۔ جمهرة البلاغه میں انھوں نے فصاحت وبلاغت کے فن پر لکھی گئی کتابوں میں پیش کردہ اصولوں پر تنقید کی ہے اور ان کو ناتمام قرار دے کر قرآن مجید کی فصاحت وبلاغت کے جانچنے کے لیے غیر موزوں قرار دیا اور

---

[1] دیکھیے: مقالہ "تفسیر تدبر قرآن کی بعض امتیازی خصوصیات" از محمد فاروق خان، مقالہ "تفسیر تدبر قرآن، ایک مطالعہ" از محمد عمر اسلم اصلاحی، مقالہ "تدبر قرآن۔ ایک منفرد تفسیر" از الطاف احمد اعظمی۔ ششماہی علوم القرآن، مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ نمبر، ادارہ علوم القرآن علی گڑھ، انڈیا۔ جلد 13 تا 15۔

Marfat.com

اس مقصد کے لیے نئے اصول وضع کیے جن کو اہل علم نے سراہا۔ ❶ کتاب القائد الی عیون العقائد اور فی ملکوت اللہ میں انھوں نے علم کلام کو قرآن کی بنیاد پر منضبط کیا اور قوموں کے عروج وزوال کے بارے میں سنت اللہ اور قوانین فطرت کی وضاحت کی۔ فی ملکوت اللہ میں انھوں نے دنیا میں رائج جدید نظاموں کا جائزہ بھی لیا اور ان پر قرآنی اصولوں کی روشنی میں تبصرہ کیا۔ مفردات القرآن میں فراہی رحمہ اللہ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ قرآن مجید کے بعض الفاظ اور تراکیب جس خاص مفہوم کے حامل تھے، ان کی طرف لغات مرتب کرنے والوں نے خاطر خواہ توجہ نہ دی۔ الفاظ کے ناتمام معانی نے قرآن فہمی میں بڑی مشکلات پیدا کیں۔ فراہی رحمہ اللہ نے ان الفاظ اور تراکیب کے بارے میں اپنی تحقیقات پیش کی ہیں۔ ان کی یہ تمام کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔

(۱) فراہی رحمہ اللہ کا حدیث وسنت کے بارے میں نقطۂ نظر:

علم حدیث پر فراہی رحمہ اللہ نے کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی البتہ ان کا نقطۂ نظر دوسری تصانیف کی مدد سے معلوم ہو جاتا ہے۔ اس حوالے سے مقدمہ نظام القرآن، تفسیر نظام القرآن اور اصول فقہ پر لکھی گئی کتابوں...... الرائع فی اصول الشرائع اور احکام الاصول باحکام الرسول علیہ السلام ...... میں بعض ضروری مباحث آ گئے ہیں۔ ان میں سے آخری دو کتابیں مخطوطوں کی شکل میں ہیں۔

سنت:

فراہی رحمہ اللہ تمام علوم میں غیر معمولی تحقیق وتنقید کے عادی تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ قرآن کی تفسیر میں احادیث کے اخذ وقبول کے لیے بھی معتدل نقطۂ نظر اپنانے کی ضرورت ہے۔ اصحاب علم کا ایک گروہ عقیدت کے جوش میں حدیث کے درجہ کو بڑھا کر قرآن کے برابر کر دیتا ہے، یہاں تک کہ اسے ناسخ قرآن بھی مانتا ہے۔ اس کے برعکس دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو سرے سے حدیث کی اہمیت ہی کے منکر ہیں۔ فراہی رحمہ اللہ کو یہ احساس بھی ہوا کہ عملاً حدیث اور سنت کو ایک ہی چیز سمجھ لیا گیا ہے، نیز خبر متواتر اور خبر واحد کے حکم کے فرق کو عملاً مٹا دیا گیا ہے۔ اصولاً تو یہ مانا جاتا ہے کہ اخبارِ آحاد ظنی ہیں لیکن عقائد اور شرعی احکام کی شرح وتعبیر میں ان سے سند لائی جاتی ہے۔ ان احساسات کے تحت فراہی رحمہ اللہ نے سنت اور حدیث کا فرق واضح کیا اور دونوں کا دین میں الگ الگ مقام متعین

---

❶ جمهرة البلاغه پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا شبلی نعمانی رحمہ اللہ نے رسالہ الندوہ میں لکھا: ''یہ تصنیف (خصوصاً اس زمانہ میں) اسلامی جماعت کے لیے اسی قدر مفید اور ضروری ہے جس قدر ایک تشنہ لب اور سوختہ جاں کے لیے آب زلال ❷۔'' (مقالات شبلی حصہ دوم) اسی طرح دور حاضر کے پروفیسر محمد راشد ندوی لکھتے ہیں: ''یہ کتاب عربی زبان میں اس موضوع پر پہلی تصنیف ہے جو مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کے لیے ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر کے علماء کے لیے باعث افتخار ہے۔'' (علامہ حمید الدین فراہی، حیات وافکار، مقالہ محمد راشد ندوی ''مولانا فراہی کے تنقیدی نظریات'' دائرہ حمیدیہ، سرائے میر (انڈیا) 1992ء)۔

❷ آب زلال: نتھرا ہوا پانی۔

Marfat.com

کیا۔ فراہی رحمہ اللہ، رسول اللہ ﷺ کی تشریعی حیثیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو شریعت کی تعلیم کے لیے مبعوث فرمایا تو حکمت اور اسرار شریعت کی تعلیم بھی آپ ﷺ کے فرائض منصبی میں داخل کردی تاکہ امت اجتہاد کے قابل ہوسکے، اپنی عقلوں کو استعمال کرنا سیکھے اور ظاہری وباطنی دلائل سے استدلال کر سکے۔ پس رسول اللہ ﷺ ہمارے لیے کتاب اللہ کی تبیین کرتے تھے تاکہ ہم پر (قرآن کے اشارات میں) تفکر وتدبر کا منہاج واضح ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تدبر کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ رسول کریم ﷺ کی اقتدا کا حکم دیا اور آپ ﷺ کی یہ حیثیت خاص طور پر واضح فرمائی کہ آپ شریعت اور حکمت کی تعلیم دینے والے ہیں۔'' [1]

مقدمہ نظام القرآن میں لکھتے ہیں:

''نبی کی روح بیدار خود بھی معروف ومنکر کی شناخت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ جن چیزوں کے بارے میں وحی کی رہنمائی موجود نہیں ہوتی، ان میں نبی اپنے الہام سے امت کو کوئی حکم اس وقت تک کے لیے دے دیتا ہے جب تک وحی نہ آئے، اور یہ کام اس کے منصب کا ایک قدرتی جزو ہوتا ہے۔'' [2]

فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک نبی ﷺ کی اس روح بیدار کا سرچشمہ وہ خاص نور وحکمت تھا جو آپ ﷺ کو عطا ہوا اور جس کا حوالہ سورہ شوریٰ میں ہے۔ وہاں ارشاد ہوا:

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۚ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (الشوری: 52)

''اور اسی طرح ہم نے تمھاری طرف اپنے حکم کی روح وحی کی۔ تم نہیں جانتے تھے شریعت کیا ہے اور نہ ایمان کو جانتے تھے لیکن ہم نے اسے نور بنایا جس کے ذریعے سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں ہدایت دیتے ہیں، اور بے شک تم صراط مستقیم کی طرف بلاتے ہو۔''

اسی کو وہ سنت رسول کی مستقل بنیاد مانتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو قرآن مجید کی جہت مکنون [3] کی طرف بھی رہنمائی فرمائی تھی۔ اس نے اس روح سے نبی کے قلب کو زندگی بخشی اور اس نور کی ہدایت دے کر آپ کو وہ علم بخشا جو آپ کو پہلے حاصل نہ تھا۔ حضور ﷺ کے احکام کی ایک قسم حقیقت میں قرآن سے ماخوذ ہے البتہ اس کا طریقۂ استنباط مکنون ہے۔ اس

---

[1] حمید الدین فراہی، احکام الاصول باحکام الرسول ﷺ، ترجمہ خالد مسعود، ''احکام رسول ﷺ کا قرآن مجید سے استنباط'' مجلہ تدبر لاہور، شمارہ 13، فروری 1985ء۔

[2] حمید الدین فراہی، مجموعہ تفاسیر فراہی، ص 57، لاہور، فاران فاؤنڈیشن، 1991ء۔

[3] جہتِ مکنون : پوشیدہ پہلو۔

Marfat.com

لیے ان احکام میں سنت کو مستقل بنیاد سمجھا جائے گا۔'' ❶

فراہی رحمہ اللہ کا ایک اہم نکتہ جو سنت کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کو مزید واضح کرتا ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حفاظت قرآن کا جو ذمہ لے رکھا ہے اس میں وہ تمام اصطلاحات شرعیہ، جن کا ذکر قرآن میں ہے مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد، طواف، صفاومروہ، مسجد حرام وغیرہ شامل ہیں، ان سب اصطلات کا مفہوم نبی ﷺ کی سنت سے واضح ہوا ہے اور یہ سنت تواتر وتوارث کے ساتھ سلف سے خلف کو منتقل ہوئی ہے۔ لہٰذا ان عبادات واصطلاحات کے مفاہیم اسی طرح محفوظ ہیں جس طرح حضور ﷺ نے ان کی تعلیم دی تھی۔ امت کے تعامل میں ان کے بارے میں بعض جزوی اختلافات نظر آتے ہیں تو یہ بالکل ناقابل لحاظ ہیں۔ فرماتے ہیں:

''سلف اور ائمہ نے اپنے مذہب کی صحت کی بدولت کتاب اور سنت کو مضبوطی سے پکڑا۔ یہ نہیں کیا کہ باطل پسندوں اور ملحدوں کی طرح ان میں تفریق کر کے ایک جز کو ترک کر دیتے۔'' ❷

دوسرے الفاظ میں وہ یہ حقیقت برملا بیان کرتے ہیں کہ امت مسلمہ جس طریقے سے آج نماز ادا کر رہی ہے یا حج کر رہی ہے یہ ٹھیک وہی طریقہ ہے جس کی تعلیم رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو دی تھی۔ گویا سنت تعامل امت سے منتقل ہوئی ہے اور اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے عمل اور تعلیم کے مطابق ہے۔ لہٰذا فراہی رحمہ اللہ سنت کے منکرین کو باطل پر سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک دین کا صحیح تقاضا یہ ہے کہ کتاب اور سنت دونوں کو لازم پکڑا جائے۔

احکام رسول کی بنیاد قرآن میں:

مولانا فراہی رحمہ اللہ، رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کی بنیاد قرآن مجید کی آیات کے اشارات میں تلاش کرتے تھے۔ وہ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے مجھے کتاب وسنت کے فہم کا ایک لطیف طریقہ سجھایا اور ان دونوں کے درمیان موافقت پیدا کرنے کا عظیم دروازہ کھول دیا جس کے نتیجے میں حضور ﷺ کا کوئی حکم ایسا نہیں رہا جس میں لوگ نسخ کے قائل ہوئے ہوں اور قرآن کے ساتھ اس کی موافقت نہ دکھائی جاسکے۔ انھوں نے اپنے اس فہم کی چند مثالیں پیش کی ہیں اور حدیث میں وارد قیامت میں مومنین کے لیے رویت باری تعالیٰ کی خبر، حدیث لا وصيّة لوارث، مقدار وصیت، باپ کے مقابلے میں ماں کے سہ گانہ ❸ حقوق، نکاح میں پھوپھی اور بھتیجی یا خالہ اور بھانجی کو جمع کرنے کی ممانعت اور حد زنا کے امور کو قرآن کے اشارات سے ثابت کیا ہے۔'' ❹

قرآن کی نسبت سے رسول اللہ ﷺ کے احکام کو وہ تین قسموں میں شمار کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

''پہلی قسم ان احکام کی ہے جن کے بارے میں حضور ﷺ نے صراحت فرمائی ہے کہ وہ کتاب اللہ سے مستنبط

---

❶ ''احکام رسول ﷺ کا قرآن مجید سے استنباط''، مجلہ تدبر لاہور، شمارہ 13، فروری 1985ء۔ ❷ ایضاً۔

❸ سہ گانہ: تین گنا۔

❹ ''احکام رسول ﷺ کا قرآن مجید سے استنباط''، مجلہ تدبر لاہور، شمارہ 13، فروری 1985ء۔

Marfat.com

ہیں حالانکہ ظاہر کتاب کی نص میں وہ حکم موجود نہیں۔ گویا وہ حکم مستنبط ٹھہرے اور حضور ﷺ کے فرض تبیین کے مطابق ہیں۔ ان احکام میں اصل وفرع پر غور کر کے ان کے استنباط کا پہلو معلوم کرنا دشوار نہیں ہوتا۔

دوسری قسم ان احکام کی ہے جن کے متعلق حضور ﷺ نے خود کوئی صراحت نہیں فرمائی مگر قرآن سے ان کے استنباط کا پہلو کلام کی دلالتوں کے ایک عارف پر ظاہر ہے۔ پس ایک تو یہ حکم قرآن سے ماخوذ ہونے کی بنا پر صحت سے قریب تر ہوتا ہے...... دوسرے رسول اللہ ﷺ تمام انسانوں سے زیادہ کتاب اللہ کو سمجھنے والے تھے۔ آپ ﷺ کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ جس معاملے کے بعض پہلوؤں کا اشارہ کتاب اللہ میں موجود ہو اس کا فیصلہ کتاب کی روشنی کے بغیر کریں۔ تیسرے عرب قوم کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ کلام کے اشارات وکنایات کو خوب سمجھنے والے تھے اور حضور ﷺ کو چوں کہ نور وہدایت اور بصیرت خدا کی طرف سے حاصل تھی اس لیے آپ ﷺ اس معاملے میں سب سے زیادہ ذکی تھے......

تیسری قسم ان احکام کی ہے جن کے متعلق قرآن کی کوئی نص وارد نہیں، البتہ وہ اس اضافے کا متحمل ہے۔ ایسے احکام میں ہم سنت کو مستقل اصل قرار دیں گے کیوں کہ ہمیں اطاعت رسول ﷺ کا حکم دیا گیا ہے اور رسول ﷺ کا حکم یکساں طور پر پراز حکمت ہوتا ہے خواہ وہ کتاب اللہ کی بنیاد پر ہو یا اس نور وحکمت کے مطابق ہو جس سے خدا نے آپ کا سینہ بھر دیا تھا......''

احکام کی قسم ثانی کے بعض وجوہ استنباط، مولانا فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک علماء پر مخفی رہ گئے لیکن غور وفکر کر کے آدمی ان تک پہنچ سکتا ہے۔ اگر یہ وجوہ واضح ہو جائیں ''تو اصول یہ ہوگا کہ ہم کتاب اللہ کو اصل اور سنت کو فرع قرار دیں گے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا اس پر اتفاق تھا کہ وہ سب سے پہلے قرآن پر غور کرتے اور جب اس میں رہنمائی نہ پاتے تو سنت کی طرف رجوع کرتے، اور یہی بات عقلی بھی ہے۔'' [1]

روایت حدیث:

جہاں تک روایات حدیث کے بارے میں مولانا فراہی رحمہ اللہ کے نقطۂ نظر کا تعلق ہے، ان کے نزدیک اصل واساس کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے۔ حدیث اس کی ایک فرع ہے۔ ان دونوں میں فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن میں جو کچھ ہے وہ قطعی ثابت ہے اور فروع میں وہم وظن کے لیے گنجائش ہوتی ہے۔ وہ ان لوگوں کی روش پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں جو ایسی روایتیں تک قبول کر لیتے ہیں جو نصوص قرآن کی تکذیب کرتی ہیں۔ وہ قرآن مجید سے متناقض یا اس کے منافی اور اصل کو ڈھانے یا جھٹلانے والی روایتوں کے، محض اس بنا پر کہ وہ بخاری یا مسلم میں نقل ہوگئی ہیں، قرآن کی طرح محفوظ ہونے کے تصور کو غلو پر مبنی سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس طرح کے غلو کا نتیجہ بعض فقہاء ومتکلمین کا یہ خیال بھی ہے کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

---

[1] ''احکام رسول ﷺ کا قرآن مجید سے استنباط''، مجلہ تدبر لاہور، شمارہ 13، فروری 1985ء۔

Marfat.com

”یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ خبر اگر چہ متواتر ہو قرآن کو منسوخ نہیں کرسکتی۔ اس کی یا تو تاویل کریں گے یا اس میں توقف کریں گے لیکن اس کی خاطر قرآن کو منسوخ نہیں کریں گے۔ امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور عام اہل حدیث، حدیث کو قرآن کے لیے ناسخ نہیں مانتے اگر چہ حدیث متواتر ہو۔ پس جب یہ ائمہ حدیث جو حدیث کے معاملے میں صاحب البیت [1] کی حیثیت رکھتے ہیں، اس بات کے قائل نہیں ہوئے تو اس بارے میں ہم فقہاء و متکلمین کی رائے کو کوئی وزن نہیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اس فتنہ سے امان میں رکھے کہ ہم اس بات کے قائل ہوں کہ رسول، اللہ کے کلام کو منسوخ کرسکتا ہے۔“ [2]

حدیث کو اصل نہ ماننے کی وجہ فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ احادیث میں صحیح و سقیم کی تمیز ایک مشکل کام ہے اور دین کی بنیاد کسی غلط روایت پر رکھنا بے حد خطرناک ہے۔ ان کے نزدیک دین کے ہر معاملے کی بنیاد قرآن کی نصوص ہی پر قائم کرنی چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں:

”قرآن کو سمجھے بغیر اگر آپ حدیث کی طرف دیوانہ وار رجوع کریں جب کہ اس میں صحیح و سقیم دونوں طرح کی روایات ملی ہوئی ہوں تو دل میں کوئی ایسی رائے بیٹھ جاتی ہے جس کی قرآن میں کوئی اصل نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی وہ قرآن کی ہدایت کے مخالف بھی ہوتی ہے۔ اس کی بنا پر آپ تاویل قرآن میں کسی سقیم حدیث پر اعتماد کر لیتے ہیں۔ اس طرح حق باطل کے ساتھ گڈمڈ ہو جاتا ہے۔“ [3]

اسرائیلیات:

اہل کتاب کی جو روایات حدیث کی کتابوں میں آگئی ہیں ان کے بارے میں مولانا فراہی رحمہ اللہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ان کے راوی بنی اسرائیل اور ان کے انبیاء کی تاریخ سے بہت کم واقف تھے، ان میں بیشتر بے اصل افسانے ہیں جو اہل کتاب کی معتبر کتابوں سے ثابت نہیں ہوتے۔

اخبار آحاد:

مولانا فراہی رحمہ اللہ سنت رسول اور تعامل صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی پیروی پر زیادہ زور دیتے اور خبر واحد کی بنا پر غلو، افراط و تفریط اور فرقہ آرائی کو پسند نہیں کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”پس جب ایسے اصطلاحی الفاظ کا معاملہ پیش آئے جن کی پوری تعریف اور تصویر قرآن میں بیان نہ ہوئی ہو تو ان کے بارے میں خواہ مخواہ اخبار آحاد پر نہیں جم جانا چاہیے۔ ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خود بھی شک میں پڑو گے اور دوسروں کے اعمال کو بھی غلط ٹھہراؤ گے اور ان سے جھگڑو گے اور تمھارے درمیان کوئی ایسی چیز نہیں ہوگی جو

---

[1] صاحب البیت : گھر والا - اوّلیس اتھارٹی۔

[2] مجموعہ تفاسیر فراہی، ص 39، لاہور، فاران فاؤنڈیشن، 1991ء۔

[3] عبدالحمید الفراہی، رسائل الامام الفراہی فی علوم القرآن، ص 275، دائرہ حمیدیہ سرائے میر (انڈیا) 1991ء۔

Marfat.com

اس جھگڑے کا فیصلہ کر سکے۔ ایسی صورتوں میں صحیح راہ عمل یہ ہے کہ جتنے حصہ پر تمام امت متفق ہے اتنے پر قناعت کرو اور ان چیزوں کے بارے میں، جن میں کوئی نص صریح اور متفق علیہ عمل نبی ﷺ موجود نہیں ہے، اپنے دوسرے بھائیوں سے جھگڑا نہ کرو۔'' [1]

مولانا فراہی رحمہ اللہ خبر واحد پر انحصار کو اس لیے صحیح نہیں سمجھتے کہ اس میں صدق وکذب دونوں کا احتمال موجود ہوتا ہے۔ نیز یہ نہیں معلوم ہوتا کہ راوی نے بات کو ٹھیک سمجھا یا نہیں یا وہ مفہوم کو درست طور پر ادا کر پایا یا نہیں۔ اس کے برعکس تعامل صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین وتابعین پر اعتماد، جو امام مالک رحمہ اللہ کا طریقہ ہے یا اجتہاد کی راہ اختیار کرنا جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک ہے، مولانا رحمہ اللہ کے نزدیک زیادہ قرین صواب تھا۔

تحقیق حدیث:

روایات کو رد یا قبول کرنے میں فراہی رحمہ اللہ نے جو اصول پیش نظر رکھے وہ حسب ذیل تھے:

- اصل واساس کی حیثیت قرآن کو حاصل ہے۔
- سنت ثابتہ منصب رسالت کا ایک قدرتی جزو اور شریعت کی ایک مستقل بنیاد ہے۔ قرآن اور سنت میں تفریق کرنا ایک ملحدانہ روش ہے۔
- حدیث کی حیثیت ایک فرع کی ہے جس کا باعث اس کی روایت میں ظن کا دخل ہے۔
- ان روایات کو قبول کرنا جائز نہیں جو اصل کے خلاف اور نصوص قرآنی کی تکذیب کرتی ہوں۔
- قرآن کی تصدیق وتائید کرنے والی تمام روایات قابل قبول ہیں۔
- قرآن اور حدیث کے درمیان اختلاف کی صورت میں حکم قرآن ہوگا۔
- خبر اگرچہ متواتر ہو قرآن کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ ظن کی بنیاد پر نسخ کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ اصل کرنے کا کام قرآن کے ساتھ سنت کی تطبیق ہے۔

مولانا فراہی رحمہ اللہ تحقیق روایت میں سند کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ یہ پہلو لازماً دیکھتے کہ وہ قرآن کے اشارات کے موافق ہے یا مخالف۔ وہ راوی کے متعلق یہ تحقیق کرتے کہ وہ خود شریک واقعہ تھا یا محض شنید پر مبنی معلومات دے رہا ہے۔ وہ یہ دیکھتے کہ روایت عرب کے معروفات کے خلاف تو نہیں اور اس سے قرآن کے کسی اصول پر زد تو نہیں پڑتی۔ روایات میں تضاد کی صورت میں وہ بعض روایات پر بعض کو ترجیح دیتے۔ اگر کسی روایت کو قرآن کی نصوص کے متناقض سمجھتے تو اس کو بکثرت دلائل دے کر مسترد کرتے ورنہ اس کے بارے میں توقف کرتے۔ اگر قرآن اور روایت میں مطابقت کی کوئی صورت نہ نکل سکتی تو اس وقت قرآن کو ترجیح دیتے کیوں کہ وہ قطعی اور ثابت ہے۔ اس کی دلیل فراہی رحمہ اللہ نے یوں دی ہے:

''جب دو حدیثوں میں تعارض واقع ہوتا ہے تو جو صحیح وثابت ہوتی ہے اس کو محدثین قبول کرتے ہیں، لہٰذا جب

---

[1] مجموعہ تفاسیر فراہی، ص 40، لاہور، فاران فاؤنڈیشن، 1991ء۔

Marfat.com

قرآن اور حدیث میں تعارض واقع ہوتا ہے تو اس اصول پر کیوں عمل نہیں کرتے؟ اسی طرح جب دو متعارض حدیثیں سند کے لحاظ سے مساوی ہوتی ہیں تو ان میں موافقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن کا یہ حال ہے کہ وہ باعتبار سند زیادہ مضبوط اور قابل اعتماد ہے۔ لہٰذا اس کے سوا چارہ نہیں کہ احادیث کی تاویل قرآن کی روشنی میں کی جائے۔'' [1]

مولانا فراہی رحمہ اللہ کے حدیث اور سنت کے بارے میں نقطۂ نظر کا یہ جائزہ یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ ان کی فکر افراط وتفریط سے پاک ہے۔ وہ نہ تو اہل الرائے کی طرح احادیث سے بے اعتنائی برتنے کے قائل ہیں اور نہ اہل روایت کی طرح ہر روایت کا درجہ قرآن کے ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔ وہ ایک بے لاگ محقق تھے۔ انھوں نے گہرے غور وفکر کے بعد دین میں حدیث کی صحیح حیثیت کو متعین کرنے کی کوشش کی اور سنت کو حدیث سے الگ کر کے وہ اعلیٰ وارفع مقام دیا جس کی وہ فی الواقع مستحق تھی۔ بعض علمائے حدیث نے ان کی آراء کو اپنے نقطۂ نظر سے بے گانہ پایا تو ان کی تحقیق کو انکار حدیث سے قریب قرار دیا۔ ہر انصاف پسند شخص اوپر کے مباحث کی مدد سے خود رائے قائم کرسکتا ہے کہ فکر فراہی میں کتنا انکار حدیث پایا جاتا ہے!

(ب) امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ کا نقطۂ نظر:

فکر فراہی کے معروف شارح مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ نے مدرسہ کی تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے دیار کے بہت بڑے شیخ الحدیث مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ شارح جامع ترمذی کے آگے زانوئے تلمذتہ کیے اور شیخ سے اصول حدیث اور جامع ترمذی سبقاً سبقاً پڑھے۔ انھوں نے فراہی رحمہ اللہ کی فکر کو آگے بڑھایا، ان کے خیالات کو مفصل ومدلل کر کے پیش کیا اور اس میں اضافے کیے۔ اصول حدیث کی بحثیں انھوں نے اپنی کتاب ''مبادی تدبر حدیث'' میں اٹھائی ہیں۔'' [2]

حدیث اور سنت:

مولانا اصلاحی رحمہ اللہ نے حدیث اور سنت میں فرق کو مزید واضح کیا۔ ان کے نزدیک حدیث تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول یا فعل یا آپ کی تصویب [3] کی روایت کو کہتے ہیں، قطع نظر اس سے کہ وہ ثابت شدہ ہو یا اس کا ثابت شدہ ہونا محل نزاع ہو۔ اس کے برعکس سنت وہ طریقہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیثیت معلم شریعت اور بحیثیت کامل نمونہ، احکام ومناسک کے ادا کرنے اور زندگی کو اللہ تعالیٰ کی پسند کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے قولاً اور عملاً لوگوں کو بتایا اور سکھایا۔ قرآن میں صرف اصولی باتیں بیان ہوئی ہیں، جب کہ دین کا پورا اور مکمل ڈھانچہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کھڑا

---

[1] رسائل الامام الفراہی فی علوم القرآن، ص 278، دائرہ حمیدیہ، سرائے میر (انڈیا) 1991ء۔

[2] امین احسن اصلاحی، مبادی تدبر حدیث، فاران فاؤنڈیشن لاہور۔

[3] تصویب: درست یا جائز قرار دینا۔

Marfat.com

ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں قرآن اور سنت میں تعلق روح اور قالب کا ہے۔ ان دونوں کی ترکیب سے ہی دین کا پورا نظام کھڑا ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن کی طرح سنت کی تعلیم رسول اللہ ﷺ کی منصبی حیثیت کا تقاضا تھا۔

مولانا اصلاحی رحمہ اللہ کے نزدیک سنت کا تعلق عملی زندگی سے ہے۔ وہ چیزیں اس کے دائرے میں نہیں آتیں جو محض عقائدی اور علمی نوعیت کی ہیں۔ اس کی بنیاد احادیث پر نہیں بلکہ امت کے عملی تواتر پر ہے جس سے مراد نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین اور صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا وہ عمل ہے جو امت میں رائج ہوا۔

دور حاضر میں منکرین حدیث نے اصطلاحات شرعیہ کا مفہوم لغات کی مدد سے متعین کرنے کی جو کوشش کی ہے، اس کے بارے میں مولانا اصلاحی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

> ''منکرین حدیث کی یہ جسارت کہ وہ صوم وصلوٰۃ، حج وزکوٰۃ اور عمرہ وقربانی کا مفہوم بھی اپنے جی سے بیان کرتے ہیں اور امت کے تواتر نے اس کی جو شکل ہم تک منتقل کی ہے اس میں اپنی ہوائے نفس کے مطابق ترمیم وتغیر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ صریحاً خود قرآن مجید کے انکار کے مترادف ہے، اس لیے کہ جس تواتر نے ہم تک قرآن کو منتقل کیا ہے، اسی تواتر نے اصطلاحات کی عملی صورتوں کو بھی ہم تک منتقل کیا ہے۔ اگر وہ ان کو نہیں مانتے تو پھر خود قرآن کو ماننے کے لیے بھی کوئی وجہ نہیں رہ جاتی۔ اصطلاحات کے معاملہ میں تنہا لغت پر اعتماد بھی بالکل غلط چیز ہے۔ صوم و صلوٰۃ کا لغت میں جو مفہوم بھی ہو لیکن دین میں وہی مفہوم معتبر ہوگا جو شارع علیہ السلام نے واضح فرمایا۔'' [1]

حدیث اور سنت کے درمیان فرق نہ کرنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ منکرین حدیث نے حدیث کے خلاف جو شبہات ایجاد کیے وہ انھوں نے سنت پر بھی پھیلا دیے، حالاں کہ سنت امت مسلمہ کے عملی تواتر سے ثابت ہے اور اس کا انکار خود قرآن کے انکار کے ہم معنی ہے۔ جب یہ مسئلہ مناظرہ کا موضوع بن گیا تو منکرین حدیث نے حدیث کے ساتھ سنت کو شامل کر کے اپنی بات کفر تک پہنچا دی اور حامیان حدیث نے حدیث اور سنت کو ایک ہی چیز قرار دے کر سنت کو بھی ہدف پر لا کھڑا کیا۔

سند حدیث:

محدثین کے ہاں روایت کی صحت کو جانچنے کے لیے محض سند کی تحقیق کو کافی سمجھا جاتا ہے۔ مولانا اصلاحی رحمہ اللہ اس حقیقت کا اعتراف کرنے کے باوجود کہ ہمارے ائمہ فن نے تحقیق کی معراج کی بلندیوں کو چھو کر فن اسماء الرجال کی نیو ڈالی، روایت کی جانچ کے معاملہ میں سند کو صرف ایک کسوٹی قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک راوی کے کردار واخلاق کے معاملہ میں قابل اطمینان رائے اسی صورت میں قائم کی جا سکتی ہے جب معاملات میں اس کے ساتھ کوئی واسطہ پڑا ہو۔ اس کے بغیر رائے قائم کرنے میں آدمی دھوکا کھا سکتا ہے۔ دوسرے، جرح وتعدیل

---

[1] ''تفسیر تدبر قرآن۔ ایک مطالعہ'' از محمد عمر اسلم اصلاحی۔ ششماہی علوم القرآن، مولانا اصلاحی نمبر، ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ، انڈیا۔ جلد 13 تا 15، ص 53۔

Marfat.com

کا کام علم، فقاہت، بصیرت، تجربہ اور معقولیت کا متقاضی ہے جب کہ راویوں کے متعلق معلومات فراہم کرنے والے انسان ہمیشہ انسان ہی رہے ہیں، فرشتے نہیں رہے ہیں۔ لہٰذا ان کی آراء عام انسانی جبلت میں موجود تعصب کے شائبہ سے پاک نہیں ہوسکتیں۔ تیسرے، ائمہ حدیث نے اہل بدعت خصوصاً شیعہ، روافض اور باطنیوں سے روایات لینے میں بڑی رعایت برتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ان کی بدعات اور ان کے مسلک سے متعلق بہت ہی غلط روایات ہماری کتابوں میں گھس آئی ہیں۔ چوتھے، یہی حال ترغیب وترہیب [1] اور فضائل کی روایات کا ہے۔ ان روایات کے ضمن میں محدثین نے سند کی صحت کے اہتمام کو بھی ملحوظ نہیں رکھا۔ تاہم مولانا رحمہ اللہ کے نزدیک اس وقت قابل عمل طریقہ یہ ہے کہ ماضی میں سند پر جو تحقیق ہو چکی ہے فی الجملہ اسی پر اکتفا کیا جائے لیکن دوسرے ذرائع سے روایات کو پرکھا جائے۔

اخبار آحاد:

مولانا اصلاحی رحمہ اللہ کے نزدیک ذخیرۂ حدیث بڑی حد تک روایت بالمعنی پر مبنی ہے۔ تمام تر احتیاط کے باوجود راوی حضرات مفہوم کو پوری طرح ادا نہیں کر سکتے۔ کہیں کہیں وہ اپنی طرف سے وضاحت اور شرح کر دیتے ہیں۔ لہٰذا اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بالمعنی روایت میں غلطی کے احتمالات ہیں۔ اسی طرح یہ ذخیرہ بیشتر اخبار آحاد پر مشتمل ہے۔ عام دنیوی معاملات میں زندگی بسر کرنے کے لیے یہ کافی ہوتا ہے کہ ظن غالب پر اعتماد کیا جائے اور اخبار آحاد اس کا فائدہ دیتی ہیں لیکن جب معاملہ دین کا ہو تو خود قرآن نے خبر واحد کے رد وقبول میں خبر دینے والے کی شخصیت، روایت کی نوعیت، قرائن اور خصوصیات ہی پر اعتماد کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا اخبار آحاد پر بالعموم اعتماد کیا جائے گا لیکن ان صورتوں میں جب ان کا تصادم کسی ایسی چیز سے ہوگا جس کی حیثیت دین میں بنیادی اور اصولی ہو، ان کی تحقیق کے لیے تمام ممکنہ وسائل بروئے کار لائیں جائیں گے۔ اس کے بعد ان کے رد یا قبول کا فیصلہ کیا جائے گا۔ گویا اخبار آحاد کے مفید یقین ہونے کے بارے میں مولانا اصلاحی رحمہ اللہ اصولیین اور محدثین سے قدرے مختلف رائے رکھتے ہیں۔ متکلمین اور اصولیین تو اس امر پر متفق ہیں کہ خبر واحد مفید یقین نہیں اس لیے اس سے عقیدے کا اثبات نہیں ہوتا۔ [2] امام غزالی رحمہ اللہ تک یہ فرماتے ہیں کہ خبر الواحد لایفید العلم۔ [3] اور محدثین خبر واحد کے مفید علم ہونے کے قائل ہیں اور ان میں سے بعض اس کے مفید علم ہونے کے لیے قرائن کی موجودگی کو ضروری سمجھتے ہیں، لیکن مولانا اصلاحی رحمہ اللہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دیکھنے کی چیز خبر واحد کا متن اور مضمون ہے۔ خبر واحد بالعموم مفید علم سمجھی جائے گی لیکن اگر دین کا کوئی بنیادی اور اصولی مسئلہ ہو یا اس سے عقیدے کا اثبات ہوتا ہو تو پھر اس کی تحقیق ضروری ہوگی اور یہ خود قرآن کی تعلیم ہے کہ اہم مسائل میں خبر اور خبر لانے والوں کی بابت تحقیق کی جائے۔

---

[1] ترہیب: ڈرانا۔

[2] البزدوی، "الاسلام عقیدہ و شریعہ"، ص: 76۔

[3] الغزالی، "المستصفی"، ص: 14۔

Marfat.com

تدبر حدیث کی ضرورت اور اس کے اصول:

مولانا اصلاحی رحمہ اللہ حدیث کے ایک طالب علم کے لیے موطا امام مالک رحمہ اللہ، صحیح بخاری رحمہ اللہ اور صحیح مسلم رحمہ اللہ کے مطالعے کو لازم قرار دیتے ہیں۔ ان کے ذخیرۂ حدیث پر عبور حاصل ہونے سے دین کا بڑا حصہ گرفت میں آجاتا ہے، چنانچہ ساٹھ کی دہائی میں مولانا اصلاحی رحمہ اللہ نے حلقہ تدبر قرآن قائم کیا تو اس کے شرکاء کو صحیح مسلم پڑھائی۔ پھر جب تفسیر تدبر قرآن لکھنے سے فارغ ہوئے تو ادارہ تدبر قرآن وحدیث قائم کیا اور اس کے شرکاء کو صحیح بخاری اور موطا امام مالک کا درس دیا۔

مولانا اصلاحی رحمہ اللہ کے نزدیک ذخیرۂ حدیث سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لیے ایک ایک روایت پر تدبر ضروری ہے۔ فہم حدیث کی راہ میں الجھنوں سے بچنے کے لیے مولانا رحمہ اللہ چند اصول تجویز کرتے ہیں:

- جس طرح قرآن مجید ہماری زندگی کے ہر گوشے میں حق و باطل میں امتیاز کے لیے کسوٹی ہے، اسی طرح حدیث کے معاملے میں بھی اصلاً وہی امتیاز کی کسوٹی ہے۔ یہ بات عقلاً اور شرعاً محال ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی کوئی بات اللہ تعالیٰ کی بات کے خلاف ہو۔ لہٰذا جو حدیث قرآن کے خلاف ہوگی وہ منکر ہے۔ قرآن کی کسوٹی پر پرکھے بغیر قبول کی ہوئی روایت میں یہ امکان موجود ہوتا ہے کہ آدمی اس چیز کو دین بنالے جو دین نہیں ہے۔
- قرآن مجید کی طرح احادیث کا بھی اپنا ایک مجموعی نظام ہے جس سے ہٹ کر نہ تو کسی حدیث کو صحیح طور پر سمجھا جاسکتا ہے اور نہ اس کی تاویل و توجیہ ٹھیک طور پر ہوسکتی ہے۔ لہٰذا ہر حدیث احادیث کے مجموعی نظام کا ایک جزو سمجھی جائے گی۔ جزو کے لیے اپنے مجموعی نظام سے پوری طرح ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی روایت اپنے مجموعی نظام سے بے جوڑ ہوگی تو اس کو رد کر دیا جائے گا۔ صوفیا کے ہاں رائج روایات میں ایسی بے جوڑ روایتیں بہت ہیں جو نہ قرآن کے اصولوں سے مطابقت رکھتی ہیں نہ حدیث کے معروفات سے۔
- صحیح روایت کا عمل معروف کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ عمل معروف قرآن وسنت رسول ﷺ میں محفوظ ہے۔ اس کے اصولوں، کلیات، ارشادات اور احکام کے منافی روایت قبول نہیں کی جائے گی۔ اسرائیلیات اس کسوٹی کی زد میں آتی ہیں۔ ایسی روایات ہی کو مستشرقین نے دین اسلام اور اکابر دین پر حملوں کا ذریعہ بنایا ہے۔
- صحیح احادیث کی زبان کا ایک خاص معیار ہے جو بہت اعلیٰ ہے۔ ہر باب میں ان احادیث کو مقدم رکھنا ہوگا جو زبان کے اعتبار سے عہد نبوت اور عہد صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی زبان سے ہم آہنگ ہوں۔ جو لوگ کلام رسول ﷺ کا ذوق اور اس کی شناخت کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ کلام کو سن کر اور اپنے دل و دماغ پر اس کے اثر ہی سے اس کو پہچان لیتے ہیں۔
- حدیث کے فہم میں کلام کے عموم وخصوص، اس کے موقع ومحل اور اس کے خطاب کو سمجھنا ضروری ہے۔ حدیث میں کہیں الفاظ عام ہیں لیکن ان سے مراد خاص ہے۔ اسی طرح کہیں کلام بظاہر خاص ہے لیکن اس کا اطلاق

Marfat.com

عام پر ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس بعض ارشادات کسی خاص موقع اور پس منظر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر اس پس منظر کو نہ سمجھا جائے تو حدیث پر کئی اعتراضات پیدا ہوتے ہیں جب کہ اپنے اصل محل میں اس کا مفہوم بالکل صحیح ہوتا ہے۔ اس کی مثال میں مولانا اصلاحی رحمہ اللہ نے حدیث الائمة من قریش اور امرت ان اقاتل الناس...... الخ کو پیش کیا ہے۔

❀ جس طرح قرآن کی تمام دعوت عقل وفطرت پر مبنی ہے اور وہ اپنے دعاوی کے اثبات کے لیے عقل وفطرت کو شہادت میں پیش کرتا ہے، اسی طرح حدیث کے دل میں اترنے کا اصل راستہ بھی عقل وفطرت ہی ہے۔ اسی وجہ سے حدیث میں کوئی بات عقل کے صریح خلاف نہیں ہوسکتی۔ حدیث میں اگر کوئی بات عقل کے منافی نظر آئے تو اس پر غور کیا جائے گا یہاں تک کہ اپنی غلطی واضح ہو جائے یا روایت کا ضعف سمجھ میں آجائے۔

❀ راوی حضرات اپنے اپنے ذوق کے مطابق واقعے کے کسی حصے کو روایت کرتے ہیں جس کے نتیجے میں اس کے بعض لازمی اور ضروری حصے چھوٹ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر خطبہ حجتہ الوداع میں اسلام کا نہایت جامع تصور دیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود یہ خطبہ کسی روایت میں یکجا بیان نہیں ہوا۔ دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی راوی کی مختلف اوقات کی روایتوں میں تکمیل، تقلیل، اطناب ❶ اور ایجاز ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا کسی ناتمام روایت کی تاویل اس قسم کی دوسری روایات کے ساتھ ملا کر کرنی ہوگی۔ اس طرح جو مضمون متعین ہوگا وہ اصل ہوگا۔

دروس حدیث:

مولانا اصلاحی رحمہ اللہ نے محض تدبر حدیث کے مذکورہ اصول دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کو برت کر دکھلایا۔ انھوں نے جب صحیح مسلم رحمہ اللہ، موطا امام مالک رحمہ اللہ اور صحیح بخاری رحمہ اللہ کے درس دیے تو ان میں اپنے پیش کردہ اصولوں کا اطلاق کیا۔ ان کے دروس پر مشتمل دو کتابیں شرح موطا جلد اول اور شرح صحیح بخاری جلد اول ودوم شائع ہوچکی ہیں۔ ❷ شرح موطا میں کتاب الزکوٰۃ، کتاب البیوع، کتاب القراض، کتاب المساقاہ، کتاب الاقضیہ، کتاب الحدود، کتاب العقول، کتاب الجامع وغیرہ شامل ہیں جب کہ شرح بخاری جلد اول میں کتاب بدء الوحی، کتاب الایمان، کتاب العلم، کتاب الوضوء، کتاب البیوع تا کتاب الاجارات زیر بحث آئی ہیں۔ شرح بخاری جلد دوم میں کتاب الحوالات تا کتاب الشہادت زیر بحث آئی ہیں۔

ان شرحوں میں مولانا رحمہ اللہ مشکل اور وضاحت طلب الفاظ اور جملوں کی وضاحت کرتے اور متن حدیث کا بھرپور مطالعہ کر کے اپنے نتائج فکر کو سامنے لاتے ہیں۔ وہ متن حدیث کے ایک ایک لفظ اور جملے پر غور کرتے اور اس

---

❶ اطناب: طول دینا۔

❷ یہ تینوں کتابیں ادارہ تدبر قرآن وحدیث، لاہور نے شائع کی ہیں۔ تاریخ اشاعت: 2000، 2002، 2003۔

Marfat.com

کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور یہ متعین کرنا چاہتے ہیں کہ واقعتہً روایت کا کتنا حصہ صحیح ہے اور کس حصے کی روایت میں کوئی خامی رہ گئی ہے۔ وہ احادیث کو دوسری ہم معنی روایات کی روشنی میں سمجھتے اور کہیں کہیں صحیح مسلم کی روایات کو بھی دلیل میں پیش کرتے ہیں۔ جہاں متن حدیث قرآن کے اصول سے ٹکراتا ہے وہاں حدیث کی روایت کی حمایت سے دستبردار ہو جاتے ہیں اور معاملہ قاری پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ خود رائے قائم کرے کہ وہ قرآن کے مقابلے میں روایت کو کیا مقام دینا چاہتا ہے۔ وہ خود برملا یہ اعتراف کر لیتے ہیں کہ یہ روایت میری سمجھ میں نہیں آئی۔

مولانا رحمہ اللہ کی یہ شرحیں احادیث کا اطلاق آج کے ماحول اور مسائل پر کرتی ہیں۔ مولانا اصلاحی رحمہ اللہ جدید مسائل زیر بحث لاتے ہیں اور ان کے حل کی تجاویز احادیث کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح موطا کی شرح میں وہ امام مالک رحمہ اللہ کے فتاویٰ کو زیر بحث لاتے اور ان کا تقابل دوسرے ائمہ فقہ کی آراء سے کرتے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب محاکمہ کا انداز لیے ہوئے ہے اور تربیت فکر کے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

صحیح بخاری کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے مولانا اصلاحی رحمہ اللہ نے چند اہم نتائج کی نشان دہی کی ہے۔ [1] مثلاً یہ کہ اس کتاب کا مزاج کلامی ہے۔ کتاب الایمان کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب میں امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنے زمانے کے فرقوں...... مرجئہ، کرامیہ اور ان کے ہم مشربوں...... کے فتنوں کو مدنظر رکھا ہے اور ان روایات کو زیادہ اہمیت دی ہے جن میں ایمان قول وعمل کا مجموعہ نظر آتا ہے۔ یہ بالکل صحیح نقطۂ نظر ہے لیکن صحیح بخاری کی عظمت کے قائل ہونے کے باوجود امت نے مرجئہ ہی کا نقطۂ نظر اپنایا ہوا ہے۔ دوسرے، یہ کہ امام صاحب کو اپنی کتاب پر نظر ثانی اور اس کی ترتیب وتنقیح کی مہلت نہ مل سکی اور اس کی روایت شروع ہوگئی۔ اسی لیے کئی عنوانات تو قائم ہوگئے لیکن ان کے تحت کوئی روایت نہیں ہے یا روایات تو نقل ہوگئیں لیکن موضوع باب سے ان کی مناسبت محل نظر ہے۔ تیسرے، امام صاحب کے عنوانات کا ایک خاص مزاج ہے۔ وہ موضوع کے بعید ترین گوشوں میں چلے جاتے اور اخذ مسائل کے لیے نہایت باریک استدلال کی راہ کھولتے ہیں۔ یہ چیز ان کے تفقہ کی دلیل اور تربیت فکر کے پہلو سے اہم ہے لیکن کبھی کبھی امام صاحب بعض غیر ضروری مسائل کی جانب بھی نکل جاتے ہیں۔ چوتھے، کتاب کی فقہی ترتیب کے باعث احادیث کا متفرق ابواب میں تذکرہ ہوا ہے جبکہ معنی ومفہوم اور حکمت دین کے پہلو سے ان کا ذکر دوسرے ابواب میں ہونا چاہیے تھا۔ امام صاحب کی ترتیب کے باعث حدیث کے ایک طالب علم کے لیے صحیح بخاری سے استفادے کے لیے مشکلات پیدا ہوگئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امت کے ایک طبقے نے صحیح مسلم کی ترتیب کو صحیح بخاری کی ترتیب کی نسبت زیادہ سائنٹفک مانا ہے اور اس کو کتب حدیث میں فوقیت دی ہے۔

---

[1] امین احسن اصلاحی، تدبر حدیث شرح صحیح بخاری، جلد اول، ص 17۔15، ادارہ تدبر قرآن وحدیث لاہور، 2002ء۔

Marfat.com

مولانا اصلاحی رحمہ اللہ کی شرح حدیث اپنے اندر غور وفکر کی دعوت دیتی ہے، فہم حدیث کے بعض نئے پہلو سامنے آتے ہیں اور زندگی کے مسائل پر احادیث کا اطلاق آدمی کو ایک نیا دینی جذبہ عطا کرتا ہے۔

تدوینِ قرآن

قرآن مجید کی کتابت کا کام حضور ﷺ نے مسلسل جاری رکھا۔ کم وبیش چالیس صحابہ کے نام کتابوں میں ایسے آئے ہیں جنہوں نے کتابت وحی میں حصہ لیا۔ ان میں مکی بھی ہیں اور مدنی بھی۔ جب بھی قرآن کی کچھ آیات نازل ہوتیں تو حضور ﷺ کتابت جاننے والے صحابی کو طلب فرماتے اور اس کو یہ ہدایت دیتے کہ ان آیات کو فلاں سورہ میں فلاں آیت کے بعد اور فلاں آیت سے پہلے لکھ دو۔ یہ ہدایت اس لیے دی جاتی کہ قرآن کو نزولی ترتیب پر لکھوانا مدنظر نہ تھا بلکہ قرآن اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق جمع ہو رہا تھا اور اس کو نئی ترتیب دی جا رہی تھی۔ یہ ترتیب توقیفی کہلاتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے تحت مقرر کردہ ترتیب۔ قرآن آج تک اسی ترتیب سے لکھا جاتا اور اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔
اس زمانہ میں دشمنوں کی یہ کوشش ہے کہ وہ اپنی من گھڑت ترتیب پر نیا قرآن مدوّن کریں۔ اسی لیے وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ موجودہ ترتیب صحابہ اور خصوصاً زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی قائم کردہ ہے اور اس کی اصلاح ضروری ہے کیونکہ اس میں ایڈیٹنگ کے نقائص ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ترتیب اللہ کے حکم سے حضور ﷺ کی نگرانی میں قائم ہوئی۔ اس میں کسی انسانی کاوش کو دخل نہیں ہے۔ مستشرقین نے قرآن کی ترتیب نو کی متعدد کوششیں کی ہیں لیکن ان کو ان کے اپنے اہل تحقیق نے ایک لایعنی کام قرار دیا ہے اور کسی کو بھی قبولیت حاصل نہیں ہوئی۔

نبی ﷺ جو کتابت کرواتے وہ اپنے خاص مصحف میں ترتیب سے رکھواتے۔ ابتداءً یہ مصحف مسجد نبوی کے ایک ستون کے پاس ایک صندوق میں رکھا رہتا۔ اس ستون کا نام ہی 'اسطوانہ مصحف' پڑ گیا۔ صحابہ یہیں بیٹھ کر اپنی ضرورت کا قرآن لکھ لیا کرتے۔ اس طرح اصل مصحف محفوظ رہتا۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا قول روایات میں نقل ہوا ہے کنا عند رسول اللہ نؤلف القرآن من الرقاع. ''ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس اوراق کی مدد سے قرآن مرتب کیا کرتے تھے۔'' (الاتقان فی علوم القرآن) بعد میں جب منافقین ومعاندین کی ریشہ دوانیاں بڑھ گئیں تو رسول اللہ ﷺ نے حفاظت کے نقطہ نظر سے یہ مصحف مسجد سے اٹھوا دیا اور اس کو ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں رکھوا دیا۔
حضور ﷺ کو توقیفی ترتیب پر قرآن سنانے کا انتظام من جانب اللہ ہوا۔ حضور ﷺ ہر رمضان میں مسجد میں معتکف ہوتے اور جبرئیل امین علیہ السلام کے ساتھ قرآن کا مذاکرہ ہوتا۔ جب قرآن کی تکمیل ہوگئی تو آخری رمضان میں حضور ﷺ نے بیس دن کا اعتکاف کیا اور حتمی ترتیب پر قرآن دو مرتبہ سنایا۔ اس طرح ایک طرف جمع قرآن کا کام مکمل ہوا، وعدۂ الٰہی کے مطابق آپ کو قرآن مرتب شکل میں سنا دیا گیا اور پھر آپ نے اس ترتیب پر جبرئیل علیہ السلام کو قرآن سنایا اور اسی کی تعلیم امت کو دی۔

(حیات رسول امی ﷺ، علامہ خالد مسعود، صفحہ نمبر 533-534، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، سال اشاعت: 2014ء)

Marfat.com

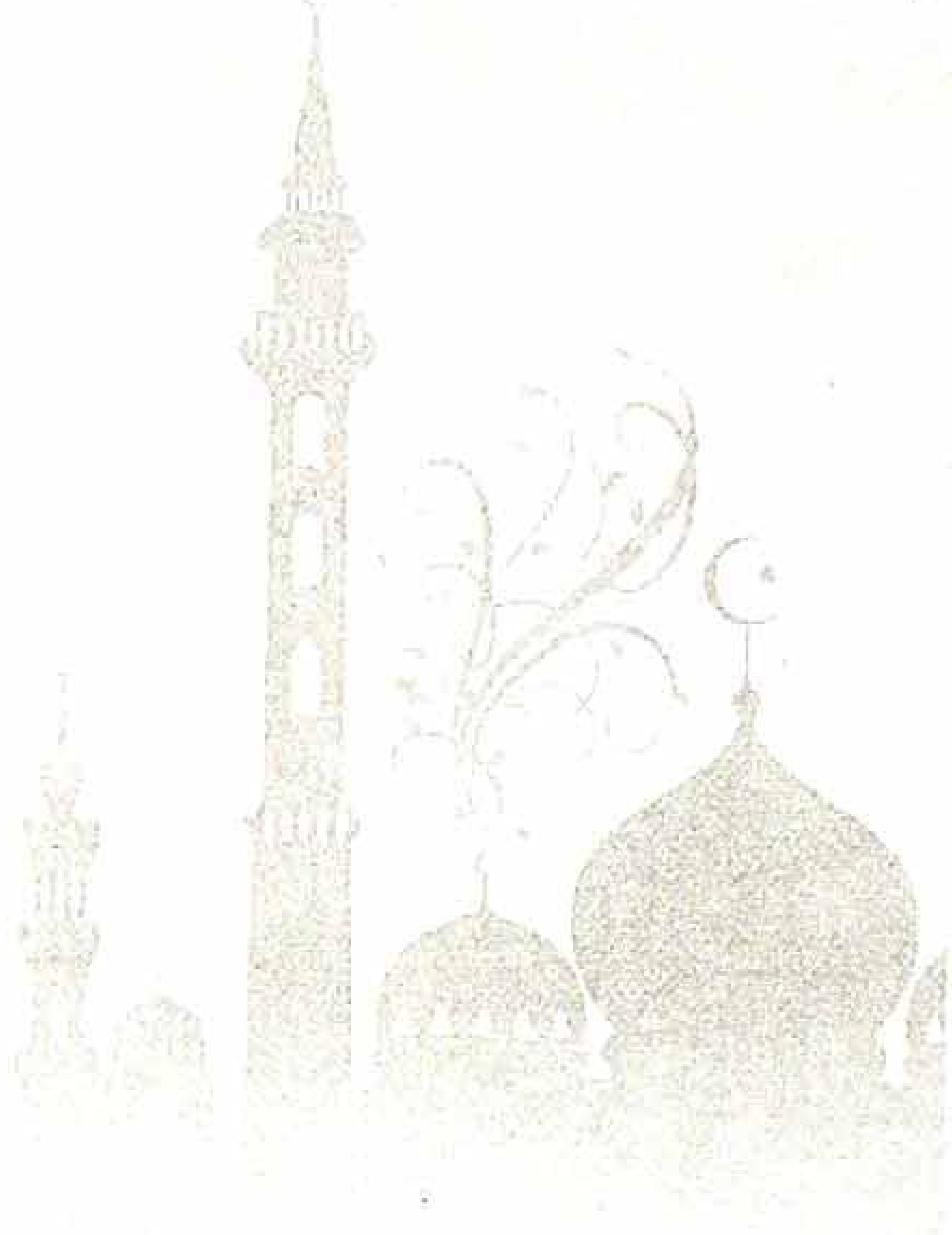

ذکرِ اصلاحی

بابِ چہارم

مولانا اصلاحی کی علمی خدمات

ادارہ تدبر قرآن وحدیث.....ایک تعارف

علم وعرفان کے ماہِ کامل کا غروب

یادگار سفرِ ہند

Marfat.com

مولانا اصلاحی کی علمی خدمات

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی مادر علمی مدرسۃ الاصلاح سرائے میر (ضلع اعظم گڑھ یو۔پی) ہے۔اس ادارہ کے اولین منتظمین میں مولانا شبلی نعمانیؒ اور امام حمید الدین فراہیؒ جیسے جلیل القدر لوگ شامل ہیں۔انہوں نے مدرسہ کو جو تخیل دیا اور جس کے مطابق نصاب درس تجویز کیا وہ امام فراہیؒ کے الفاظ میں یہ ہے:

''مدرسۃ الاصلاح کا دعویٰ ہے کہ مسلمانوں کے انحطاط وتنزل کا اصلی سبب یہی ہے کہ وہ قرآن مجید کی تعلیم کو آہستہ آہستہ کم کرتے گئے اور وہ علوم جو قرآن مجید کے لیے آلہ اور وسیلہ ہوسکتے تھے، ان کی تحصیل میں اس قدر مصروف ہوگئے کہ وہ خود مقصود بالذات بن گئے۔ یہاں تک کہ ہوتے ہوتے قرآن مجید کے درس وتدریس کے لیے انہوں نے بالکل جگہ نہ چھوڑی اور اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ محض تلاوت وحفظِ الفاظ پر اکتفا کرلیا گیا اور ہم پر رسول خداؐ کی یہ شکایت منطبق ہونے لگی کہ یَارَبِّ اِنَّ قَومِی اتَّخَذُوا ھٰذَا الْقُرآنَ مَھْجُورًا (اے میرے رب، میری قوم نے اس قرآن کو پس انداز کردہ چیز بنایا) لیکن اللہ کی توفیق سے مدرسۃ الاصلاح نے یہ راز پالیا اور قرآن مجید کو سرچشمۂ ہدایت وترقی تسلیم کرکے جملہ علوم کی تعلیم اس کی تعلیم کے ماتحت کردی۔ وہ ادب، فقہ، حدیث، تاریخ وسیر، منطق و حکمت کی تعلیم دیتا ہے لیکن اس طور کہ جس علم کی طرف قدم بڑھے قرآن کی روشنی میں بڑھے اور جو دروازہ کھلے قرآن ہی کے اندر سے کھلے۔''

مدرسہ سے سند فراغ پانے کے بعد مولانا اصلاحیؒ کو امام فراہیؒ جیسی نابغہ شخصیت سے براہ راست فیض یاب ہونے کا خاص موقع ملا۔ استاذ نے کمال شفقت وتوجہ کے ساتھ مولانا کی فکری رہنمائی کی اور ان کو علوم قرآن کا ایسا شیدائی بنا دیا کہ اس کے بعد پوری زندگی میں وہ اس جانب سے غافل نہ ہوسکے۔ کلام الٰہی ان کے دل کی بہار، ان کے سینے کا نور، ان کی مشکلات میں سہارا اور ان کے غم کا مداوا بن گیا۔ انہوں نے پڑھا تو اسی کے افہام وتفہیم کی خاطر اور لکھا تو اسی کو محور بنا کر لکھا اور آج دنیا ان کو قرآن مجید کے ایک عظیم شارح وترجمان کی حیثیت سے پہچانتی ہے۔

مولاناؒ نے اپنے علمی کام کا آغاز اپنے استاذ امام فراہیؒ کے افکار وتحقیقات کو اہل علم میں روشناس کرانے سے کیا۔ انہوں نے ان کے عربی میں لکھے گئے تفسیری رسائل اور اصول تفسیر کے بارے میں تحقیقات کو اردو جامہ پہنایا

Marfat.com

جس سے ان بیش قیمت جواہر پاروں کو ایک وسیع علمی دائرہ میں پھیلانا ممکن ہوگیا۔ اسی دوران انہوں نے استاذ کے اصولوں کی روشنی میں اپنا ذاتی تحقیقی کام شروع کر دیا جس کے نتائج آہستہ آہستہ سامنے آئے۔ مولانا کا یہ کام تفسیر، حدیث، اصول فقہ، کلام اور تزکیہ نفس کے موضوعات پر محیط ہے۔

فکر فراہیؒ:

قرآن مجید کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ یہ صحیفۂ آسمانی اپنے مدعا میں بالکل واضح ہے۔ اس کا اساسی پیغام مختلف پیرایوں میں سامنے آ کر کوئی ابہام نہیں چھوڑتا اور ہر طالب ہدایت اس سے ہدایت حاصل کرسکتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک صاحب فہم کے لئے، جو گہرائی میں اُتر کر اس کا مطالعہ کرنا چاہے، اس میں بڑی مشکلات بھی ہیں۔ عربی زبان اور اسلوب کلام کی مشکلات کے علاوہ لوگ آیات کو سیاق و سباق (Context) میں رکھ کر سمجھنا مشکل ہی نہیں پاتے بلکہ یہ رائے رکھتے ہیں کہ ہر آیت اپنی جگہ الگ مضمون کی حامل ہوتی ہے اور جہاں تک کلام کا تعلق ہے تو یہ غیر مربوط ہے۔ اس تصور کے تحت ہر شخص آیات کی ترجمانی اپنے رجحان طبع اور ذہنی اپج کے مطابق کرسکتا ہے۔ چنانچہ عرصہ دراز سے قرآن مجید پر غور کرنے کا یہ طریقہ رائج ہے کہ سارا اعتماد تفسیر کی ان قدیم کتابوں پر کیا جاتا ہے جن میں ائمہ تفسیر کے اقوال نقل کیے گئے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک قول یا چند اقوال کو بلاوجہ ترجیح لے لیا جاتا ہے یا تفسیر کی رائج کتابوں کی ہر بات مجرد اس دلیل کی بنا پر حق سمجھ لی جاتی ہے کہ وہ ان کتابوں میں نقل ہے۔ یہ طریقہ ان لوگوں کے لیے موزوں نہیں ہے جو اقوال کو دلائل کی کسوٹی پر بھی پرکھنا چاہتے ہیں۔ اس طریقہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ امت مسلمہ نے ہر ہر آیت کی اتنی تفسیریں بیان کر دیں کہ اصل مفہوم غائب ہوگیا اور امت خود بھی تفرقہ کا شکار ہوگئی۔ امام فراہیؒ نے اس صورت حال پر طویل عرصہ تک غور وفکر کیا اور اس نتیجہ تک پہنچے کہ وحدت امت کے لیے ضروری ہے کہ قرآن فہمی میں فکری انتشار کی راہ مسدود کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے تفسیر کے لیے ایسے اصول وضع کیے جو آیات کی ایک ہی تاویل تک پہنچانے میں مدد دیں۔ انہوں نے اس حقیقت کو بھی پالیا کہ قرآن مجید کی ہر سورہ اول تا آخر مربوط اور ایک مکمل وحدت ہوتی ہے۔ اس کا ایک مخصوص موضوع ہوتا ہے جس کو انہوں نے عمود سے تعبیر کیا۔ انہوں نے بتایا کہ جب سورہ کا عمود متعین ہو جائے تو اس کے تمام مباحث کو اس عمود کے ساتھ وابستہ کرنا ممکن ہو جاتا ہے اور ہر آیت اپنے سیاق وسباق میں جو مفہوم دیتی ہے وہ ایک ہی ہوتا ہے۔ اس میں کئی معنوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ لہٰذا قرآن کو سمجھنے کے لیے آیات کے نظم وربط کو سمجھنا از بس ضروری ہوتا ہے۔ امام فراہیؒ کے نزدیک قرآن مجید کلام اللہ ہونے کے باعث دوسری ہر چیز پر حاکم ہے لہٰذا ہر وہ علم جس کا تعلق قرآن کے موضوع سے ہے اسی سے مستنبط ہونا چاہیے اور اس کی بنیادیں قرآن کی دی ہوئی ہدایت پر استوار ہونی چاہئیں۔

استاذ کے اس فکر کو مولانا اصلاحیؒ نے جس طرح اپنایا اور وسیع دائروں میں اس کا اطلاق کیا وہ انہی کا حصہ ہے۔ ان کے علمی کام کا مرکز ومحور قرآن مجید ہے اور ان کا تمام علمی کام اسی اصل سے پھوٹا ہے۔ اس میں سرفہرست ان کی عظیم تفسیر تدبر قرآن ہے۔

Marfat.com

تفسیر تدبر قرآن:

تفسیر تدبر قرآن ایک منفرد انداز میں تصنیف کی گئی ہے۔ مولانا اصلاحی ہر سورہ کی تفسیر سے پہلے اس کا مرکزی مضمون یا عمود بیان کرتے اور پہلی اور پچھلی سورتوں کے ساتھ اس کے معنوی ربط پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کے بعد وہ پوری سورہ کا تجزیہ کر کے آیات کے ایسے مجموعوں کی نشاندہی کرتے ہیں جو ایک مضمون پر مشتمل ہوتی ہیں۔ پھر وہ ہر مجموعہ کو لے کر اس کی تفسیر کرتے ہیں۔ اس میں وہ ہر آیت کے مشکل الفاظ اور جملوں کی ساخت نیز اسالیب زبان کی شرح کرتے ہیں، پھر ہر آیت کا اندرونی نظم کھولتے اور آیات کے مجموعہ میں اس کا مفہوم واضح کرتے ہیں۔ اس طرح ہر آیت کا مفہوم اپنے سیاق و سباق میں متعین ہو جاتا اور پوری سورہ ایک وحدت کی صورت میں سامنے آ جاتی ہے۔ یہ طرز بیان بالکل نیا اور نہایت دل نشین ہے۔ تدبر قرآن متعدد خصوصیات کی حامل ہے جن میں سے اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

(ا) مولانا اصلاحی نے شعوری کوشش کر کے اپنی تفسیر کو قرآن کے اپنے پیغام کو واضح کرنے تک محدود رکھا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ قرآن کا اصل مفہوم سامنے آئے اور الفاظ کا جتنا تقاضا ہے اسی کے بقدر وضاحت کی جائے۔ اسی لیے نہ تو انہوں نے کلامی و فقہی مسالک اور ان کی موشگافیوں کو تفسیر میں جگہ دی ہے اور نہ کسی رائج الوقت نظریہ کی حمایت و مخالفت کے لیے قرآن کو ذریعہ بنایا ہے، حتیٰ کہ شان نزول کی روایات میں سے اگر کسی روایت کا تذکرہ ضروری سمجھا ہے تو اس کو سرسری طور پر بیان کر دیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ ایک طالب علم قرآن کے الفاظ کے ساتھ مربوط رہتا ہے اور کوئی چیز اس کی توجہ اصل مضمون سے ہٹانے کا باعث نہیں بنتی۔

(ب) تفسیر کی ایک خوبی اس کی تفہیم کا انداز ہے۔ الفاظ سے لے کر جملوں، آیات، آیات کے مجموعوں اور پوری سورہ کی تفہیم یہ اس طرح کرتی ہے جیسے کوئی گائیڈ کسی نووارد کی انگلی پکڑ کر اسے منزل تک پہنچا دے۔ جہاں کوئی سوال پیدا ہوتا ہے اس کا جواب ملتا ہے۔ جہاں اعتراض پیدا ہوتا ہے اس کی تشفی بخش وضاحت موجود ہوتی ہے۔ کوئی نحوی مشکل ہو تو اس کا حل فراہم کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے ہر ہر پہلو سے آیات پر غور کیا ہے اور اس دوران میں جو مشکلات خود انہیں پیش آئی ہیں اپنے قاری کے لیے پہلے ہی سے ان کا حل پیش کر دیا ہے۔

(ج) دوسری تفاسیر کے مصنفین دوران تفسیر اپنے نکات، تحقیقات اور ضمنی مسائل اتنی تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ اصل سلسلہ کلام سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔ مولانا کے استاذ بھی تفسیری نکات اور جزوی مسائل پر بکثرت طویل فصلیں لکھتے ہیں۔ تدبر قرآن میں ایسا نہیں ہے۔ گنتی کے چند موضوعات کے سوا انہوں نے کوئی فصل تفسیر کے بیچ میں داخل نہیں کی اور ان چند موضوعات کو بھی وہ ایسے مقام پر لائے ہیں جہاں سلسلہ کلام میں خلل واقع نہیں ہوتا۔

(د) مولانا اصلاحیؒ نے تکلف کر کے کوئی مفہوم تراشنے سے گریز کیا ہے۔ وہ سادہ تفسیر اختیار کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک قرآن کے اولین مخاطب سادگی پسند تھے اور انہی کے مزاج کے مطابق قرآن نازل ہوا۔ چنانچہ

Marfat.com

مولانا اصلاحی تفسیر کے لیے جدید سائنسی تحقیقات کو خاطر میں نہیں لاتے۔ مثال کے طور پر سورہ انبیاء کی آیت ۳۰ میں آسمان وزمین کے لیے رتق اور فتق (بند ہونا اور کھلنا) کے الفاظ آئے ہیں۔ جدید مفسرین اس سے Big Bang Theory کو مراد لیتے ہیں جس کے مطابق پہلے آسمان وزمین یکجا تھے۔ پھر ایک دھماکا ہوا تو ان کے پرزے چاروں طرف پھیلنے لگے اور وہ ابھی تک اپنے مرکز سے ہٹتے ہی چلے جارہے ہیں۔ مولانا کے نزدیک آسمان کے بند ہونے اور کھلنے سے مراد امساک باراں اور پھر بارش کا برسنا ہے۔ اسی طرح زمین کا رتق وفتق اس کے مساموں کا بند ہونا اور بارش ہونے پر کھلنا اور نباتات اُگانا ہے۔

مولانا فراہیؒ کی تفسیر سورہ ذاریات میں نطق سے قیامت کے استدلال کی بحث کو مولانا اصلاحی نے تکلف قرار دیا ہے اور اس کے لیے کلمہ ''کن'' کی تعبیر کو زیادہ مناسب قرار دیا ہے۔ سورہ مرسلات میں امام فراہیؒ نے جہنمیوں کے لیے دھوئیں کے سہ شاخہ ہونے کی توجیہ یہ کی ہے کہ کفار کی تین نمایاں خصلتوں کے لحاظ سے دھواں سہ شاخہ ہوکر ان پر پھیلے گا۔ مولانا اصلاحی کہتے ہیں کہ بیک وقت کسی کافر میں تینوں خصلتوں کا پایا جانا ضروری نہیں۔ اس لیے بہتر تاویل یہ ہوسکتی ہے کہ ایک سمت سے جہنمیوں کو ہانک کر لایا جارہا ہوگا، باقی تینوں سمتوں میں دھوئیں کے بال چھائے ہوں گے۔

(ہ) تفسیر میں الفاظ کے معانی کی تحقیق، نحوی ترکیب اور اسالیب کلام پر اہم بحثیں ملتی ہیں۔ یہ چیز ان لوگوں کے اندر تو بے چینی پیدا کرتی ہے جو خالص علمی مباحث میں دلچسپی نہیں رکھتے لیکن مولانا کی تفسیر صرف عربی سے نابلد لوگوں کے لیے نہیں لکھی گئی بلکہ عربی جاننے والوں کے لیے بھی ہے۔ ان کے لیے یہ فنی مباحث نہایت قیمتی اور ان کی ضرورت کی چیز ہیں۔ قرآن فہمی کی مشکلات کو دور کرنے میں ان مباحث کا بڑا حصہ ہے۔

(و) تدبر قرآن کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اس میں قرآن کے استدلال کو اس طرح کھولا گیا ہے کہ ہر عقیدہ اور دعویٰ کے فطری و عقلی دلائل کھل کر سامنے آگئے ہیں۔ قرآن کا مطالعہ کرنے والا ایک عام شخص چاند، سورج، ہوا، بارش، سمندر، کشتی وغیرہ کا ذکر آنے پر سوچتا رہ جاتا ہے کہ آخر وہ کیا خاص بات ہے کہ قرآن میں ان کا تذکرہ بار بار ہوا ہے۔ تدبر قرآن میں ایسی تمام اشیاء کے اندر شہادت کا پہلو اتنی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ اس سے آدمی اطمینان قلب کی دولت پاتا ہے۔

(ز) مولانا اصلاحیؒ نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی سوچ کے مطابق اور اپنی آزاد رائے کی روشنی میں لکھا ہے۔ محض نقل انہیں کہیں گوارا نہیں ہوئی۔ وہ جس رائے کو دلیل کی روشنی میں اختیار کرلیتے ہیں اس کو اپنی نہایت قیمتی متاع سمجھتے ہیں۔ وہ صاف لکھتے ہیں:

''کتاب وسنت کے سوا میں کسی چیز کو حجت نہیں سمجھتا اور غور وتدبر میرے نزدیک انسانی فضائل میں سب سے برتر اور سب سے اعلیٰ فضیلت ہے۔ میری کوشش یہ ہے کہ ایک مدت دراز سے قرآن وحدیث پر

Marfat.com

غور و تدبر کی جو راہ مسدود ہے وہ اب کھل جائے اور اگر اس راہ میں مجھ سے کوئی خدمت بن آتی ہے تو مجھے اس سے ہچکچانا نہیں چاہیے۔''

(دیباچہ تدبر قرآن)

یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جب بعض اہم تفسیری مشکلات کو حل کیا ہے تو ان کو مدلل کر کے برملا بیان بھی کر دیا ہے اور کسی مصلحت کو آڑے نہیں آنے دیا۔ مثال کے طور پر اصحاب الاعراف کی تعیین، اسیران بدر سے فدیہ کے معاملہ، شادی شدہ زانی کی سزا اور ازواج نبیؐ کے ایلاء و تخییر 1 کے واقعات میں مولانا کا موقف نہایت دوٹوک طریقہ سے مدلل ہو کر سامنے آیا ہے، اگر چہ ان معاملات میں مفسرین کی رائیں بے حد الجھی ہوئی ہیں۔

مولانا اصلاحیؒ کی یہ آزادئ فکر ان سورتوں کی تفسیر میں بھی سامنے آئی ہے جو ان کے استاذ گرامی کی تفسیر نظام القرآن میں شامل ہیں۔ استاذ کے طریقہ کے برعکس انہوں نے سورتوں کی تفسیر اپنے پیرایہ بیان میں کی ہے، ضمنی مباحث کو یک قلم ختم کر دیا ہے۔ سورتوں کے عمود انہوں نے اپنے متعین کیے ہیں جس کے باعث تفسیر میں بھی فرق واقع ہوا ہے۔ مثال کے طور پر مولانا فراہی کے نزدیک سورہ تحریم کا عمود 'محاسبہ میں سخت گیری' ہے۔ مولانا اصلاحی اس کو 'محبت کے اندر اللہ کی حدود کی حفاظت' سے تعبیر کرتے ہیں۔ سورہ مرسلات کا عمود استاذ کی تحقیق میں 'قیامت، خشیت اور احسان' ہے جب کہ تدبر قرآن میں حشر و نشر اور جزا و سزا کے ایک شدنی امر ہونے کو عمود قرار دیا گیا ہے۔

(ح) مولانا اصلاحیؒ کی سوچ نہایت عاقلانہ اور بے حد متوازن ہے۔ اس میں نہ تو ان لوگوں کی بے اعتدالی پائی جاتی ہے جو صدیوں پرانے معیار فہم و تحقیق کو حرز جان 2 بنائے ہوئے ہیں اور دین میں عقل کا کوئی مقام تسلیم کرنے کو تیار نہیں اور نہ دور حاضر کے ان لوگوں کی آزاد خیالی اور بے راہ روی ہے جو اپنے ملی ورثہ علمی کے بارے میں احساس کمتری میں مبتلا ہیں اور ہر مسئلے میں ان کے نزدیک رائے وہی صائب ہے جو اہل مغرب نے پیش کی ہے۔ گویا مولانا کے فکر میں وہ قدامت ہے جو عقل و دانش سے عاری نہیں اور وہ جدت ہے جس میں بگٹٹ قسم کی آزادروی نہیں۔

ترجمہ قرآن:

جہاں تک ترجمہ قرآن کا تعلق ہے اس کا مروج طریقہ یہ ہے کہ پہلے سے موجود چند ترجمے سامنے رکھ کر اپنے ذوق کے مطابق ان کی نوک پلک درست کر کے ایک نیا ترجمہ تیار کر لیا جاتا ہے۔ تدبر قرآن میں جو ترجمہ کیا گیا ہے وہ اس انداز کا نہیں ہے بلکہ غور و فکر اور تدبر کے بعد آیات کا ربط اور سیاق و سباق جو مضمون پیدا کرتا ہے اس کو ترجمہ میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس میں الفاظ اور جملوں کی ساخت کا لحاظ تو ہے ہی، عربی زبان کے اسالیب کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے مثلاً عربی زبان میں فصاحت و بلاغت کی مناسبت سے جملوں میں بعض الفاظ حذف کر دیے جاتے ہیں جبکہ اردو میں یہ اسلوب ناپید ہے۔ مولانا اصلاحیؒ مراد معانی کو ادا کرتے ہوئے حذف کو کھول دیتے ہیں اور اس وضاحت کو

---

1 ایلاء: قسم کھانا، نبی ﷺ کے ایک بار اپنی بیویوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھانے کا واقعہ۔ تخییر: بہتر کا انتخاب، اللہ کی طرف سے ازواجِ نبوی کی تادیب کہ بعید نہیں نبی ﷺ تمھیں طلاق دے دیں تو اللہ آپ ﷺ کو تم سے بہتر بیویاں عطا کر دے۔

2 حرزِ جان: جان کا تعویذ، پسندیدہ چیز۔

Marfat.com

قوسین (Brackets) میں لانا بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ ترجمہ میں مولانا اپنے استاذ کی اس ہدایت پر عمل کرتے ہیں کہ طرز ادا، شان کلام اور اظہار جذبات کلام کی جان ہوتے ہیں۔ ترجمہ کرتے ہوئے ان کو بدلنا عبارت کو مسخ کرنا ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ کلام الٰہی کا ترجمہ روزمرہ کی زبان سے الگ ہونا چاہیے۔ قدامت طرز متانت کے موافق ہوتی ہے اس لیے اس کی پیروی ہونی چاہیے۔ مولانا اصلاحی نے آخری پاروں کی سورتوں کی مختصر آیات کا ترجمہ انہی کی طرح مختصر اور معنی آفرین کیا ہے جبکہ طویل آیات کا ترجمہ بیانیہ انداز میں کیا ہے۔ چونکہ یہ ترجمہ سیاق وسباق کو ملحوظ رکھ کر کیا گیا ہے اس لیے یہ قرآن مجید کا بالکل نیا (Original) ترجمہ کہلا سکتا ہے۔

مولانا فراہیؒ کی فراہم کردہ بنیادوں پر مولانا اصلاحیؒ نے تدبر قرآن کی صورت میں جو عظیم عمارت تعمیر کی ہے اس کی تکمیل پر وہ اپنے استاذ کے لیے شکر وسپاس اور اپنی ذات کے لیے عجز وانکسار کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اگرچہ میں اپنے طرز فکر کو حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کے فکر کے ساتھ ملانا بے ادبی خیال کرتا ہوں لیکن چونکہ واقعہ یہی ہے کہ میں نے عمر بھر استاذ ہی کے سُر میں اپنا سُر ملانے کی کوشش کی ہے اور میرا فکر ان کے فکر کے قدرتی نتیجہ ہی کے طور پر ظہور میں آیا ہے اس وجہ سے یہ جوڑ ملانے کی جسارت بھی کر رہا ہوں۔ اگر یہ بے ادبی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرمائے۔'' (دیباچہ تدبر قرآن)

نظام قرآن کی نئی جہات:

امام فراہیؒ نے جیسا کہ اوپر بیان ہوا، ہر سورہ کے ایک وحدت ہونے اور اس کا ایک خاص عمود ہونے کا تصور پیش کر کے قرآن مجید کو ایک مربوط ومنظم کتاب ثابت کیا۔ مولانا اصلاحیؒ نے مزید غور وفکر کے بعد اس تصور کو بڑی ترقی دی ہے۔ ان کے ہاں قرآن کے نظام کی جو نئی جہات ملتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(ا) قرآن کی ہر سورہ اپنا ایک جوڑا اور مثنیٰ بھی رکھتی ہے اور ان دونوں میں اسی طرح کی مناسبت ہوتی ہے جس طرح کی مناسبت زوجین میں ہوتی ہے۔ یعنی ایک میں جو خلا ہوتا ہے دوسری اس خلا کو بھرتی ہے۔ ایک میں جو پہلو مخفی ہوتا ہے دوسری اس کو اُجاگر کرتی ہے۔ اس طرح کی مثنیٰ سورتوں کا عمود اور نفس مضمون ایک ہی ہوتا ہے لیکن کبھی ایک سورہ دوسری سورہ کے اجمال کی تفصیل کرتی ہے۔ کبھی ایک سورہ میں عام اصول بیان ہوتا ہے اور دوسری اس اصول کی تشریح کرتی ہے۔ کبھی دو سورتوں میں ایک ہی مضمون کو ثابت کرنے کے لیے مختلف قسم کے شواہد استعمال کیے جاتے ہیں۔ کبھی دو سورتیں کسی معاملے کے مثبت اور منفی پہلوؤں کے بیان کے لیے خاص ہوتی ہیں۔ کبھی ایک میں کسی معاملے کے مقدمات اور دوسری میں ان سے نکلنے والے نتائج بیان کیے جاتے ہیں۔

(ب) بعض سورتیں ایسی بھی ہیں جن کی حیثیت ضمنی سورہ کی ہے یعنی وہ کسی سورہ کے مستقل مثنیٰ کی حیثیت نہیں رکھتی ہیں بلکہ اپنی ماسبق سورہ کے کسی ایک اہم پہلو کی وضاحت کے طور پر نازل ہوئی ہیں۔

(ج) قرآن مجید میں سورتوں کے سات ایسے مجموعے یا گروپ موجود ہیں جن کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر مجموعہ ایک یا

Marfat.com

ایک سے زیادہ مکی سورتوں سے شروع ہو کر ایک یا ایک سے زیادہ مدنی سورتوں پر ختم ہوتا ہے۔ جس طرح ہر سورہ کا ایک خاص مرکزی مضمون ہے جس سے تمام اجزائے کلام وابستہ ہوتے ہیں، اسی طرح ہر گروپ کا بھی ایک جامع عمود ہے اور اس گروپ کی تمام سورتیں اس جامع عمود کے کسی خاص پہلو کی حامل ہوتی ہیں۔ مطالب اگرچہ ہر گروپ میں مشترک سے ہیں لیکن اس اشتراک کے ساتھ جامع عمود کی چھاپ ہر گروپ پر نمایاں ہے۔ ہر گروپ کی مدنی سورتیں اپنے گروپ کے عمومی مزاج سے بالکل ہم آہنگ وہم رنگ ہیں۔ ان کو اپنے گروپ کی مکی سورتوں سے وہی مناسبت ہے جو مناسبت کسی درخت کی جڑ اور اس کی شاخوں میں ہوتی ہے۔

(د) ہر گروپ کے اندر اسلامی دعوت کے تمام ادوار ابتدا سے لے کر انتہا تک نمایاں ہوئے ہیں، البتہ نمایاں ہونے کا پہلو ہر ایک کے اندر مختلف ہے۔ نیز ایجاز اور تفصیل کے اعتبار سے انداز الگ الگ ہیں۔

(ہ) قرآن مجید کی بعض سورتوں مثلاً الرحمٰن، الشعراء اور المرسلات میں ایک ہی آیت بار بار دہرائی جاتی ہے، اسے اصطلاح میں ترجیع کہتے ہیں۔ یہ ترجیعات تمام قرآن میں پائی جاتی ہیں اور ان کی دو قسمیں ہیں: ایک لفظی دوسری معنوی۔ لفظی ترجیعات تو مذکورہ سورتوں میں نظر آتی ہیں لیکن معنوی ترجیعات تقریباً ہر سورہ میں ہیں۔ البتہ ان کو تلاش کرنے کے لیے مضامین سورہ کا ذہن میں محفوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے اور معرفت نظم کا بہت کچھ مدار ان ہی پر ہوتا ہے۔

(ر) قرآن مجید کی قسموں کے متعلق یہ بات طے ہے کہ یہ آگے آنے والے دعویٰ پر دلیل اور شہادت کے طور پر آتی ہیں۔ جو شہادت قسموں کے اسلوب میں پیش کی گئی ہے وہی شہادت سادہ اسلوب میں طویل سورتوں میں بھی آ گئی ہے۔ لہٰذا قسموں کو حل کرنے کے لیے اس مضمون کی بیانیہ آیات سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔

اصول فہم حدیث:

قرآن مجید کی تفسیر کے لیے مولانا اصلاحیؒ کے سامنے امام فراہیؒ کے مجوزہ طریق کار کا ایک نقشہ اور کچھ نمونہ موجود تھا لیکن حدیث کی تحقیق وشرح کے لیے ان کے سامنے ایسی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ وہ حدیث میں ایک جلیل القدر محدث مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوریؒ (شارح ترمذی ومصنف تحفۃ الاحوذی) کے شاگرد تھے اور ان کی سند حدیث معاصر علماء میں بہت عالی تھی لیکن حدیث کی تحقیق کے بارے میں ان کے استاذ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ حدیث میں اصل اعتماد سند پر ہوتا ہے۔ اگر سند قابل اعتماد ہو تو حدیث کے مضمون پر بحث لاحاصل ہے۔ مولانا اصلاحیؒ جیسے عقلی آدمی کے لیے اس نقطہ نظر سے اتفاق کرنا ممکن نہ تھا لہٰذا انہوں نے فہم حدیث کیلیے مفید اصولوں کی طرف رہنمائی کی ہے۔ وہ سند کو حدیث کے پرکھنے کا محض ایک ذریعہ قرار دیتے اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ متن حدیث کی نسبت چونکہ رسول اللہ ﷺ کی طرف ہوتی ہے اس لیے اس کو ہر اعتبار سے جانچ کر اس کی صحت کا فیصلہ کرنا لازم ہے۔ اس کے لیے وہ قرآن کی کسوٹی پر اعتماد کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''اس وقت حدیث کی تعلیم ہر مکتب فکر کے علماء اپنے اپنے تقیدات [1] کے تحت دے رہے ہیں۔ کلام و

---

[1] تقیدات: حد بندیاں، تقید (حد بندی) کی جمع۔

Marfat.com

عقائد اور فقہیات میں جس گروہ کا جو مسلک ہے وہ کوشش کرتا ہے کہ قرآن و حدیث دونوں سے وہ اپنی تائید حاصل کرے اگرچہ اس کے لیے کتنا ہی ظلم کرنا پڑے۔ حالانکہ صحیح علمی طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی طرح پورے ذخیرہ حدیث پر بھی براہ راست ان کے الفاظ، ان کے موقع و محل، ان کے سیاق و سباق، ان کے نظائر و شواہد اور قرآن کے ساتھ ان کی موافقت یا عدم موافقت کے پہلو سے غور کیا جائے اور بغیر کسی گروہی تعصب کے وہ حدیثیں اختیار کی جائیں جو مذکورہ کسوٹی پر پوری اُترتی ہوں، اگرچہ وہ ہماری خواہشوں کے خلاف ہوں۔ ہمیں اتباع بہر حال رسول اللہ ﷺ کی کرنی ہے نہ کہ اپنی خواہشوں کی یا کسی خاص فقہ و کلام کی"۔ (تعارف ادارہ تدبر قرآن و حدیث)

متن حدیث کو پرکھنے کیلیے مولانا نے جو طریق کار تجویز کیا ہے اس کے اہم نکات حسب ذیل ہیں:

(ا) حق و باطل میں امتیاز اور دین و شریعت کی ہر چیز کی جانچ کے لیے کسوٹی قرآن مجید ہے۔ لہٰذا متن حدیث میں تردد ہونے کی صورت میں روایت قرآن مجید ہی کی ترازو میں تولی جائے گی۔ اس کسوٹی پر پرکھے بغیر قبول کی ہوئی روایت میں یہ امکان موجود ہوتا ہے کہ آدمی اس چیز کو دین بنا لے جو دین نہیں ہے۔

(ب) جس طرح قرآن کی تمام دعوت عقل و فطرت پر مبنی اور اپنے دعاوی پر شہادت انہی سے پیش کرتی ہے، اسی طرح صحیح حدیث کی کوئی بات عقل و فطرت کے منافی نہیں ہوسکتی۔ اگر کوئی روایت اس کے منافی نظر آئے تو اس پر اچھی طرح غور کرنا ہوگا، یہاں تک کہ اپنی عقل کی کوتاہی واضح ہو جائے یا روایت کا ضعف سمجھ میں آ جائے۔

(ج) قرآن کی طرح حدیث کا بھی اپنا ایک مجموعی نظام ہے۔ ہر حدیث اس نظام کا ایک جزو مانی جائے گی۔ اس نظام سے ہٹ کر حدیث کو صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے نہ ٹھیک طور پر اس کی تاویل و توجیہ ہوسکتی ہے۔ اہل تصوف کے ہاں جو روایات رائج ہیں وہ بیشتر احادیث کے مجموعی نظام سے متعارض اور بے جوڑ ہیں۔

(د) حدیث کی اصل زبان ٹکسالی عربی ہے۔ لہٰذا ہر باب میں ان احادیث کو مقدم رکھا جائے گا جن کی زبان عہد نبوت و عہد صحابہ کی زبان سے ہم آہنگ ہو۔

(ہ) راوی حضرات اپنے ذوق کے مطابق واقعہ کے کسی حصے کی روایت کرتے ہیں جس کے نتیجے میں بعض لازمی اور ضروری حصے چھوٹ جاتے ہیں جیسا کہ خطبہ حجۃ الوداع کی روایات میں ہوا۔ ایک ہی راوی کی مختلف اوقات کی روایتوں میں تکمیل، تقلیل، اطناب اور ایجاز ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا کسی ناتمام روایت کی تاویل اس قسم کی دوسری روایات کے ساتھ ملا کر کرنی ہوگی۔ اس طرح جو مضمون متعین ہوگا وہ اصل ہوگا۔

(و) متن میں کلام کے عموم و خصوص، موقع و محل اور خطاب کا فہم حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس سے صرف نظر کر کے بعض روایات مثلاً امرت ان اقاتل الناس اور الائمة من قریش کی توجیہ اس قدر غلط ہوگئی کہ اسلام کو مطعون کرنے کی راہ کھل گئی۔

Marfat.com

مولانا نے اپنی حیات میں تعلیم دین کے لیے دو حلقے قائم کیے تو حلقہ تدبر قرآن میں انہوں نے اپنے اصولوں پر صحیح مسلم کا درس دیا جوان کے نزدیک حدیث کا اصل مجموعہ اور سب سے زیادہ سائنٹفک ترتیب کا حامل ہے۔ ادارہ تدبر قرآن وحدیث میں انہوں نے موطا امام مالک کا درس دیا جو نبی ﷺ سے قریب العہد مرتب ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ صحیح بخاری کا درس دیا جوان کے نزدیک اصلاً کتاب حدیث نہیں بلکہ امام بخاری کے فقہی وکلامی مذہب کی عکاس کتاب ہے۔ اس لیے اس کی تدوین فقہی وکلامی طرز پر ہوئی ہے۔ مولانا کے موطا اور صحیح بخاری کے دروس باقاعدگی سے رسالہ تدبر میں شائع ہوتے رہے اور اب تدبر حدیث کے نام سے مرتب ہو کر کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔

حکمت قرآن:

مولانا کی رائے میں قرآن پر تدبر کے نتیجے میں آدمی کو حکمت حاصل ہونی چاہیے جس کو قرآن مجید نے خیر کثیر قرار دیا ہے۔ مولانا نے اس حکمت کے جواہر ریزے اپنی تفسیر میں جگہ جگہ بکھیر دیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان کی تفسیر سے بہت سے دینی موضوعات پر قرآن کی حکمت بہ آسانی جمع کی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی مستقل تصانیف میں ان کو یکجا بھی کر دیا ہے۔ حقیقت شرک وتوحید، حقیقت نماز، حقیقت تقویٰ، دعوت دین اور اس کا طریق کار وہ کتابیں ہیں جن میں اس حکمت کے مختلف پہلو یکجا دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ کتابیں قرآن فہمی میں بھی مدومعاون اور اس کی تربیت دیتی ہیں۔ حقیقت توحید تو گویا قرآنی استدلال کی اساسات کو واضح کرنے والی ایک اہم دستاویز بن گئی ہے۔ اس بارے میں مولانا کی تحقیق یہ ہے کہ ''قرآن کے دلائل یا تو مخاطب کے اقرار پر مبنی ہوتے ہیں یا ایسے مستقل اصولوں پر قائم ہوتے ہیں جو مخاطب کے اقرار وانکار سے بالکل بالاتر ہوتے ہیں۔ پھر اس دوسری قسم کی دو قسمیں ہیں۔ یا تو ان دلائل کا ماخذ خود انسان کے نفس کے اندر ہے یا خارج میں۔ پہلی قسم کو ہم دلائل انفس سے تعبیر کریں گے اور دوسری کو دلائل آفاق سے۔ یہ سب ملا کر قرآنی استدلال کی تین قسمیں ہوئیں۔

1۔ وہ استدلال جو مخاطب کے اقرار واعتراف پر مبنی ہے۔ اس کے کئی پہلو ہیں۔ مثلاً جو قومیں کسی اللہ کو مانتی ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ ان تمام صفتوں اور باتوں کو مانیں جن پر یہ لفظ مشتمل ہے یا جو قومیں اللہ کی بنیادی صفتوں کو مانتی ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ ان صفتوں کو بھی مانیں جو ان صفتوں کے لوازم میں سے ہیں، نیز ان صفات سے ان کی تنزیہہ ❶ کریں جو ان صفات کے منافی ہیں۔ علیٰ ھذا القیاس ان صفتوں کو تسلیم کرنے سے آدمی پر جو ذمہ داریاں اور حقوق واجب ہوتے ہیں ان کا بھی اقرار کریں۔ نیز جو قومیں کوئی آسمانی صحیفہ رکھتی ہیں یا اپنے پیچھے کوئی تاریخ رکھتی ہیں یا اپنی سوسائٹی کے اندر نیکی اور بدی کا کوئی ضابطہ رکھتی ہیں، ان کے لیے ضروری ہے کہ ان کی بنیادی صداقتوں سے، ان کے معروف مسلمات سے اور ان کے بدیہی منطقی نتائج سے

❶ تنزیہہ: آلودگی سے پاک کرنا۔

Marfat.com

گریز نہ کریں۔ ایسا کرنا اپنے تسلیم کردہ مقدمہ سے فرار اور خود اپنے منہ سے اپنے آپ کو جھٹلانا ہے۔

2۔ دوسری قسم دلائل آفاق کی ہے۔ اس کے بھی مختلف پہلو ہیں۔ سب سے پہلے وہ قوانین ہیں جن کا اس کائنات میں ہر آن مشاہدہ ہو رہا ہے اور جن سے ایک خدا کی اور اس کی ان تمام صفتوں کی شہادت مل رہی ہے جو قرآن نے خدا کے لیے بیان کی ہیں۔ پھر وہ قوانین ہیں جو اس کائنات کے واقعات و حوادث اور قوموں کے عروج و زوال میں کارفرما نظر آتے ہیں اور جو درحقیقت انہی صفات کے مظاہر ہیں جن سے خالق کائنات متصف ہے۔

3۔ تیسری قسم دلائل انفس کی ہے۔ ان کا ماخذ درحقیقت خود انسان کا نفس ہے اور اس سے مراد وہ فطری وجدان و اذعان ہے جو فاطر السماوات والارض نے نفوس کے اندر ودیعت فرمایا ہے۔

یہ تو دلائل کی بڑی قسمیں ہوئیں۔ مولانا جب مزید تفصیل میں جاتے ہیں تو دلائل آفاق میں کائنات کے حسن و جمال، مختلف اجزاء میں باہمی موافقت اور سازگاری، عظیم اشیاء کے ایک محکم نظام کے تحت مقہور و مسخر ہونے، کائنات کی محکم تدبیر، ایک ضد سے دوسری ضد کے وجود پانے، ہر نظم اجتماعی کے لیے حاکمیت کے غیر منقسم ہونے، مختلف ارادوں اور مذاقوں کے تصادم کے نتیجے میں تناسب کے وجود کے محال ہونے، حق و باطل کی آویزش میں حق کے غالب رہنے اور مختلف اشارات (Suggestions) کو شمار کرتے ہیں۔ دلائل انفس میں ان کی نگاہ انسان کے اندر عہد فطرت کے تصور، علم و یقین کی فطری طلب، احساس برتری اور ذلت و طاعت سے نفرت، ضعف و افتقار ❶ وغیرہ پر جا ٹھہرتی ہے۔

متکلمین کا طرز استدلال یونانیوں کے فرسودہ طریق استدلال سے ماخوذ ہے جس کے اندر عقل و فطرت کے لیے کوئی اپیل نہیں ہے۔ مولانا کے طرز استدلال سے قرآن کی عقلیت آشکارا ہو جاتی ہے اور عصر حاضر نے نئی نسل کے ذہنوں میں جو زہر پھیلائے ہیں ان کا تریاق ❷ بھی اس طریقہ میں ہے۔ مولانا نے قرآنی علم کلام کو مرتب کرنے کی بنیاد فراہم کر دی ہے۔

مولانا کے نہج پر غور و فکر کرنے سے عصری عمرانی علوم کے بارے میں یہ تحقیق ممکن ہے کہ ان علوم کے کون سے حصے قرآنی فکر سے مطابقت نہیں رکھتے اور یہ کہ ان میں اسلامی نقطہ نظر کیا ہونا چاہیے۔ یہ وہی ہدف ہے جو آج Islamization of Knowledge کی ضرورت کا احساس رکھنے والے مسلمانوں کے اداروں کے سامنے ہے۔ اس کی نہایت عمدہ مثال مولانا کی کتاب 'فلسفہ کے بنیادی مسائل' فراہم کرتی ہے جس میں انہوں نے فلسفہ کے چھ اہم بنیادی مسائل پر مغربی حکماء کی آراء کا محاکمہ کرنے کے بعد ان کے بارے میں حکمت قرآن کو واضح کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے مسلمان علماء اور دانشوروں نے ان مسائل پر پُرمغز تحریریں چھوڑی ہیں لیکن ان کے ہاں جامع قرآنی حکمت اپنے پورے استدلال کے ساتھ سامنے نہیں آتی۔ مولانا جب فلاسفہ کے خیالات کا تجزیہ

---

❶ افتقار: ہڈیوں کا ڈھانچا بن جانا، نہایت کمزور ہو جانا۔

❷ تریاق: زہر کا علاج (دوا)۔

Marfat.com

کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر موضوع پر فلاسفہ کے رجحانات کی کمزوری اور خامی کا پورا ادراک رکھتے ہیں، پھر اس کے مقابل جب قرآن کا فلسفہ پیش کرتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ ان کے پاس حکمت نورانی کا ایک ایسا آئینہ موجود ہے جس میں فلسفہ قدیم و جدید کے تمام تصورات کی کم مائیگی کا عکس نظر آتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ دنیا کے غیر معمولی ذہین دماغوں نے عقل و حواس پر انحصار کر کے اور وحی کے سرچشمے سے محروم ہو کر کیسی کیسی ٹھوکریں کھائی ہیں۔

اسلامی قانون:

مولانا اصلاحی کے ذہن نے دور حاضر کے جس میدان میں جولانی دکھائی ہے وہ اسلامی ریاست کی تشکیل اور اس میں اسلامی قانون کے نفاذ کا میدان ہے۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد یہ موضوع قدرتی طور پر بے حد اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ اس کے بارے میں لوگوں کے پاس معلومات کم تھیں اور جو معلومات تھیں وہ جدید دور کی ضروریات کے مطابق نہ تھیں۔ پھر نوزائیدہ مملکت میں ایسے لوگ سرگرم تھے جو پاکستان کو ایک اسلامی مملکت کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ انہیں اسلام کے اندر جدید زمانے کے مسائل سے نمٹنے کی صلاحیت نظر نہیں آتی تھی اور اگر صلاحیت دیکھتے بھی تھے تو سوسائٹی میں اسلامی احکام کے نفاذ کے تصور ہی سے ان کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ مولانا اصلاحی نے ایک طرف تو اسلامی ریاست کے اصول و مبادی واضح کیے جن میں خلافت اور اس کے بنیادی اصول بیان کیے۔ اس میں قوم، وطن، زبان اور تہذیب و روایات کے عمل دخل پر روشنی ڈالی۔ پھر اسلامی ریاست میں بنیادی شہری حقوق اور فرائض کو واضح کیا۔ رعایا کے مختلف طبقات کا تعین کر کے ان کے حقوق متعین کیے۔ ریاست کے لیے اطاعت کے شرائط و حدود پر روشنی ڈالی اور حکومت کے کارکنوں کے اوصاف اور ان کی ذمہ داریاں واضح کیں۔ دوسری طرف اسلامی نظام کے معترضین کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کے ایک ایک اعتراض کا نہایت مدلل اور مسکت [1] جواب دیا۔ ان مباحث میں مولانا قرآن و سنت کے علاوہ اسلامی تاریخ سے دلائل فراہم کرتے ہیں۔ نہایت دقیق مباحث کو انہوں نے ایسی سلیس زبان میں پیش کیا ہے کہ ان کی قدرت بیان پر حیرت ہوتی ہے۔ بعض موضوعات کو انہوں نے نئی تعبیر عطا کی ہے جس میں ان کو سمجھنا سہل ہو گیا ہے۔ اس کی مثالیں مولانا کی کتاب 'اسلامی قانون کی تدوین' میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

فقہی موضوعات پر مولانا کی تحریریں محض اصولی نہیں ہیں بلکہ جہاں انہوں نے محسوس کیا ہے کہ پاکستان کے حالات متقاضی ہیں کہ ان میں شریعت کا حل پیش کیا جائے تو وہاں انہوں نے احکام کو پاکستان کے حالات پر منطبق بھی کیا ہے اور جدید مسائل کا مواجہہ [2] کرتے ہوئے مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ ان کا حل بھی پیش کیا ہے۔ مثلاً پاکستان کی غیر مسلم اقلیتوں پر وہ ذمیوں کے احکام نافذ کرنے کے حق میں نہیں ہیں بلکہ ان کی رائے یہ ہے کہ یہ لوگ

---

[1] مُسکت: جو دوسرے کو خاموش کر دے ('سکوت' سے اسم فاعل)۔

[2] مواجہہ: موازنہ۔

Marfat.com

قیام پاکستان کی جدوجہد میں شریک رہے یا انہیں تسلی دی گئی کہ پاکستان بننے کے بعد ان کے ساتھ معاملہ دوسری رعایا سے مختلف نہیں ہوگا، لہٰذا ان پر معاہد اہل ذمہ کے احکام نافذ ہوں گے۔

مسلمانوں کے درمیان فقہی اختلافات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کے درمیان جو فقہی اختلافات ہیں اگرچہ وہ بالکل سرسری اور سطحی ہیں لیکن امتداد زمانہ سے ان کی جڑیں اتنی گہری اُتر چکی ہیں کہ اب ان کا اکھاڑنا آسان نہیں رہا اور ان کے اکھاڑے بغیر نہ صحیح نہج پر اسلامی قانون کی تدوین ہی ممکن ہے اور نہ اس کے موثر نفاذ ہی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان من حیث الجماعت اس اصول پر مجتمع ہوں کہ ان کے قانون کے پرکھنے کے لیے اصل کسوٹی قرآن و سنت ہیں۔ اور ان پر یہ واجب ہے کہ وہ ان کسوٹیوں کو اپنے دوسرے تمام تعصبات و تعلقات سے بالکل دستبردار ہو کر تسلیم کریں۔'' (فقہی اختلافات کا حل، ص 8)

مولانا کے نزدیک اسلامی قانون کا مزاج بیک وقت دو متضاد خصوصیات رکھتا ہے۔ ایک پہلو سے یہ ثابت اور غیر تغیر پذیر ہے، دوسرے پہلو سے اپنے اندر خاصی لچک اور وسعت رکھتا ہے جس کے باعث یہ ہر زمانے کے مسائل کو حل کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ اصول فقہ کی کتابوں میں اسلامی قانون کے مآخذ میں کتاب اللہ، سنت رسول، اجماع اور قیاس کا نام آتا ہے۔ مولانا ان کی تعبیر کتاب اللہ، سنت رسول، اجتہاد، رواج اور مصلحت سے کرتے ہیں۔ اجتہاد کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے کہ یہ ہر مسلمان کی ہر دور کی ضرورت ہے جس کے بغیر وہ اپنی اسلامیت پر قائم نہیں رہ سکتا۔ فرماتے ہیں:

''مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ زندگی میں جو قدم بھی اٹھائے، اسلام کے حکم اور اشارے کے مطابق اٹھائے۔ زندگی جن حالات و تغیر سے بھی گزرتی ہے ان میں کوئی مرحلہ بھی ایک مسلم کے لیے ایسا نہیں آتا جس میں وہ اسلام سے استفتاء کا محتاج نہ رہتا ہو۔ اپنی اسی خصوصیت کے سبب سے ایک مسلمان کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اجتہاد کے بغیر اپنی اسلامیت کو برقرار رکھ سکے۔''

(اسلامی قانون کی تدوین، ص 61)

اس عام تصور کے برعکس کہ مسلمانوں نے اپنے اوپر اجتہاد کا دروازہ صدیوں سے بند کر رکھا ہے، مولانا کی رائے یہ ہے کہ ''اس زوال وانحطاط کے باوجود جو علم دین اور اصحاب علم دین پر طاری رہا ہے، ہر مسلمان ملک کے علماء نے اپنی اپنی صلاحیت و استعداد کے مطابق اجتہادات کیے اور اپنے اپنے ملکوں کے عوام کی رہنمائی کی۔'' تاہم مولانا اس خیال سے متفق ہیں کہ اجتہاد کی اہلیت رکھنے والے لوگ کم پیدا ہوئے اور اجتہاد کی رفتار سست رہی لیکن اس کا عذر یہ بیان کرتے ہیں کہ مغرب کے لادینی اثرات کے تحت مسلمان حکومتوں نے بھی غیر اسلامی قوانین اختیار کرنے شروع کر دیے۔ اجتماعی وسیاسی زندگی کے ہر گوشے سے اسلامی قانون کو خارج کر دیا گیا۔ جب قانون عملی زندگی سے اتنا

Marfat.com

بے تعلق ہو جائے تو اس کے سیکھنے سکھانے کا ذوق بھی مردہ ہو جاتا ہے چہ جائیکہ اس کے اندر اجتہاد کا ولولہ پیدا ہو۔ جاہلیت کے غلبہ وتسلط کے اس عالمگیر اندھیرے میں اجتہاد کے لیے محرک کون سا باقی رہ گیا تھا؟

1955ء میں حکومت پاکستان نے عائلی مسائل وقوانین کے جائزے اور اس سلسلہ میں تجاویز وسفارشات مرتب کرنے کے لیے ایک کمیشن قائم کیا جس نے اپنی رپورٹ جون 1956ء میں پیش کی۔ مولانا کے الفاظ میں یہ رپورٹ مغرب زدہ طبقہ کے خیالات ونظریات کا مرقع بن گئی، اس وجہ سے انہوں نے اس پر مفصل تنقید لکھنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے بڑی دقت نظر سے اجتہاد اور اصول اجتہاد کے بارے میں اس طبقے کے خیالات جمع کر کے ان پر بحث کی اور ان کی خامیوں اور غلطیوں کو واضح کیا۔ رپورٹ کے مرتبین کے نزدیک ''اجتہاد کا مفہوم کسی قانونی مسئلہ پر آزادانہ رائے قائم کرنا ہے۔'' یہ طبقہ جن اصولوں کی روشنی میں اجتہاد کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہیں:

1۔ جو چیز قطعی اور غیر مشروط طور پر ایک واضح حکم کے ذریعہ سے ممنوع نہیں ہے وہ جائز ہے، اگر افراد یا قوم کی بہبود اس کا تقاضا کر رہی ہو۔

2۔ موجودہ زمانے کا معاشرتی اور اقتصادی نقشہ اسلام کی ابتدائی صدیوں کے مقابلے میں تبدیل ہو چکا ہے۔

3۔ بعض چیزوں کی اجازت اسلام نے اس لیے دی تھی کہ انسانی سوسائٹی ہنوز اپنے دور طفولیت میں تھی۔ یہ اجازت غلط طور پر استعمال ہو رہی ہے تو اس اجازت پر اب پابندیاں عائد ہونی چاہئیں۔

4۔ یہ تعین کرنا ہوگا کہ اسلام کے کون سے احکام سب کے لیے ہیں اور برابر قائم رہنے والے ہیں اور کون سے احکام ایک خاص طرز کی سوسائٹی، ایک مخصوص دور اور ایک خاص علاقے سے تعلق رکھنے والے ہیں۔

5۔ استحسان کا مفہوم یہ ہے کہ عوام کے مفاد کو سامنے رکھ کر جو جی میں آئے قانون بنا ڈالا جائے۔

مولانا نے تنقید کر کے ان اصول اجتہاد کے بخیے ادھیڑے لیکن تبصرہ کو تبصرہ ہی تک محدود نہ رکھا بلکہ عائلی نظام میں ان خرابیوں کی نشاندہی بھی کی جو ان پاکیزہ اصولوں اور تعلیمات کے بالکل خلاف ہیں جن پر اسلام نے اپنے عائلی نظام کو قائم کیا تھا۔ چنانچہ مولانا نے وہ تدابیر بتائی ہیں جو ان خرابیوں کو دور کر سکتی ہیں۔ اس طرح ان کا تبصرہ اسلام کے عائلی نظام پر ایک سیر حاصل بحث بن گیا ہے۔

عائلی کمیشن کی سفارشات پر تبصرہ ہو یا خاندانی منصوبہ بندی کی مہم کی وکالت پر ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب پر گرفت، جماعت اسلامی کے دفاع میں معترضین کے افکار کا جواب ہو یا دین میں حکمت عملی اور مصلحت شناسی کے مقام کے بارے میں جماعت اسلامی کے نقطہ نظر کا محاکمہ، ہر چیز میں مولانا اصلاحی بھرپور انداز میں بحث کرتے ہیں اور عقلی ونقلی دلائل کا اتنا انبار لگا دیتے ہیں کہ حریف کے لیے کوئی راہ فرار باقی نہیں رہتی۔ وہ بنیادی طور پر ایک محقق اور سکالر ہیں اس لیے دلیل ان کا سب سے موثر ہتھیار ہے۔ البتہ تنقیدی مضامین میں مولانا بسا اوقات شوخی اور طنز وتعریض سے بھی کام لیتے ہیں جو نہایت برمحل، برجستہ اور چبھتا ہوا ہوتا ہے۔ اردو ادب کے حوالے سے تو اس کی

Marfat.com

بڑی قدر و قیمت ہے لیکن مولانا کا اس کے بارے میں نقطہ نظر مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جس طرح زندگی کا خاصہ حرارت ہے اسی طرح زندہ مسائل میں بھی ایک قسم کی حرارت پائی جاتی ہے۔ اس حرارت کے سبب سے جب ان پر تنقید کی جاتی ہے تو اس تنقید میں بھی کچھ نہ کچھ حرارت کا پیدا ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس قسم کی حرارت ان مضامین میں بھی قارئین محسوس کریں گے لیکن مجھے امید ہے کہ یہ حرارت اپنے فطری اور جائز حدود سے کہیں بھی متجاوز نظر نہیں آئے گی۔ اور اگر کہیں متجاوز نظر آئے تو سمجھنا چاہیے کہ یہ محض میری ادبی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ اس میں میری جانب سے سوءِ نیت کو کوئی دخل نہیں ہے۔ میں نے حتی الامکان یہ مضامین لکھتے وقت اس امر کو ملحوظ رکھا کہ تنقید میں کہیں بے جا سختی یا طنز و تعریض کا رنگ غالب نہ آنے پائے۔''

مولانا اصلاحی نے امت کے اندر فقہی اختلافات کو ہوا دینے کی شدت سے مخالفت کی ہے۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ تمام فقہیں اسلامی فقہیں ہیں اور یکساں طور پر قابل قدر ہیں۔ ان کے ائمہ امت کے عظیم رجال میں سے تھے، لہٰذا ان سب کے لیے احترام واجب ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ایک شخص کا اپنے آپ کو حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کہنا اسی طریقہ سے ہے جس طرح وہ کہہ دے کہ میں لاہوری یا دہلوی ہوں۔ یعنی اس کی نوعیت محض ایک نسبت کی ہے۔ دین کے معاملے میں واقعہ یہ ہے کہ اس نسبت پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ آدمی حنفی کیوں ہے شافعی کیوں نہیں ہے، یا شافعی کیوں ہے مالکی کیوں نہیں، یا مالکی کیوں ہے حنبلی کیوں نہیں ہے۔ اس لیے کہ تمام ائمہ فقہاء پوری امت کے امام ہیں۔ ان ائمہ کے متعلق کسی کا بھی یہ خیال نہیں ہے کہ ان میں سے کسی کا اصول یا طریقہ گمراہی کا اصول یا طریقہ تھا۔ ان سب کی فقہ کی بنیاد کتاب وسنت پر ہے۔ سب دین کے اصولوں کو یکساں طور پر مانتے ہیں۔ ان کے درمیان جو اختلاف ہے وہ اجتہاد کا اختلاف ہے۔ ایک مسئلہ میں اجتہاد کرتے ہوئے کسی کی رائے کچھ ہوگئی ہے اور کسی کی کچھ۔ اس لیے ان کے بارے میں کوئی تعصب نہیں ہونا چاہیے۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ ذی علم اصحاب کو رایوں کے ماننے میں کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے تو میرے نزدیک ایسے لوگوں کا فرض یہ ہے کہ وہ ہر رائے کو اس کے دلائل کی بنیاد پر مانیں۔ انہیں یہ تحقیق کرنی چاہیے کہ ایک معاملہ میں احناف کا مذہب قوی ہے یا شوافع، مالکیہ یا حنابلہ کا، پھر قوی ترین رائے کو ترجیح دینی چاہیے۔ میں ہمیشہ یہی طریقہ اختیار کرتا ہوں۔'' (فقہی اختلافات میں صحیح طرزِ عمل۔ تدبر 3: ص64)

مولانا کے نزدیک صحیح اسلامی حکومت کسی متعین امام کی تقلید کے اصول پر قائم نہیں ہوتی بلکہ اس کی اساس براہ راست کتاب وسنت اور اجتہاد وشوریٰ پر ہوتی ہے۔ البتہ ہر شہری اس بات میں آزاد ہوتا ہے کہ وہ اپنی انفرادی زندگی کے دائرے میں جس فقہی وکلامی مسلک کو ترجیح دیتا ہو اس کو اختیار کرلے لیکن اجتماعی مسائل میں اسے حکومت کے

Marfat.com

قانون اور فیصلے کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ وہ اپنے فقہی مسلک کی بنا پر ان سے آزاد نہیں ہوسکتا۔

مولانا اصلاحی حکومت پاکستان کے ارباب کار سے شاکی ہیں کہ انہوں نے زبان سے اسلام نافذ کرنے کے دعوے کرنے اور عملاً ہر اقدام اس مقصد کے خلاف کرنے کی روش اپنا رکھی ہے۔ وہ بڑے دردمندانہ انداز میں لکھتے ہیں:

''ایک معقول آدمی کے لیے معقول رویہ تو یہ ہے کہ کفر اور اسلام میں سے جس پر اس کا دل ٹھک جائے اس کو مسلک زندگی کی حیثیت سے اختیار کرلے اور مشکلات و موانع سے بے پروا ہو کر اس پر چل پڑے۔ حق و باطل سے قطع نظر کرکے یہ یکسوئی بجائے خود ایک بڑی اہم طاقت ہے اور جس راہ میں بھی کوئی قابل ذکر کامیابی ہوتی ہے وہ اس یکسوئی کی بدولت ہی حاصل ہوتی ہے۔ دنیا میں ہمیشہ کامیابی حاصل کرنے والوں نے اسی طریقہ کو اختیار کیا ہے اور اپنے اپنے مطمح نظر کے لحاظ سے اسی کے بل پر کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ لیکن ہمارے ملک کے ارباب کار نے یکسوئی کی یہ اولو العزمانہ روش اختیار کرنے کے بجائے دورخے پن کی بزدلانہ روش اختیار کی ہے جس کو اسلامی اصطلاح میں ہم نفاق سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ نفاق انسان کی ایک مہلک بیماری کی حیثیت سے تو ضرور متعارف ہے اور ہر دور اور ہر سوسائٹی میں ایسے افراد و اشخاص پیدا ہوتے رہے ہیں جو اس بیماری میں مبتلا ہوئے ہیں لیکن ہمیں تاریخ میں کسی ایسی قوم کا سراغ نہیں ملتا ہے جس کے لیڈروں نے متفق ہو کر نفاق کو قومی پالیسی کی حیثیت سے اختیار کیا ہو اور اس کو اپنی مشکلات کے حل کی کلید جانا ہو۔ پوری تاریخ انسانی میں اس قسم کی کوئی قوم اگر ملتی ہے تو صرف ایک قوم ملتی ہے اور وہ بدقسمتی سے ہماری قوم ہے۔''

(اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام، ص 15-16)

تزکیۂ نفس:

مولاناؒ کی کتاب تزکیۂ نفس کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ انھوں نے اس کو فکری اعتبار سے اپنے دینی فکر کا لُبِّ لباب قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''برسوں کے فکر و مطالعہ سے دین و شریعت کی جو روح میری سمجھ میں آئی ہے اس کا ایک حصہ میں نے ان اوراق میں الفاظ کے جامہ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے...... میں نے اس کتاب میں ان لوگوں کی رہنمائی کرنے کی کوشش کی ہے جو اپنے نفس کی اصلاح و تربیت کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے تزکیۂ نفس کے وہ اصول و مبادی انشاء اللہ سامنے آجائیں گے جو کتاب و سنت میں بیان ہوئے ہیں اور ساتھ ہی وہ بہت سی غلط فہمیاں رفع ہوجائیں گی جو غلط قسم کے تصوف کی راہ سے ہمارے اندر پھیلی ہیں۔ چونکہ اس کتاب کا موضوع وہی ہے جو تصوف کا موضوع ہے، اس وجہ سے مجھے جگہ جگہ اس میں مروجہ تصوف پر تنقید بھی کرنی پڑی ہے۔ ممکن ہے یہ تنقید ان لوگوں کو کچھ ناگوار ہو جو اپنے اپنائے ہوئے کسی طریقہ پر کسی تنقید کو برداشت کرنے کے عادی نہیں ہیں لیکن ایک غیر جانبدار قاری انشاء اللہ میری کسی تنقید کو بھی تحقیقِ حق اور حمایتِ کتاب و سنت کے جذبے اور کوشش سے خالی نہیں پائے گا''۔ (دیباچہ تزکیۂ نفس، حصہ اول)

Marfat.com

ہمارے ہاں تزکیۂ نفس کا جو مفہوم ارباب تصوف کے زیر اثر قائم ہوا ہے وہ عبادات اور کچھ اوراد و وظائف تک محدود ہے۔ مولانا نے قرآن وسنت پر غور کر کے اس کو اتنی وسعت دے دی ہے کہ وہ زندگی کے ہر گوشے پر حاوی ہوگیا ہے۔ اس میں سب سے پہلے تزکیۂ علم آتا ہے۔ پھر تزکیۂ عمل اور اس کے بعد تزکیۂ تعلقات و معاملات۔ اس تزکیہ سے بہرہ مند ہونے کے بعد سب سے بڑا عارف وہ شخص قرار پاتا ہے جو دنیا کے جھمیلوں میں پڑ کر اپنی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں کو اس طرح ادا کرے جس طرح ادا کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا اور جس کا کامل نمونہ رسول اللہؐ کی حیات طیبہ میں نظر آتا ہے۔ مولانا کے الفاظ میں ''کسی شخص کے صاحب تزکیہ ہونے کے لیے تنہا یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ ذاکر و شاغل اور زاہد و مرتاض ہو بلکہ اسلامی نقطہ نظر سے میرے نزدیک یہ بھی ضروری ہے کہ وہ معاشرے کا ایک خدمت گزار فرد اور اپنی ریاست کا اسلامی مفہوم میں ایک فرض شناس شہری بھی ہو۔''

مولانا اصلاحیؒ کے پیش کردہ فکر کے اس جائزے سے ظاہر ہو رہا ہے کہ انہوں نے قرآن وسنت دونوں کی تحقیق کا ایک ایسا طریق کار وضع کر دیا ہے اور اس پر عملاً کام کر کے دکھا بھی دیا ہے کہ اگر تعصبات کو راہ نہ دی جائے تو ہر مسلمان یکساں شرح صدر اور اطمینان قلب کے ساتھ ان کے حقیقی علم سے فیض یاب ہوسکتا ہے اور فرقوں میں بٹی ہوئی اُمت کے اختلافات کی خلیج پاٹی جاسکتی ہے۔

مولانا کی یہ عظیم خدمت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہم قرآن پر تدبر کے لیے ان کا دیا ہوا لائحہ عمل اپنائیں اور نظم قرآن کے رموز پر مزید تحقیق کریں تاکہ دور حاضر کے مستشرقین کے اس اعتراض کا مسکت جواب دیا جاسکے کہ قرآن مجید ایک بے ربط اور وحدت فکر سے عاری تصنیف ہے اور اس کی ترتیب کو الٹ پلٹ کر دوبارہ ایڈٹ کرنے کی ضرورت ہے۔ مولانا اصلاحی نے تدبر قرآن لکھ کر بنیادی کام کر دیا ہے۔ اب مزید باریکیوں میں قرآن کے نظام کو ثابت کرنے کی ضرورت ہے۔

مولانا نے حکمت قرآن کو مرتب کرنے کی جو راہ کھولی ہے اس پر چل کر مزید بے شمار عنوانات پر کام کیا جاسکتا ہے۔ اس میں مولانا کی تفسیر رہنما کا کام دے گی۔ حکمت قرآن کو جس قدر مدلل کر کے پھیلایا جاسکے گا اسی قدر امت کی اصلاح متوقع ہے۔ اس حکمت کی روشنی میں عصری عمرانی علوم کا جائزہ لینا اور ان کی تدوین نو کا کام بھی ضروری ہے تاکہ قرآن کی روشنی سے یہ علوم بے بہرہ نہ رہیں اور قرآن مجید کی فطری عقلیت بے نقاب ہو۔

قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کے فرائض چار بتائے گئے ہیں: تلاوت آیات، تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور تزکیۂ نفوس۔ میں غور کرتا ہوں تو مولانا اصلاحی کا علمی کام مجھے ان چاروں پر محیط نظر آتا ہے۔ اس طرح میرے نزدیک دور حاضر میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ایک فرض شناس امتی ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔

Marfat.com

ادارہ تدبرِ قرآن وحدیث.....ایک تعارف

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ حساس دل رکھتے تھے۔ وہ برابر اپنی دینی ذمہ داریوں کا جائزہ لیتے اور دین کی خدمت کے لیے تجاویز سوچتے رہتے۔ 1958ء میں جماعت اسلامی چھوڑنے کے بعد جب انھوں نے صورتِ حالات پر نظر ڈالی تو ان کا تجزیہ یہ تھا کہ دین کو درپیش خطرات سے بچانے کی اگر کوئی تدبیر ہے تو یہ ہے کہ ہماری قوم میں دین و دنیا دونوں میں بصیرت رکھنے والے ایسے علما پیدا ہوں جو جدید ہتھیاروں سے مسلح ہو کر ہر محاذ پر مذہب کی خدمت کر سکیں۔ ہماری قوم میں جو پرانے علما اپنے علم وفضل کے لحاظ سے قابل اعتماد تھے ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے ہیں۔ جو چند ایک باقی ہیں وہ اب چراغ سحری کے حکم میں داخل ہیں۔ جن پرانی درس گاہوں سے یہ علما پیدا ہوئے تھے ان کی کس مپرسی یوں تو ہمیشہ ہی سے قابل رحم رہی ہے لیکن اب تو ان کی کس مپرسی اور بے وقعتی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ ان کا عدم اور وجود دونوں تقریباً برابر ہے۔ [1]

اس تجزیہ کی روشنی میں مولانا رحمہ اللہ کو چھوٹے پیمانہ پر دین کی تعلیم کے لیے ایک حلقہ قائم کرنے کا خیال آیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے رسالہ میثاق میں لکھا:

> ''ان مایوس کن حالات کے اندر مذکورہ مقصد کے لیے کوئی بہت زیادہ موثر اور نتیجہ خیز کام کرنا تو ممکن نہیں ہے لیکن اگر ایک کام بڑے پیمانہ پر نہیں ہوسکتا تو یہ بات کچھ دانش مندی کی نہیں قرار دی جاسکتی کہ اپنے بس کے اندر اس کو جس پیمانہ پر کیا جاسکتا ہے آدمی اس کا بھی تجربہ نہ کرے۔ چنانچہ اسی بنا پر ہم نے یہ ارادہ کیا ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے کچھ ذہین اور سعید طلبہ کو لے کر ان پر کچھ محنت کی جائے اور ان کو باقاعدہ دین کی تعلیم دی جائے۔ باقاعدہ سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ ان کو صرف بطورِ تبرک قرآن کے کچھ حصے ہی نہ پڑھائے جائیں بلکہ جس طرح وہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جدید علوم وفنون ایک خاص ترتیب اور مخصوص نظام کے تحت دلیل اور محبت کے ساتھ سیکھتے ہیں اسی طرح ان کو دین کے اصل مآخذوں یعنی قرآن وحدیث سے عالمانہ اور محققانہ طور پر آگاہ کیا جائے تاکہ وہ زندگی کے مسائل پر دینی نقطۂ نظر سے غور کر سکیں اور اصل حقائق تک براہ راست رسائی حاصل کر سکیں اور اس طرح اپنے اندر وہ قابلیت پیدا کر سکیں جو مختلف دینی موضوعات پر وقت معیار کے مطابق ریسرچ اور تحقیق وتنقید کے لیے کفایت کر سکے۔'' [2]

[1] مقالات اصلاحی 314-315
[2] مقالات اصلاحی، صفحہ: 317

Marfat.com

ان خطوط پر کام کرنے کے لیے نوجوان طلبہ کا ایک حلقہ قائم کیا گیا جس میں ابتداءً بارہ تیرہ افراد شریک ہوئے۔ بعد میں اس تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اور تعداد بیس تک جا پہنچی۔ مولانا رحمہ اللہ نے اس حلقہ کے قیام کے مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھا:

''علم قرآن کے چند شائقین کے اصرار پر میں نے قرآن مجید کے تحقیقی نوعیت کے درس کے لیے حلقہ تدبر قرآن کے نام سے ایک حلقہ قائم کر دیا ہے۔ خاص چیز جو اس حلقہ کے قیام کے لیے محرک ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ عمر تیزی کے ساتھ گزرتی جا رہی ہے اور میری تفسیر تدبر قرآن ابھی اپنے ابتدائی مراحل سے بھی آگے نہیں بڑھی ہے۔ نہیں معلوم پیش نظر نقشہ کے مطابق اس کی تکمیل کی فرصت ملتی ہے یا نہیں۔ یہ کام خاصا لمبا کام ہے۔ اس وجہ سے خیال ہوا کہ اس کے ساتھ ساتھ ایک حلقہ درس قائم کر کے کچھ ذہین و ذی استعداد طلبہ کو اس طرزِ فکر کی تربیت بھی دی جائے جو اس تفسیر میں اختیار کیا گیا ہے۔'' [1]

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا رحمہ اللہ یہ چاہتے تھے کہ تفسیر تدبر قرآن جس قدر بھی لکھی جا سکے، کچھ لوگوں کو اس کے نہج پر سوچنے کی تربیت دے دینی چاہیے تاکہ وہ بھی کسی حد تک اس ذمہ داری میں شریک ہو سکیں۔ یہ حلقہ 1962ء کے اوائل میں قائم کیا گیا۔

مولانا رحمہ اللہ نے ان طلبہ کو صرف و نحو مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کے طریقے پر بطریق مشق اور ان کی کتاب اسباق النحو پڑھائی۔ اس کے بعد انہی کی کتاب امثال آصف الحکیم بطور ابتدائی ریڈر پڑھائی۔ ریڈر کے بعد ادب میں مزید ترقی کے لیے کلیلہ و دمنہ اور اس کے بعد مقدمہ ابن خلدون شروع کرا دیا گیا۔ مولانا رحمہ اللہ نے جب محسوس کیا کہ طلبہ اب مقدمہ سے اخذ مطالب میں کوئی مشکل محسوس نہیں کرتے ہیں تو انھوں نے اس کے بجائے دیوان حماسہ (ابوتمام) شروع کرا دیا تاکہ عربی زبان، اس کے قواعد اور اس کے اسالیب سے ان کی نظر اچھی طرح آشنا ہو جائے۔

عربی کے ساتھ ہی قرآن مجید کا تحقیقی درس روز اول سے برابر ہوتا رہا جس میں نحو، زبان، نظم کلام اور تاویل آیات ہر چیز طلبہ کے سامنے آتی رہی۔ اس کے علاوہ صحاح میں سے مسلم شریف کا انتخاب کیا گیا اور یہ سبقاً سبقاً پڑھائی گئی۔ مولانا رحمہ اللہ مسلم شریف کو نہایت سائنٹفک ترتیب پر مرتب کی ہوئی کتاب حدیث سمجھتے تھے اور اس کے بڑے مداح تھے۔

اپنے مکمل خاکہ کے لحاظ سے مولانا چاہتے تھے کہ ادب میں حماسہ، فقہ میں ھدایۃ المجتھد اور کوئی ایک کتاب اصول فقہ میں پوری پڑھا دیں۔ اس کے بعد اسرار دین میں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ مکمل پڑھانے کا خیال تھا، لیکن عملاً 1965ء میں ان کے بڑے بیٹے ابوصالح اصلاحی کی ناگہانی وفات نے حلقہ تدبر قرآن کا سارا کام معطل کر دیا۔ بیٹے کی ذمہ داریوں کا بوجھ مولانا کے ناتواں کندھوں پر آ پڑا۔ اس سے مولانا رحمہ اللہ کی مالی پریشانیوں میں بے پناہ اضافہ ہو گیا جن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بالآخر وہ لاہور سے پچاس میل دور ایک گاؤں

[1] مقالات اصلاحی، صفحہ: 314

Marfat.com

رحمان آباد میں منتقل ہو کر زمینداری کرنے لگے۔

مولانا رحمہ اللہ کے اس تجربہ کو اس معنی میں تو کامیاب نہیں قرار دیا جا سکتا کہ اس سے وہ مقاصد پورے ہو گئے ہوں جو مولانا کے پیش نظر تھے۔ لیکن یہ بالکل ناکام بھی نہ رہا کیونکہ اس میں شریک طلبہ کسی قدر عربی اور دین کے اصل ماخذ ...... قرآن اور حدیث ...... سے آشنا ہو گئے اور فکر فراہی سے آگاہی بھی فی الجملہ انھیں حاصل ہو گئی، اگرچہ پیش نظر نصاب ادھورا رہ جانے کے باعث ان کی تربیت میں کمی رہ گئی۔ بعد میں حلقہ کے رفقا مولانا رحمہ اللہ کی خدمت میں آتے جاتے رہے لیکن تعلیمی پروگرام بوجوہ از سر نو شروع نہ کیا جا سکا۔ کئی ساتھی آہستہ آہستہ روزگار کے سلسلہ میں نقل مکانی کر گئے۔ لاہور میں رہ جانے والوں نے اپنے طور پر عربی کی تعلیم اور قرآن کے درس کا سلسلہ شروع کر لیا جس سے کچھ ساتھیوں کو یکجا رکھنے میں مدد ملی نیز کچھ نئے ساتھی میسر آئے جو بعد میں علمی کام میں شریک ہو گئے۔ مولانا رحمہ اللہ گاؤں منتقل ہو گئے جب بھی حلقہ کے رفقا نے مولانا کے ساتھ رابطہ رکھا اور ان کی خدمت میں وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے، چنانچہ مولانا کو تفسیر لکھنے کے دوران میں کچھ مشکلات پیش آتیں یا کتب سے مراجعت کی ضرورت ہوتی تو یہی ان کو مطلوبہ تعاون مہیا کرتے اور مسودات کی تبییض کا کام کرتے رہے۔

1979ء میں مولانا اپنی اہلیہ محترمہ کی بیماری کے باعث دوبارہ لاہور منتقل ہو گئے اور وہیں نومبر 1980ء میں تفسیر لکھنے سے فارغ ہوئے۔ ان کے احباب و رفقا نے اصرار کیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے تفسیر تدبر قرآن کے عظیم کام کی تکمیل ان کے ہاتھوں کروا دی ہے تو اب مولانا ایک ایسی ہی کتاب حدیث پر لکھنا شروع کریں تاکہ فہم قرآن کی طرح فہم حدیث کی راہ بھی کھلے۔ مولانا اس وقت بمشقت ہی کچھ لکھ پاتے تھے۔ ان کا ہاتھ درد کرنے لگتا اور قلم گرفت میں نہیں آتا تھا۔ ہاتھ میں خفیف رعشہ کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ ان تمام عوارض نے مولانا کو اس قابل نہ چھوڑا کہ وہ خود لکھنے کا کوئی بڑا کام کر سکیں۔ اس لیے انھوں نے حدیث کے تحقیقی درس دینے کی ہامی بھری اور یہ فیصلہ ہوا کہ اگر کچھ لوگ معاونت کریں تو مولانا یہ کام شروع کر دیں گے۔ اس کے لیے حلقہ تدبر قرآن کو پھر سے منظم کرنے اور اس کو وسعت دے کر ادارہ تدبر قرآن و حدیث کے نام سے کام کرنے کا فیصلہ ہوا۔ مولانا نے ادارہ کا تعارف کرواتے ہوئے لکھا:

> ''(تحقیق حدیث کا) یہ کام 'تدبر قرآن' کے کام سے کچھ کم مشکل نہیں ہے۔ اس کو حسن و خوبی سے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے حدیث، رجال، اصول حدیث اور اصول فقہ کے ہزاروں صفحے پڑھنے ہوں گے اور اس سے کہیں زیادہ قرآن اور عقل و نقل سے اس کی موافقت معلوم کرنے پر غور و تدبر کی ضرورت ہو گی۔ یہ موضوع نسبتاً حساس بھی زیادہ ہے اس وجہ سے جب تک پوری تیاری کے ساتھ کوئی ایسی چیز نہیں پیش کی جائے گی جو لوگوں کو قائل کر دینے والی ہو تو اندیشہ ہے کہ وہ مفید ہونے کے بجائے مضر ہو گی۔ ان وجوہ سے میں اپنے اندر تو یہ ہمت نہیں پا رہا ہوں کہ اس بارِ عظیم کو اٹھاؤں لیکن اس کام کی

Marfat.com

اہمیت کا مجھے پورا احساس ہے، اس وجہ سے میں نے اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ کرلیا ہے کہ اگر کچھ نئی صلاحیتیں اس خدمت کے لیے آمادہ ہو جائیں گی تو میں اپنے علم و استطاعت کی حد تک ان کی مدد کرنے کی کوشش کروں گا۔''

مولانا نے تین ارکان ...... جاوید احمد غامدی صاحب، ماجد خاور صاحب اور راقم ...... پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل کر دی جو مجوزہ ادارہ کے لیے ایک دستور مرتب کرے۔ اس کمیٹی کے دستور کو ان رفقا کے ایک اجلاس میں پیش کیا گیا جو ادارہ کے مقاصد سے متفق تھے۔ انہوں نے غور و فکر کے بعد اس دستور کو معمولی ترامیم کے ساتھ قبول کرلیا۔ چنانچہ یکم محرم الحرام 1401ھ مطابق 10 نومبر 1980ء کو 'ادارۂ تدبرِ قرآن و حدیث' وجود میں آیا جس کے رکنِ اول مولانا امین احسن اصلاحی تھے۔

ادارہ کے قیام کے لیے جو قراردادِ تاسیس منظور ہوئی وہ یہ ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''ہم ارکانِ مجلس تاسیس اس امر کا یقین رکھتے ہیں کہ قرآن مجید اور حدیث نبوی دین اسلام کے مآخذ ہیں۔ افراد میں صراطِ مستقیم کی معرفت اور امت مسلمہ میں وحدتِ فکر پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک طرف قرآن پر غور کرنے کی صحیح راہ باز ہو تا کہ اس پر تدبر کرنے والے اس خزانۂ حکمت تک رسائی حاصل کرسکیں جو قرآن کو ان کے لیے صحیح معنوں میں وہ کسوٹی بنا دے جس سے وہ زندگی کے ہر گوشے میں حق و باطل کے درمیان امتیاز کرسکیں اور دوسری طرف حدیث پر تدبر کی راہ کھلے جس سے نہ صرف اس کی مطابقت قرآن مجید کے ساتھ واضح ہو سکے بلکہ حدیث کے ذخیرۂ حکمت سے امت مسلمہ پوری طرح بہرہ مند ہو سکے۔

ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ قرآن مجید اور حدیث نبوی پر تدبر کی صحیح راہ باز ہونے سے اسلامی علم کلام کو اجاگر کرنا اور مروجہ علوم و افکار کو دین کی کسوٹی پر پرکھنا ممکن ہو سکے گا جس کے نتیجے میں امت مسلمہ کی فکری و عقائدی اصلاح کا امکان پیدا ہوگا اور اس طرح دین کی اقامت و شہادت کا وہ فریضہ ادا ہوگا جو واجباتِ دین میں سے ہے۔

ہم اس امر کا احساس رکھتے ہیں کہ پیش نظر کام کی تکمیل ایک ایسے ادارہ کے قیام سے ممکن ہے جو اپنی تمام تر مساعی قرآن مجید اور حدیث نبوی پر تدبر کے لیے وقف کر دے اور معارفِ اسلامی کی تحقیق و اشاعت کا اہتمام کرے۔

اس لیے ہم ارکانِ مجلس تاسیس ربّ ذوالجلال ولاکرام کی رضا کے لیے اسی کے بھروسے پر آج بتاریخ یکم محرم الحرام 1401ھ (مطابق 10 نومبر 1980ء) بوقت پونے پانچ بجے شام 'ادارۂ تدبرِ قرآن و حدیث' کے قیام کا اعلان کرتے ہیں۔''

Marfat.com

ادارہ کی رکن سازی کے بعد دستور میں تجویز کردہ طریق کار کے مطابق مجلس عاملہ کا انتخاب ہوا جس میں ارکانِ ادارہ نے حسب ذیل ارکان کو کثرتِ رائے سے منتخب کیا:

مولانا امین احسن اصلاحی، جاوید احمد غامدی، خالد مسعود، عبداللہ غلام احمد، ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ، محمد نعمان علی، داؤد احمد، سعید احمد، محمد ارشد، منیر احمد، منصور الحمید، محمد رفیق، محبوب سبحانی، اسحاق علی، ماجد خاور۔

مجلسِ عاملہ نے کثرتِ رائے سے راقم کو ادارہ کے انتظامی معاملات سرانجام دینے کے لیے ناظم منتخب کیا۔ اس کے بعد علمی معاملات میں ادارہ کی راہنمائی کے لیے مجلس علمی کا انتخاب ہوا جس میں حسب ذیل ارکان منتخب ہوئے:

مولانا امین احسن اصلاحی، جاوید احمد غامدی، خالد مسعود، ماجد خاور، عبداللہ غلام احمد۔

ان ارکان نے مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ کو اپنا صدر چنا اور اس طرح دستور کی رو سے مولانا مدظلہ ''ادارہ تدبر قرآن وحدیث' کے سربراہ منتخب ہوئے۔

ادارہ کے قیام کے بعد مولانا نے ہفتہ میں ایک بار درس قرآن اور ایک بار درس حدیث دینا شروع کیا۔ ادارہ کے افکار کی ترویج کے لیے سہ ماہی رسالہ تدبر کے اجرا کا فیصلہ ہوا۔ حلقہ تدبر قرآن کے رفقا مولانا کو نا تمام کاموں کی تکمیل کا حوصلہ دیتے رہے۔ چنانچہ اس دوران میں مولانا نے تزکیۂ نفس کا دوسرا حصہ 'تزکیۂ تعلقات و معاملات' کے موضوع پر لکھ کر کتاب کی تکمیل کی۔ فلسفہ کے بنیادی مسائل پر فلسفیوں کے افکار و دلائل پر تنقید و محاکمہ کیا اور ان کے مقابل میں قرآن مجید کے نقطہ نظر کو مدلل کر کے پیش کیا۔ مولانا کے یہ لیکچر ادارہ کے رفیق جناب محبوب سبحانی اور راقم نے مرتب کیے اور انھیں کتاب کا جامہ پہنایا۔ درس حدیث کا آغاز اصول حدیث پر لیکچرز سے ہوا۔ ان تقاریر کو جناب ماجد خاور نے مرتب کر کے مبادی تدبر حدیث کے نام سے شائع کیا۔ ادارہ کے زیر اہتمام درس میں مولانا نے موطا امام مالک مکمل پڑھائی اور اس کے بعد صحیح بخاری کا درس شروع کیا۔ باب بدء الوحی سے لے کر کتاب الوضوء کے آخر تک اور کتاب البیوع سے کتاب الشہادات تک بخاری شریف پڑھائی گئی جس کے بعد مولانا کے ضعف پیری کے باعث درس کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ موطاً اور بخاری شریف کے دروس ادارہ کے رفقا جناب سعید احمد، جناب سید اسحاق علی اور راقم نے مرتب کیے اور انہیں کتابی شکل میں ادارہ تدبر قرآن وحدیث نے شائع کیا۔

رسالہ تدبر کے ذریعہ مولانا فراہی رحمہ اللہ کے افکار کی ترویج کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ مولانا فراہی کی دو کتابوں حکمة القرآن اور دیانة الاسلامية کا ترجمہ 'حکمت قرآن' کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ رسالہ تدبر میں افادات فراہی کے عنوان کے تحت مولانا فراہی کے افکار کو منظر عام پر لایا گیا ہے۔ مولانا فراہی کے اصول تفسیر مرتب کر کے کتابی شکل میں شائع کیے گئے۔ رسالہ تدبر میں بعض نئے تحقیقی مضامین بھی شائع ہوئے ہیں مثلاً قرآن کے اسالیب سے شناسا کرنے کے لیے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا گیا ہے جس میں مولانا فراہی کی کتاب الاسالیب کی روشنی میں زیادہ تفصیل سے موضوع پر بحث کی گئی ہے۔ راقم کا ایک سلسلہ سیرت النبی ﷺ پر مضامین کا ہے۔

Marfat.com

قرآن مجید کی روشنی میں سیرت پر کتاب ''حیات رسول اُمی ﷺ'' شائع ہو چکی ہے۔ مولانا اصلاحی کے ترجمۂ قرآن اور راقم کے حاشیہ کے ساتھ ایک قرآن مجید شائع کیا گیا ہے جو مولانا کی زندگی میں رسالہ تدبر میں شائع ہوتا رہا، اسے تفسیر تدبر قرآن سے ماخوذ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ادارہ نے مولانا فراہی کی اسباق النحو کو قدرے مفصل کر کے ایک نئی ترتیب کے ساتھ شائع کیا ہے۔

ادارہ تدبر قرآن وحدیث اتنے عرصہ سے کام کر رہا ہے لیکن مولانا کی وہ تمنا پوری نہیں ہوسکی کہ یہ دلوں اور سینوں کے علاوہ زمین پر بھی قائم ہوتا اور یہ تعلیمی اداروں کی طرح چلتا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اول تو اس کو زیادہ مالی وسائل میسر نہیں آئے اور اگر کسی ذی ثروت آدمی نے تعاون کی پیش کش کی بھی تو اس کے ساتھ اس نے ادارہ کے اوپر اپنی گرفت بھی چاہی اور یہ شرط مولانا کو کبھی قبول نہیں ہوئی اس وجہ سے کچھ احباب ادارہ کے ساتھ نہ چل سکے۔ دوسرے، ادارہ کو ایسے لوگ میسر نہیں آئے جو اس کام کو زندگی کا مقصد بنا لیتے۔ تمام ساتھی جزوقتی تعاون ہی پر آمادہ ہوئے اور انھوں نے اپنی معاشی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ادارہ کے کام کو نبھانے کی کوشش کی۔

Marfat.com

علم وعرفان کے ماہِ کامل کا غروب

[مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ کے سانحۂ ارتحال پر ایک تحریر]

شعبان 1418ھ کی چودھویں کا چاند جب پوری آب وتاب سے آسمان پر اپنی رعنائی دکھا رہا تھا عین اس وقت علم وعرفان کا ماہ کامل غروب ہو رہا تھا۔ دور حاضر کے عظیم مفسر قرآن اور علوم قرآنی کے یکتا عارف مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ نے زندگی بھر اپنے رب سے مناجات کے لیے صبح تین بجے کا جو وقت مقرر کیے رکھا، وہی وقت رب نے اپنے بندے کو اپنے پاس بلانے کے لیے پسند فرمایا۔ مولانا رحمہ اللہ کی عمومی صحت 1993ء کے آخر تک بہت اچھی رہی۔ اس کے بعد عارضۂ قلب میں مبتلا ہوئے۔ اس بیماری پر قابو پالیا گیا لیکن دو سال قبل مولانا رحمہ اللہ پر فالج کا حملہ ہوگیا جس کے بعد ان کی بیماری پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی گئی۔ 1997ء کے سال میں مرض میں اگرچہ اضافہ نہ ہوا، طبیعت یکساں رہی، لیکن نقاہت بڑھتی چلی گئی۔ اس کے باوجود مولانا رحمہ اللہ نے صبر وسکون کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا۔ وہ مہمانوں کو خوش آمدید کہتے۔ سہارے سے بیٹھ کر مجلس میں اپنی شمولیت کا اظہار کرتے۔ خاص اعزہ واقارب، احباب اور شاگردوں کو پہچانتے، ان سے بات کرتے اور الوداع کہتے۔ راقم سطور اپریل 1997ء میں حج سے واپسی پر ملاقات کے لیے حاضر ہوا۔ مصافحہ کر کے بیٹھنے لگا تو فوراً بغلگیر ہونے کے لیے بازو اٹھا دیے کہ حاجیوں سے ملنے کا دستور یہی ہے۔ نومبر میں غذا بے حد کم ہوگئی جس کے باعث نقاہت اتنی زیادہ ہوگئی کہ پہچاننے میں مشکل پیش آنے لگی۔ اپنا مدعا بھی زبان پر نہ لا سکتے۔ جسم تیزی سے گھلنے لگا۔ یہی نقاہت بالآخر جان لیوا ثابت ہوئی اور مجسم علم وعرفان اور صبر وعزیمت کا یہ پہاڑ 15 دسمبر 1997ء کو زمین میں اتر گیا جہاں ہر متنفس کو جانا ہے۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيۡهِ رَاجِعُوۡنَ۔

مولانا مرحوم کی زندگی کا مقصد وحید قرآن سیکھنا، اپنے کو اس کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنا اور قرآن سکھانا تھا۔ اس کے لیے انھوں نے عمر کے ستر سال تو بالکل مخصوص ہی کر دیے تھے۔ انھوں نے زندگی نہایت بھرپور گزاری، اس میں بڑے نشیب وفراز بھی آئے لیکن بقول شاعر

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

مولانا نے اپنے مقصد حیات کو کبھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

Marfat.com

خیر کم من تعلم القرآن وعلمه.

''تم میں بہترین شخص وہ ہے جو قرآن خود سیکھے اور دوسروں کو سکھائے۔''

مولانا مرحوم اس ارشاد کا کامل مصداق تھے۔ ان کی کتاب زندگی کا ہر ورق اس کا شاہد ہے۔

نسب و وطن:

مولانا امین احسن اصلاحی کے والد ماجد کا نام حافظ محمد مرتضیٰ ولد وزیر علی ہے۔ حافظ صاحب نے حج کی سعادت بھی حاصل کی تھی۔ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے۔ وہ بھارت کے صوبہ یوپی کے ایک چھوٹے سے گاؤں بمہور ضلع اعظم گڑھ کے ایک متدین، نیک سیرت اور معزز فرد تھے جن کا تعلق ضلع کی راجپوت برادری سے تھا۔ یہ وہی برادری تھی جس سے مولانا شبلی نعمانی کو نسبت حاصل تھی۔ حافظ صاحب گاؤں کے ایک متوسط درجے کے زمیندار تھے۔ ان کے گھر میں دینی فضا تھی۔ نماز روزہ کا خاص اہتمام تھا۔ ان کے ہاں بیٹے کی ولادت 1904ء میں ہوئی لیکن صحیح تاریخ محفوظ نہیں رہ سکی۔ خاندان کے بزرگوں، خصوصاً والد صاحب نے، بیٹے کی پرورش بڑی شفقت سے کی۔

تعلیم:

مولانا اصلاحی کی ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہوئی۔ دیہی مکتب میں لکھنا پڑھنا سیکھا۔ ایک مولوی صاحب سے قرآن پڑھا، نیز فارسی کے کچھ سبق لیے۔ دس سال کی عمر ہوئی تو گاؤں کے ایک عالم مولانا شبلی متکلم کے مشورے سے ان کو دینی وعصری تعلیم کے لیے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں داخلہ دلوایا گیا۔ یہ مدرسہ 1327 ہجری میں علاقہ کے ایک بزرگ مولانا محمد شفیع نے قائم کیا تھا۔ اسے چلانے کے لیے انجمن اصلاح المسلمین فعال تھی۔ ابتدا میں یہ مدرسہ معمولی نوعیت کا تھا۔ بعد میں مولانا شبلی نعمانی نے اس میں دلچسپی لی اور اس کے اغراض ومقاصد مرتب کیے۔ مولانا حمید الدین فراہی نے اس کے لیے نصاب تعلیم تجویز کیا اور نا تمام شعبوں کی تکمیل کی۔ یوں یہ مدرسہ ترقی کر گیا۔ اس میں دینی تعلیم جدید تصور کے مطابق دی جاتی تھی۔ قرآن مجید کی تعلیم کو اس میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ادب عربی پڑھانے کا خاص اہتمام تھا۔ فقہ کی تعلیم بغیر کسی گروہی تعصب کے دی جاتی تھی۔ کوشش کی جاتی کہ طالب علم جس فقہی مسلک کو کتاب وسنت سے زیادہ موافق پائیں اس کو اختیار کریں۔ ابتدائی درجہ تک انگریزی سے بھی متعارف کرایا جاتا تھا۔ مولانا اصلاحی رحمہ اللہ چونکہ ابتدائی تعلیم گاؤں میں حاصل کر چکے تھے اس لیے مدرسہ میں ان کو تیسرے درجہ میں داخلہ دیا گیا۔ ان کا یہاں قیام 1914ء سے 1922ء تک رہا جب انھوں نے سند فراغ حاصل کی۔ مدرسہ کے نام کی نسبت ہی سے اصلاحی کہلاتے تھے۔

مدرسہ میں متعدد اساتذہ سے پڑھا لیکن سب سے زیادہ جس شخصیت نے مولانا رحمہ اللہ کو متاثر کیا اور ان کی علمی، ادبی اور تقریری صلاحیتوں کو پروان چڑھایا وہ مولانا عبدالرحمٰن نگرامی رحمہ اللہ تھے جو بے حد ذہین، لائق اور ہمہ صفت موصوف استاد تھے۔ مولانا رحمہ اللہ بتایا کرتے تھے کہ میں نے جب مدرسہ میں داخلہ لیا تو پڑھنے کے معاملہ میں بدشوق سا

Marfat.com

تھا لیکن مولانا نگرامی رحمہ اللہ کی محنت اور توجہ سے میرے اندر عام مطالعہ کے علاوہ عربی ادب کا شوق پیدا ہوگیا۔ ان کا فیض صحبت میری زندگی میں انقلاب پیدا کرنے کا باعث بنا۔ علم کلام میں مولانا رحمہ اللہ کے استاد مولانا شبلی رحمہ اللہ کے شاگرد خاص مولانا شبلی متکلم ندوی رحمہ اللہ تھے لیکن ان کے مضمون سے مولانا رحمہ اللہ کو کبھی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی۔ ایک عاقل کے لیے وہ علم کلام کی افادیت کے قائل نہ تھے۔ ریاضی کے مضامین کو بھی مولانا ایک بوجھ ہی سمجھتے رہے۔ فرماتے تھے کہ اسی لیے میں میراث وفرائض کے مضامین میں کمزور رہا۔ تقریر میں مولانا رحمہ اللہ کی صلاحیتیں خوب ابھریں اور طالب علمی کے زمانہ ہی میں ان کی شہرت مدرسہ سے باہر علاقہ میں پھیل گئی۔ مدرسہ میں مولانا محمد علی جوہر رحمہ اللہ کی تقریر ہوئی تو ان کے سامنے طلبہ کی نمائندگی کرنے کے لیے مولانا اصلاحی رحمہ اللہ سے تقریر کروائی گی۔ مولانا جوہر رحمہ اللہ نے اس تقریر کی بڑی داد دی اور مولانا فراہی رحمہ اللہ نے اس پر خوش ہوکر حسن تقریر کے انعام کے طور پر اپنی کتابوں کا ایک سیٹ مولانا رحمہ اللہ کو دیا۔

مدرسہ سے سند فراغ حاصل کرنے بعد بجنور سے شائع ہونے والے اخبار ''مدینہ'' کے مالک محمد مجید حسن نے مولانا کو اخبار میں کام کرنے کی پیشکش کی۔ وہ ان کے لکھے ہوئے بعض مضامین کو دیکھ کر ان کی تحریری صلاحیت کے معترف ہوئے تھے۔ چنانچہ مولانا نے اخبار کے نائب مدیر کا کام سنبھالا۔ اس وقت مولانا کی عمر اٹھارہ برس تھی۔ اسی لیے مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ کہا کہ مدینہ اخبار کو نابالغ مدیر میسر آ گیا ہے۔ اخبار مدینہ اس زمانہ میں یوپی کا سب سے اچھا اخبار سمجھا جاتا تھا۔ ان دنوں وہ تحریک خلافت کا علمبردار اور سیاست میں کانگریس کا ہمنوا تھا۔ اخبار کے مالک مجید حسن نے بچوں کے ایک ہفت روزہ رسالہ ''غنچہ'' کی ادارت بھی مولانا کے سپرد کردی۔ اس کے ساتھ ساتھ مولانا نے اخبار ''سچ'' کے لیے بھی کام کیا جس کو مولانا عبدالماجد دریابادی رحمہ اللہ نکالتے تھے۔

مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ ریاست حیدرآباد میں نظام دکن کے قائم کردہ دارالعلوم عثمانیہ کے پرنسپل تھے اور اس وقت علم تفسیر میں نظم قرآن پر مبنی جدید منہاج تجویز کرنے کے باعث علمی ودینی حلقوں میں بڑی شہرت پا چکے تھے۔ 1925ء میں انھوں نے اپنے منصب سے استعفادے دیا اور اپنے وطن پھریہا ضلع اعظم گڑھ لوٹ آئے۔ مولانا اصلاحی کو ان کی آمد کا پتا چلا تو ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ انھوں نے احوال ومصروفیات معلوم کیں۔ پھر پوچھا: ''کیا آپ اخبار نویسی ہی کریں گے یا ہم سے قرآن پڑھیں گے؟'' مولانا نے بلاتوقف کہا: ''اگر آپ قرآن مجید پڑھائیں تو میں حاضر ہوں۔'' مولانا قرآن فہمی میں ان کے مرتبہ ومقام سے آگاہ تھے لیکن اب تک ذاتی طور پر ان سے استفادہ کا موقع حاصل نہیں کر پائے تھے لہٰذا انھوں نے مولانا فراہی کی اس پیشکش کو نعمت غیر مترقبہ اور ان کی شاگردی کو اپنے لیے سعادت سمجھتے ہوئے فوراً قبول کرلیا۔ مولانا فراہی رحمہ اللہ نے اسی وقت طے کردیا کہ آپ کا قیام وطعام میرے ساتھ رہے گا، معاملات کو سمیٹ کر جلد آجایئے۔ جب مدرسۃ الاصلاح کے اساتذہ کو علم ہوا کہ مولانا فراہی رحمہ اللہ اصلاحی صاحب کو قرآن پڑھانے والے ہیں تو انھوں نے درخواست کی کہ یہ درس گھر کے بجائے مدرسہ

Marfat.com

میں ہوتا کہ وہ بھی اس میں شرکت کر سکیں۔ مولانا فراہی نے اس درخواست کو قبول کر لیا اور درس مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر میں ہونے لگا۔ مولانا فراہی جس عمارت میں قیام کرتے، اسی عمارت میں سامنے کا کمرہ مولانا اصلاحی کا تھا جو استاد کی ضروریات کا خیال رکھتے، ان کی خدمت کے لیے ہمہ وقت حاضر رہتے اور قرآن کے اسباق کی تیاری کرتے۔ یوں انھیں استادِ گرامی سے فیض یاب ہونے کا موقع سب سے زیادہ ملتا۔

مولانا اصلاحی کے ہم درس یوں تو مدرسۃ الاصلاح کے کئی اساتذہ تھے لیکن حقیقی ساتھی مولانا اختر احسن اصلاحی تھے جو مدرسہ میں تعلیم کے دوران ان کے ہم جماعت رہے تھے اور اس وقت مدرسہ میں مدرس تھے۔ مولانا فراہی سے تلمذ کے زمانہ میں دونوں میں بے حد محبت پیدا ہوگئی۔ مولانا اعتراف کرتے تھے کہ اختر احسن صاحب نے میری علمی خامیوں کے دور کرنے میں نہایت فیاضی سے مدد کی۔ اس طرح وہ نہ صرف درس کے ساتھی بلکہ مولانا کے استاد بھی تھے۔ مولانا فراہی کی توجہ ان دونوں پر رہی اور دونوں نے بھی بڑی محنت سے کسب فیض کیا۔ مولانا اصلاحی نے اس درس کو ہمیشہ سرمایۂ حیات سمجھا اور ان دنوں کا تذکرہ بے حد شوق سے کیا کرتے۔ جونہی استادِ گرامی کا ذکر ہوتا تو ان کی یادداشتوں کے دریچے وا ہو جاتے اور وہ بلا تکان اس زمانہ کے احوال سنایا کرتے۔

مولانا فراہی کا یہ درس 1930ء کے اواخر تک رہا۔ نومبر 1930ء میں ان کا انتقال ہوا۔ انتقال سے قبل متھرا کے ضلعی ہسپتال میں مولانا اصلاحی کو یاد کرتے رہے۔ مولانا کو بلوایا گیا اور وہ ابھی کمرے کے باہر ہی تھے کہ استاد نے فرمایا: ''امین آ گیا۔'' مولانا کو کمرے میں بلوایا گیا تو ان کو سینے سے لگا لیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسی انتظار میں تھے کہ ان کے معتمد شاگرد آئیں تو اپنی علمی امانت ان کے حوالہ کر کے دنیا سے رخصت ہوں۔

مولانا فراہی کی شاگردی میں مولانا نے ان سے علوم تفسیر ہی نہیں پڑھے بلکہ استاد کے طریقۂ تفسیر میں مہارت حاصل کی۔ اس کے علاوہ عربی شاعری کی مشکلات کے حل میں ان سے مدد لی۔ سیاسیات میں ایک اہم کتاب بلنچلی کی تھیوری آف اسٹیٹ سبقاً سبقاً پڑھی اور فلسفہ کی بعض چیزیں مولانا فراہی کی نگرانی میں پڑھیں۔ اس دوران مولانا STOICS کے فلسفہ سے بے حد متاثر ہوئے۔ بتایا کرتے تھے کہ میں مارکس آریلیس کی تحریریں پڑھ پڑھ کر رویا کرتا تھا۔ مولانا فراہی کو پتہ چلا تو انھوں نے اس کے فلسفہ پر ایک تقریر کی جس کے بعد میرے دل کو قرار آ گیا۔

مولانا فراہی رحمہ اللہ جیسی نابغہ روزگار شخصیت سے کسب فیض کے بعد مولانا اصلاحی کی خواہش ہوئی کہ علم حدیث بھی کسی صاحب فن سے پڑھیں۔ اتفاق سے ان کے اپنے وطن ہی میں ایک قصبہ مبارک پور میں شیخ الحدیث، مولانا عبدالرحمن مبارک پوری رحمہ اللہ، جو حدیث میں نہایت عالی سند رکھتے تھے، علمی کام میں مصروف تھے۔ وہ صحاح ستہ کی مشہور کتاب جامع ترمذی کے استاد تھے اور ان دنوں اس کی شرح ''تحفۃ الاحوذی'' کے نام سے لکھ رہے تھے۔ مولانا ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور علم حدیث پڑھانے کی درخواست کی۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ یہ نوجوان مدرسۃ الاصلاح کے فاضل اور مولانا فراہی کے شاگرد ہیں، انھوں نے رسمی طور پر ترمذی کی ایک حدیث پڑھا کر کتاب کے

Marfat.com

نسخہ پر مولانا کو اپنی جانب سے سند لکھ کر دے دی اور اس پر اپنے دستخط ثبت کر دیے۔ مولانا نے استاد کا یہ تحفہ قبول کر لیا لیکن کہا کہ میں محدثین کرام کا یہ تاج محض اجازت حدیث لے کر اپنے سر پر سجانے کے لیے حاضر نہیں ہوا بلکہ علم حدیث کو بطور فن آپ سے سیکھنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ آپ ترمذی شریف کے ماسٹر ہیں۔ مجھے باقاعدہ شاگردی میں لیجیے۔ مولانا مبارک پوری نے بخوشی اس کی اجازت دے دی۔ انھیں اصول حدیث میں نخبة الفکر پڑھائی، جامع ترمذی کا درس شروع کیا اور اپنی شرح کے لیے رجال حدیث کی تحقیق میں مولانا سے کام لینے لگے۔ اس طرح مولانا فن حدیث کے اصول، سند کی تحقیق، رجال کی جرح وتعدیل کے طریق کار، ہر چیز سے آشنا ہو گئے۔ بتایا کرتے تھے کہ مبارک پور میں مجھے جو محنت کرنی پڑی اس کو میں کبھی بھول نہیں سکا۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ مجھے اپنے گاؤں سے مبارک پور تک پیدل آنا جانا پڑتا تھا۔ درس کی مقدار غیر معمولی تھی جس کے لیے بڑی محنت کرنی پڑتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ مدت کے بعد اس قدر بیمار ہو گیا کہ افاقہ وصحت کی کوئی صورت ہی نظر نہ آتی تھی۔

مولانا رحمہ اللہ بیان کرتے تھے کہ جب کبھی متن حدیث کے بارے میں کوئی اشکال پیش کر کے میں استاد گرامی سے وضاحت چاہتا تو وہ فرمایا کرتے کہ اس کی سند دیکھو۔ میں کہتا کہ سند میں تو کوئی راوی کمزور نہیں تو فرماتے کہ پھر آگے بڑھو۔ کبھی مجھ سے عبارت پڑھنے میں غلطی ہو جاتی تو اصلاح کرتے اور فرماتے: کوئی بات نہیں، اصیل گھوڑا بھی کبھی ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ مولانا مبارک پوری رحمہ اللہ کے درس میں مولانا کو اندازہ ہوا کہ محدثین کرام اصل زور سند پر صرف کرتے ہیں، متن کی تحقیق ان کے ہاں بنیادی اہمیت نہیں رکھتی۔

مولانا رحمہ اللہ نے فقہ کی تعلیم مدرسہ ہی میں حاصل کی۔ وہاں گروہی فقہ نہیں پڑھائی جاتی تھی بلکہ تمام مکاتیب فکر کی فقہ کو یکساں اہمیت دی جاتی تھی۔ بعد میں مولانا نے فقہ کا مطالعہ اپنے طور پر جاری رکھا اور امہات کتب پر ان کی نظر تھی۔ اصول میں وہ حنفی فقہ کو افضل مانتے تھے لیکن اپنی تربیت کی روشنی میں انھیں بعض مسائل میں احناف سے اختلاف بھی تھا۔

تدریس:

1925ء میں مولانا اصلاحی جب سرائے میر آگئے تو مدرستہ الاصلاح نے ان کو بطور مدرس تعینات کر لیا۔ مدرسہ میں وہ قرآن مجید، عربی ادب اور فلسفہ تاریخ کے مضامین پڑھاتے تھے۔ مدرسہ سے یہ وابستگی مولانا فراہی کے انتقال کے بعد بھی قائم رہی۔ یہ سلسلہ 1943ء میں منقطع ہوا۔

مدرسہ کے ساتھ سترہ سالہ وابستگی کے دوران مولانا نے مدرسہ کے لیے چندہ فراہم کرنے کی غرض سے ملایا کا دورہ کیا جہاں ان کے علاقہ کے بعض تاجر مقیم تھے۔ 1935ء میں اپنے استاد مولانا فراہی کی غیر مطبوعہ تصنیفات کی ترتیب وتہذیب اور اشاعت کے لیے مدرسہ میں ''دائرہ حمیدیہ'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس کے زیر اہتمام ایک اردو ماہنامہ ''الاصلاح'' کے نام سے جاری کیا تا کہ استاد کے افکار سے اردو دان طبقہ کو بھی آشنا کیا

Marfat.com

جائے کیوں کہ مولانا فراہی نے جو کچھ لکھا وہ عربی زبان میں تھا۔ مسودات کی ترتیب وتہذیب کا کام مولانا اختر احسن کرتے اور ان کا ترجمہ کرنا اور رسالہ کی ترتیب مولانا اصلاحی کے ذمہ ٹھہری۔ اس دوران میں مولانا فراہی کے بعض مسودات طبع ہوگئے۔

مولانا رحمہ اللہ قرآن مجید پر برابر تدبر کرتے اور مختلف موضوعات پر تحقیق کرتے رہے۔ چنانچہ الاصلاح میں جہاں انھوں نے مولانا فراہی کی تفاسیر کے تراجم شائع کیے وہیں اپنی تحقیقات بھی شائع کیں جو بعد میں حقیقت توحید، حقیقت شرک، حقیقت تقویٰ اور توضیحات کے نام سے شائع ہوئیں۔ ''مجموعہ تفاسیر فراہی'' کے نام سے وہی تراجم یکجا شائع ہوئے جو پہلے الاصلاح میں چھپے تھے۔ ماہنامہ الاصلاح کی اشاعت 1939ء میں معطل ہوگئی۔ مبادی تدبر قرآن بھی مولانا کی اسی دور کی تصنیف ہے۔

جماعت اسلامی میں شمولیت:

جس زمانہ میں الاصلاح شائع ہورہا تھا مولانا مودودی رحمہ اللہ کانگریس پر سخت تنقید اور متحدہ قومیت کے تصور کو غلط قرار دے رہے تھے۔ مولانا اصلاحی نے ایک مضمون میں لکھا کہ جہاں تک متحدہ قومیت کے غلط ہونے کا تعلق ہے اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن اس کے مقابل میں مسلم لیگ جو دعوت دے رہی ہے وہ یہ ہے کہ ''مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ''۔ اس جماعت کو لوگوں کے دین وایمان، عقائد، اخلاق اور کردار سے کوئی بحث نہیں۔ اس کی دعوت کونوا عباداللہ اخوانا کی اسلامی دعوت نہیں ہے یعنی اللہ کے بندو، سب بھائی بھائی بن جاؤ، حالاں کہ کرنے کا اصل کام یہ ہے اور انبیاء وصلحاء کی دعوت ہمیشہ یہی رہی ہے۔ لہٰذا مولانا مودودی اگر اسلام کے لیے بیداری پیدا کرنا چاہتے ہیں تو انھیں لوگوں کو اسلام پر مجتمع ہونے کی دعوت دینی چاہیے۔ مولانا مودودی نے اس موقف کو صحیح تسلیم کیا اور ان کے مضامین میں تبدیلی آ گئی۔ بعد میں مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ مدرسۃ الاصلاح میں مولانا سے ملے اور دریافت کیا کہ اگر کونوا عباداللہ اخوانا کی بنیاد پر کوئی جماعت قائم کی جائے تو کیا مولانا اس میں شمولیت اختیار کرلیں گے۔ مولانا نے جواب دیا کہ مدرسہ میں میری ذمہ داریاں بے حد اہم ہیں اور مجھے مولانا فراہی کے ناتمام کاموں کی تکمیل کرنی ہے، لہٰذا میں کسی دوسرے کام میں شریک تو نہیں ہوسکتا البتہ میں ایسے کام کو مبارک سمجھتا ہوں۔ یہ کام ہونا چاہیے۔ مولانا نعمانی رحمہ اللہ نے با اصرار کہا کہ ایک ملاقات مولانا مودودی سے ضرور کریں کیوں کہ وہ ایک جماعت کی داغ بیل ڈال رہے ہیں۔ یہ ملاقات لاہور میں ہوئی۔ ملاقات کے بعد مولانا نعمانی نے پوچھا کہ آپ نے مولانا مودودی کو کیسا پایا۔ مولانا نے جواب دیا: مولانا ان کا قصہ چھوڑیے۔ بس ایک اچھے انشا پرداز ہیں۔ مولانا نعمانی نے کہا دیکھو، اب شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید کے پایہ کے لوگ نہیں ملیں گے۔ اب تو کام چلاؤ آدمی چاہیے۔ اس لیے اگر ایک شخص اس نیک کام کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہے تو ہمیں اس کا ساتھ دینا چاہیے۔ مولانا اصلاحی نے کہا: آپ حضرات ساتھ دیجیے اور کام کیجیے۔ میں کب کہتا ہوں کہ اگر شاہ صاحب اور سید صاحب جیسے لوگ نہ ملیں تو کام ہی نہ ہو۔

Marfat.com

1941ء میں جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی گئی۔ جب تاسیس میں شامل ارکان کے نام شائع ہوئے تو ان میں مولانا اصلاحی کا نام بھی تھا، حالاں کہ وہ تاسیسی اجلاس میں شریک نہ ہوئے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے تردید چھاپنے کا ارادہ کیا تو مولانا اصلاحی نے اسے مروت کے خلاف سمجھا اور مولانا ندوی سے کہا کہ آپ کاہے کو تردید کرتے ہیں۔ کوئی دینی کام ہی ہوگا۔ غیر دینی کام تو نہیں ہوگا۔ اس طرح مولانا نعمانی کے اعتماد کو انھوں نے ٹھیس نہ پہنچائی جنھوں نے اپنے اعتماد پر ان کا نام شائع کروا دیا تھا۔

جماعت اسلامی کا مرکزی دفتر دارالاسلام پٹھانکوٹ میں قائم ہوا تو جماعت کے کاموں میں معاونت کے لیے مولانا مودودی کی نظر انتخاب مولانا اصلاحی پر پڑی۔ انھوں نے تقاضا شروع کیا کہ مرکز کی تمام ذمہ داریاں ان کے لیے تنہا سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے اس لیے مولانا دارالاسلام منتقل ہو جائیں۔ مولانا سرائے میر میں اپنی ذمہ داریوں کے حوالے سے لیت ولعل سے کام لیتے رہے لیکن یہ تقاضا بھی بڑھتا چلا گیا۔ ادھر مدرسہ کے احوال میں بھی تبدیلی آئی اور مولانا کو بعض لوگوں کی رقابت کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے استخارہ کے ساتھ ساتھ دیوان حافظ سے فال لی تو یہ شعر نکلا:

معرفت نیست دریں قوم خدایا مددے
تا برم گوہرِ خود را بہ خریدار دگر

''ان لوگوں میں پہچان نہیں ہے۔ الٰہی مدد کر کہ میں اپنا موتی دوسرے خریدار کے سامنے پیش کروں۔''

چنانچہ مولانا 1943ء میں دارالاسلام منتقل ہو گئے اور بعد ازاں نائب امیر کی ذمہ داری ادا کرتے رہے۔ اب ان کا اوڑھنا بچھونا اگرچہ جماعت تھی لیکن قرآن مجید پر غور وفکر ان کی تمام سرگرمیوں کا محور تھا۔ خاص اوقات اس کے لیے وقف تھے۔ جماعتی ضرورتوں کے لیے رہنمائی بھی قرآن مجید سے اخذ کرتے تھے۔ ''دعوت دین اور اس کا طریق کار'' ان کی ایسی ہی تصنیف ہے۔

مولانا فرمایا کرتے تھے کہ ان میں اور مولانا مودودی میں قدر مشترک یہ بات تھی کہ دونوں تقلید وتنقید سے آزاد تھے۔ دینی معاملات پر ایک ہی طرح سوچتے تھے، ان امور میں کوئی اختلاف نہیں تھا کہ قرآن، حدیث اور فقہ پر کیسے غور کرنا چاہیے، علماء کو دعوت کس طرح دی جائے اور لوگوں کے ذہنوں میں تبدیلی کیسے لائی جائے۔ دونوں میں اختلاف ذوق اور فکر کا تھا۔ مولانا فراہی کے فکر سے مولانا مودودی کو نہ کوئی دلچسپی تھی اور نہ یہ ان کے بس کا کام تھا۔ جبکہ مولانا اصلاحی دل وجان سے اس کے گرویدہ اور صحیح فہم دین میں اس کو فی الواقع مشعل راہ بنائے ہوئے تھے۔

جماعت کے قیام کے کچھ عرصہ بعد مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ اور مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کو امیر جماعت کی شخصیت اور ان کے معیار تقویٰ سے کچھ شکایتیں پیدا ہو گئیں۔ ان کا خیال تھا کہ جماعت کے مقاصد کے لحاظ سے جماعت کے سربراہ کو نہایت عبادت گزار اور متقی ہونا چاہیے تاکہ اس کی ذات سے سلف صالحین کی یاد تازہ ہو جائے۔ مولانا مودودی رحمہ اللہ ان کے معیار تقویٰ پر پورے نہیں اترتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے جماعت سے

Marfat.com

علیحدگی کا فیصلہ کرلیا۔ انھوں نے اس موقع پر مولانا اصلاحی کو بھی اعتماد میں لیا۔ انھیں توقع تھی کہ مولانا بھی انہی کی طرح فیصلہ کریں گے لیکن مولانا کا جواب یہ تھا کہ آپ حضرات تقویٰ اور عزیمت کے جس مقام پر ہیں، آپ کا امیر جماعت کی شخصیت پر اطمینان نہ ہونا سمجھ میں آتا ہے لیکن میں تو مولانا مودودی سے بھی گیا گزرا ہوں، لہٰذا میں اس چیز کو جماعت سے علیحدگی کی بنیاد نہیں بنا سکتا۔ یہ ایک ایسی بات تھی جو مولانا کے اونچے ظرف کی غماز تھی۔ اس میں عجز وانکسار بھی تھا اور وابستگان جماعت کے لیے ایک سبق بھی۔ بعد ازاں جب مولانا نعمانی نے جماعت اسلامی کے خلاف لکھا تو مولانا ہی نے اپنے اس عزیز دوست کے خلاف مورچہ لگایا۔ جماعت کے لیے ان کی فدویت کا یہ عالم رہا کہ جدھر سے بھی جماعت کو نشانہ بنایا گیا، مولانا دفاع کے لیے سینہ سپر ہوگئے۔ ان کے تمام تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''تنقیدات'' کے نام سے شائع ہوا۔

1947ء میں جماعت اسلامی کے اکابر دارالاسلام سے پہلے راولپنڈی اور پھر لاہور منتقل ہوئے اور وہیں جماعت کے مرکزی دفاتر قائم ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد مولانا مودودی کی سوچ میں بنیادی تبدیلی پیدا ہوئی۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلم لیگ کی ذمہ داری پاکستان بنانا تھا۔ اس کو چلانے کی اہلیت اس کے پاس نہیں ہے اور ایک اسلامی ریاست کے چلانے کے لیے مطلوبہ صفات کے حامل افراد جماعت اسلامی کے پاس ہیں۔ لہٰذا اب اقتدار جماعت کو ملنا چاہیے۔ پاکستان کے عوام دل وجان سے اسلام کے نفاذ کے خواہش مند ہیں، لہٰذا جماعت کے برسر اقتدار آنے میں اب کوئی رکاوٹ موجود نہیں ہے۔ جماعت کے محرم رازلوگوں کا بیان ہے کہ پاکستان میں ہونے والے پہلے الیکشن سے قبل کارکنان جماعت یہ تک سوچتے تھے کہ جماعت اسلامی کی حکومت میں کون شخص کس وزارت پر فائز ہونے کا اہل ہے۔ مولانا اصلاحی انتخابی سیاست کو قبل از وقت اور جماعت کے حق میں غیر مفید قرار دیتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ یہ اقدام اس مقصد کے لیے سخت مضر ہوگا جس کے لیے جماعت قائم ہوئی۔ 1951ء میں جماعت نے پنجاب کے الیکشن میں حصہ لیا اور مولانا کو بھی ایک حلقہ سے بطور امیدوار کھڑا کیا لیکن نتیجہ سامنے آیا تو جماعت اپنی مہم میں بری طرح ناکام ہوگئی تھی۔

قیام پاکستان کے ساتھ ہی مولانا نے ایک علمی منصوبہ پر کام کیا کہ ایک اسلامی ریاست کیا ہوتی ہے، اس کے مقاصد کیا ہوتے ہیں، حکومت کے کارکنوں اور عہدہ داروں کے فرائض اور ذمہ داریاں کیا ہیں، اس میں شہریوں کو کون سے حقوق حاصل ہوتے ہیں، غیر مسلموں کو کیسے تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔ مولانا کے یہ مضامین پہلے پمفلٹوں کی صورت میں اور پھر کتاب ''اسلامی ریاست'' کی شکل میں شائع ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی کے ہال میں اسلامی دنیا کے علماء کا اسلامک کلوکیم منعقد ہوا تو اس میں مولانا نے اسی موضوع پر عربی میں اپنا مقالہ پیش کیا۔ پاکستان قائم ہونے کے جلد بعد حکومتی سرپرستی کے تحت ایسے ادارے قائم ہونے لگے جو عورتوں کی آزادی اور ملک میں ثقافتی تبدیلی کے علمبردار تھے۔ مولانا نے ان کی سرگرمیوں کو خلاف شریعت اور معاشرہ کے لیے تباہ کن سمجھا، اور ان کے نتائج وعواقب کو واضح

Marfat.com

کرنے کے لیے ''قرآن میں پردہ کے احکام''، ''پاکستانی عورت دوراہے پر'' اور ''اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام'' کے نام سے کتابیں لکھیں اور اس طرح اپنی دینی ذمہ داری پوری کی۔ غیر اسلامی قانون سازی ہوئی تو اس پر تبصرے کر کے دینی موقف کو واضح کیا۔ کراچی کے لاء کالج میں تقاریر کے ایک سلسلے میں اسلامی قانون کی مختلف اطراف کو واضح کیا۔ یہ تقاریر ''اسلامی قانون کی تدوین'' کے نام کی کتاب میں شامل ہیں۔

1953ء میں قادیانیوں کے خلاف چلنے والی تحریک میں مولانا اصلاحی گرفتار ہو کر ڈیڑھ سال کے لیے جیل میں بند کر دیے گئے۔ قید کے دوران میں انھیں جماعت کی منصبی ذمہ داریوں سے فراغت نصیب ہوئی تو انھوں نے اپنے تیس سالہ قرآنی فکر کو مجتمع کیا۔ قرآن کی سورتوں کے مضامین کا تجزیہ کر کے آیات کو پیراگراف کی صورت میں تقسیم کیا اور ہر سورہ کا عمود یا مرکزی مضمون متعین کیا۔ حقیقت میں اسیری کے انہی ایام میں ان کی عظیم تفسیر تدبر قرآن پر اساسی کام ہوا۔

جماعت اسلامی میں مولانا اصلاحی نائب امیر جماعت رہے، نیز مرکزی شوریٰ میں ہمیشہ شامل رہے۔ مولانا مودودی کی غیر حاضری میں امیر جماعت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کا بھی انھیں موقع ملا۔

جماعت اسلامی سے علیحدگی:

قیام پاکستان کے بعد جماعت اسلامی نے ملکی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ابتدائی برسوں میں جو امور سامنے آئے وہ اصولی اور دستوری قسم کے تھے جن میں حصہ لینے میں کوئی قباحت نہ تھی لیکن انتخابی سیاست میں حصہ لینے پر مولانا اصلاحی کی رائے الگ تھی۔ وہ اسے جماعت کے لیے سخت مضر سمجھتے تھے۔ جماعت ان کے نقطہ نظر کی قائل نہ ہو سکی۔ پنجاب کے الیکشن کے نتائج سامنے آئے تو جماعت میں بحران پیدا ہو گیا۔ کارکنوں میں مایوسی پیدا ہوئی اور قیادت کے خلاف جذبات پیدا ہونے لگے۔ جب شکوے شکایتیں زیادہ بڑھ گئیں تو 1956ء میں جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ نے تحقیقات کے لیے ایک جائزہ کمیٹی تشکیل دی۔ اس کے سربراہ حکیم عبدالرحیم اشرف رحمہ اللہ اور ارکان میں مولانا عبدالجبار غازی رحمہ اللہ، مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ اور حکیم شیخ سلطان احمد رحمہ اللہ تھے۔ اس کمیٹی نے پورے ملک کا دورہ اور ارکان جماعت سے ملاقاتیں کر کے دسمبر 1956ء میں مجلس شوریٰ کے اجلاس میں رپورٹ پیش کی۔ شوریٰ نے کمیٹی کی کارکردگی کو سراہا اور ایک قرارداد منظور کی جس کی ایک اہم شق یہ تھی کہ جماعت انتخابات کی سرگرمیوں سے فی الحال صرف نظر کر کے معاشرے کی اصلاح پر زور دے گی۔ جائزہ کمیٹی کی رپورٹ جماعت کے اندر بعض ایسے امور کو منکشف کرنے کا باعث ہوئی کہ مولانا مودودی نے اسے اپنے خلاف چارج شیٹ قرار دے دیا۔ ان کا احساس تھا کہ جائزہ کمیٹی کے ارکان نے ان کے خلاف ایک سازش کی ہے۔ چنانچہ انھوں نے شوریٰ کی قرارداد پر برہمی کا اظہار کیا اور جائزہ کمیٹی کے ارکان پر جتھہ بندی اور بلاک سازی کا الزام عائد کر کے ان سے استعفےٰ طلب کر لیے۔ مولانا اصلاحی کے علم میں یہ بات آئی تو انھوں نے امیر جماعت کے نام ایک خط تحریر کیا جس میں ان کے

Marfat.com

اقدام کو دینی، اخلاقی، دستوری ہر لحاظ سے غلط قرار دیا۔ اس پر مولانا مودودی نے جماعت اسلامی کی امارت سے استعفا دے دیا اور دوبارہ یہ ذمہ داری قبول کرنے پر صرف اس صورت میں آمادگی ظاہر کی کہ ارکان جماعت کا اجتماع ان کی پالیسیوں کی تائید کرے، نیز دستور جماعت میں ایسی تبدیلیاں کی جائیں کہ امیر جماعت اپنی پالیسیوں کو بغیر کسی رکاوٹ کے عملی جامہ پہنا سکے۔ 1957ء میں ماچھی گوٹھ ضلع رحیم یار خان کے مقام پر جماعت کا یہ اجتماع منعقد ہوا اور دستور میں ترامیم کر کے امیر جماعت کو ہمہ مقتدر بنا دیا گیا۔ اس میں مجلس شوریٰ کی حیثیت کمزور کر دی گئی۔ مولانا اصلاحی رحمہ اللہ نے اجتماع میں ان تمام کوششوں کا توڑ کرنے کی کاوش کی اور ایک مفصل خطاب کیا لیکن جماعت نے ان کی اس نہایت اہم تقریر کو محفوظ نہیں کیا۔ نئی صورت حال میں مولانا اصلاحی رحمہ اللہ نے جماعت اسلامی سے استعفا دینے کا ارادہ کر لیا۔ جماعت کے کئی بہی خواہوں نے استعفا رکوانے کی بڑی کوششیں کیں۔ انھوں نے اس معاملے میں مصالحت کرانی چاہی۔ شام کے سفیر عمر بہاء الامیری تک نے اپنا کردار ادا کیا، ایک پنچایت بھی قائم ہوئی لیکن اس تگ ودو کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر کار جنوری 1958ء میں مولانا جماعت سے حتمی طور پر علیحدہ ہو گئے۔

جماعت سے علیحدگی کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا اصلاحی رحمہ اللہ بیان کرتے تھے کہ ''مولانا مودودی رحمہ اللہ اسلامی نظام کی بنیادی خصوصیت......شورائیت......کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اپنی آمریت قائم کرنے کے لیے انھوں نے دستور اور نظام جماعت کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ جائزہ کمیٹی کے خلاف غیر اخلاقی اور غیر دستوری اقدام سے انھوں نے جماعت میں بحران پیدا کر دیا اور جب اس کے خلاف آواز بلند کی گئی تو انھوں نے معترضین کی کردار کشی کرنے کے ساتھ ساتھ یہ اصول بھی پیش کر دیا کہ نظریاتی حکمت اور ہوتی ہے، عملی حکمت اور۔ اسلام میں امیر کو دیکھنا پڑتا ہے کہ دین کے نفاذ میں اسے کیا حکمت عملی اختیار کرنی ہے۔ اس کے لیے وہ بعض اصولوں کو ضرورت پڑنے پر قربان بھی کر سکتا ہے۔ ان تجربات سے گزرنے کے بعد میں کس مقصد کے لیے جماعت میں پڑا رہتا؟ میں نہ تو انقلابی قیادت کے نعرہ کو اسلامی انقلاب کا ذریعہ سمجھتا ہوں اور نہ ووٹ حاصل کرنے کی بھاگ دوڑ کو اصلاح معاشرہ کا واسطہ۔ جماعت کا موجودہ دستور میرے نزدیک نہ شورائی ہے نہ جمہوری۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مجھے امیر جماعت کے نہ عدل پر بھروسا ہے، نہ ان کی تنہا بصیرت پر، نہ دستور جماعت کے ساتھ ان کی وفاداری پر۔ لے دے کے صرف ایک چیز رہ جاتی ہے۔ وہ یہ کہ اس جماعت میں بہت سے نیک دل اور خدا ترس مسلمان شامل ہیں۔ جماعت کی یہ چیز میری نگاہوں میں بڑی قابل قدر ہے۔ میں ان سب بھائیوں سے محبت کرتا اور ان کے لیے دعائے خیر کرتا ہوں لیکن اس محبت اور دعا گوئی کے لیے میرا جماعت کے ساتھ بندھے رہنا کوئی ضروری نہیں تھا۔ یہ خدمت میں باہر رہ کر بھی انجام دیتا رہوں گا۔''

مولانا کے نزدیک نئے دستور کے تحت جماعت پیری مریدی کا ایک نظام تھا یا پھر ایک آمر کی آمریت۔ ان دونوں چیزوں سے مولانا کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لہٰذا جماعت سے سترہ رسالہ رفاقت کا خاتمہ ہو گیا۔ مولانا کے استعفا پر

Marfat.com

مولانا مودودی ان کے پاس آئے اور استعفا واپس لینے کے لیے گفتگو کی۔ مولانا نے جواب دیا کہ مولانا، میں نے آپ کو پہچان لیا اور آپ نے مجھے پہچان لیا۔ اب ہماری راہیں جدا ہو چکی ہیں۔ آئندہ ہم کبھی نہ ملیں گے۔

خدمت دین کے پروگرام:

جماعت سے مستعفی ہونے کے بعد مولانا نے اپنی ان ذمہ داریوں پر خصوصی توجہ دی جو قرآن مجید کے حوالے سے ان پر عائد ہوتی تھیں۔ سب سے پہلے انھوں نے تفسیر لکھنے کا باقاعدہ آغاز کر دیا اور اس کی اقساط مولانا عبدالرحیم اشرف رحمہ اللہ کی زیر ادارت لائل پور سے شائع ہونے والے رسالہ المنبر میں شائع ہونے لگیں۔ اس سال مولانا حج پر گئے اور اپنے مشاہدات حج ایک سفرنامہ کی صورت میں مرتب کیے۔ اس کی اقساط اسی رسالہ میں شائع ہوتی رہیں۔ بعدازاں مولانا نے اپنا ذاتی رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا نام انھوں نے ''میثاق'' رکھا۔ جون 1959ء سے اس کی اشاعت شروع ہوئی۔ اب مولانا کی تمام تحقیقات اس رسالہ میں شائع ہونے لگیں۔ ابتدائی چند پرچوں میں مولانا نے مولانا مودودی کے نظریہ حکمت عملی کے تار و پود بکھیرنے کے لیے ایک سلسلہ مضامین لکھا جو ان کی کتاب ''مقالات اصلاحی'' میں شامل ہے۔

جنوری 1958ء میں راقم سطور اپنے دوست جناب محبوب سبحانی کی معیت میں مولانا کے در دولت پر حاضر ہوا اور درخواست کی کہ وہ اپنے اوقات میں سے کچھ فارغ وقت قرآن مجید پڑھانے پر صرف کریں۔ مولانا نے ہم دونوں کو روزانہ بعد از نماز عصر آنے کی ہدایت کی۔ ہم قرآن مجید لے کر ان کے پاس پہنچتے لیکن مغرب تک کا سارا وقت ادھر ادھر کی باتوں میں گزر جاتا اور درس کی نوبت نہ آتی۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ تک یہی کیفیت رہی۔ آخر کار ایک دن مولانا فرمانے لگے: تم لوگ بڑے سخت جان ہو۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ یہ نوجوان یوں ہی پڑھنے کی امنگ لے کر آئے ہیں، چند روز میں جوش ختم ہو جائے گا۔ میرا پہلا تجربہ لوگوں کے ساتھ یہی تھا لیکن اب میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ پڑھنے میں سنجیدہ ہیں، لہٰذا کام شروع کرنا چاہیے۔ اس کے بعد مولانا باقاعدہ توجہ فرمانے لگے۔ 1959ء میں انھوں نے رسالہ میثاق جاری کیا تو اس میں راقم حتی المقدور ہاتھ بٹانے لگا۔ تین سال بعد مولانا نے محسوس کیا کہ ان کی معمولی توجہ سے بھی اسے بہت فائدہ ہوا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ہدایت فرمائی کہ دوسرے لوگوں کو بھی دعوت دے کر درس کو باقاعدہ حلقہ کی شکل دی جائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو وہ عصر تا عشاء کا وقت تدریس کے لیے وقف کرنے کو تیار ہیں۔ اس دعوت پر اٹھارہ بیس نوجوان تیار ہو گئے اور 1961ء میں تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مولانا نے کمال دل جمعی اور محنت سے عربی گرامر، عربی ادب کی بعض کتابیں اور صحیح مسلم پڑھائی اور قرآن مجید کا تحقیقی درس دیا۔ یہ سلسلہ 1965ء تک جاری رہا جب ان کے صاحب زادے ابو صالح ہوائی جہاز کے حادثہ میں انتقال کر گئے اور ان کی تمام ذمہ داری مولانا کے ناتواں کندھوں پر آ گئی۔ اس حادثے نے رسالہ میثاق اور حلقہ تدبر قرآن دونوں کا کام تلپٹ کر دیا۔

1966ء میں مولانا نے رسالہ کی ادارت جماعت اسلامی کے ایک سابق ساتھی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے

Marfat.com

حوالہ کی جوان دنوں لاہور منتقل ہوئے تھے اور اپنے لیے ایک رسالے کا ڈیکلریشن حاصل کرنے کے خواہشمند تھے۔

جماعت اسلامی سے اختلاف کر کے علیحدہ ہونے والے تنہا مولانا اصلاحی نہیں تھے بلکہ اجتماع ارکان کے بعد تقریباً ستر ارکان نے جماعت چھوڑ دی تھی۔ مولانا کے احباب اور جماعت کے دور کے ساتھیوں نے ان سے درخواست کی کہ وہ ان تمام افراد کو مجتمع کریں اور ایک نئی جماعت کا نظم قائم کریں۔ مولانا کا خیال یہ تھا کہ تمام لوگ چوں کہ کسی ایک نکتہ پر متفق ہو کر جماعت سے الگ نہیں ہوئے، اس لیے ان کو مجتمع کرنا مینڈکوں کی ایک پنسیری باندھنے کے مترادف ہوگا اور وہ کوئی کام نہیں کر پائیں گے۔ تاہم مولانا نے اس بات پر اتفاق کیا کہ ایسے سابق ارکان سے فرداً فرداً رابطہ کیا جائے۔ اگر ان کے اندر ذہنی ہم آہنگی اور کسی پروگرام پر اتفاق پایا جائے تو نظم قائم کرنے کا اقدام کیا جائے۔ مولانا عبدالغفار حسن اور شیخ سلطان احمد صاحبان نے ملک کا دورہ کر کے سابق ارکان سے ملاقاتیں کیں اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان لوگوں کی جماعت سے الگ ہونے کی وجوہ مختلف تھیں اور ہر شخص جماعت اسلامی میں خرابی کی نشان دہی اپنے تجربہ کی روشنی میں ذاتی رائے کے مطابق کر رہا تھا۔ ان میں قدر مشترک صرف یہی تھی کہ یہ سب جماعت سے علیحدہ ہوئے تھے۔ یہ لوگ کسی متعین ہدف پر بھی متفق نہیں تھے۔ اس صورت حال میں یہ فیصلہ ہوا کہ فوری طور پر جماعتی نظم قائم کرنا لاحاصل ہوگا۔ البتہ جتنے لوگ ہم خیال نظر آتے ہیں ان کا اجتماع منعقد کر کے ایک مجلس مشاورت قائم کر دی جائے۔ اگر کچھ لوگ اس کے مقاصد کے ساتھ ہم آہنگ پائے جائیں تو ان کو بھی فی الحال مجلس مشاورت ہی میں شریک کیا جائے۔ اس مجلس کا ایک اجتماع 9۔ستمبر 1967ء کو رحیم یار خان میں منعقد ہوا جس میں آئندہ کام کے لیے ایک قرار داد منظور کی گئی اور ایک اجتماعی جماعت کی تشکیل کی راہ ہموار کرنے کے لیے ایک مجلس مشاورت کا تقرر ہوا۔ اس مجلس میں سات ارکان تھے...... مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبدالغفار حسن، مولانا عبدالحق جامعی، سردار محمد اجمل خان، ڈاکٹر محمد نذیر مسلم، ڈاکٹر اسرار احمد اور شیخ سلطان احمد (معتمد) لیکن افسوس کہ باقاعدہ تنظیم قائم نہ ہو سکی۔ البتہ مجلس کے فیصلوں کی روشنی میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے مکان پر ایک نشست ہفتہ وار درس قرآن و حدیث کی شروع کی جس میں مولانا اصلاحی نے انتیسویں پارہ اور کچھ تیسویں پارہ کا درس دیا۔ بعد میں مولانا کو ڈاکٹر صاحب کے فکر سے اختلاف اور ان کے رویوں سے کچھ شکایتیں پیدا ہو گئیں۔

نسیان کی بیماری کا حملہ:

1971ء کے آخر میں جب مولانا سورہ بنی اسرائیل تک تفسیر مکمل کر چکے تھے، ان کو دورانِ سر اور نسیان کی بیماری نے آلیا۔ اس کی شدت اس قدر تھی کہ مولانا کو اشیاء اور افراد کی پہچان بھی نہ رہی۔ لکھنے لکھانے کا تمام کام ٹھپ ہو گیا۔ تفسیر کے شائقین اس کی تکمیل سے مایوس ہو گئے۔ لاہور کے تمام اہم ڈاکٹروں کے علاج سے مولانا کو کوئی افاقہ نہ ہوا اور بیماری تھی کہ روز بروز پہلے کی نسبت شدت اختیار کر رہی تھی۔ مولانا کے کئی عقیدت مندوں نے ان کی صحت کے لیے دعائیں کیں اور منتیں مانگیں۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ کراچی کے نامور دماغی معالج ڈاکٹر جمعہ سے علاج کرایا

Marfat.com

جائے۔ اس وقت مولانا کے ہم زلف چوہدری اقبال صاحب فرشتۂ رحمت ثابت ہوئے۔ انھوں نے پیشکش کی کہ وہ مولانا کا علاج کروائیں گے اور مولانا کا قیام کراچی میں انہی کی قیام گاہ پر ہوگا۔ ڈاکٹر جمعہ کی تشخیص کے مطابق بہت زیادہ دماغی محنت نے دماغ کی شریانوں کو سخت کر دیا تھا لہٰذا خون کی گردش میں دشواری کے باعث نسیان کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر کے تجویز کردہ علاج سے اللہ تعالیٰ نے چند ہفتوں میں بیماری سے خلاصی دے دی۔ الفاظ کی یادداشت بحال ہوگئی، جملوں میں ربط پیدا ہوگیا اور پہچان لوٹ آئی۔ طبیعت بحال ہوتے ہی راقم سطور کو یاد کیا اور اپنی صحت کے بارے میں خط لکھوایا۔ مولانا کی بیماری میں تشویش کا ایک پہلو یہ تھا کہ مولانا صحت یاب ہونے پر اپنے سرمایۂ علمی کو بھول نہ چکے ہوں۔ چنانچہ جوں ہی یادداشت لوٹ آنے کے آثار نظر آئے تو کراچی میں مولانا کے دوست شیخ سلطان احمد صاحب نے مولانا سے درس کی فرمائش کی۔ مولانا نے سورہ حدید کا درس دیا تو فرط مسرت میں شیخ صاحب نے راقم کو خوشخبری لکھ کر بھیجی کہ مولانا کی بیماری نے ان کے علم کو قطعاً کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور درس حسب سابق بہت مدلل اور موثر تھا۔ مئی 1972ء میں مولانا لاہور واپس آئے۔ اب وہ خاصے صحت یاب ہو چکے تھے۔ راقم ملنے گیا تو فرمایا کہ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت عقل ہے۔ اسی کے باعث انسان اشرف المخلوقات ٹھہرا۔ اس بیماری میں مبتلا کر کے اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ حقیقت واضح کی ہے کہ انسان اپنی جس صلاحیت پر ناز کر سکتا ہے اللہ تعالیٰ پلک جھپکنے میں اس کو سلب کر سکتا ہے۔ میری بیماری نے میرے اوپر بعض حقائق منکشف کیے ہیں۔ اگر میں اس تجربہ سے نہ گزرتا تو ان کے بارے میں اتنا پختہ یقین نہ ہو سکتا تھا۔ مثلاً یہ مسئلہ کھلا کہ قرآن پر گہری نظر سے وہ صحیح ایمان پیدا ہوتا ہے جو مصائب میں سہارا بنتا اور مشکلات میں پریشانی سے بچاتا ہے۔ اگر ایک آزمائش سے گزر کر آدمی کچھ ایسی باتیں سمجھ لے جو بڑھاپے میں سہارا دینے والی ہوں تو وہ قیمت کچھ زیادہ نہیں ہے۔

بیماری سے اٹھ کر مولانا نے کئی ماہ بعد جمعہ کی نماز 9۔ جون 1972ء کو پڑھی تو اس پر بے حد مسرور تھے۔ فرمانے لگے کہ اگرچہ مجھے یہ تسلی تھی کہ میں بیماری کے باعث نماز جمعہ کی حاضری سے معذور ہوں لیکن مجھے اس حدیث کے باعث وحشت ہوتی تھی جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص لگاتار جمعہ کی تین نمازوں میں حاضر نہ ہو تو خدا کو اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ وہ یہودی ہو کر مرتا ہے یا نصرانی ہو کر۔ مجھے پریشانی یہ تھی کہ میں کئی ماہ گزر جانے کے باوجود ابھی اس پر قادر نہیں ہو رہا ہوں۔

ماہ جون میں مولانا کام کرنے کے قابل ہوگئے۔ فرمانے لگے کہ اب میری صحت اچھی ہو رہی ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کام کی شکل کیا ہوگی اور تفسیر کیسے لکھی جائے گی۔ راقم نے مشورہ دیا کہ آپ سورہ کہف اور اس کے بعد کی سورتوں کو زیر مطالعہ رکھیں۔ حلقہ تدبر قرآن کے ساتھی بھی ان کو پڑھتے رہا کریں اور فی الحال ان کی مشکلات کے بارے میں آپ سے سوالات کریں۔ جب صحت مزید بہتر ہو جائے تب آپ لکھنا شروع کریں۔ مولانا نے اس مشورے پر عمل کیا اور علمی مجالس منعقد ہونے لگیں۔ جولائی سے مولانا نے سورہ کہف کا درس باقاعدہ دینا شروع کیا اور

Marfat.com

اس کے لیے ہفتہ میں دو دن مخصوص کیے۔ چند ہفتوں میں انھوں نے محسوس کیا کہ اب وہ تفسیر لکھ سکتے ہیں بشرطیکہ حلقہ کے رفقاء بھی اس کام میں شریک ہو جائیں۔ چنانچہ راقم سطور، عبداللہ غلام احمد صاحب اور محمود احمد لودھی صاحب نے معاونت کا کام اپنے ذمہ لیا اور اس طرح تفسیر کی تحریر وتسوید کا کام پھر سے شروع ہو گیا۔

دیہات میں قیام:

مولانا رحمہ اللہ کی معاشی حالت مستحکم نہیں تھی۔ وہ معاش کو اہمیت دینے کے بالکل قائل نہ تھے۔ قرآن مجید کی تعلیم کی روشنی میں ان کا ایمان اس بات پر تھا کہ آدمی کو فکر صرف اپنا فرض ادا کرنے کی ہونی چاہیے۔ اگر وہ اخلاص کے ساتھ اس میں منہمک ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کی کفالت کی ایسی راہیں خود کھول دے گا جو اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوں گی۔ اگر اس راہ میں کچھ آزمائشیں پیش آتی ہیں تو ان کا مقصد انسان کی تربیت کرنا ہوتا ہے۔

مولانا رحمہ اللہ کی اہلیہ محترمہ جالندھر کے قریب ایک گاؤں راہوں کے ایک بڑے زمیندار چوہدری عبدالرحمٰن کی صاحبزادی تھیں۔ تقسیم ہند کے بعد غیر منقولہ جائداد کے بدلے میں پاکستان میں چوہدری صاحب کو مختلف مقامات پر زمین الاٹ کی گئی۔ مولانا کی گزراوقات اس زمین کی پیداوار سے ہوتی تھی جو بیگم صاحبہ کے حصہ میں آئی۔ لیکن یہ آمدنی اخراجات کے مقابل میں ناکافی تھی۔ مولانا کے ایک عزیز دوست سردار محمد اجمل خان لغاری نے بیگم صاحبہ کے حصہ کی زمین اشتمال اراضی کے ذریعہ سے یکجا کروادی تو اس کا انتظام ممکن ہو گیا۔ ابتدا میں زمین پر کاشت منشی کی زیر نگرانی ہوتی لیکن پیداوار پر ذاتی توجہ نہ دینے کے باعث یافت کم رہتی۔ مولانا کی بیماری کے اخراجات نے انھیں خاصا مقروض کر دیا تھا۔ صحت یابی کے بعد گھر میں اس مسئلہ پر غور ہوا کہ رقبہ پر رہائش کیوں نہ اختیار کر لی جائے تاکہ شہری اخراجات سے جان چھوٹ جائے۔ دو وجوہ ایسی تھیں جو مولانا کو زمین پر منتقل ہونے سے روکتی تھیں۔ ایک یہ کہ لاہور میں قرآن کی تدریس کا کام اس صورت میں بالکل معطل ہو جاتا تھا۔ دوسری یہ کہ مولانا بیگم صاحبہ کی زمین پر ہی انحصار کر کے اپنی ذمے داری بیگم صاحبہ کو منتقل کرنے والے کہلاتے۔ مولانا اس بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کے بارے میں متامل ہو گئے۔ انھوں نے شیخ سلطان احمد صاحب سے رائے طلب کی تو انھوں نے کہا کہ یہ ہے تو آپ کا ایک ذاتی اور خانگی معاملہ جس کا فیصلہ حالات کے لحاظ سے ہونا چاہیے۔ دوسرا گاؤں جانے میں آپ کو تامل کیوں ہے؟ مولانا کا موقف تھا کہ اس طرح میں نان نفقہ کی ذمہ داری اپنی اہلیہ پر ڈالنے والا بن جاؤں گا۔ شیخ صاحب نے دلیل دی کہ آپ وہاں فارغ تو نہ بیٹھیں گے۔ آپ زمینداری کے جملہ معاملات خود سنبھالیں گے۔ اس طرح منشیوں کے تقرر کی ضرورت نہیں ہوگی۔ کاشت کی منصوبہ بندی اور نگرانی آپ خود کریں گے تو اس میں آپ کا وقت اور محنت صرف ہوگی۔ آپ اس کا معاوضہ پانے کے حقدار ہوں گے۔ لہٰذا زمین سے جو یافت ہوگی اس میں آپ کا ذاتی حصہ اچھا خاصا ہوگا۔ یوں آپ اہلیہ سے نان نفقہ پانے کے الزام سے بری ہوں گے۔ یہ دلیل مولانا کو قائل کرنے کا باعث بنی اور وہ رقبہ پر منتقل ہو گئے۔

Marfat.com

مذکورہ زمین ضلع شیخوپورہ میں واقع قصبہ خانقاہ ڈوگراں سے چند میل کے فاصلہ پر ہے۔ مختصر آبادی کے گاؤں کا نام مولانا نے رحمان آباد رکھا۔ اس میں شہری سہولتیں بالکل نہ تھیں حتی کہ بجلی بھی نہ تھی۔ مکانات کچے تھے۔ گلیوں میں گائیں بھینسیں بندھی ہوئی ہوتیں اور غلاظت کے انبار پھیلے ہوتے۔ مکھیوں اور مچھروں کی بھرمار تھی۔ گرمی خوب پڑتی۔ آبادی ناخواندہ تھی اور مولانا کی علمی باتوں کو سمجھنے والا اور ان کی قدر کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس کے باوجود مولانا کو دیہی زندگی سے بے حد انس تھا۔ وہ زمینوں کی دیکھ بھال بڑی جاں فشانی سے کرتے۔ ان کا معمول تھا کہ نماز فجر اور پھر نماز عصر کے بعد رقبے پر جاتے۔ کاشت کی نگرانی کرتے۔ کسانوں کو برسر موقع ہدایات دیتے۔ نہری پانی ملنے کی باری اگر رات کو ہوتی تب بھی رات کو اٹھ کر رقبہ پر جاتے۔ گاؤں کی زمین کینو کی کاشت کے لیے موزوں پائی تو بڑے اہتمام سے کینو کے دو باغ لگوائے۔ وہ ایک ایک بوٹے پر توجہ دیتے اور بروقت کسانوں کو ہدایات دیتے۔ اس محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین سے آمدنی میں خاصا اضافہ ہوا اور باغ جب پھل دینے پر آئے تو ٹھیکے سے کافی آمدنی ہوتی۔

مولانا کا رقبے پر آنا جانا صرف زمینی مسائل کے حل کے لیے نہیں ہوتا تھا۔ وہ اسے تفسیری مشکلات کے حل کے لیے بھی ضروری سمجھتے تھے۔ جو کچھ انھیں لکھنا ہوتا اس کے اسلوب کو متعین کرنے کے لیے سیر کا یہ وقت بڑا موزوں ہوتا۔ مولانا قرآن مجید کو صرف نظری طور پر نہیں بلکہ علمی طور پر بھی کتاب ہدایت سمجھتے اور اس کے مطابق اقدام کرنے کے عادی تھے۔ سورہ کہف میں باغ والے کا ایک قصہ بیان ہوا ہے کہ اس کا باغ درختوں سے گھرا ہوا تھا اور بیچ بیچ میں کاشت کی جاتی تھی، مولانا نے وہیں سے اپنے باغ کا نقشہ اخذ کیا۔ زمین کے گرداگرد شیشم کے درخت لگوائے۔ درمیان میں کینو کے پودے تھے اور ان کے بیچ کی زمین پر کاشت ہوتی تھی۔ مولانا باغ میں داخل ہوتے وقت ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ۔ (جو کچھ اللہ نے چاہا عطا فرمایا، اللہ کے بغیر ہماری کوئی طاقت نہیں) پڑھتے اور اپنی عبودیت وممنونیت کا اقرار کرتے۔

شہر کے ہنگاموں اور مصروفیات سے چھٹکارا ملا تو تفسیر لکھنے کے کام میں تیزی آگئی۔ مولانا نماز فجر کے بعد رقبے کا چکر لگا کر واپس آتے، ناشتہ کرتے اور گاؤں سے متصل واقع دیہی کونسل کی عمارت میں چلے جاتے۔ وہاں کسی شیشم کے درخت کے نیچے بیٹھ کر تفسیر لکھتے جس پر غور انھوں نے سحری کے وقت کر لیا ہوتا۔ ظہر کے وقت کچھ آرام کرتے۔ پھر آگے کی آیات کا مطالعہ کر کے ان کے نکات پر غور عصر کی سیر کے دوران کرتے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ آیات کا نظم سمجھ میں نہ آتا یا کسی مضمون کو ادا کرنے کا اسلوب ہاتھ نہ آتا تو وہ کئی کئی روز تک فکر وتدبر جاری رکھتے اور لکھنے کی نوبت نہ آتی۔ حلقہ تدبر قرآن کے رفقا معمولاً مہینہ میں ایک بار حاضر ہوتے تو مولانا اس دوران پیش آنے والی مشکلات کا تذکرہ فرماتے۔ اگر کوئی چیز تحقیق طلب ہوتی تو راقم کے حوالے کرتے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ مولانا نے راقم کو اپنا نقطہ نظر لکھ کر پیش کرنے کو کہا اور جب اس نے اپنی سوچ کے مطابق تفسیر لکھ کر دی تو مولانا نے خوش ہو کر فرمایا کہ تم نے بات کو ٹھیک سمجھا اور اس سے مسئلہ حل ہو گیا ہے۔

Marfat.com

گاؤں میں ایک مسجد تھی۔ مولانا رحمہ اللہ اس میں جمعہ کی نماز پڑھاتے۔ خطبہ سننے والے کسانوں کے لیے ان کا پیغام یہ ہوتا کہ ان کے لیے اپنے رب کو یاد رکھنا اور اس پر اعتماد و توکل کرنا بے حد آسان ہے کیوں کہ ایک کسان بیج ڈالنے سے لے کر فصل اٹھانے تک برابر اللہ تعالیٰ ہی سے امید رکھنے والا ہوتا ہے۔ اس لیے اگر کسان اس حقیقت کو فی الواقع دل میں جگہ دے لیں تو وہ اللہ کے ہاں بڑا مرتبہ پا سکتے ہیں۔ مولانا گاؤں میں ابھرنے والے جھگڑوں کو نمٹانے میں بھی دلچسپی لیتے اور غریب لوگوں کی پشت پناہی کرتے۔

گاؤں میں مولانا کے تلامذہ کے علاوہ ان کے احباب اور بعض اہل علم بھی کبھی کبھار ملنے کے لیے پہنچ جاتے۔ راقم کا جانا ہوتا تو مولانا تمام ایسے مہمانوں کا تذکرہ فرماتے۔ وہ اکرامِ ضیف کی ہدایت پر عمل کرتے تھے۔ جب مہمان آتا تو بے حد خوش ہوتے اور تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔ گاؤں میں انھیں واحد پریشانی علاج معالجہ کی سہولتوں کے فقدان کی تھی۔ بیگم صاحبہ شوگر کی مریض تھیں۔ ان کی حالت دگرگوں ہو جاتی تو مولانا کو کسی پہلو چین نہ آتا۔ بالآخر یہی چیز انھیں واپس لاہور لانے کا باعث بنی۔ 1979ء میں وہ پھر سے لاہور منتقل ہو گئے اور اگست 1980ء میں تفسیر تدبر قرآن مکمل ہوئی۔

تفسیر تدبر قرآن کی تکمیل:

تفسیر تدبر قرآن مولانا اصلاحی کی زندگی کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کا اعزاز کسی کو کم ہی حاصل ہوتا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے بڑی مشقت اٹھائی اور بڑی قربانیاں دیں۔ فرماتے تھے کہ میں نے قرآن کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے بڑی محنت کی ہے۔ میری مادری زبان پوربی تھی لیکن دس سال کی عمر سے میں نے اردو اختیار کی۔ دلی کے محاوروں کے لیے غالب، میر، نذیر احمد، حتیٰ کہ شرر کو بھی پڑھا۔ شاعروں کے دیوان پڑھ پڑھ کر عربی زبان کے اسالیب کو اردو میں ڈھالا اور ان کو تدبر قرآن میں جگہ دی۔ کلام عرب کو سیکھنے کے لیے بے حد محنت کی ضرورت ہے۔ عام طور پر لوگ عرب جاہلیت کے مزاج سے ناواقف ہیں، اس لیے وہ آیات کا منشا اور زور سمجھ نہیں پاتے۔ اور تو اور مولانا شبلی تک بھی قریش کے پینتروں سے واقف نہیں ہو سکے اور سیرت میں کئی جگہ غلطی کر گئے ہیں۔

لوگ کئی بار مولانا سے ان کی تفسیر کے انداز مشکل ہونے کی شکایت کرتے تو مولانا یہ جواب دیتے کہ بڑی ضرورت قرآن فہمی میں لوگوں کا انداز فکر بدلنے کی ہے۔ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ میں قرآن مجید کی آیات کا مفہوم زبان، اسالیب زبان اور نظام زبان کی روشنی میں اس قدر مدلل طور پر واضح کر دوں کہ قرآن کا بڑے سے بڑا منکر بھی کہہ اٹھے کہ بات وہی ہے جو قرآن کہتا ہے۔ یہ مقصد افادۂ عام کے لیے لکھی ہوئی تفسیر سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ مولانا اصلاحی کے نام اپنے مکاتیب میں تفسیر کی برابر تحسین فرماتے رہے۔ وہ لکھتے کہ میں اپنے درس قرآن کے لیے اسی میں سے تیاری کرتا ہوں۔ اس کی مدد سے میرا درس بے حد مفید ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

میں برابر دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ہاتھوں اس کی تکمیل کرا دے۔ 30۔ رمضان المبارک 1400ھ کو انھوں نے مولانا کے نام ایک خط لکھا اور بتایا کہ اس کے لکھنے کا محرک ایک خواب ہوا ہے جو آپ کے لیے اور آپ کی اہلیہ مکرمہ کے لیے خوش کن ہوگا۔

''رات تین بجے سے کچھ پہلے دیکھا کہ میں آپ کے مکان پر پہنچا ہوں۔ یہ مکان کسی شہر میں نہیں ہے بلکہ کسی اچھے ترقی یافتہ قسم کے دیہات میں ہے۔ مکان بہت بڑا ہے جیسے پرانے زمانہ میں دیہات میں زمینداروں کے مکانات ہوتے تھے۔ بالکل پرانے طرز کا ہے۔ میرے پہنچنے سے آپ کو بے حد خوشی ہوئی ہے۔ میں مکان میں داخل ہوا تو دیکھا ایک بہت بڑا دیگچہ...... یہ کہنا چاہیے کہ چھوٹی قسم کی دیگ...... چولہے پر ہے۔ اس میں زردہ تیار ہو رہا ہے۔ دیگ کھلی ہوئی ہے۔ میں نے دیکھا کہ زردہ بہت اعلیٰ قسم کا ہے اور تیاری کے قریب ہے۔ آپ نے میری وجہ سے بہت سے لوگوں کو مدعو کر رکھا ہے۔ ایک بڑے کمرے میں دری کا فرش ہے۔ آپ مجھے وہاں لے گئے۔ اور حضرات بھی آ گئے۔ آپ نے مجھے بتایا کہ میری اہلیہ کو آپ کی آمد کی مجھ سے زیادہ خوشی ہے۔ خواب کے بس یہی اجزا محفوظ رہ گئے ہیں۔ تعبیر یہی ذہن میں آئی کہ تدبر قرآن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے تیاری کے قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پوری امید ہے کہ آپ کے ہاتھ سے اس کا اتمام ہوگا اور ان شاء اللہ قبول ہوگی۔ غذاؤں میں زردہ مجھے خاص طور سے مرغوب ہے۔''

مولانا نعمانی رحمہ اللہ کا یہ مکتوب فی الواقع تدبر قرآن ہی کے متعلق تھا کیوں کہ مولانا نے اس کی تکمیل 29۔ رمضان المبارک 1400ھ کے روز کی تھی۔ اس کی تکمیل پر وہ اپنے احساسات ان الفاظ میں قلمبند کرتے ہیں:

''29۔ رمضان 1400ھ کو اس کتاب کی آخری سطریں حوالۂ قرطاس کرتے ہوئے میں نے صرف یہی نہیں محسوس کیا کہ یہ کتاب میں نے پوری کر دی بلکہ یہ بھی محسوس کیا کہ اپنی زندگی کا آخری ورق بھی الٹ دیا۔ ایک بھاری بوجھ جو تیئس سال اٹھائے لیے پھرا، اس سے سبکدوش ہونے پر ایک گہری مسرت کا احساس تو ایک فطری چیز ہے لیکن ساتھ ہی یہ احساس بھی ہے کہ اب کیا کام کرنے کی صلاحیت باقی رہ گئی ہے جس کے لیے جینے میں لذت ہو۔ میں نے آخری سطریں لکھ کر اپنا سر اپنے رب کے آگے ڈال دیا اور صرف یہ دعا کی کہ اے رب، اگر تو نے اپنی کتاب عزیز کی خدمت کی یہ توفیق بخشی تو اس کو قبول بھی فرما اور اس کو اپنے غلام کی نجات کا ذریعہ بنا۔ بس اس کے سوا میں کسی چیز کا متمنی نہیں۔''

مولانا نے تفسیر کی تکمیل کی خبر مولانا نعمانی کو دی تو انھوں نے اصرار کیا کہ اس موقع پر ایک جشن کا اہتمام ہونا چاہیے۔ مولانا نے لکھا کہ میں تو اس طرح کی چیزوں کو اہمیت نہیں دیتا۔ البتہ اگر آپ صدارت کے لیے تیار ہوں تو میں اس میں شریک ہوں گا اور اس کا اہتمام بھی کروں گا لیکن مولانا نعمانی کی یہ تجویز عمل میں نہیں آ سکی۔

Marfat.com

ادارہ تدبر قرآن وحدیث:

تفسیر کی تحریر کا کام جوں جوں اختتام کے قریب آرہا تھا، مولانا کو یہ خیال رہتا کہ تکمیل کے بعد اگر عمر اور صحت نے اجازت دی تو وہ اس طرح کی ایک کتاب حدیث پر بھی لکھیں گے۔ وہ اس بارے میں اپنے رفقا اور شاگردوں سے برابر مشورہ کرتے رہتے۔ ان سب کی غالب رائے یہی تھی کہ مولانا کو باقی عمر حدیث کی خدمت کے لیے وقف کرنی چاہیے۔ اسی دوران جناب جاوید احمد غامدی نے تجویز پیش کی کہ ایک ادارہ اس مقصد کے لیے قائم کر لیا جائے۔ چنانچہ مولانا نے فیصلہ کیا کہ حلقہ تدبر قرآن کو، جو ایک طویل عرصہ سے ان کی زیر سرپرستی اور راقم کی نگرانی میں کام کر رہا تھا، وسعت دے کر ایک ادارہ کی شکل دے دی جائے اور آئندہ کام اس کے تحت سرانجام دیا جائے۔ یہ ادارہ ''ادارہ تدبر قرآن وحدیث'' کے نام سے ایک دستور کے تحت یکم محرم 1401ھ کو جناب محمد نعمان علی کی قیام گاہ پر قائم ہوا۔ مولانا اس کے صدر اور راقم ناظم مقرر ہوا۔ ادارہ کے تحت مولانا نے ہفتہ وار درس قرآن کا وہی سلسلہ جاری رکھا جس کا آغاز گاؤں سے ان کی واپسی پر ہو چکا تھا۔ اسی طرح ہفتہ وار نشست میں حدیث کے اصولوں پر انھوں نے لیکچر دیے جو اس وقت ''مبادی تدبر حدیث'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ کتب حدیث میں پہلے موطا امام مالک اور اس کے بعد صحیح بخاری کا درس ہوا۔ اوّل الذکر کتاب مکمل طور پر پڑھی گئی جبکہ صحیح بخاری کا درس 1993ء میں معطل ہو گیا۔ ادارہ کی تحقیقات اور مولانا کے دروس کی اشاعت کے لیے رسالہ تدبر کا اجرا عمل میں آیا جو ایک سلسلہ منشورات کے طور پر شائع ہو رہا ہے۔ مولانا نے فلسفہ کے بنیادی مسائل پر قرآن مجید کا نقطہ نظر بھی واضح کیا۔ ان کی اسی دور کی تحقیقات پر مبنی کتابیں ''تزکیۂ نفس'' اور ''فلسفہ کے بنیادی مسائل'' کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ مولانا کی تمام کتب فاران فاؤنڈیشن، لاہور شائع کرتا ہے جس کے مالک مولانا کے ایک شاگرد جناب ماجد خاور ہیں۔[1] انھوں نے مولانا کو اشاعت کتب کی پریشانیوں سے آزاد کیے رکھا۔

1993ء میں پیری کی نقاہت کے باعث مولانا نے دروس کا سلسلہ منقطع کیا۔ اس وقت ان کی عمر نوے برس تھی۔ عام طور پر لوگ اس سے کہیں پہلے ناکارہ محض ہوتے ہیں لیکن مولانا چاق چوبند اپنے اسی محاذ پر کام کرتے رہے جس کا ذمہ انھوں نے پون صدی قبل اٹھایا تھا۔ درس کا سلسلہ منقطع ہونے کے بعد بھی وہ علمی مسائل میں رہنمائی دیتے رہے حتیٰ کہ بیماریوں نے ان کو آ گھیرا، یہاں تک کہ اللہ کا یہ بندہ اپنے رب سے جا ملا۔

قرآن پر تدبر کا طریقہ:

1925ء میں مولانا فراہی کی شاگردی میں آنے کے بعد سے آخر عمر تک مولانا کا معمول یہ رہا کہ وہ صبح تین بجے بیدار ہو جاتے۔ نماز تہجد ادا کر کے قرآن مجید کا مطالعہ کرتے۔ ایک سورہ ان کے زیر غور ہوتی جس کے ایک ایک لفظ اور آیت پر وہ ڈیرے ڈالتے۔ اس سورہ سے پہلی اور پچھلی سورہ بھی زیر مطالعہ رکھتے۔ اس کے علاوہ پورے قرآن کی تلاوت الگ سے جاری رہتی۔ وہ متصل سورتوں کے مضامین کی مماثلتوں پر غور کرتے اور پورے قرآن میں سے

---

[1] دسمبر 2003ء میں جناب ماجد خاور کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے حسن خاور اس ادارہ کو چلا رہے ہیں۔

Marfat.com

ان کے حق میں نظائر تلاش کرتے۔ اسی طرز تدبر سے وہ اس حقیقت تک پہنچے کہ قرآن میں دو دو سورتیں مل کر ایک مضمون کی تکمیل کرتی ہیں۔ ان میں تعلق اجمال اور تفصیل کا بھی ہوسکتا ہے، دو مختلف انداز استدلال بھی ہوسکتے ہیں۔ دونوں میں سے ایک، دوسری کے برعکس مضمون کی حامل ہوسکتی ہے، نیز ایک کی حیثیت دوسری کے تتمہ اور تکملہ کی بھی ہوسکتی ہے۔ علی ھذا القیاس مولانا اس نتیجہ پر بھی پہنچے کہ قرآن مجید کی سورتوں کے سات گروپ بن گئے ہیں جن میں سے ہر گروپ ایک خاص مضمون کا حامل ہے جو اس گروپ کا عمود ہے۔ تمام سورتیں اسی عمود کے ساتھ متعلق اور اس کے کسی نہ کسی پہلو کو واضح کرتی ہیں۔ ہر سورہ اندرونی طور پر بھی مربوط مضامین کی حامل ہوتی ہے۔

مولانا کے یہ نتائج فکر ایسے ہیں جنھوں نے مستشرقین کی دو صدیوں کی ان کاوشوں کو خاک میں ملا دیا ہے جو وہ قرآن کو ایک بے ربط کتاب قرار دینے اور اس کو نئی ترتیب دینے کے لیے کرتے اور دنیا کو یہ باور کراتے رہے کہ مسلمانوں نے اپنے پیغمبر کے اقوال کو صحیح طور پر ایڈیٹ نہیں کیا۔ مولانا کی تفسیر نے ثابت کیا کہ قرآن کی ہر آیت بالکل درست طور پر اپنے مقام پر رکھی گئی ہے۔ ہر سورہ کو جو مقام ملا ہے وہی اس کے لیے موزوں ترین مقام ہے۔ پورے قرآن کے مضامین میں ترتیب قائم ہے۔ اس کو کہیں سے بھی توڑ دیا جائے تو کتاب کا حسن باقی نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ اب مغرب میں اس تفسیر کی خصوصیات زیر بحث آ رہی ہیں اور مستشرقین نظم قرآن کے تصور اور حقیقت کو دوبارہ زیر غور لا رہے ہیں۔

مولانا رحمہ اللہ اپنے استاد امام فراہی رحمہ اللہ کا قول سنایا کرتے تھے کہ قرآن کو ہمیشہ اپنی ہدایت کے لیے پڑھو۔ فرماتے تھے کہ استاد کے اس قول پر عمل کرنے کے نتیجے میں ایک مرحلہ ایسا آجاتا ہے جب آدمی کا علم ابلا پڑتا ہے اور وہ بے چین ہوجاتا ہے کہ اپنے علم سے آس پاس والوں کو بھی روشناس کرائے۔ جب وہ ایسا کرنے لگتا ہے تو وہ اسی طرح مبارک ہوجاتا ہے جیسے آسمان سے برسنے والا پانی زمین کی روئیدگی کے لیے مبارک ہوتا ہے۔ مولانا نے خود یہی مبارک زندگی گزاری جوان کی جوانی اور بڑھاپے دونوں پر محیط ہے۔

لمبے وقفوں کے بعد دیے جانے والے درسوں کی افادیت کے مولانا زیادہ قائل نہ تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان میں بیشتر شرکائے درس محض برکت کے حصول کی نیت سے آتے ہیں، قرآن فہمی ان کا مقصد نہیں ہوتا۔ فرماتے کہ ہمارے پیش نظر یہ بات ہے کہ قرآن کا صحیح فہم دیا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ درس باقاعدہ ہوں اور کم وقفوں کے ساتھ دیے جائیں۔ ایسے دروس میں شرکاء کی تعداد بے معنی ہوتی ہے۔ ہمیں ایک بھیڑ اکٹھی کرنے کے بجائے ان چند افراد کو تلاش کرنا چاہیے جو دل لگا کر کتاب الٰہی کو سمجھنا چاہتے ہوں۔

اپنے شاگردوں کے لیے مولانا کی نصیحت یہ ہوتی کہ ناقدروں کو کچھ نہیں ملا کرتا۔ قرآن کی قدر کرو گے تو بہت کچھ ملے گا۔ جاننے سے پہلے بانٹنے کی کوشش کبھی نہ کیجیے۔ ہزاروں خام باتیں بتانے سے اچھا یہ ہے کہ ایک ہی بات لیکن صحیح بات بتائی جائے۔ مولانا کی تلقین یہ بھی ہوتی کہ میں نے قرآن کا علم مفت پایا اور اسے مفت بانٹا ہے۔ تم بھی اسے مفت پھیلانا۔ اگر اس کا حق ادا نہیں کرو گے تو یہ علم میرے پاس واپس آجائے گا۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ چوری کے

Marfat.com

مال سے دکان نہیں سجا کرتی۔ کچھ ادھر سے کچھ ادھر سے سرقہ کر کے علم حاصل نہیں ہوتا۔

ایک مرتبہ بیان کیا کہ مولانا فراہی کے پاس ملاقاتی آتے تو عجیب وغریب سوالات کرتے۔ بعض لوگ ان کو مشورے دینے لگتے۔ مولانا ہر شخص کی بات بڑی خاموشی اور متانت سے سنتے اور کسی کسی وقت سبحان اللہ یا الحمدللہ کہہ دیتے لیکن بحث بالکل نہ کرتے۔ میں نوجوان تھا۔ مجھے لوگوں کی یہ حرکت بے حد کھلتی۔ لوگوں کے چلے جانے کے بعد میں کہتا کہ ان صاحب کی فلاں بات تو قابل بحث تھی۔ آپ نے خاموشی سے اس کو سن لیا۔ مولانا اس کا جواب یہ دیتے کہ ہر بات میں الجھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ مولانا اصلاحی فرماتے کہ استاد کی یہ بات اس وقت میری سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن تفسیر تدبر قرآن لکھتے وقت اس نے مجھے بہت فائدہ دیا ہے۔

حکومتی مناصب کے بارے میں رویہ:

1956ء میں پاکستان کے آئین کے تقاضا کے تحت ایک اسلامک لاء کمیشن قائم کیا گیا تو حکومت نے مولانا اصلاحی کو بھی اس کا رکن بنایا۔ یہ کمیشن تقریباً دوسال کام کرسکا اور جنرل محمد ایوب خان کے مارشل لاء نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ اس کمیشن کی ترکیب اور مقاصد وطریقہ کار سے مولانا اس نتیجے تک پہنچے کہ حکومت اسلامی قانون یا نظام کے نفاذ میں مخلص نہیں۔ اس طرح کے ادارے قائم کرتے وقت یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ کوئی کام ڈھنگ سے نہ ہوسکے اور مختلف سوچ رکھنے والے ارکان آپس میں چونچیں لڑاتے رہیں۔ یہ محض دفع الوقتی اور لوگوں کو خاموش کرانے کے لیے ہوتا ہے، چنانچہ اس کے بعد مولانا نے ہر ایسی پیش کش کو ٹھکرا دیا۔

جنرل محمد ایوب خان کے دور حکومت میں مخالف پارٹیوں نے مل کر مس فاطمہ جناح کو صدارت کے لیے نامزد کیا۔ جماعت اسلامی نے اس نامزدگی کی تائید کی اور اس کے حق میں لٹریچر تیار کیا۔ مولانا نے اس نامزدگی کی پرزور مخالفت کی اور جماعت کے موقف کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ یہ مضامین رسالہ میثاق میں چھپے۔ چوں کہ یہ ایوب خان کے حق میں جاتے تھے اس لیے حکومت نے ان کو اپنے اہتمام میں چھپوا کر ملک کے گوشے گوشے میں پہنچایا۔ ایوب خان صدر منتخب ہوگئے۔ لاہور آئے تو مولانا سے گورنر ہاؤس میں ملاقات کی۔ ان کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی تحریروں سے ان کو بے حد فائدہ ہوا۔ اس کے بعد صدر نے پیش کش کی کہ مولانا عوام میں آئیں۔ حکومت ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائے گی اور ان کی پسند کے میدان میں ان کو کسی اہم منصب پر فائز کرے گی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب مولانا شدید مالی مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود صدر صاحب کو ان کا جواب یہ تھا کہ مضامین میں نے آپ کی حمایت میں نہیں لکھے بلکہ عورت کی سربراہی کے بارے میں دینی موقف کی وضاحت کے لیے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ میں جو کام اس وقت کر رہا ہوں وہ میری زندگی کا مشن ہے۔ اس میں کسی چیز کو رکاوٹ بننے نہیں دینا چاہتا لہٰذا شکریہ کے ساتھ آپ کی پیش کش قبول کرنے سے معذرت چاہتا ہوں۔

جون 1972ء کا واقعہ ہے۔ مولانا ان دنوں اپنی بیماری سے اٹھے تھے۔ ایک صاحب ملنے آئے اور مولانا سے

Marfat.com

سیاست کے رنگ ڈھنگ کے بارے میں پوچھا۔ مولانا نے جواب دیا کہ میں نے چھ ماہ سے اخبار کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اخبار کی سرخیاں اب دیکھنے لگا ہوں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم ایک بڑے بحران کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ وہ کہنے لگا کہ عوامی حکومت اس بحران کا مقابلہ کر رہی ہے۔ اس کے بعد وہ شخص مولانا کے مصارف اور وسائل کی بابت پوچھنے لگا۔ مولانا نے جواب دیا: ''مہنگائی کا زمانہ ہے، مصارف کافی زیادہ ہوتے ہیں لیکن خدا دیتا ہے۔ اسی پر بھروسہ ہے۔'' کہنے لگا: ''آپ جیسے قابل لوگوں کی سرپرستی تو حکومت بھی کرتی ہے۔'' مولانا نے جواب دیا: ''کرتی ہوگی۔ لیکن میں نے کبھی کسی حکومت کا ساتھ نہیں دیا۔ ہر حکومت پر تنقید کرتا رہا ہوں۔ کسی کو کیا پڑی ہے کہ ایسے شخص کی سرپرستی کرے۔'' اس نے کہا: ''آپ خود اس کے لیے درخواست نہ بھی کریں تو دوسرے لوگ آپ کے لیے تگ ودو کر سکتے ہیں۔'' مولانا نے فرمایا: ''یہ حرکت وہی شخص کر سکتا ہے جو مجھ سے واقف نہ ہو۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر کوئی توہین نہیں ہو سکتی۔ حکومتوں کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ ان کے خوشامدیوں اور وظیفہ خواروں کے ہاتھ آج تک کون سا کارنامہ انجام پایا ہے۔'' اس پر وہ آدمی مولانا سے اجازت لے کر چل دیا۔

مولانا رحمہ اللہ جب رحمان آباد میں تھے تو ضلع کے ڈپٹی کمشنر ان کی ملاقات کے لیے گاؤں پہنچے اور بتایا کہ بھٹو صاحب کی حکومت آپ کی دینی خدمات کے صلے میں سول ایوارڈ دینا چاہتی ہے۔ اس بارے میں پہلے آپ کو اعتماد میں لینا ضروری ہے۔ مولانا نے یہ پیش کش شکریے کے ساتھ مسترد کر دی اور فرمایا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ اپنا فرض سمجھ کر کیا ہے۔ ایوارڈ حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا۔ میں اس کا اجر اپنے رب سے چاہتا ہوں۔

اگست 1977ء میں مولانا ظفر احمد انصاری مرحوم جنرل محمد ضیاء الحق کی طرف سے مولانا کو اسلامی مشاورتی کونسل کی رکنیت پر آمادہ کرنے آئے۔ مولانا نے فرمایا کہ میں تین اسباب کی بنا پر رکن بننا پسند نہیں کرتا۔ ایک یہ کہ مجھے ثقل سماعت کا عارضہ ہے۔ میں جب کسی کی سن نہیں سکتا تو مجھے سنانے کا حق بھی نہیں۔ دوسری یہ کہ میں ہمہ تن تفسیر لکھنے میں مصروف ہوں۔ کسی دوسری چیز کی طرف توجہ دوں گا تو تفسیر لکھنے کا کام متاثر ہوگا جو مجھے قطعاً گوارا نہیں۔ تیسرا یہ کہ جنرل صاحب تین ماہ کے لیے حکومت سنبھال رہے ہیں تو اس طرح کے طول طویل کاموں میں کیوں پڑنا چاہتے ہیں۔ میرے نزدیک ان کا یہ اقدام مناسب نہیں۔

جنرل صاحب نے جب حکومت میں اپنے قدم جما لیے تو مولانا سے ملنے آئے۔ انھوں نے پھر ذاتی طور پر پیش کش کی کہ وہ مولانا کی ضروریات کو پورا کرنے کو سعادت سمجھیں گے لیکن مولانا نے فرمایا کہ میں ایک درویش آدمی ہوں، میری کوئی ضروریات نہیں، اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر سہولت فراہم کر رکھی ہے اور میں نہایت اطمینان سے زندگی بسر کر رہا ہوں۔

کردار کے بعض پہلو:

مولانا اصلاحی رحمہ اللہ نے زندگی کا جو مقصد متعین کیا، آخر دم تک اس کو نبھایا۔ حالات سرد و گرم رہے اور ان میں

Marfat.com

بڑے نشیب وفراز آئے لیکن مولانا نے کبھی اپنے مقصد حیات کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ ایسی استقامت کم ہی لوگوں میں دیکھنے میں آتی ہے۔

مولانا نہایت حساس طبیعت کے مالک تھے۔ اخباروں میں قتل وغارت گری کی خبریں پڑھتے تو ان کی نیند اچاٹ ہو جاتی۔ انھیں دکھ ہوتا کہ انسان اس قدر خون خوار کیوں ہو رہا ہے۔ ملک کے دشمنوں کی کارروائیاں علم میں آتیں تو دعائیں کرتے کہ اے میرے رب، تیرا یہ عاجز بندہ بھی اس کشتی میں سوار ہے، تو اس کشتی کو طوفانوں میں محفوظ رکھ۔

مولانا کے بڑے بیٹے ابو صالح ایڈیٹر مشرق ملک کے ایک نامور صحافی تھے۔ وہ پی آئی اے کی قاہرہ کی اس پرواز میں لقمہ اجل بنے جس کو مصر میں حادثہ پیش آ گیا تھا۔ [1] مولانا حادثہ کی خبر سنتے ہی سربسجود ہو گئے اور اپنے رب سے صبر واستقامت کی دعا کی۔ لوگ تعزیت کے لیے جمع ہونے لگے تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ مولانا پر غم کا یہ پہاڑ جب ناقابل برداشت ہونے لگتا تو مجلس سے اٹھ جاتے اور نماز پڑھنے لگتے۔ اس طرح انھوں نے مصائب وآلام کے مواقع پر استعینوا بالصبر والصلوۃ (صبر اور نماز کے ذریعے مدد چاہو) کی قرانی ہدایت پر عمل کر کے اس ناگہانی مصیبت کا مقابلہ کیا۔ یہی نہیں بلکہ راقم کا تجربہ یہ ہے کہ وہ ہر معاملے کی کنہ وحقیقت معلوم کرنے کے لیے فی الفور قرآن کی طرف متوجہ ہو جاتے اور دیکھتے کہ اس صورت حال میں اس کی تعلیم کیا ہے۔ جب وہ اس کا تعین کر لیتے تو پھر اس پر استقامت دکھاتے، خواہ اس کے لیے انھیں بڑی سے بڑی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑتی۔

رجم کی سزا کے اطلاق کے بارے میں ان کی رائے کے باعث ملک وبیرون ملک میں ان کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ انھوں نے مخالفین کے تمام دلائل پر غور کرنے کے بعد اپنے موقف کو قرآن کے نصوص کی روشنی میں درست سمجھا اور پھر کسی دوستی، لالچ یا دھمکی کو خاطر میں نہیں لائے۔ اس موقع پر ایک گروہ کی طرف سے انھیں دھمکیاں ملیں کہ وہ اپنی رائے واپس لیں ورنہ انھیں نقصان اٹھانا پڑے گا۔ پھر ان سے یہ کہا گیا کہ ہم آپ کو عدالتوں میں گھسیٹیں گے۔ مولانا کا جواب یہ تھا کہ ضرور ایسا کیجیے تاکہ مجھے کچھ اور باتیں کہنے کا موقع ملے جو میں ابھی تک زبان پر نہیں لایا۔ ان کے ایک عزیز دوست نے مولانا کی اپنی رائے پر اصرار کو خلاف مصلحت قرار دیا تو انھوں نے جن الفاظ میں جواب دیا، وہ ان کی زندگی کے نہج کو سمجھنے میں مدد دے گا:

> ''میرے اور آپ کے درمیان ایک اصولی اختلاف ایسا ہے کہ میں آپ کو اپنی کسی رائے کا قائل نہیں کر سکتا۔ وہ یہ کہ میں کوئی رائے اختیار کرنے میں اصل اہمیت دلیل کو دیتا ہوں، اشخاص کی اہمیت میرے نزدیک ثانوی ہے۔ اس کے برعکس آپ کا اصل اعتماد اشخاص پر ہوتا ہے، دلیل کو آپ دوسرے درجہ میں رکھتے ہیں۔ میں اس معاملہ میں آپ کو ملامت نہیں کرتا۔ اول تو اس میں مزاج کو دخل ہے۔ ثانیاً میری ذمے داریاں آپ کی ذمے داریوں سے مختلف ہیں۔ مجھ پر تحقیق سے اگر کوئی حق واضح ہو جائے تو واجب ہے کہ اس کو عندالضرورت برملا

---

[1] یہ حادثہ مئی 1965ء میں پی آئی اے کی پہلی پرواز قاہرہ کو پیش آیا تھا۔

Marfat.com

کہوں، اگر چہ میرا سر قلم کر دیا جائے لیکن آپ پر یہ ذمہ داری نہیں ہے۔''

بعض لوگ مولانا کو زود رنج اور غصیلی طبیعت کا سمجھتے ہیں لیکن عملاً وہ ایسے نہیں تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ بڑی دیر تک ہر معاملے پر غور کرتے اور اس کی حیثیت کے تعین کے لیے موافق ومخالف دلائل کو دیکھتے۔ اس کے بعد جب وہ اس میں حق کا پہلو متعین کر لیتے تو مخالفین کے ساتھ رعایت برتنے کے قائل نہ تھے۔ ذاتی زندگی میں وہ بے حد شفیق وہمدرد، ملنسار اور مروت ظاہر کرنے والے تھے۔ حق کے لیے غیرت کو وہ ایمان کا جزو قرار دیتے تھے۔ ہیجڑا پن سے انھیں نفرت تھی۔

مولانا رحمہ اللہ کی رحلت ان کے اعزہ وتلامذہ ہی کا نقصان نہیں بلکہ ایک قومی وملی نقصان ہے۔ ایسی شخصیات صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ بقول اقبال ؎

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

(زندگی کعبہ اور بت خانہ میں مدتوں روتی ہے، تب کہیں بزمِ عشق سے کوئی دانائے راز باہر آتا ہے۔)

اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں اور لغزشوں سے درگزر فرمائے، ان کی نیکیوں اور خدمات دینی کو قبول فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں مقام عطا فرمائے۔ آمین۔

مولانا اصلاحی جس فکر کے حامل تھے اب اس کا تعارف ''فکر فراہی'' کے نام سے ہوتا ہے۔ اس کی آبیاری میں انھوں نے جو مشقت اٹھائی ہے اس کے نتائج اب دنیا کے سامنے اور ملت کا سرمایہ ہیں۔ اس کو جانچنے کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ مولانا کی زندگی ہی میں ملک وبیرون ملک کئی یونیورسٹیوں میں تفسیر تدبر قرآن میں اختیار کردہ انداز تفسیر پر تحقیقی کام ہونے لگا تھا۔ ملکی یونیورسٹیوں نے بالعموم مولانا کے تفردات کو موضوع بحث بنایا جبکہ بیرون ملک تصور نظم قرآن کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے جو کچھ لکھا وہ قرآن کو محور بنا کر لکھا۔ انھوں نے اس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک آیت پر ڈیرے لگائے۔ اس کے مدعا کو سمجھا اور اس کو اپنی فکر کی اساس بنایا۔ لہٰذا قرآنی مضامین ہوں یا دلائل یا طرز استدلال، مولانا نے ہر چیز کو اپنی تحریروں میں سمویا۔ وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ میری کسی رائے کو نظر انداز کرنے سے پہلے سو بار سوچنا کیوں کہ میں نے برسوں کے غور کے بعد ہر بات کی اصل قرآن مجید میں ڈھونڈنے کی سعی کی ہے۔ جب صورت حال یہ ہے تو ظاہر ہے کہ یہ کام کرنے کا اہل وہی شخص ہے جس کی نظر پورے قرآن پر ہو اور وہ اس میں غور کرنے کا عادی ہو۔

مولانا رحمہ اللہ کے فکر کو سمجھنا، اس کی خصوصیات کا تعین کرنا، ان کی تفسیر اور دوسری تحریروں پر نقد وتبصرہ کرنا اور پھر اس رنگ میں ان پر اضافے کرنا آسان کام نہیں، نہ یہ کسی ایک شخص کے بس کی بات ہے۔ یہ کام کسی نہ کسی طور پر اب ہوتا رہے گا۔ لوگ معلوم کریں گے کہ اس مرد درویش نے قرآن، حدیث، فقہ، قانون اور فلسفہ میں امت کو کیا کچھ دیا ہے۔

☆......☆......☆

Marfat.com

یادگارِ سفرِ ہند

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر......! برصغیر پاک وہند میں پھیلی ہوئی سینکڑوں دینی درس گاہوں میں سے ایک درس گاہ......! عام حالات میں اگر یہ نام سننے میں آتا تو کسی مسجد میں قائم ایک مدرسہ کا تصور ہوتا۔ لیکن میرے لیے اس نام کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ تھی۔ جب سے مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ سے کسب فیض کا موقع میسر آیا، یہ نام پے در پے کانوں میں پڑتا رہا۔ یہ معلوم ہوا کہ مولانا رحمہ اللہ کے نام کا لاحقہ اس مدرسہ کے ساتھ ان کی نسبت کو ظاہر کرتا ہے جو ان کے وطن مالوف مشرقی یوپی کے ضلع اعظم گڑھ کے قصبہ سرائے میر میں قائم ہے۔ مولانا اسی مدرسہ کے فارغ التحصیل تھے۔ پھر یہیں ان کو مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ سے قرآن پڑھنے اور دوسرے علوم کے بارے میں رہنمائی حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اس کے بعد اسی مدرسہ میں انھوں نے بحیثیت معلم فرائض انجام دیے اور اپنے استاد کی عربی کتابوں کے تراجم اردو میں کر کے ان کے علم کو اردو دان طبقہ میں متعارف کرایا۔ جوں جوں مولانا اصلاحی رحمہ اللہ کی معیت میں مزید وقت گزرا تو یہ تجربہ ہوا کہ مولانا کے دل ودماغ پر اس مدرسہ نے کچھ ایسے نقوش مرتسم کیے ہیں کہ جب مولانا فراہی اور مدرسہ کا ذکر آتا ہے تو مولانا کا معاملہ وہی ہوتا ہے جو معلقہ کے شاعر امرؤ القیس کا تھا جس نے کہا:

قفا نبک من ذکریٰ حبیب ومنزل

مولانا کی گفتگو طولانی ہو جاتی ہے، ان کی یادوں کے دریچے کھل جاتے ہیں، اور وہ مزے لے لے کر ان ایام کا ذکر کرتے ہیں جو مدرسہ میں گزرے۔ یہ بات بھی دیکھنے میں آئی کہ اگر کوئی صاحب ان کے دیار سے پاکستان آتے تو مولانا مدرسہ کی ہیئت، نظم وضبط، تعلیم اور رفتار ترقی کے بابت سوالات کرتے۔ وہ مدرسہ کے طہارت خانوں اور ہوسٹلوں کے گرد شجرکاری تک کے بارے میں پوچھتے۔ مولانا پر آخری مرض کا حملہ ہوا تو وہ بے تاب ہو گئے۔ ان کے ذہن پر کئی روز تک یہ خیال مستولی رہا کہ انھیں سرائے میر جانا ہے، وہاں جانے کے لیے گاڑی کب ملے گی، انھیں کون وہاں پہنچائے گا۔ ایک طویل مدت تک استاذ گرامی سے یہ تذکرے سنتے سنتے میرے دل میں بھی مدرسۃ الاصلاح کی عظمت کا نقش قائم ہو گیا۔ شوق پیدا ہوتا کہ اس چمنستانِ فراہی کی زیارت کی جائے لیکن اس کے لیے عملی اقدام کی کبھی نوبت نہ آئی۔

جنوری 99ء کے وسط میں انجمن طلبائے قدیم مدرسۃ الاصلاح کے صدر محترم، مولانا احتشام الدین اصلاحی کی جانب سے دعوت نامہ موصول ہوا کہ 24 تا 26 فروری کی تاریخوں میں مولانا امین احسن اصلاحی کی حیات وخدمات کا

Marfat.com

جائزہ لینے کے لیے ایک سیمینار منعقد کیا جا رہا ہے۔ اس میں شرکت کی جائے اور مقالہ ارسال کیا جائے۔ مولانا سے شرف تلمذ کے باعث اس دعوت نامہ نے آتش شوق بھڑکانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ میں نے فی الفور پاسپورٹ بنوالیا اور بھارتی ہائی کمیشن کو دو ہفتہ کے ویزا کی درخواست دے دی۔ بعد از خرابی بسیار 19۔فروری کو ویزا منظور ہوا جو براستہ اٹاری ٹرین کے سفر کے لیے تھا۔ٹرین ہفتہ میں صرف دو دن ملتی ہے۔آئندہ ٹرین 22۔فروری کو مل سکتی تھی لہٰذا میں نے اسی ٹرین سے سفر کا فیصلہ کیا اور اس کی اطلاع سرائے میر میں منتظمین کو دے دی۔ٹرین 23۔فروری کی صبح کو دہلی پہنچی۔ ریلوے اسٹیشن پر مدرسۃ الاصلاح کے تین فارغین، جو اس وقت دہلی کی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں، استقبال کے لیے موجود پائے۔ ان میں صدر انجمن طلبائے قدیم کے صاحبزادے عزیزی نازش احتشام بھی تھے، جنھیں میرا ''افسر مہمان داری'' مقرر کیا گیا تھا۔ انھوں نے جس منصوبہ بندی اور ذوق وشوق سے اپنی ذمے داری کو دہلی میں اور اس کے بعد پورے سفر اور عرصہ قیام میں نبھایا وہ لائق تحسین ہے۔ فی الواقع وہ نہایت ہی سعادت مند رفیق سفر ثابت ہوئے۔ انھوں نے دہلی سے آگے کے سفر کے لیے پھوی ایکسپریس میں برتھ محفوظ کروا رکھی تھی۔ یہ گاڑی 24۔فروری کی صبح کو بنارس پہنچی۔

بنارس ریلوے اسٹیشن پر مدرسہ کے نائب صدر مدرس واستاذ ادب عربی مولانا انیس احمد اصلاحی چھ طلبہ کے ہمراہ موجود تھے۔ انھیں ہدایت تھی کہ مہمان کو بلا تاخیر سرائے میر لایا جائے۔ چنانچہ فوراً قافلہ دو گاڑیوں میں اگلے سفر پر روانہ ہو گیا۔ بنارس سے سرائے میر تقریباً ایک سو کلومیٹر دور ہے۔ یہ فاصلہ اڑھائی گھنٹے میں طے ہوا۔ گاڑی مدرسہ کی حدود میں داخل ہوئی تو انجمن طلبائے قدیم کے عہدیداروں، مدرسہ کے سینئر اساتذہ اور بعض مندوبین کو چشم براہ پایا۔ نہایت پرتپاک خیر مقدم ہوا۔ سب لوگوں کے چہروں پر مسرت وبشاشت کے آثار دیدنی تھے۔ انھوں نے مجھ جیسے ہیچمیرز [1] کو غیر معمولی اعزاز واکرام کے لائق سمجھا اور بطور خاص اس آرام کرسی پر بٹھایا جو پون صدی پہلے مولانا فراہی اور ان کے بعد مولانا اصلاحی کے زیر استعمال رہی تھی اور آج کل بزرگوں کی نشانی کے طور پر محفوظ کر لی گئی ہے۔ میرے طویل سفر کی رعایت سے منتظمین سیمینار نے افتتاحی اجلاس کا انعقاد بعد از نماز ظہر تک موخر کر دیا اور مجھ سے اس کی صدارت کی فرمائش کی۔ تقریباً دو گھنٹے کے افتتاحی اجلاس کے بعد مناسب وقفوں سے چھ مزید اجلاس ہوئے جن کی صدارت کے فرائض مولانا ضیاء الدین اصلاحی (ناظم دار المصنفین اعظم گڑھ)، مولانا نظام الدین اصلاحی، مولانا احتشام الدین اصلاحی، ڈاکٹر یاسین مظہر صدیقی (علی گڑھ یونیورسٹی)، ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی (جامعہ ہمدرد دہلی) اور ڈاکٹر محمد عنایت اللہ سبحانی (جامعۃ الفلاح بلریا گنج) نے انجام دیے۔ اول تا آخر سٹیج سیکرٹری کے فرائض پروفیسر ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی (مدیر مجلہ علوم القرآن علی گڑھ) نے انجام دیے اور مقالات کی ترتیب اور دفتری کاموں میں ان کی معاونت ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے کی۔ مقالات کی تعداد 34 تھی جن میں سے 28 مقالات سیمینار میں پڑھے جا سکے۔ ڈاکٹر ظلی صاحب نے خود اپنے مقالہ کے لیے بھی وقت پیدا کرنا ضروری نہ سمجھا۔

[1] ہیچ میرز: بے قیمت، ناچیز۔

Marfat.com

افتتاحی اجلاس میں تلاوت قرآن کے بعد طلبہ کے ایک گروپ نے مدرسۃ الاصلاح کا ترانہ گایا جس کے کچھ بول یوں تھے:

یہ ہمارا چمن ہے ہمارا چمن

رحمتِ ایزدی اس پہ سایہ فگن نورِ شمعِ یقیں زینتِ انجمن

بُوئے ایماں ہے پھیلی چمن در چمن جوئے عرفاں ہے آغوش میں موجزن

یہ ہمارا چمن ہے ہمارا چمن

گود میں اس کی پلتے ہیں علم و ہنر ہر طرف ضوفشاں اس کے شمس و قمر

اس کی مٹی سے اگتے ہیں لعل و گہر اس کے ذرے ہیں صد رشک دُرِّ عدن

یہ ہمارا چمن ہے ہمارا چمن

کارفرما یہاں روحِ دینِ متیں مرکزِ فکر اس کا کتابِ مبیں

اس کا دستور تقلیدِ جامد نہیں اس میں فکرِ فراہی کا ہر سو چلن

یہ ہمارا چمن ہے ہمارا چمن

فی الحقیقت اس ترانہ میں پیش کردہ تصویر مدرسہ کے بام ودر سے ہویدا تھی۔ بعد میں اساتذہ اور طلباء کے ساتھ ملاقاتوں میں بھی یہ بات سامنے آئی کہ اساتذہ وطلبہ دونوں مدرسہ کے مقاصد کا گہرا ادراک رکھتے اور ان کے حصول کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ مدرسہ کی فضا میں مولانا فراہی رحمہ اللہ، مولانا اختر احسن اور دوسرے بزرگوں کے انفاس طیبہ کی مہک محسوس ہوتی ہے۔

ترانہ کے بعد ناظم مدرسہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا جس میں مدرسہ کی تاریخ پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ دونو جوانوں نے مولانا اصلاحی کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ مولانا کے دو معمر شاگردوں...... مولانا عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی اور مولانا قمر الدین اصلاحی...... نے اپنے دور طالب علمی کی یادداشتیں سنائیں اور اپنے استاد گرامی کی یاد تازہ کی۔ میں نے اپنے مختصر خطاب میں منتظمین مدرسہ وسیمینار کی طرف سے غیر معمولی اظہار محبت اور اعزاز وتکریم کے معاملہ پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ مدرسہ کے علمی ودینی ماحول کی تعریف کی اور استاذ گرامی کے بارے میں بتایا کہ ان کی عزیز ترین کتاب قرآن مجید تھا جس کے فہم اور افہام وتفہیم کو انھوں نے اپنا مقصد زندگی قرار دے رکھا تھا۔ ان کی تمام سوچ اور فکر کا محور یہی کتاب تھی۔ جس عنوان پر لکھنا چاہتے تو اسی کتاب کی طرف رجوع کرتے اور ہمیشہ حق کے متلاشی رہتے۔ اپنے مقصد زندگی کی خاطر انھوں نے بڑی قربانیاں دیں۔ سرد وگرم ہر طرح کے حالات کا انھوں نے پامردی اور استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا۔ شہری سہولتوں کی قربانی دے کر ایک چھوٹے سے گاؤں میں مقیم ہوگئے اور نہایت مشکل حالات میں اپنی تفسیر لکھی، لیکن کبھی انھوں نے حالات کا شکوہ نہ کیا۔ حکومتی اہل کاروں نے ان

Marfat.com

کو جو پیشکشیں کیں وہ اگر ان سے فائدہ اٹھاتے تو ان کی ہر دنیاوی مشکل حل ہوسکتی تھی۔ لیکن انھوں نے اپنے رب ہی سے محنت کا اجر پانے کو ترجیح دی۔ ان کے اس رویے میں ہم سب کے لیے ایک درخشاں مثال ہے۔

سیمینار کے مندوبین میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور جامعہ الفلاح بلریا گنج کے اساتذہ اور فارغین کے علاوہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ نئی دہلی، جامعہ ہمدرد نئی دہلی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی، ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ اور لکھنو یونیورسٹی کے اساتذہ اور فضلاء شامل تھے۔ پاکستان سے صرف دو مندوب پہنچے، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی اور میں۔ دوسرے جن لوگوں کو دعوت نامے بھیجے گئے وہ پاسپورٹ اور ویزا کی بھاگ دوڑ کے لیے وقت کم ہونے یا خرابی صحت کے باعث سیمینار میں شرکت سے محروم رہے۔ سیمینار کے چھ اجلاس مقالات کے لیے مخصوص تھے۔ ان سب میں پانچ چھ سو کی حاضری برقرار رہی۔ ہر مقالہ کے بعد مندوبین کو سوالات کرنے کا موقع دیا جاتا اور مقالہ نگاران کا جواب دیتے۔ مقالات میں ایک تہائی مولانا اصلاحی کے اصول تفسیر اور ان کی تفسیر تدبر قرآن کے بارے میں تھے۔ باقی دو تہائی ان کی حیات، خدمات علمی و دینی، حدیث اور فقہ میں ان کے انداز فکر و تحقیق اور تصانیف کے موضوعات پر تھے۔ چیدہ مقالہ نگاروں میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی، مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی، مولانا نظام الدین اصلاحی، مولانا نسیم ظہیر اصلاحی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، پروفیسر محمد اسلم اصلاحی، ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی، ڈاکٹر ولی حسین جعفری اور ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی شامل تھے۔ میرا اپنا مقالہ 'مولانا امین احسن اصلاحی کی خدمت حدیث' کے موضوع پر تھا۔ 25۔فروری کی شب سرائے میر اور اس کے اطراف کے دیہات کے مسلمانوں کے لیے ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا جس میں بڑی تعداد میں عوام شریک ہوئے اور علماء کے خطابات کو بڑی عقیدت سے سنا۔

مولانا اصلاحی رحمہ اللہ ایک مردِ حرّ تھے۔ انھیں غور وفکر کے بعد جب اپنی کسی رائے پر ابرام [1] ہو جاتا تو پھر وہ کسی مصلحت کو خاطر میں نہ لاتے اور اپنی رائے کا برملا اظہار کر دیتے۔ وہ اس کے حق میں اتنے دلائل رکھتے کہ اگر ان کی رائے کی مخالفت ہوتی تو وہ خم ٹھونک کر میدان میں آجاتے اور دلائل کا انبار لگا دیتے۔ اپنی اس حریت فکر کی ان کو قیمت بھی ادا کرنی پڑی۔ جہاں انھوں نے اپنے قدردان اور دوست پیدا کیے وہیں اپنے مخالف بھی بنا لیے۔ سیمینار میں پیش کردہ مقالات سے بھی اندازہ ہوا کہ مدرسۃ الاصلاح کے اسٹیج پر مولانا کے حلیف اور حریف دونوں موجود ہیں۔ فی الجملہ مولانا کی خدمات کو سراہا گیا اور ان کے تفسیری کارنامے کی تحسین میں بخل سے کام نہ لیا گیا، لیکن چند مقالات سے اندازہ ہوا کہ ان کے لکھنے والوں کو مولانا کی رفعت شان ایک آنکھ نہیں بھاتی اور وہ ان کے قامت کو گھٹانے کی شعوری کوشش کر رہے ہیں۔ ایک فاضل دانشور نے تو یہ تحقیق پیش کر کے دن کو رات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مولانا اپنے مادر علمی کا مذاق اڑانے والے تھے، انھوں نے مولانا فراہی سے بغاوت اور ان کے فکر سے بے پروائی برتی۔ اس صورت حال پر مولانا احتشام الدین اصلاحی نے بڑا حکیمانہ تبصرہ کیا۔ انھوں نے اس مصور کا قصہ سنایا جس

[1] ابرام: مضبوط ہونا، اٹل ہونا۔

Marfat.com

نے اپنی بنائی ہوئی ایک عمدہ تصویر ایک چوراہے میں اس تحریر کے ساتھ رکھ دی کہ اگر کسی شخص کو اس میں کہیں خامی نظر آئے تو وہ اس کی نشاندہی کے لیے خامی کی جگہ پر ایک نقطہ ڈال دے۔ مصور کو اپنے فن پر بڑا ناز تھا۔ شام کو خوشی خوشی تصویر اٹھانے گیا تو دیکھا کہ تصویر نقطوں کی کثرت کے باعث سیاہ ہو چکی ہے۔ وہ نہایت افسردہ ہو کر گھر لوٹا تو والد نے افسردگی کی وجہ دریافت کی۔ جب مصور نے تمام صورت حال بتائی تو والد نے اسے مشورہ دیا کہ تصویر دوبارہ بناؤ اور یہ عبارت تحریر کرو کہ اگر کسی شخص کو اس میں کہیں خامی نظر آئے تو براہ کرم اس کو درست کر دے۔ مصور نے ایسا ہی کیا اور شام کو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تصویر پر اصلاح کا کوئی نشان تک نہ تھا۔ مولانا احتشام الدین نے فرمایا کہ مولانا اصلاحی کا کام غلطیوں سے مبرا نہیں ہو سکتا لیکن لوگوں کو چاہیے کہ وہ کچھ انصاف سے کام لیں اور مولانا کی تصویر کو بالکل سیاہ نہ کر دیں۔ ایک مقالہ نگار جناب عبید اللہ فہد فلاحی نے سورہ یوسف کے قصہ میں کرداروں، مقالات اور Situations کی تبدیلی کا ادبیانہ جائزہ لیا۔ اس نوع کا ایک مضمون کئی سال قبل ڈاکٹر مستنصر میر کے قلم سے معروف مجلّہ ''دی مسلم ورلڈ'' میں چھپ چکا ہے۔ البتہ فاضل مقالہ نگار نے اپنا مضمون مولانا اصلاحی، مولانا مودودی اور مولانا آزاد کی تفاسیر کے تقابل کے ساتھ پیش کیا۔

26۔ فروری کی سہ پہر کو آخری اجلاس تھا۔ اس میں چند مقالات پڑھے گئے اور اس کے بعد مولانا ضیاء الدین اصلاحی کو اور مجھے سیمینار کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرنے کی دعوت دی گئی۔ مولانا نے فرمایا کہ مولانا اصلاحی قرآنیات کے میدان میں بیش قیمت خدمات انجام دے کر رخصت ہوئے اور دوسروں کو فکر و تحقیق کی راہ دکھا دی۔ اب یہ ان کے معتقدین اور مدرسۃ الاصلاح کے فضلاء کا کام ہے کہ وہ اس سلسلہ کو آگے بڑھائیں اور قرآنی علوم کے نئے پہلوؤں پر تحقیق کا کام کریں۔ میں نے اپنے تاثرات میں سیمینار کے منتظمین کی طرف سے اپنی قدر افزائی کا شکریہ ادا کیا اور واضح کیا کہ میں اپنے کو ہرگز اس کا اہل نہیں پاتا۔ اگر دوسرے لوگ میرے اندر کوئی خوبی دیکھتے ہیں تو اسے مولانا اصلاحی کا فیض ہی سمجھنا چاہیے:

''کمالِ'' ہمنشیں درمن اثر کرد   وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم [1]

سیمینار کو میں نے ہر لحاظ سے کامیاب قرار دیا۔ اس میں اتنی بڑی تعداد میں علماء و فضلاء کی شرکت، مقالات کا علمی معیار اور تنوع، ان پر مندوبین کی تنقید و تبصرہ اور تمام اجلاسوں میں بھرپور حاضری اس کی کامیابی کے بین شواہد تھے۔ میں نے کہا کہ اس سیمینار سے مولانا اصلاحی کی ذات اور ان کے کمالات کو اجاگر کرنے میں مدد ملی ہے، تاہم مقالات میں مولانا کے فکر کا وسیع تناظر میں مطالعہ سامنے نہیں آیا، حتیٰ کہ تفسیر تدبر قرآن کے بارے میں جو مضامین پڑھے گئے ان میں بھی اس کے مجموعی فکر اور قرآن کے نظام کے بارے میں مولانا کی تحقیقات پر رائے زنی نہیں کی

---

[1] یہ سعدی شیرازی کا شعر ہے، اصل شعر کے شروع میں لفظ ''جمال'' آیا ہے۔ مٹی سے پوچھا گیا کہ تجھ میں اتنی خوشبو کہاں سے آ گئی تو اس نے جواب دیا کہ میرے ہم نشین (گلاب) کی خوبصورتی نے مجھ پر اثر کیا ہے (اور مجھ میں رچ بس گئی ہے) ورنہ میں تو وہی مٹی ہی ہوں۔

Marfat.com

گئی۔ تمام مضامین میں خردہ گیری [1] کا عنصر غالب رہا۔ مولانا کی تنقیص کے حامل مقالات پر رائے دیتے ہوئے میں نے اپنے ذاتی تجربہ کا حوالہ دیا کہ مولانا سے رابطہ سے قبل میں نے مدرسۃ الاصلاح کا نام سنا تھا اور نہ مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کا یا ان کے فکر کا۔ اس کے برعکس آج میں مدرسہ میں نہ صرف یہ کہ موجود ہوں بلکہ یہاں کے فضلاء فکر فراہی کے لیے میری کچھ حقیر خدمات کی بدولت مجھے سر آنکھوں پر بٹھا رہے ہیں۔ یہ فرق کیسے پیدا ہو گیا؟ ظاہر ہے کہ مولانا اصلاحی کے ساتھ رابطہ کے بعد یہ ساری چیزیں میرے علم میں آئیں۔ مولانا اپنے استاد مولانا فراہی یا مدرسۃ الاصلاح کا جب ذکر کرتے تو اپنی یادداشتوں کے دفتر کھولتے جاتے اور گھنٹوں بے تکان گفتگو کرتے۔ فکر فراہی کو انھوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا اور وہ اس کے مدھم نقوش کو واضح تر کرنے کے درپے رہتے۔ اسی کے نتیجے میں آج فکر فراہی کا چرچا دنیا بھر میں ہونے لگا ہے۔ مولانا کے بارے میں یہ تجربہ صرف میرا نہیں بلکہ ان بیسیوں ساتھیوں کا ہے جو میرے ہم درس رہے اور انھیں مولانا سے استفادے کا موقع ملا۔ یہ امین احسن ہیں جن سے میں واقف ہوں۔ ایک اور امین احسن وہ ہیں جن کا انکشاف سرائے میر میں آکر ہوا ہے۔ یہاں کے تحقیق نگار بیان کرتے ہیں کہ ان کے امین احسن مدرسہ کی زندگی کا مذاق اڑاتے، مولانا فراہی سے بیزاری کا اظہار کرتے اور ان کے فکر کو نقصان پہنچاتے۔ لیکن حیرت ہے کہ تقریباً چالیس برس مولانا کے قریب رہنے کے باوجود میں نے ان دوسرے امین احسن کی جھلک نہیں دیکھی جبکہ مقالہ نگار فرماتے ہیں کہ اس طرح کی باتیں خود مولانا نے ان کے کان میں پھونکیں۔ میں نے کہا کہ میں مقالہ نگار کی ثقاہت کے بارے میں کچھ نہیں کہتا، اس کا جائزہ لوگ خود لیں۔ البتہ میں اتنی بات ضرور عرض کروں گا کہ ایسے خیالات کو قبول کرنے سے پہلے احناف کے اس موقف کو ضرور مدنظر رکھیں کہ وہ عموم البلویٰ کے معاملات میں خبر واحد کو بالکل خاطر میں نہیں لاتے۔ میرے اس تبصرہ کو بالعموم پسند اور مجمع کے دل کی آواز قرار دیا گیا۔

علمی حدود کے اندر رہ کر تنقید و تبصرہ کا حق استعمال کیا جائے تو اس سے افکار کے افہام و تفہیم میں مدد ملتی ہے اور ہر جگہ اس کی پذیرائی کی جاتی ہے لیکن معاملہ جب شخصی ہو جائے اور مقالہ نگار حضرات سیمینار کے مقاصد ہی سے انحراف کر رہے ہوں تو ان کو اس کے لیے اسٹیج مہیا کرنے کی مصلحت میری سمجھ میں نہیں آئی۔ سیمینار کا اختتام مولانا اشفاق احمد اصلاحی سیکرٹری جنرل انجمن طلبائے قدیم کے کلمات تشکر کے ساتھ ہوا۔

سیمینار کی سہ روزہ مصروفیت کے بعد مدرسۃ الاصلاح کے بارے میں معلومات حاصل کیں جو قارئین کے لیے یقیناً دلچسپی کا باعث ہوں گی۔ یہ مدرسہ 1327ھ کے موسم بہار میں قائم ہوا۔ اس کے بانی اس دیار کے ایک بزرگ مولانا محمد شفیع تھے۔ مدرسہ کا آغاز کرنے کے بعد انھوں نے مولانا شبلی نعمانی رحمہ اللہ سے درخواست کی کہ وہ مدرسہ کی نگرانی اپنی صوابدید کے مطابق فرمائیں۔ چنانچہ انھوں نے مدرسہ کے اغراض و مقاصد وضع کیے اور طریق کار کا ایک اجمالی خاکہ بنایا۔ اس کے بعد مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ سے کہا کہ وہ اس مدرسہ پر توجہ دیں۔ مولانا فراہی نے اس

[1] خردہ گیری: باریکیاں چھانٹنا (خردہ: چھوٹی چیز)۔

Marfat.com

کا مکمل نظام وضع کیا اور جدید خطوط پر اس کا نصاب تعلیم تجویز کیا۔ وہ 1930 میں اپنی وفات تک مدرسہ کے کام کی نگرانی فرماتے رہے۔

مدرسہ کے مقاصد میں مسلمانوں کے لیے مذہبی و دنیاوی تعلیم کا انتظام کرنا ہے۔ اس میں مذہبی تعلیم کو مقدم رکھا جاتا ہے۔ پورے قرآن کی محققانہ تعلیم نصاب کا اہم حصہ ہے۔ مدرسہ کے پانچ سالہ حصہ پرائمری میں (جسے حصہ اردو کہا جاتا ہے) قرآن کی ناظرہ تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تین زبانیں...... اردو، فارسی اور ہندی...... سکھائی جاتی اور حساب، تاریخ، جغرافیہ اور دینیات کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے بعد سات سالہ عربی کورس ہے۔ اس میں پورے قرآن کا ترجمہ و تفسیر، حدیث میں موطا امام مالک، صحیح بخاری، صحیح مسلم اور سنن ترمذی، اصول حدیث میں شرح نخبۃ الفکر اور تاریخ فنون الحدیث، فقہ میں قدوری، ہدایہ اولین و آخرین، بدایہ المجتہد اور اصول فقہ اربعہ، صرف و نحو میں اسباق النحو، قواعد اللغۃ العربیہ، المفصل اور البلاغۃ الواضحہ، عربی ادب میں دروس الادب، القراءۃ الرشیدہ، امثال آصف الحکیم، کلیلہ ودمنہ، جمہرۃ خطب العرب، مقدمہ ابن خلدون، دیوان حماسہ، جمہرۃ اشعار العرب، علم الفرائض میں سراجی و شریفیہ، اسرار دین میں حجۃ اللہ البالغہ، اور منطق و فلسفہ قدیم و جدید پڑھائے جاتے ہیں۔ اسی عرصے میں طلبہ انگریزی کا بی۔ اے تک کا کورس بھی پڑھتے ہیں۔ امتحانات کے لیے خارجی ممتحن متعین کیے جاتے ہیں۔ اس طرح مدرسہ کا فارغ طالب علم دینی تعلیم رکھتے ہوئے ایک گریجوایٹ ہوتا ہے اور اس کی یہ ڈگری یونیورسٹیوں میں داخلہ کے لیے تسلیم کی جاتی ہے۔

مدرسہ تقریباً بیس ایکڑ رقبہ پر قائم ہے۔ اس میں طلبہ کی تعداد 1300 کے لگ بھگ ہے۔ پچاس سے زیادہ اساتذہ کام کرتے ہیں۔ ساڑھے تین سو طلبہ ہوسٹلوں میں قیام کرتے ہیں۔ مستطیع طلبہ سے کھانے کا خرچ لیا جاتا ہے جبکہ نادار طلبہ کا تمام خرچ مدرسہ برداشت کرتا ہے۔ اس وقت کمپیوٹر کی تعلیم کے لیے ایک نئی عمارت کی تعمیر جاری ہے۔ مدرسہ کی حدود میں کھیلوں کے وسیع میدان موجود ہیں۔ میرے زمانہ قیام میں دو ٹیموں کے درمیان کرکٹ میچ منعقد ہوا۔ مدرسہ میں پانی کی بلند و بالا ٹینکی اور بجلی کی فراہمی کے لیے جنزیٹر موجود ہے۔

مدرسہ کا تذکرہ ادھورا رہے گا اگر اس کے طلبہ کی انجمن کا ذکر نہ کیا جائے۔ یہ انجمن بے حد فعال اور طلبہ کی ذہنی تہذیب اور فکری تربیت میں بھرپور کردار ادا کرتی ہے۔ اس کے سالانہ انتخابات ہوتے ہیں جن میں بزم خطابت اور دار المعلومات کے لیے عہدہ داران چنے جاتے ہیں۔ بزم خطابت میں ہر ہفتہ اردو، عربی اور انگریزی میں تقریروں کی مشق کرائی جاتی اور مقابلوں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ دار المعلومات میں طلبہ کی اپنی نہایت شاندار لائبریری قائم ہے جس میں مختلف رسائل و جرائد کی فائلیں محفوظ کرنے کا خاص اہتمام ہے۔ یہ شعبہ طلبہ کو ان کی ضرورت کی کتب جاری کرتا ہے۔ دوسرا شعبہ طلبہ کی تحریری صلاحیتوں کو پروان چڑھاتا ہے۔ اس میں تحقیقی مقالات، مضامین، تراجم اور ادبی نگارشات کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔ یہ شعبہ اہم علمی مباحث پر سیمینار بھی منعقد کرتا ہے۔ یہ تمام تخلیقات طلبہ کے ترجمان رسالہ ''مجلّہ'' میں شائع ہوتی ہیں۔ مجلّہ کے چند شمارے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان میں طلبہ کی علمی و ادبی

Marfat.com

کاوشیں اتنے عمدہ معیار کی سامنے آئیں کہ گمان ہوتا ہے کہ یہ رسالہ طلبہ نہیں بلکہ نہایت کہنہ مشق مصنف وادیب نکالتے ہیں۔ مدرسہ کے اساتذہ دارالمعلومات اور بزم خطابت دونوں کے پروگراموں میں شریک ہوتے ہیں اور طلبہ کی پوری پوری حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ میری ایک نشست مدرسہ کے آخری سالوں کے طلبہ کے ساتھ بھی ہوئی۔ اس میں انھیں مولانا امین احسن، ان کے فکر، تفسیر تدبر قرآن اور ادارہ تدبر قرآن وحدیث کے بارے میں سوالات کرنے کا مواقع فراہم کیا گیا۔ طلبہ کے سوالوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔

لاہور سے بذریعہ ٹرین سرائے میر آنے اور جانے میں پانچ روز لگ جاتے ہیں۔ اس طرح مدرسہ میں رہنے کا موقع دس دن کے لیے ملا۔ سیمینار کے بعد مدرسہ کی عاملہ کے ارکان، اساتذہ اور طلبہ سے برابر ملاقاتیں رہیں اور تبادلہ خیالات کا موقع ملا۔ جامعہ الفلاح بلریا گنج کے اساتذہ نے بڑے خلوص سے دعوت دی کہ میں ان کے ادارہ کو بھی دیکھوں لیکن افسوس کہ ویزا فقط سرائے میر کے لیے تھا لہٰذا معذرت کرنی پڑی۔ مدرسۃ الاصلاح کے لوگوں کا کہنا تھا کہ میری آمد ان کے شوق علم وتحقیق کو مہمیز دینے کا باعث ہوئی ہے۔ مولانا اصلاحی کے معمر ترین شاگرد مولانا عبدالرحمٰن ناصر فرمانے لگے کہ حاصل سیمینار تو آپ ہیں۔ ان باتوں کو سن کر مجھے حیرت ہوتی تھی کہ میری وہ کون سی خدمت ہے جو ان بزرگوں کے دلوں میں گھر کر گئی ہے اور انھوں نے میری ذات سے بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔

5۔ مارچ کو واپسی سفر براستہ شاہ گنج ہوا۔ مدرسہ پر لوگوں نے بڑی محبت سے رخصت کیا۔ مولانا احتشام الدین بنفس نفیس شاہ گنج ریلوے اسٹیشن تک، جو سرائے میر سے تیس کلومیٹر دور ہے، تشریف لائے۔ ان کے ہمراہ اساتذہ میں سے مولانا انیس احمد، مولانا سرفراز احمد، مولانا اعجاز احمد، مولانا عتیق الرحمٰن اور آٹھ دیگر ساتھی تھے۔ جوں جوں ریل گاڑی کی آمد کا وقت قریب آرہا تھا جذباتی کیفیات چہروں پر نمایاں ہورہی تھیں۔ عزیز طلبہ کی تمنا تھی کہ گاڑی لیٹ ہو اور یہ لمحات طویل تر ہوجائیں۔ دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی دعاؤں کو اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے۔ گاڑی اسٹیشن پر تو ٹھیک اپنے وقت پر پہنچی لیکن خلاف معمول نصف گھنٹہ وہیں ٹھہری رہی۔ رخصت ہوتے وقت اساتذہ کرام اور طلبہ سب میں محبت کی حدت محسوس کی جاسکتی تھی۔ اور مجلّہ کے ایڈیٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی تو فی الواقع آبدیدہ ہوگئے۔ مولانا انیس احمد اصلاحی، جنھوں نے بنارس میں میرا خیر مقدم کیا تھا، شاہ گنج سے گاڑی کے روانہ ہوتے وقت کچھ ایسی کیفیت میں تھے کہ ''دور تک دیکھتے'' اور ''دیر تک سوچتے'' نظر آئے۔ واپسی کے سفر میں میرے ساتھ عزیزی نازش احتشام تھے جنھوں نے حسب معمول خدمت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ دہلی پہنچ کر انھوں نے اپنے اصلاحی دوستوں سے ملوایا۔ وہ لوگ کسی نصیحت کے طالب ہوئے تو میں نے انھیں اپنے علم کی حفاظت کی تلقین کی اور ہفتہ میں ایک بار باہم مل کر قرآنی مطالعہ ومذاکرہ کا اہتمام کرنے کا مشورہ دیا۔ 7۔ مارچ کو لاہور کا سفر شروع ہوا۔ تیس گھنٹے کے اعصاب شکن سفر کے بعد میں اس وقت لاہور پہنچا جب 9۔ مارچ کی تاریخ شروع ہوچکی تھی۔ اب زندگی کے ان قیمتی یادگار دنوں کی یادیں باقی رہ گئی ہیں۔

☆......☆......☆

Marfat.com

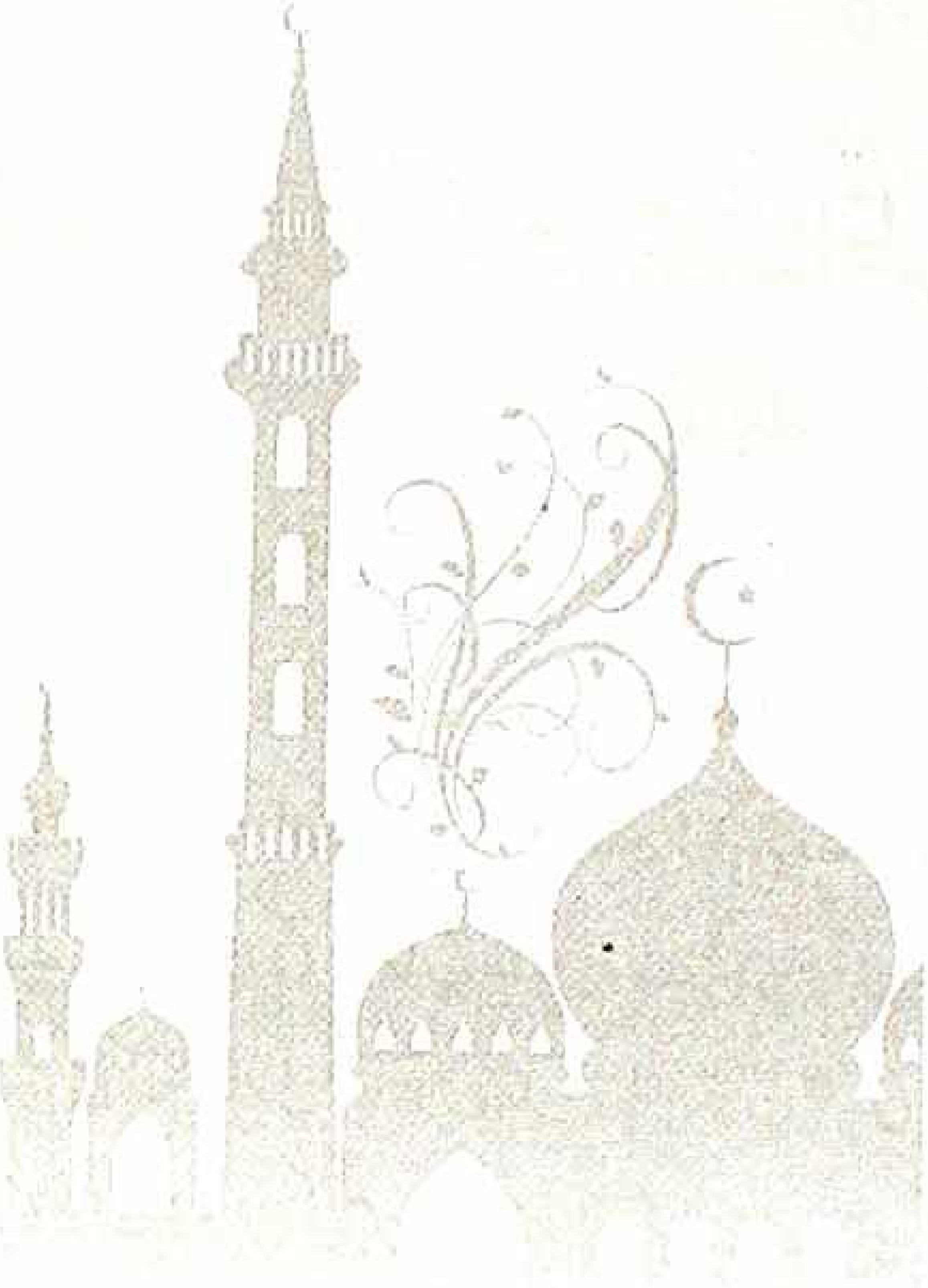

اسلام اور سائنس

باب پنجم

سائنس۔ قرآنِ کریم کے تناظر میں

سائنسی تلاش کے مقاصد... قرآن کے نقطۂ نظر سے

سائنس کا صحیح طریقِ کار

ٹیکنالوجی اور قرآن

حیات و ممات کا راز... ایک لاینحل مسئلہ

Marfat.com

سائنس ..... قرآنِ کریم کے تناظر میں

مسلمان سائنس دانوں کے ذہنوں میں یہ حقیقت آئے دن روشن سے روشن تر ہوتی جارہی ہے کہ قرآن کریم کی بہت سی آیات ان موضوعات کو اجاگر کرتی ہیں جن کا تعلق براہ راست جدید سائنس سے ہے۔ چناں چہ انھوں نے ایسی بہت سی آیات بھی منتخب کرلی ہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ سائنس ہی کے کسی شعبے کے کسی نہ کسی پہلو کی حامل ہیں۔ اس طرح قرآن کریم کا ایسا لٹریچر تیار ہوگیا ہے جو سائنس کی ہر شاخ کے بارے میں قرآن کریم کا نقطۂ نظر نمایاں کرتا ہے۔ اس طرح یہ حقیقت بجائے خود قرآن کریم کی حقانیت کی شہادتوں میں برہان قاطع [1] کی حیثیت اختیار کرگئی ہے۔ امر واقع یہ ہے کہ مسلمان سائنس دانوں نے یہ کام اپنے دین کی لگن کے زیر اثر کیا ہے۔ دین کی محبت ان کے دلوں میں رچی ہوئی ہے۔ اس لیے سائنسی حقائق کے بارے میں قرآن کریم کی آیات جمع کرنا ایک صحیح اور قابل فہم اقدام ہے۔

اس عمل کے دوسرے پہلو پر غور کیجیے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں سائنس کے مختلف شعبوں کی طرف بڑے واضح اشارے ملتے ہیں، لیکن جب قرآن کریم کا مطالعہ خود قرآن ہی کی روشنی میں کیا جائے تو وہی آیات جنھیں سائنس کی طرف انگشت نما [2] بتایا جاتا ہے، ان کی ایک اور ہی حقیقت جلوہ نما ہونے لگتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ آیات مبارکہ سائنس کی اہمیت جتانے کے لیے ہیں، نہ ان کا سائنس کی دنیا سے کوئی واسطہ ہے۔

آیئے اس معاملے کو ان آیات مقدسہ کے تناظر میں دیکھیں جو مظاہر قدرت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اگر ہم اس قسم کی ہر آیت پر کلام شروع کردیں تو بات بہت لمبی ہوجائے گی جب کہ طوالت مطلوب نہیں۔ اس لیے اس مسئلے کا صرف ایک دو آیات کی روشنی میں جائزہ لینا کافی ہے۔ اس طرح وہ اصل مقصد روشن ہوجائے گا جس تک پہنچانا قرآن کریم کا مقصود ہے!

قرآن کریم کی شہادتیں:

مذکورہ بالا موضوع سے تعلق رکھنے والی آیات مقدسہ کا مطالعہ کیا جائے تو دل و دماغ پر بہت گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک انمٹ نقش یہ حقیقت ہے کہ یہ آیات زندگی کے اس کارخانے کے حقائق کے

---

1. برہانِ قاطع: کاٹ دار دلیل۔
2. انگشت نما: اشارہ کرنے والا۔

Marfat.com

بارے میں گواہی کی حیثیت رکھتی ہیں جو ہمارے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ ایسی آیات میں ’آیہ‘ یا ’آیات‘ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جب کہ آیہ کا مطلب نشانی یا تعجب انگیز چیز ہے۔ مختلف موضوعات پر اپنا نقطۂ نظر ثابت کرنے کے لیے قرآن کریم قدرتی مظاہر کا حوالہ دیتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ یہ نشانیاں ایک خاص حقیقت کی طرف رہبری کر رہی ہیں۔ یہ اسی نوعیت کی آیات ہیں، ان کا بغور مطالعہ کیجیے:

﴿وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ O اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ﴾ (البقرہ: 163، 164)

”اور تمہارا خدا بس ایک ہی معبود ہے۔ اس بے حد مہربان رحم فرمانے والے کے سوا اور کوئی خدا نہیں۔ بے شک آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں، رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آنے میں اور سمندر میں چلنے والے جہازوں میں جو ایسی چیزیں لے کر چلتے ہیں جو لوگوں کے لیے نفع بخش ہیں، اس برسات میں جو اللہ آسمان سے برساتا ہے اور جس سے زمین مردہ ہو جانے کے بعد دوبارہ جی اٹھتی ہے اور اس میں ہر طرح کے جانوروں کو پھیلا دیتا ہے اور ہواؤں کے فرّاٹے میں اور آسمان و زمین کے مابین مسخر شدہ بادل میں عقل والے لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔“

یہ آیات مبارکہ فطرت کے مختلف مظاہر کی طرف توجہ دلاتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مظاہر فلکیات، طبعیات (فزکس) اور موسمیات کے حوالے سے سائنسی حقائق سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم ان آیات میں ہمیں جو ترغیب دے رہا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم عقل سے کام لیں اور یہ حقیقت جان لیں کہ یہ سارے مظاہر اپنے تن تنہا خالق کی وحدت کی علامات ہیں۔ ان مظاہر میں زمین و آسمان کی تخلیق بھی شامل ہے۔ غور کیجیے، زمین و آسمان کی بناوٹ کیسے کیسے حقائق اجاگر کرتی ہے۔ زمین و آسمان زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اس پردے کے پیچھے ایک صاحب ارادہ ہستی موجود ہے جس نے انھیں اپنی زبردست قدرت سے ایک باقاعدہ نظام کے تحت بامقصد طور پر پیدا فرمایا ہے۔ پھر اس مقدس ہستی کی حیرت انگیز کاریگری دیکھو، اس نے ایک خاص ترتیب کے ساتھ دن اور رات کی گردش کا قاعدہ ٹھہرا دیا۔ پھر یہ دیکھو کہ اس قادر مطلق نے جہاں تہاں بکھری ہوئی چیزوں میں کس طرح تعاون کی خصوصیت بھر دی۔ سمندر اور زمین کی مثال تمھارے سامنے موجود ہے۔ یہ چیزیں کیسے کیسے نتائج پیدا کر رہی ہیں اور یہ انسان کے لیے کس قدر نفع بخش ہیں۔ غور کرو یہ سارے مظاہر کیا کہتے ہیں؟ درحقیقت یہ سب صرف اسی سچائی کی گواہی دیتے ہیں کہ اس کائنات کا تنہا خالق صرف اللہ رب العزت ہے۔ حکمت موجود ہو اور حکیم موجود نہ ہو، یہ بات بعید از فہم ہے۔ اسی طرح جب کائنات کا نقشہ موجود ہے تو اس کائنات کا کوئی نقشہ ساز بھی یقیناً موجود ہے۔ اگر اس

Marfat.com

کائنات کا کوئی نقاش نہ ہوتا تو یہ ساری کائنات ایک بے مقصد، بے مصرف اور مہمل چیز نظر آتی۔ ہمارے سامنے فطرت کے جس قدر مظاہر کھلے پڑے ہیں اگر ان کا کوئی خالق نہ ہوتا تو ان مظاہر میں سرے سے کوئی ربط، کوئی تعاون اور کوئی ہم آہنگی ہی موجود نہ ہوتی۔ پس اس کائنات کا نظم، قرینہ اور اس کا مقصد یہ گواہی دیتا ہے کہ اس کا پیدا فرمانے والا اللہ وحدہ لاشریک ہے اور اس ذات مقدس کے سوا کوئی اور قادر مطلق نہیں ہے۔

اسی پر بس نہیں، قرآن کریم میں جابجا اور بھی ایسی آیات ہیں جو مشاہدے میں آنے والے حقائق کے ذریعے قیامت کے دن پر استدلال کرتی ہیں۔ اس کی ایک سیدھی سادی واضح مثال قرآن کریم میں یہ دی گئی ہے:

﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَ نُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَآءُ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوٓا أَشُدَّكُمْ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ إِلَى أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا وَ تَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَآ أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ وَ أَنْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ﴾ (الحج: 5)

''اے لوگو! اگر تمھیں دوبارہ جی اٹھنے کے بارے میں کوئی شک ہے، تو ذرا غور کرو کہ ہم نے تمھیں کس چیز سے پیدا کیا؟ مٹی سے! پھر (تمھاری پیدائش کا سلسلہ کس طرح چلا؟) ایک بوند سے، پھر خون کی پھٹکی سے، پھر متشکل اور غیر متشکل گوشت کے لوتھڑے سے تاکہ تم پر واضح کر دیں کہ جسے ہم چاہتے ہیں اسے رحم مادر میں ایک مدت تک ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر بچہ بنا کر پیدا کر دیتے ہیں تاکہ تم (یکے بعد دیگر مراحل کے بعد) اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی وفات پا جاتا ہے اور کوئی نکمی عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے کہ سمجھ بوجھ کا درجہ پا کر پھر ناسمجھی کی حالت میں پڑ جائے...... اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے۔ جب ہم اس پر پانی برسا دیتے ہیں تو وہ پھر ابھرتی اور لہلہانے لگتی ہے اور پھر ہر قسم کی خوشنما چیزیں اگاتی ہے۔''

یعنی بطن مادر سے بچے کی پیدائش اور زمین کے سینے سے طرح طرح کی پیاری پیاری نازک نازک کونپلوں کا پھوٹنا اور اجناس کا پیدا ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ مرنے کے بعد آخرت والی زندگی میں انسان کو پھر سے زندہ کر دیا جائے گا، اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی مشکل بات نہیں۔ قادر مطلق بغیر کسی سعی کے مرے کھپے انسانوں کو دیکھتے ہی دیکھتے ازسرنو زندہ کر دکھائے گا۔

بعض آیات میں اس آشوب و آزمائش کا حوالہ دیا گیا ہے جس کا سامنا جناب رسالت مآب ﷺ اور ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو وقتاً فوقتاً کرنا پڑا۔ اس کی توضیح اللہ تعالیٰ نے مظاہر فطرت میں اپنی قدرت کی نیرنگیوں کے حوالے سے کی ہے۔ قرآن کریم میں اس قسم کی جتنی بھی آیات آئی ہیں ان میں سارا زور سائنسی پہلوؤں پر نہیں بلکہ ان حقائق پر دیا گیا ہے جن کی طرف قرآن کریم ہمیں متوجہ کرنا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ آیات مقدسہ دیکھیے:

Marfat.com

﴿وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّ لِیُذِیْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ
وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ o وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ
فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا وَ كَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ o
اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ كَیْفَ یَشَآءُ وَ یَجْعَلُهٗ كِسَفًا
فَتَرَى الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ فَاِذَاۤ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ
یَسْتَبْشِرُوْنَ o وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِیْنَ o فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ
رَحْمَتِ اللّٰهِ كَیْفَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْیِ الْمَوْتٰى وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ
قَدِیْرٌ o﴾ (الروم: 46 تا 50)

''اور اس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ وہ خوشخبری دینے والی ہوائیں چلاتا ہے تا کہ تمھیں اپنی رحمت کا نمونہ دکھائے، تا کہ اس کے حکم سے کشتیاں چل پڑیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور شائد تم شکر کرو۔ اور (اے نبی!) ہم نے آپ سے پہلے بھی کئی رسول ان قوموں کی طرف بھیجے اور وہ ان کے پاس واضح دلیلیں لے کر آئے۔ پھر ہم نے مجرموں سے بدلہ لے لیا۔ مومنوں کی مدد کرنا ہم پر لازم تھا۔ اللہ وہ ہے جو ہواؤں کو چلاتا ہے جو بادلوں کو ابھارتی ہیں، پھر وہ جیسے چاہتا ہے انھیں آسمان میں پھیلاتا ہے، پھر انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ ان سے بارش ہونے لگتی ہے، پھر وہ انھیں اپنے جن بندوں کی طرف چاہتا ہے بھیج دیتا ہے اور وہ خوشی منانے لگتے ہیں۔ اللہ کی رحمت کی نشانیاں دیکھو۔ زمین مردہ ہو جاتی ہے تو وہ کس طرح اسے زندہ کر دیتا ہے۔ بے شک وہی ہے جو مردوں کو زندہ کر دے گا۔ وہ ہر بات پر قادر ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی صفات:

سائنسی پہلوؤں سے متعلق دیگر نوعیت کی بعض آیات مبارکہ ایسی ہیں جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی صفات کا قائل کر دیتی ہیں۔ ذرا ان آیات پر فکر و تدبر کی نگاہ ڈالیے:

﴿ذٰلِكَ وَ مَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِیَ عَلَیْهِ لَیَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ
غَفُوْرٌ o ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَ یُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ
بَصِیْرٌ o ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ
الْعَلِیُّ الْكَبِیْرُ o اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً اِنَّ اللّٰهَ
لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ o لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ط وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ o اَلَمْ
تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ وَ الْفُلْكَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَ یُمْسِكُ السَّمَآءَ
اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ o﴾ (الحج: 60 تا 65)

Marfat.com

''......پس جس کسی نے خود زیادتی نہیں کی بلکہ جتنی سختی اس کے ساتھ کی گئی تھی، ٹھیک اتنی ہی سختی بدلے میں کرنی چاہی اور پھر دشمن مزید زیادتی پر اتر آیا تو ضروری ہے کہ اللہ مظلوم کی مدد کرے۔ اللہ یقیناً معاف فرمانے اور بخش دینے والا ہے۔ اور یہ حالت اس لیے ہوئی کہ اللہ رات کو دن کے اندر نمایاں کرتا ہے اور دن کو رات کے اندر (یعنی یہاں ہر گوشے میں حالات کی متضاد تبدیلی کا قانون جاری ہے) اور اس لیے کہ اللہ سننے اور دیکھنے والا ہے......اور اس لیے بھی کہ حق صرف اللہ کی ہستی ہے اور اس کے سوا جن ہستیوں کو پکارا جاتا ہے، وہ باطل ہیں۔ پھر اس لیے بھی...... کہ اللہ ہی کی ہستی بلند مرتبہ اور بڑائی والی ہے...... کیا تم نے یہ منظر نہیں دیکھا کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور (سوکھی) زمین سرسبز ہو کر لہلہانے لگتی ہے۔ یقین جانو! اللہ بڑا ہی لطف فرمانے والا اور ہر بات کی خبر رکھنے والا ہے......آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے۔ وہی ہے جو بے نیاز ہے۔ وہی ہر طرح کی ستائشوں ❶ کے لائق ہے۔ کیا تم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ کس طرح اللہ نے زمین کی تمام چیزیں تمھارے لیے مسخر کر دی ہیں۔ جہاز کو دیکھو کس طرح وہ اس کے حکم سے سمندر میں تیرتا چلا جاتا ہے۔ پھر کس طرح اس نے آسمان (یعنی اجرام سماوی) کو تھام رکھا ہے کہ زمین پر نہ گر پڑیں اور گریں تو اس کے حکم سے! بلاشبہ اللہ تعالیٰ انسان کے لیے بڑی ہی شفقت اور بڑی ہی رحمت والا ہے۔''

ان آیات میں رب ذوالجلال کی وہ صفات بتائی گئی ہیں جنھیں بروئے کار لا کر اللہ تعالیٰ انسان پر اپنا فضل فرماتا ہے اور اسے سرفرازی بخشتا ہے۔ ان آیات سے یہ حقیقت بھی منکشف ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے غافل نہیں ہے، نہ وہ کسی طرح سے عاجز یا لاچار ہے۔ وہ قادر مطلق ہے، ساری کائنات اسی کے قبضہ قدرت میں ہے، وہی ہے جو دن اور رات سے الٹ پھیر کا عمل انجام دے رہا ہے۔ ہر چیز کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہے۔ آدمی اپنے آرام وراحت کے لیے مشینی کل پرزوں سے جو کام لیتا ہے وہ بھی دراصل اللہ ہی کے امر اور منشاء سے انجام پاتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ مہربان نہ ہوتا تو دنیا کی کوئی معمولی سی چیز بھی انسان کی معین و مددگار نہ بنتی اور اس کی ساری سائنس دھری کی دھری رہ جاتی۔ ان آیات میں اللہ رب العزت کی جو صفات بیان ہوئی ہیں ان کے مطابق وہ علیم و خبیر ہے، نگرانی کی نگاہ رکھتا ہے، صاحب عظمت ہے، صاحب جلال و جمال ہے، مہربان ہے، رحم فرمانے والا ہے، رفعت، سبقت، ماورائیت ❷ اور مطلقیت کی یگانگی ❸ اسی کو زیبا ہے اور اس کی یہ تمام صفات ان مظاہر فطرت کے ذریعے بخوبی سمجھ میں آ سکتی ہیں جو ہمارے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔

بعض آیات انہی مظاہر فطرت سے اللہ تعالیٰ کی اتھاہ قوت، دانائی، تابع فرمان رکھنے کی قدرت اور منصوبہ بندی کی شان والے دلائل مہیا کرتی ہیں۔ مظاہر فطرت کو دیکھ کر انسان اپنے رب کو پہچان سکتا ہے اور پروردگار عالم کی سلطنت میں خود انسان کی کیا حیثیت ہے، یہ حقیقت بھی مظاہر فطرت پر غور و فکر کی بدولت اس پر بخوبی عیاں ہو سکتی ہے۔

---

❶ ستائشیں: تعریفیں۔ ❷ ماورائیت: ماوراء (بے کنار) ہونا۔ ❸ یگانگی: یگانہ (بے مثال) ہونا۔

Marfat.com

شکر وسپاس:

آیات قرآنی کی رو سے مظاہر فطرت کے سائنسی پہلو کا تیسرا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی حقیقت اور حیثیت جان لے۔ وہ باور کر لے کہ وہ ایسی عاجز اور ناتواں مخلوق ہے جس کی خود اپنی کوئی قوت ہی نہیں، کوئی سکت نہیں۔ اللہ رب العزت اس کی کمزوریوں سے اچھی طرح باخبر ہے اور اس پر اپنا فضل وکرم فرماتا رہتا ہے۔ رب ذوالجلال کی زبردست طاقت اور اپنی بے مائیگی کا احساس ویقین انسان کو اللہ کی ذات عالی کا شکرگزار بنا دیتا ہے۔ یہ حقیقت اس آیت مبارک کے آئینے میں دیکھئے:

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ○ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآىِٕبَيْنِ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ○ وَ اٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ﴾ (ابراهیم: 32 تا 34)

"یہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا، اور اوپر سے زمین پر پانی برسایا جس کی آبیاری سے طرح طرح کے پھل پیدا ہوتے ہیں جو تمھاری غذا کا سامان ہیں اور جہاز تمھارے لیے مسخر کر دیے کہ اس کے حکم سے سمندر میں چلنے لگیں، اور دریا بھی تمھارے لیے مسخر کر دیے۔ اسی طرح سورج اور چاند بھی مسخر کر دیے کہ ایک خاص دستور پر برابر چل رہے ہیں اور رات اور دن کا ظہور بھی مسخر ہے۔ غرضیکہ تمھیں (اپنی زندگی کی ضرورتوں کے لیے) جو کچھ مطلوب تھا وہ سب اس نے عطا فرما دیا۔ اگر تم اللہ کی نعمتیں گننی چاہو تو وہ اتنی ہیں کہ کبھی ان کا احاطہ نہ کر پاؤ۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ناانصاف اور بڑا ناشکرا ہے۔"

اس ارشاد ربانی کا واضح مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز انسان کے لیے پیدا فرمائی ہے اور خود انسان کو اس دنیا میں اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ فطرت کی قوتوں کو بھی اللہ تعالیٰ ہی نے انسان کی خدمت پر مامور کیا ہے اور انسان کو ہر وہ چیز مرحمت فرمائی ہے جس کا وہ محتاج ہے۔ جب تک اس دھرتی پر زندگی کی رونق موجود ہے اللہ تعالیٰ انسان کو اس کی ضروریات زندگی عطا فرماتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور اس کی بخشش ومرحمت انسان میں اللہ کے لیے شکر وسپاس کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ اس طرح انسان میں بھی عاجزی اور اطاعت گزاری کی صفات پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بڑی بدنصیبی کی بات ہے کہ انسان رب العزت کی نعمتوں اور بخششوں سے تو ہر آن فائدہ اٹھا رہا ہے مگر خود اسے اپنی ذمہ داری کے احساس کی توفیق نہیں ہوتی۔ انسان کا یہ طرز عمل اس کے ناشکرے پن کی دلیل ہے۔ قرآن کریم کی یہ آیات مبارکہ ملاحظہ کیجیے، ان میں یہی حقیقت جتلائی کی گئی ہے:

سورہ عنکبوت کی آیت: 63، سورہ زمر کی آیات: 5-7، سورہ فاطر کی آیات: 11-13 اور سورہ زخرف کی آیات: 9-14۔

Marfat.com

خدائے مقدس کا ارشاد ہے:

﴿اِنۡ تَکۡفُرُوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنۡکُمۡ ۟ وَلَا یَرۡضٰی لِعِبَادِہِ الۡکُفۡرَ ۚ وَاِنۡ تَشۡکُرُوۡا یَرۡضَہُ لَکُمۡ ؕ وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی ؕ ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمۡ مَّرۡجِعُکُمۡ فَیُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ؕ اِنَّہٗ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ﴾

(الزمر: 7)

''اگر تم ناشکری کرو گے تو اللہ تم سے بے نیاز ہے۔ لیکن وہ بندوں کی ناشکری سے خوش نہیں ہوتا اور اگر تم شکر کرو گے تو وہ اسے تمھارے لیے پسند فرماتا ہے۔''

آدمی اپنی جہالت وحماقت سے یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ وہ اس دنیا کا مالک ہے۔ انسان کا یہ خبط اس کی سائنسی تحقیقات کے غلط نقطۂ نظر کا نتیجہ ہے۔ قرآن کے نزدیک یہ نقطۂ نظر مردود ہے۔ قرآن انسان کو بتاتا ہے کہ اس کی سائنس کی حدود کیا ہیں؟ قرآن بتاتا ہے کہ آدمی قدم اٹھا سکتا ہے لیکن اس کے قدم اسے کس منزل تک پہنچائیں گے، یہ بات صرف عالم الغیب ہی کے دست قدرت پر موقوف ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

﴿اَفَرَءَیۡتُمۡ مَّا تَحۡرُثُوۡنَ ۝ ءَاَنۡتُمۡ تَزۡرَعُوۡنَہٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الزّٰرِعُوۡنَ ۝ لَوۡ نَشَآءُ لَجَعَلۡنٰہُ حُطَامًا فَظَلۡتُمۡ تَفَکَّہُوۡنَ ۝ اِنَّا لَمُغۡرَمُوۡنَ ۝ بَلۡ نَحۡنُ مَحۡرُوۡمُوۡنَ ۝ اَفَرَءَیۡتُمُ الۡمَآءَ الَّذِیۡ تَشۡرَبُوۡنَ ۝ ءَاَنۡتُمۡ اَنۡزَلۡتُمُوۡہُ مِنَ الۡمُزۡنِ اَمۡ نَحۡنُ الۡمُنۡزِلُوۡنَ ۝ لَوۡ نَشَآءُ جَعَلۡنٰہُ اُجَاجًا فَلَوۡلَا تَشۡکُرُوۡنَ ۝﴾

(الواقعہ: 63 تا 70)

''جو کچھ تم بوتے ہو کیا تم نے کبھی اس پر غور کیا ہے؟ کیا تم اسے اگاتے ہو یا ہم؟ اگر ہم چاہیں تو ساری فصل چورا چورا کر دیں اور تم باتیں ہی بناتے رہ جاؤ کہ ''ہم پر تو چٹی پڑ گئی''، ''نہیں ہم بے نصیب ہیں۔'' جو پانی تم پیتے ہو، کبھی اس پر غور کیا ہے؟ کیا تم نے اسے بادل سے برسایا ہے یا ہم نے؟ ہم چاہیں تو اسے کھاری کر دیں۔ پھر تم شکر کیوں نہیں کرتے؟''

اس ارشاد گرامی کا مطلب بڑا واضح ہے۔ انسان کو بتا دیا گیا ہے کہ اپنی حدود کو سمجھ لے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہ رہے۔ یہی وہ شعور وآگہی ہے جس کے زیر اثر وہ شکر وسپاس کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ قرآن کریم کی اکثر تمثیلات وحکایات قدرتی مناظر ومظاہر پر مبنی ہیں کیوں کہ یہ حقیقی تجربوں کی باتیں ہیں، اس لیے زیر بحث موضوع کا مفہوم آشکار کرنے میں بڑی مدد دیتی ہیں۔

قرآن کریم نے ایک صاحب ایمان کے دماغ میں ایمان ویقین کی روشنی اور ایک کافر کے دماغ میں کفر وگمراہی کی تاریکی کا موازنہ ہمارے ہی تجربوں کے تمثیلی دائرے میں اس طرح کیا ہے کہ اصل مقصد روز روشن کی طرح جگمگا اٹھا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

Marfat.com

﴿اللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ٥﴾ (النور: 35)

''اللہ کی ہستی آسمان اور زمین کی روشنی ہے۔ اس کی روشنی کی مثال یوں سمجھو جیسے ایک قندیل ہے۔ قندیل میں چراغ، چراغ شیشے کے کنول میں، شیشے کا کنول اس قدر صاف اور شفاف جیسے ایک چمکتا ہوا ستارہ، زیتون کے مبارک درخت کے تیل سے اسے روشن کیا گیا، اس کی روشنی نہ تو مشرق کی طرف ہوئی نہ مغرب کے رخ۔ تیل کی صفائی کا یہ حال ہے کہ آگ نہ چھوئے جب بھی یوں لگتا ہے جیسے آپ ہی آپ روشن ہو جائے گا۔ گویا ایک روشنی پر دوسری روشنی جلوہ گر ہو۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنی روشنی کی راہ پر لگا دیتا ہے اور وہ لوگوں کے سمجھنے بوجھنے کے لیے مثالیں بیان فرماتا ہے۔ اس کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں۔''

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ٥ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ﴾ (النور: 39 - 40)

''جنھوں نے کفر کی راہ اختیار کی، ان کے کاموں کی مثال ایسی ہے جیسے سراب...... ریگستان میں نظر کا دھوکا کہ پیاسا اسے پانی سمجھ کر لپکے مگر جب پاس پہنچے تو کچھ بھی نہ پائے۔ ہاں! اللہ کو اپنے پاس موجود پائے جو اس کی بے سود کوشش کا پورا پورا حساب چکا دیتا ہے اور وہ حساب چکانے میں بہت تیز ہے۔ یا پھر ان کی مثال ایسی سمجھو جیسے گہرے سمندر کو لہروں (کی چادر) نے ڈھانک رکھا ہو۔ ایک لہر کے اوپر دوسری لہر اور لہروں کے اوپر بادل چھایا ہوا۔ گویا تاریکیاں ہی تاریکیاں ہوئیں، ایک تاریکی پر دوسری تاریکی۔ آدمی اگر خود اپنا ہاتھ نکالے تو امید نہیں کہ سجھائی دے اور جس کسی کے لیے اللہ نے اجالا نہیں کیا تو پھر اس کے لیے روشنی میں کیا حصہ ہو سکتا ہے؟''

قرآن کریم کے ان ارشادات میں پہلی مثال کا جائزہ لیجیے۔ قندیل کی روشنی کئی اسباب و موثرات کا مخلوط مظاہرہ ہے۔ قندیل کا ہر عامل اپنی قوت کا اثر دکھاتا ہے اور قندیل کے اجالے میں اضافہ کر دیتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ایک صاحب ایمان ویقین اپنے سامنے ایسے عوامل پاتا ہے جو اس کے دماغ کو منور کر دیتے ہیں۔ اس کی فطرت سلیم اور اس کا شعور باطن کی روشنی سے پہلے ہی جھلملا رہا ہوتا ہے۔ ایسے میں جب اس کے سامنے حرف وحی آتا ہے تو یہ نور علیٰ نور کا منظر ہوتا ہے۔ جب درخشانی [1] کا عالم یہ ہو تو پھر اس کی راہ پر گمراہی کا کوئی اندھیرا اس کی راہ کھوٹی نہیں کر سکتا۔ پھر

---

[1] درخشانی: چمک دمک۔

Marfat.com

اس کے قدم صراط مستقیم کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

اس کے برعکس ایک کافر کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ گھٹا ٹوپ اندھیروں کی تہ میں پڑا ہوتا ہے۔ اس کے باطن میں روشنی کی کوئی ٹمٹماتی کرن بھی نہیں ہوتی۔ اس کا ذہن ہر قسم کے اناپ شناپ ترنگوں ❶ اور گڑبڑ گھٹالے ❷ کی باتوں کی طرف لپک پڑتا ہے۔ وہ آسمانی ہدایت سے محروم ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اس قابل ہی نہیں رہتا کہ وہ اللہ نور السموات والارض کی ذات عالی سے روشنی کی ایک جھلک بھی پا سکے۔ اس کے سارے نام نہاد اچھے کام محض سراب ثابت ہوتے ہیں جن کا صلہ ملنے کا کبھی کوئی امکان نہیں۔ سورہ یونس کی 24 ویں آیت اور سورہ الحدید کی 20 ویں آیت میں دنیا کی کھوکھلی زندگی کی پرکشش تفصیلات کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور ہمارے ہی تجربے سے گزری ہوئی ایک حقیقت بطور عبرت بیان کی گئی ہے۔ یعنی ہم ایسے دلکش باغ کی لگن میں لگے رہتے ہیں جو ہماری آرزوؤں کا نگار خانہ ہوتا ہے۔ جب کہ دنیاوی باغ کی حقیقت یہ ہے کہ اس پر قدرتی آفتیں ٹوٹ پڑتی ہیں اور تمناؤں کی لہلہاتی فصل کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیتی ہیں۔ قرآن کریم بنی نوع انسان کو اس طرح کی مثالوں سے اپنا پیغام نہایت اثر انگیز اسلوب میں دیتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ قرآنی نقطۂ نظر کے مطابق مظاہر فطرت نہایت اہم پیغام کے حامل ہیں۔ یہ دنیا پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ اور کلی اقتدار کا نشان ہیں۔ یہ اللہ رب العزت کی یگانہ شان اور اس کے وحدہ لاشریک ہونے کی گواہی ہیں۔ یہی وہ علامات ہیں جو یوم قیامت کی نشان دہی کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ مناظر اس دنیا میں قدرت کے لاگو قوانین کی دلیل ہیں۔ ان کا پیغام یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کو اللہ تعالیٰ کا شکر گزار اور اطاعت گزار بن کر رہنا چاہیے۔ دنیا میں زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ یہی ہے۔

حتمی بات:

مسلمان سائنس دانوں کا یہ موقف کہ قرآن کریم سائنسی حقائق کا حوالہ دیتا ہے، سچائی سے خالی نہیں۔ یہ موقف نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے سائنس دانوں کا موقف اپنی جگہ بہر حال جو ہے سو ہے، لیکن خود قرآن کریم کا موقف یہ ہے کہ سائنسی پہلوؤں کے مناظر درحقیقت غور و فکر کا سامان ہیں۔ یہ ہمیں ایک اعلیٰ حقیقت کے ادراک واحساس کی دعوت دیتے ہیں۔ ہمیں ایسا نتیجہ اخذ کرنا چاہیے جو قرآنی پیغام حقیقت کا آئینہ دار بھی ہو اور اس کی بدولت مسلمان سائنس دانوں کی تشفی کا اہتمام بھی ہو جائے مثلاً:

1۔ پہلی بات یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک سائنس کوئی لادینی عنصر یا دنیاوی چیز نہیں ہے بلکہ یہ تو انسان پر اللہ تعالیٰ کی عنایات میں سے ایک اہم عنایت ہے۔ انسان کو اس دنیا میں سائنس کی نعمت اس لیے عطا کی گئی ہے کہ وہ انسان کی خدمت اور راحت رسانی کا وسیلہ بن جائے۔ سائنس اللہ تعالیٰ کے وحدہ لاشریک ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔ سائنس انسان پر اللہ تعالیٰ کے حقوق و فرائض کی دلیلوں سے لبریز ہے۔ اس لیے مغربی تہذیب کا یہ دعویٰ

❶ ترنگ: خواہش، وہم، شیخی۔ ❷ گڑبڑ گھٹالا: گڈمڈ خیالات۔

Marfat.com

کہ وہ سائنسی بنیادوں پر قائم ہے، بے بنیاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب کی مروجہ سائنسی تہذیب دنیاوی مقاصد کے بوجھ سے پچک گئی ہے اور انسانی زندگی کے لیے روز بروز خطرناک بنتی چلی جارہی ہے۔

2۔ دوسری بات یہ ہے کہ سائنس بجائے خود کوئی مقصود نہیں ہے بلکہ یہ تو اس دنیا کے حقائق جاننے پہچاننے کا وسیلہ ہے۔ سائنس کا سب سے پہلا اور فوری سبق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات عالی اور اس کی صفات کو پہچانا جائے۔ اللہ تعالیٰ اپنی تخلیقات کے پردے میں خود اپنی ذات ستودہ صفات [1] کو منکشف فرماتا ہے، اس لیے نت نئی حقیقتوں کی دریافت کا عمل سائنس دانوں کو اللہ رب العزت سے قریب تر کر دینے کا ذریعہ بننا چاہیے، اور ہر وہ نئی ایجاد جو زندگی کو آسان اور راحت بخش بنائے، اس کا اولین تقاضا یہ ہے کہ اس سے فائدہ اٹھانے والے اللہ تعالیٰ کے زیادہ سے زیادہ شکرگزار بندے بن جائیں۔

جس طرح مظاہر فطرت ایک خاموش پیغام کے حامل ہیں، اسی طرح سائنس بھی مظاہر فطرت کی ترجمان ہے۔ اس لیے سائنس کو بھی لامحالہ ایک پیغام کا حامل ہونا چاہیے۔ اسے اندھی، گونگی اور بہری طاقت بننا زیبا نہیں۔ اس مقصد کے لیے یہ بات شرط لازم کی حیثیت رکھتی ہے کہ سائنس کو مذہب کی چھاؤں میں پڑھایا جائے۔ سائنس پر لکھی گئی اخلاقی روح سے محروم کتابیں اندیشے سے خالی نہیں۔ ایسی کتابیں بجائے خود بہت بڑے خلل اور جہالت کا باعث بن سکتی ہیں۔ یہ کتابیں سائنس کی منطق کو لنگڑا، لولا اور انسانیت کو خدائے مقدس کی رحمتوں سے محروم کردیں گی۔

حرف آخر یہ کہ مسلمان سائنس دانوں کو قرآن کریم کی آیات سے سائنسی پہلو اخذ کرنے میں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ آپ کی نگاہ شوق قرآنی آیات میں سائنسی اہمیت کے اجزاء ہی ڈھونڈتی رہے گی تو یہ اندیشہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن کریم کے متن اور سیاق وسباق کی رو سے اصل مفہوم کا رشتہ آپ کے ہاتھ سے چھوٹ سکتا ہے۔ خدا نہ کرے ایسا ہو ورنہ مغربی سائنس کی طرح اسلامی سائنس کا حلیہ بھی بگڑ جائے گا۔ اس لیے ہمارے پر جوش مسلمان سائنس دانوں کو یہ بات شرط لازم کے طور پر یاد رکھنی چاہیے کہ وہ اصلی قرآنی تصور کو ہر چیز پر مقدم رکھیں۔

(انگریزی سے اردو ترجمہ: احمد کامران)

[1] ستودہ: تعریف کیا گیا۔ ستودہ صفات: قابلِ تعریف صفتیں۔

Marfat.com

سائنسی تلاش کے مقاصد... قرآن کے نقطۂ نظر سے

یہ بڑی اہم اور معنی خیز حقیقت ہے کہ قرآن کریم نے عقل وشعور کو مذہب کی بنیاد کی حیثیت سے بیان فرمایا ہے۔ قرآن کا ایک پرشوق طالب علم کلام الٰہی کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ اس کتاب حکیم کے زیادہ تر مطالب ومفاہیم تین سچائیوں پر مشتمل پاتا ہے:

(1) خدائے بزرگ وبرتر کی صفات (2) رسولوں کی بعثت اور ذمہ داریاں

(3) امور آخرت

یہی تین موضوعات ہیں جو قرآن کے اوراق پر جابجا جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے جو حیرت انگیز حقیقت آشکارا ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ قرآن کہیں بھی اپنے ناظر پر اپنے مطالب ومفاہیم ٹھونسنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس کے برعکس قرآن کا طریق تفہیم یہ ہے کہ وہ اپنی بیان کردہ سچائی کی گواہی ان روشن دلیلوں سے دیتا ہے جو فطرت اور خود انسان کی نفسیات سے عیاں ہیں۔ اس راہ پر آگے قدم بڑھائیے۔ آپ کو ایک اور حیران کن منظر نظر آئے گا، وہ یہ کہ جب رسالت مآب ﷺ سے ان کے سامعین نے یہ کہا کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں اس کی سچائی کے ثبوت میں ذرا ہمیں خدائی ظہور اور فرشتوں کا کوئی معجزہ دکھلائیے تاکہ ہم آپ پر ایمان لے آئیں تو قرآن کریم نے اس قسم کے مطالبات یہ کہہ کر مسترد کر دیئے کہ ماضی میں بھی کوئی معجزہ منکرین کو قائل نہیں کر سکا۔

پس قرآن کے نزدیک حقائق کے اثبات وتوضیح کے لیے عقلی دلیل کی روشنی ناگزیر ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَ مَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ وَ اٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا وَ مَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا﴾ (بنی اسرائیل: 59)

''اور ہمیں کوئی بات نشانیاں بھیجنے سے نہیں روک سکتی سوائے اس کے کہ پچھلے زمانے کے لوگوں نے انھیں جھٹلایا۔ ہم نے قوم ثمود کو اونٹنی دی تھی۔ وہ ایک درخشاں نشانی تھی۔ لیکن انھوں نے اونٹنی پر ظلم ڈھایا اور ہم نشانیاں (سرکشوں کو) ڈرانے کے لیے ہی بھیجتے ہیں۔''

قرآن کریم کا قرینہ یہی ہے۔ وہ اپنی اتباع کے لیے صاحب شعور انسان کو اس کے سب سے بڑے وصف یعنی عقل وشعور سے جدا دیکھنا نہیں چاہتا۔

Marfat.com

فطرت کی نشانیوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ مظاہر فطرت ہمیں سائنٹفک تحقیق و جستجو کی دعوت دے رہے ہیں اور قرآن کے اکثر دلائل فطرت ہی کی نشانیوں کے حوالے پر مبنی ہیں۔ قرآن اپنی دلیلیں علم ہیئت، طبقات الارض، علم نباتات، علم الابدان اور موسموں کے تغیر و تبدل کے حوالوں سے دیتا ہے۔ اصحاب علم و نظر نے اس موضوع پر 750 آیات مقدسہ کی نشاندہی کر کے انھیں دلیل ٹھہرایا ہے۔

موریس بوکائے (Maurice Bucaille) [1] کے مطابق قرآن کریم میں ایک حرف بھی ایسا نہیں ہے جس کی صحت و صداقت پر جدید سائنسی علوم کی روشنی میں کوئی انگشت اعتراض اٹھائی جا سکے۔ قرآن کریم نے جہاں جہاں اس قسم کے کلیدی اہمیت کے مناظر کی طرف اشارہ کیا ہے، ان کے پیش نظر مسلمان سائنس دانوں کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوتی ہے کہ ایسا سائنٹیفک لٹریچر ظہور میں آنا چاہیے۔

قرآن کریم سائنٹیفک تحقیق و جستجو کی بڑی حوصلہ افزائی فرماتا ہے، اس لیے کہ یہ طریقہ حقیقت شناسی کے لیے مجرد اعتقاد سے زیادہ موثر ہے۔ اس قسم کی اساسی اہمیت کا کوئی مضمون ایسا نہیں جسے قرآن کریم نے وضاحت سے نہ بتلا دیا ہو۔ سائنسی تحقیق و جستجو کے لیے باریک بین مشاہدہ ضروری ہے۔ اس کے لیے عقل و شعور کی ضرورت بالکل عیاں ہے۔ اسی طرح نتائج کے استنباط اور محتاج ثبوت دعووں کی صحت کے اظہار و اعلان کے لیے بھی فراست درکار ہے۔ اس عمل میں انسان بالعموم مادی محاصل [2] پر دھرنا دے بیٹھتا ہے اور یہ کیفیت بجائے خود ایک مقصد کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس کے مضمون کو بالعموم ایک آزاد، لادین اور دنیاداری کی چیز سمجھا جاتا ہے۔ دوسری طرف قرآن کریم بھی بلاشبہ فہم و فراست کو بروئے کار لانے پر زور دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ عقل رسا کے لیے زیادہ تفصیل اور توضیح طلب افعال کی وضاحت بھی کرتا ہے۔ یوں ہمیں ایسا اچھوتا سائنسی نقطۂ نظر دستیاب ہو جاتا ہے جو عام جانے پہچانے طور طریقوں سے بہت مختلف ہے۔

اب دیکھیے قرآن کریم اس موضوع کو کس طرح آگے بڑھاتا ہے۔ قرآن کریم ہم پر زور دیتا ہے کہ ہم سننے اور دیکھنے کی صلاحیتوں سے ان کے نقطۂ عروج تک کام لیں۔ قرآن کا فرمان ہے:

﴿وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ ابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ۝﴾ (الروم: 23)

''اور اس کی نشانیوں میں سے رات کو اور دن کو تمھارا سو جانا اور اس کا فضل تلاش کرنا ہے۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں جو سننے والے ہیں۔''

---

[1] ڈاکٹر موریس بوکائے (98-1920ء) فرانسیسی نومسلم نے ''بائبل، قرآن اینڈ سائنس'' لکھ کر شہرت حاصل کی۔ وہ شاہ فیصل اور انور سادات کے فیملی فزیشن بھی رہے۔

[2] محاصل: حاصل شدہ معلومات۔

Marfat.com

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُزْجِیْ سَحَابًا ثُمَّ یُؤَلِّفُ بَیْنَهٗ ثُمَّ یَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ وَیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِیْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَیُصِیْبُ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ وَیَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ یَّشَآءُ یَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ یَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ o یُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ﴾ (النور: 43 - 44)

”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ بادلوں کو چلاتا ہے، پھر انھیں آپس میں ملا دیتا ہے، پھر انھیں تہ در تہ کر دیتا ہے اور پھر تم ان میں سے بارش ہوتے دیکھتے ہو۔ وہ انھیں آسمان سے پہاڑوں پر بھیج دیتا ہے، ان سے اولے برساتا ہے، پھر انھیں جس پر چاہتا ہے برساتا ہے اور جس سے چاہے ہٹائے رکھتا ہے۔ اس کی بجلی کی چمک نظروں کو اچکے لیے جاتی ہے۔ اللہ دن رات کو بدلتا رہتا ہے۔ بے شک اس میں اہل نظر کے لیے ایک سبق موجود ہے۔“

یہ دیکھنا اور سننا کوئی محدود چیز نہیں ہے۔ نہ یہ محض ظواہر بینی کے لیے بروئے کار لانے کی صلاحیتیں ہیں بلکہ یہ نتائج اخذ کرنے اور سبق حاصل کرنے کے وسیلے بھی ہیں۔

اس سے آگے ذہنی صلاحیتوں کا کردار بھی آتا ہے۔ قرآن کریم یہ نہیں چاہتا کہ ایک سائنس دان اس دنیا میں اپنی تحقیق و جستجو کے لیے محض مادی نوعیت کے وسائل کا اسیر بنا رہے۔ سائنس کی دنیا میں تو یہی مادی وسائل تحقیق و تفتیش کا حتمی ذریعہ باور کیے جاتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم کی نظر میں ایک سچا سائنس دان اور جویائے حقیقت وہ شخص ہے جو عقل، فقہ، عبرہ، تذکر اور تفکر کو بروئے کار لائے اور ذہنی سرگرمیوں کی حالت نمایاں کر دے۔

عقل:

ولیم لین کہتا ہے کہ عقل تجسس، تفہیم، فراست اور شعور کو اجاگر کرتی ہے۔ اشیاء کے معیار کا علم حاصل کرنے کی اہمیت جتاتی ہے اور ان کی بھلائی یا برائی سے آگاہ کرتی ہے۔ ہر سائنس دان کو اپنی تحقیق و تفتیش کے لیے لامحالہ عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے عقل کی صفت کو بروئے کار لانے کے سلسلے میں یہ ارشاد فرمایا ہے:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّ تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ﴾ (البقرہ: 164)

”بے شک آسمانوں اور زمین کے بنانے میں، رات اور دن کے چھوٹے بڑے ہونے میں اور ان کشتیوں میں جو سمندر میں ایسی چیزیں لے کر چلتی ہیں جو لوگوں کو نفع دیتی ہیں، اس پانی میں جو اللہ آسمان سے اتارتا ہے اور جس سے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کرتا ہے اور اس میں ہر طرح کے جانور پھیلا دیتا ہے، ہواؤں کے فراٹوں میں اور آسمان و زمین کے مابین قابو شدہ بادل میں صاحب عقل لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔“

Marfat.com

یہ آیت فطرت میں ادھر ادھر پھیلے ہوئے تفرقات کی بجائے دراصل فطرت کی ہم آہنگی کو نمایاں کرتی ہے۔ یہ آیت قادر مطلق کی آشکار قدرت کاملہ اور فضل و کرم کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ انسان اس آیت پر غور تو کرے۔ اس آیت میں جو فطری مظاہر بتائے گئے ہیں انسان ان پر سوچ بچار کرے تو اسے اپنی عقل و بصیرت کی رہنمائی کے لیے بڑی کامل ہدایت نصیب ہوگی۔

فقہ:

فہم وادراک کے ذریعے کسی چیز کی حقیقت جاننے کا عمل فقہ کہلاتا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ علم فراست کا ماحصل ہوتا ہے لیکن فقہ دل ودماغ کے باہمی عمل کا نام ہے جو جذبات ومحسوسات سے لبریز ہوتا ہے...... یوں فقہ مادی محاصل سے ماوراء امور کی تحقیق وجستجو کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں اس شخص پر عیاں نہیں ہوسکتیں جس کا سب سے بڑا مقصود صرف مادی نوعیت کی تحقیق وجستجو ہو۔ تفہیم کی اس صلاحیت کے استعمال کے بارے میں اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا گیا ہے:

﴿وَ هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسۡتَقَرٌّ وَّ مُسۡتَوۡدَعٌ قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّفۡقَهُوۡنَ۝﴾ (الانعام: 98)

''اور وہی ہے جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا۔ پھر ایک ٹھہرنے کی جگہ ہے اور ایک سونپے جانے کی جگہ ہے۔ ہم نے غور وفکر کرنے والوں کے لیے (اپنی) آیات کھول کر بیان کردی ہیں۔''

اس آیت میں اللہ وحدہ لاشریک کی وحدانیت اس دلیل سے بتا دی گئی ہے کہ دنیا میں انسانوں کی بھانت بھانت کی نسلیں موجود ہیں مگر ان سب کی ضروریات کی کفالت ایک کامل اور بے داغ منصوبہ بندی کے تحت ہو رہی ہے۔ یہ عمل یقیناً ایک اللہ انجام دے رہا ہے۔

عبرہ:

عبرہ کا مطلب ایسی گواہی ہے جس کے ذریعے آدمی ایک دیکھی بھالی معلوم بات سے آگے گزر کر وہ بات معلوم کر لیتا ہے جو مشاہدے میں نہیں آتی۔ اس طرح آدمی دیکھے بھالے حقائق سے سبق حاصل کرتا ہے۔ ''عبرہ'' کی وضاحت اس آیت سے ہو جاتی ہے جہاں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کس طرح آنتوں اور خون کے بیچ سے پاک صاف دودھ باہر لے آتا ہے:

﴿وَ اِنَّ لَكُمۡ فِی الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَةً ؕ نُسۡقِیۡكُمۡ مِّمَّا فِیۡ بُطُوۡنِهٖ مِنۡۢ بَیۡنِ فَرۡثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیۡنَ﴾ (النحل: 66)

''اور چوپایوں میں بھی یقیناً تمھارے لیے ایک سبق موجود ہے۔ ہم تمھیں اس میں سے جو ان کے پیٹ میں گوبر اور خون کے مابین ہوتا ہے، پینے والوں کو خالص اور خوشگوار دودھ پلاتے ہیں۔''

Marfat.com

یہ آیت اللہ تعالیٰ کی نفع رسانی کی نشانی بیان کرتی ہے کہ وہ کتنا بڑا نقشہ ساز ہے اور کس طرح نازک نازک چیزوں سے کیسے کیسے محیر العقول نتائج پیدا کرتا ہے۔

تذکر:

تذکر کا مطلب ولیم لین نے ''کسی چیز کے بارے میں یاددہانی'' بتلایا ہے۔ قرآن کریم بھی یہی مفہوم بتاتا ہے۔ اس کے نزدیک اعتقاد کی معیت کے ساتھ یادآوری کا نام تفکر ہے۔ انسان کو تمام حقائق کا علم عطا کر دیا گیا ہے، مگر وہ اکثر ان حقائق کو بھول جاتا ہے۔ دنیا میں جابجا پھیلی ہوئی قدرت کی نشانیاں اسے بھولی بسری حقیقتیں ازسرنو یاد دلا دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر کوئی شخص یوم قیامت کا قائل نہیں ہے تو اسے چاہیے کہ وہ بنجر زمین کی طرف دیکھے اور غور کرے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ بارش برسا کر بے آب وگیاہ زمین کو ازسرنو زندگی کی شادابی عطا کر دیتا ہے۔ اسی طرح ایک اور مثال پر غور کرے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا جوڑا بنایا ہے۔ جوڑے ایک دوسرے کے لازم وملزوم ثنا خواں ہیں۔ اگر اس دنیا کی زندگی ناہموار دکھائی دیتی ہے اور اس ناہمواری کا کوئی جواز دستیاب نہیں ہوتا تو پھر انسان حیات بعد ممات کے بارے میں کیوں نہ سوچے؟ جو اپنے دامن میں اس دنیا کے لیے دادودہش [1] کا خزانہ رکھتی ہے۔

مندرجہ ذیل آیات میں سائنس دانوں کو تذکر کی صلاحیت بروئے کار لانے کی دعوت دی گئی ہے:

﴿وَ اَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ وَ اَنْھٰرًا وَّ سُبُلًا لَّعَلَّکُمْ تَھْتَدُوْنَ ○ وَ عَلٰمٰتٍ وَ بِالنَّجْمِ ھُمْ یَھْتَدُوْنَ ○﴾ (النحل: 15-16)

''اور اس نے پہاڑ کھڑے کر دیے تاکہ زمین تمھیں لے کر ڈول نہ جائے اور دریا اور راستے بنائے تاکہ تمھیں راہ مل جائے اور (ہماری دوسری) نشانیاں بھی ہیں اور ستاروں سے بھی لوگ راہ پا لیتے ہیں۔''

اس آیت کی رو سے وہ شخص بڑا نادان ہے جو وحدہ لاشریک قادر مطلق کے ساتھ کسی اور کو معبود جانے اور اس کا شریک ٹھہرائے، جب کہ اس وحدہ لاشریک کی صفات میں کوئی شریک وسہیم نہیں ہے۔

تفکر:

ولیم لین کے مطابق کسی چیز کا مفہوم پانے کے لیے بار بار غوروفکر کرنا یا کسی نامعلوم چیز کی پہچان کے لیے اس کے بارے میں معلوم حقائق کو دماغی طور پر مرتب کرنا 'فکر' کہلاتا ہے۔ اس لحاظ سے مختلف مظاہر وحوادث میں پوشیدہ رمزودانش تک پہنچ جانے کے لیے غوروفکر کو 'تفکر' کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے غوروفکر کرنے والوں کے لیے عظیم انعامات کا وعدہ فرمایا۔ یہ عمل انسان کے شعور کو زندگی میں مابعد الطبیعیاتی عملداری تک پہنچا دیتا ہے۔ اس طرح وہ اس کائنات میں اللہ رب العزت کی موجودگی کا احساس وادراک کرنے لگتا ہے۔ وہ جان جاتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر اللہ تعالیٰ کے قوانین کارفرما ہیں۔ مزید برآں اس پر یہ حقیقت بھی عیاں ہوجاتی ہے کہ وہ مرنے کے بعد یوم حشر میں

---

[1] دادودہش: دادن (دینا) مصدر سے داد (دیا) اور دہش (دینا) ہے اور مرکب عطفی ''دادودہش'' کے معنی ہیں: عطا، سخاوت۔

Marfat.com

دوبارہ جی اٹھے گا۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَ اَوۡحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحۡلِ اَنِ اتَّخِذِیۡ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعۡرِشُوۡنَ ○ ثُمَّ کُلِیۡ مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسۡلُکِیۡ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا یَخۡرُجُ مِنۡ بُطُوۡنِہَا شَرَابٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُہٗ فِیۡہِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ○﴾ (النحل: 68 - 69)

''اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کو سوجھ بوجھ دی کہ پہاڑوں اور درختوں اور جو چھتریاں لوگ بناتے ہیں، ان میں گھر بنا۔ پھر ہر طرح کے پھل کھا اور اپنے رب کے مقرر کردہ آسان راستوں پر نکل چل۔ ان کے پیٹ سے طرح طرح کے رنگوں کا شربت نکلتا ہے جس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔ بے شک اس میں غور و فکر کرنے والے لوگوں کے لیے ایک نشانی ہے۔''

شہد کی مکھی نہایت پیچیدہ عمل اور سخت محنت سے شہد تیار کرتی ہے جس سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے۔ چنانچہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ محض شہد ہی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی کتنی نمایاں نشانی ہے۔

ایک اور آیت میں فرمایا گیا ہے:

﴿اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الۡاَنۡفُسَ حِیۡنَ مَوۡتِہَا وَ الَّتِیۡ لَمۡ تَمُتۡ فِیۡ مَنَامِہَا فَیُمۡسِکُ الَّتِیۡ قَضٰی عَلَیۡہَا الۡمَوۡتَ وَ یُرۡسِلُ الۡاُخۡرٰۤی اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ○﴾

(الزمر: 42)

''اللہ جان کو موت کے وقت اور جو فوت نہیں ہوئے ان کی جان کو ان کی نیند میں قبض کر لیتا ہے۔ پھر جس کی موت کا فیصلہ ہو جاتا ہے اسے روک لیتا ہے اور دوسری جان کو ایک مقررہ مدت تک کے لیے رہائی دیتا ہے۔ بے شک اس (عمل) میں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں کئی نشانیاں ہیں۔''

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی زندگی اللہ تعالیٰ ہی کے زبردست قبضۂ قدرت میں ہے۔ محض سونے اور جاگنے ہی کے عمل کے ذریعے انسان روزانہ روز قیامت کو جی اٹھنے کا آموختہ دہراتا ہے۔

قرآن کریم کی رو سے ''تفکر'' ہر سائنس دان کی سعی بلیغ ہونی چاہیے۔ اگر ایک سائنس دان غور و فکر کی صلاحیت صحیح ڈھنگ سے بروئے کار لائے تو اس پر وہ حقائق بے نقاب ہو جائیں گے جو انسان کے مستقبل کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس طرح وہ یہ حقیقت بھی سمجھ لے گا کہ یہ کائنات محض اسباب و موثرات کا بے ترتیب اور گڈمڈ مجموعہ نہیں ہے۔ نہ یہ کائنات اچانک کسی حادثے کے نتیجے میں ظہور میں آئی ہے۔ اس کے برعکس اسے صاف معلوم ہوگا کہ اس دنیا کے نقشے کی تشکیل میں کوئی زبردست صاحب ادراک قوت کارفرما ہے۔ یہ نقشہ ہر لحاظ سے اس قدر مکمل اور زبردست عقل و دانش کا ایسا مظہر ہے جو ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کر رہا ہے کہ اس دنیا کو بڑے زبردست دانا قادر مطلق اللہ ہی نے پیدا فرمایا ہے۔ وہ ایسی غالب و کارآفرین ہستی ہے جس کی مرضی اپنی ہر مخلوق پر غالب ہے۔ چوں کہ وہ نہایت حکیم اور

Marfat.com

دانا ہے، اس لیے اس نے اس دنیا کو لہو ولعب کے لیے پیدا نہیں کیا۔ یہاں کی ہر چیز فنا پذیر ہے اور یہ دنیا بالآخر اپنے خاتمے کو پہنچے گی۔ انسان اس دنیا میں طرح طرح کی نفع بخش چیزوں سے خوب فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسے یقیناً اپنے خالق ومالک کے روبرو جواب دینا پڑے گا۔ اگر وہ رب العزت کے منشا کے مطابق زندگی کے تقاضے پورے نہیں کرے گا تو اسے یقیناً سزا بھی ملے گی۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ وہ حتمی حقائق ہیں جن تک ایسا سائنس دان لامحالہ پہنچ کر رہے گا جو تحقیق وتجسس کا عمل قرآنی تعلیمات کی روشنی میں انجام دیتا ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ۙ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ (آل عمران: 190 - 191)

''(بے شک) آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کی آمدوشد میں عقل مندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ وہ (لوگ) جو اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے یاد کرتے ہیں اور آسمان اور زمین کی پیدائش پر غور کرتے ہیں (جو پکار اٹھتے ہیں) ہمارے رب! تو نے یہ کارخانہ بے مقصد نہیں بنایا۔ تو پاک ہے۔ ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔''

قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

﴿تِلۡکَ اٰیٰتُ اللّٰہِ نَتۡلُوۡہَا عَلَیۡکَ بِالۡحَقِّ ۚ فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَ اللّٰہِ وَ اٰیٰتِہٖ یُؤۡمِنُوۡنَ﴾

(الجاثیہ: 6)

''یہ اللہ کی نشانیاں ہیں جو ہم تجھے سچائی کے ساتھ سنا رہے ہیں۔ پھر وہ اللہ اور اس کی نشانیوں کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے؟''

اس آیت کی تفسیر میں قرآن کریم کے جید مفسر مولانا اصلاحی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اس آیت میں لفظ 'الحق' متذکرہ بالا علامات پر غور وفکر کے نتیجے کی طرف واضح اور مدلل اشارہ کرتا ہے۔ جہاں تک علامات پر محض سوچنے کی بات ہے، لوگ یقیناً سوچ بچار کرتے ہیں۔ لیکن ان کی سوچ بچار بڑے محدود اور مخصوص مقاصد کے لیے ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ ان حقائق کے پاس پھٹکنے بھی نہیں پاتے جن کی طرف یہ علامات دعوت غور وفکر دیتی ہیں۔ اور اگر وہ ان حقائق تک رسائی حاصل کر بھی لیں تو وہ انھیں اپنے منشا اور مقصد کے خلاف پاتے ہیں، اس لیے انھیں بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بلاشبہ ایک ماہر فلکیات آسمان کی علامتوں پر غور وفکر کرتا ہے۔ ایک ماہر طبقات الارض زمینی حقائق پر توجہ کی نگاہ ڈالتا ہے۔ ایک ماہر علم الابدان انسانی بدن کے اعضاء و جوارح کا تحقیقی مطالعہ کرتا ہے۔ ایک عالم حیوانیات چوپایوں کی زندگی کے مختلف مراحل کا جائزہ لیتا ہے۔ ایک ماہر موسمیات دن رات کے الٹ پھیر سے بہت کچھ اخذ کرتا ہے۔ وہ

Marfat.com

ہواؤں کے رخ پہچانتا ہے، رفتار کا پتہ چلاتا ہے اور موسمی حالات کا اندازہ لگالیتا ہے لیکن ان سب لوگوں کا انداز غور وفکر نہایت محدود ہے۔ یہ لوگ چھوٹی سے چھوٹی حقیر چیزوں کی جانچ پرکھ کے لیے بڑی بڑی دوربینیں اور خرد بینیں استعمال کرتے ہیں لیکن وہ اس ساری تگ ودو کے باوجود نہایت عظیم الشان حقائق سے بے خبر ہی رہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایک ماہر موسمیات یہ پیش گوئی ضرور کردے گا کہ آنے والا دن فلاں فلاں وجوہ کے باعث گرم اور خشک رہے گا۔ ایسی پیش گوئیاں عام طور پر صحیح ثابت ہوتی ہیں اور ان کے اسباب وعوامل بھی ٹھیک ٹھیک بتلا دیے جاتے ہیں۔ لیکن یہ سارا جائزہ اور مشاہدہ بے حد محدود ہے۔ اس کا مقصد موسم کے مطالعے کے سوا اور کچھ نہیں۔ ایک ماہر موسمیات یقیناً موسم کا تغیر وتبدل جان بھی لے گا اور بتا بھی دے گا مگر اسے اس ننھی سے بات سے کہیں زیادہ ارفع واعلیٰ یہ حقیقت جاننے کا خیال بھی نہیں آتا کہ موسموں کو بدلنے، الٹنے اور پھیر دینے والا کون ہے؟ اس کے حقوق کیا ہیں اور فرائض کیا ہیں؟ جب کہ اس معاملے کی اصل حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اس دنیا میں جتنی بھی نیرنگیاں اور تغیر وتبدل دکھائی دیتا ہے اس کا مقصد انسان کو متذکرہ بالا سوال کی طرف متوجہ کرنا ہے اور اس پر لازم ہے کہ وہ اس سوال کا جواب ڈھونڈے۔ اگر کوئی اور شخص اسے اس سوال کا معقول جواب مہیا کردے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اسے مانے اور اسی کے مطابق عمل کرے۔"

جب ہم جدید سائنس کا جائزہ قرآن کریم کی روشنی میں لیتے ہیں تو صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ تفکر، تذکر اور عبرہ کی خصوصیات سے بالکل کوری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مابعد الطبیعیات، مذہب اور اخلاق کی برکتوں سے محروم ہے، سائنس دان رب ذوالجلال کو بھول گیا ہے اور اس دنیا میں اپنی اصل حیثیت سے بے خبر ہے۔ اسے زندگی اور موت کی حقیقتوں کا کبھی دھیان ہی نہیں آتا۔ اس کے باطن میں کوئی روشنی نہیں ہے جو اسے سیدھی اور سچی راہ دکھائے۔ وہ مایوسی اور کلفت [1] کا پیامبر بن گیا ہے۔ وہ علم کے دفینے تباہی وبربادی کے مقاصد کے لیے کھود رہا ہے۔ اور انسان سائنس دانوں کے کرتوتوں کے نتیجے میں آنے والی تباہی بربادی سے ہراساں ہے۔ انسانیت کی نجات صرف اس امر پر موقوف ہے کہ سائنسی تحقیق وجستجو کے لیے قرآن کریم کی مہیا کردہ روشنی سے فائدہ اٹھایا جائے۔

(انگریزی سے اردو ترجمہ: احمد کامران)

---

[1] کلفت: ناہمواری، رنج، تکلیف۔

Marfat.com

سائنس کا صحیح طریقِ کار

مسلمانوں کے علاقوں پر مغربی اقوام کے تسلط کے دور میں مسلمان دانشوروں نے اسلامی تعلیمات کے بارے میں ایک معذرت خواہانہ رویہ اختیار کر لیا تھا۔ وہ ان کے جدید علوم سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ اپنی کمزوری کا سبب اسلامی تعلیم کو سمجھا اور بعض ایسی بدیہی چیزوں کا انکار کر بیٹھے جو اگرچہ قرآن مجید سے ثابت تھیں لیکن مغرب کے عقلیت پسند ان کو نہیں مانتے تھے۔ جب سے مغربی اقوام کا استیلا ختم ہوا ہے اور مسلمانوں کو ان علوم سے خود بہرہ ور ہونے کا موقع ملا ہے جو پہلے صرف مغربی اقوام کی دسترس میں تھے، نہ صرف ان کے معذرت خواہانہ رویے میں تبدیلی آئی ہے بلکہ گمان ہوتا ہے کہ اب وہ دوسری انتہا کی طرف چل پڑے ہیں۔ اس کی ایک واضح علامت مسلمان سائنس دانوں کی یہ کوشش ہے کہ قرآن مجید کو سائنس کی ایک کتاب کی حیثیت سے سمجھا جائے حتیٰ کہ اس میں بیان کردہ اخلاقی قوانین پر بھی جدید سائنس کے طبعی قوانین کا اطلاق کر کے ان کی نئی توجیہات پیش کی جائیں، ہمارے نزدیک ان سائنس دانوں کا یہ جذبہ تو قابل قدر ہے کہ اب وہ اسلامی تعلیمات کے بارے میں کوئی معذرت خواہانہ رویہ اختیار نہیں کرنا چاہتے اور قرآن مجید کو اپنی رہنما کتاب کی حیثیت سے ماننا چاہتے ہیں لیکن قرآن مجید کو اس کی اپنی بتائی ہوئی حیثیت سے مختلف کوئی حیثیت دینا خطرے سے خالی نہیں۔

قرآن مجید بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے نازل ہوا۔ یہ ہدایت ان کی عقلی، فکری اور اخلاقی تربیت کے لیے ہے۔ لہٰذا اس میں سب سے زیادہ وہ مسائل زیر بحث آئے ہیں جو فلسفہ مابعد الطبیعیات، عمرانیات اور اخلاقیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان مسائل کا صحیح حل انسان کو اس ایمان و یقین اور اخلاق و کردار سے ہم کنار کر سکتا ہے جو زمین میں اللہ تعالیٰ کی خلافت کا حق ادا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ سائنس کے طبعی قوانین قرآن مجید کا اصل موضوع نہیں ہیں۔ سائنس ایک ایسا میدان ہے جس میں انسان اپنی دنیوی ضروریات کی تکمیل اور حاجات کے حصول کے لیے اپنے اندر زبردست داعیہ [1] رکھتا ہے اور اس میں اس کی عقل کی رہنمائی کافی ہوتی ہے۔ مثلاً قدیم انسان کی سب سے بڑی ضرورت اپنے لیے خوراک کا حصول تھا۔ اسی ضرورت نے اس کی عقل کو مہمیز دی اور اس نے پتھروں اور دھاتوں کے اوزار بنائے جن سے وہ شکار کر سکے یا زمین کو نرم کر کے اس میں اپنی ضرورت کی فصل کاشت کر سکے۔ اس تعلیم کے

[1] داعیہ: خواہش، دعویٰ۔

Marfat.com

لیے کسی آسمانی صحیفے کی ضرورت نہ تھی۔ جوں جوں اس کا مشاہدہ اور تجربہ بڑھتا گیا وہ اس سائنس میں ترقی کرتا گیا۔ آج کے انسان کی زندگی تیز رفتار ہے اور اسے کمپیوٹر جیسے آلات ایجاد کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے تو اس نے اپنی عقل سے بڑے سے بڑا طاقتور کمپیوٹر تیار کرلیا ہے کیوں کہ ایسا کرنے کا داعیہ وہ اپنے اندر پاتا تھا۔ انسان نے مادی ترقی کی تمام منزلیں کسی صحیفۂ آسمانی کے بغیر طے کی ہیں۔

سائنس کی مادی تعلیم کبھی انبیائے کرام کے فرائض منصبی میں شامل نہیں رہی۔ رسول اکرم ﷺ کے فرائض قرآن مجید کی متعدد آیات میں نہایت وضاحت سے بیان ہوئے ہیں۔ ان کے مطابق آپ ﷺ کی ذمہ داری وحی آسمانی کو لوگوں تک پہنچانا، ان کو احکام شریعت اور حکمت کی تعلیم دینا اور ان کے اخلاق و کردار کا تزکیہ کرنا تھا۔ مادی علوم کی تعلیم آپ کی ذمہ داری نہ تھی۔ اس بات کو آپ ﷺ نے واضح طور پر بیان بھی کیا۔ آپ ﷺ کا گزر ایک نخلستان سے ہوا۔ آپ ﷺ نے دیکھا کہ لوگ کھجور کے بعض درختوں کا بور اس کے دوسرے درختوں پر ڈال رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے اس کا سبب پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ اس طرح پھل زیادہ آتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر تم ایسا نہ کرو تو کوئی ہرج نہ ہوگا۔ لوگوں نے حکم کی تعمیل کی۔ اگلے سال پھل کم آیا تو لوگ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بتایا کہ پیداوار میں بے حد کمی واقع ہوئی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اپنے تجربے پر عمل کرو، تم دنیوی امور میں مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔

کھجوروں کا یہ واقعہ جو حدیث کی کتابوں میں تابیر نخل کے واقعے کے نام سے بیان ہوا ہے، ایک خالص سائنسی عمل سے متعلق ہے۔ نر اور مادہ کھجوروں کے بور کا ملاپ بار آوری کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ عام حالات میں قدرتی عوامل مثلاً ہوا، پرندے اور حشرات بور کی منتقلی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ مدینہ منورہ کے کسان یہ کام خود بھی کرتے تھے اور بار آوری مکمل ہوتی تھی۔ یہ ایک سائنسی مشاہدے اور تجربے کا معاملہ تھا۔ آنحضرت ﷺ کا خیال مبارک یہ ہوا کہ اسے قدرتی عوامل پر ہی منحصر رہنا چاہیے لیکن ایسا کرنے سے پیداوار میں کمی واقع ہوگئی تو آپ ﷺ نے اپنی رائے پر اصرار نہیں فرمایا اور ہدایت دی کہ دنیوی امور میں لوگوں کا علم آپ سے زیادہ ہے اس لیے وہ اپنے علم و تجربہ کے مطابق عمل کریں۔

اس امر کے باوجود کہ قرآن مجید سائنس کی کتاب نہیں ہے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآن نے بیسیوں سائنسی حقائق بیان کیے ہیں اور یہ حقائق ہیں بھی ایسے کہ مادی سائنس صدیوں کی مسافت طے کر کے وہاں تک پہنچتی ہے۔ اس حقیقت کو جدید سائنس دانوں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ فرانس کے ایک ڈاکٹر موریس بوکائے (Maurice Bucaille) جن کو قرآن کے اس پہلو نے اتنا متاثر کیا کہ وہ اسلام لے آئے، اپنی کتاب ''قرآن، بائبل اور سائنس'' میں یہ اقرار کرتے ہیں کہ سائنسی دوائر میں قرآن مجید کا کوئی بیان ایسا نہیں جس کو موجودہ ترقی یافتہ سائنس جھٹلا سکے۔ ہر بات نہایت محکم ہے اور کتنی ہی باتیں ایسی ہیں کہ سائنس بعد از خرابیٔ بسیار ان تک اب آ کر پہنچی ہے۔

Marfat.com

سائنسی حقائق پر مشتمل آیات پر ایک مجمل نظر بھی یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ یہ ان آیات میں بیان ہوئے ہیں جن کو قرآن مجید اپنے دلائل آفاقی قرار دیتا ہے۔ یعنی ایسی دلیلیں جو کائنات کے گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی ہیں اور ہر شخص برابر ان کا مشاہدہ کرتا ہے۔ قرآن مجید کے مباحث کے تین بڑے دائرے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، دنیوی زندگی کے اختتام پر حیات اخروی کا وقوع اور ہدایت انسانی کے لیے رسالت کا منصب۔ آفاقی دلائل اصلاً انہی مباحث کی تکمیل کے لیے آئے ہیں۔ انسان سے یہ تقاضا کیا گیا ہے کہ وہ ان دلائل پر غور کر کے ان نتائج تک رسائی حاصل کرے جن کی طرف قرآن مجید رہنمائی دیتا ہے۔ یہ امر کہ یہ آفاقی دلائل کس بات کو ثابت کرنے کے لیے بیان کیے گئے ہیں، ان آیات کے سیاق وسباق سے واضح ہوتا ہے جن میں یہ آئے ہیں۔ گویا نظم قرآن ان کے مدلول [1] پر روشنی ڈالتا ہے۔

سائنسی طریق کار یہ ہے کہ حواس کے ذریعے حاصل ہونے والے شواہد سے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں اور ان نتائج کی صحت کو جانچنے کے لیے تجربات کیے جاتے ہیں۔ جب تجربات سے ان نتائج کی تائید ہو جائے تو ان کو ایک اصول کی حیثیت سے مان لیا جاتا ہے اور اس اصول کو مادی ترقی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس طرح سائنس سمع وبصر کو مشاہدات وتجربات میں اور عقل کو نتائج کے استنباط میں استعمال کرتی ہے۔ قرآن مجید جب دلائل آفاق کا تذکرہ کرتا ہے تو سمع وبصر اور عقل ہی کے استعمال کا تقاضا نہیں کرتا بلکہ تذکر، تفقہ اور عبرت پذیری کا بھی مطالبہ کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید ایک سائنس دان کے اس طریق کار کو کافی قرار نہیں دیتا جو وہ موجودہ سائنس کی رو سے اختیار کرتا ہے بلکہ اس کو آگاہ کرتا ہے کہ حسی مشاہدے سے مادی قسم کے فوائد حاصل کرنے پر ہی وہ اکتفا نہ کرے بلکہ تذکر، تفقہ اور عبرت پذیری کی صلاحیتیں استعمال کر کے اپنی جولان گاہ مابعد الطبیعیاتی دائروں تک وسیع کرے۔

تذکر کے معنی یاد دہانی حاصل کرنا ہے۔ آدمی کسی حقیقت کو بھولا ہوا ہو اور کسی دوسری چیز کے مشاہدہ سے وہ چونک جائے اور اس بھولی بسری حقیقت پر متنبہ ہو جائے تو یہ تذکر ہے۔ قرآن مجید انسان کو جس علم سے آگاہ کرتا ہے اس علم کی تمام اساسات اس کی فطرت میں ودیعت ہیں۔ لیکن دنیا کی دلچسپیوں میں کھو کر وہ ان کو بھول جاتا ہے۔ چوں کہ صحیح علم انسان کی فلاح کے لیے ضروری ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو متنبہ کرنے کے لیے قدم قدم پر ایسے شواہد پیدا فرما دیئے ہیں جن سے اس کو تذکر ہو۔ سورہ اعراف آیت ۱۳۰ کے مطابق قوم فرعون کو تنبہ [2] نہیں ہو رہا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو قحط سالی اور پیداوار کی کمی سے دوچار کیا تاکہ اس کی آنکھیں کھلیں۔ سورہ توبہ آیت ۱۲۶ کے مطابق بندوں کو سال میں ایک دو مرتبہ آزمائش میں مبتلا کیا جاتا ہے تاکہ وہ حقیقت کو بھلا نہ بیٹھیں اور انھیں تذکر

---

[1] مدلول: دلالت کیا گیا۔ دلیل سے ثابت شدہ بات۔

[2] تَنَبُّہ: وارننگ، تنبیہ۔ مُتَنَبَّہ: خبردار کیا ہوا۔

Marfat.com

ہو۔ سورہ زمر آیت ۲۷ کی رو سے اسی تذکر کے لیے قرآن مجید نے ہر اہم بات کو سمجھانے کے لیے تمثیلات بیان فرمائی ہیں۔ نظامِ فطرت کے مشاہدات کو بیان کرتے ہوئے بھی یہ توقع ظاہر کی گئی ہے کہ سائنس دان ان سے تذکر حاصل کریں گے یعنی ان کی نگاہیں محض مادی فوائد پر مرتکز نہیں ہو جائیں گی بلکہ وہ ان سے ایسے حقائق تک رسائی پائیں گے جن کا علم تو ان کی فطرت میں پنہاں ہے مگر وہ اس کو بھولے ہوئے ہیں۔ چناں چہ فرمایا:

﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ﴾ (الواقعة: 62)

''اور پہلی پیدائش کو تو تم جانتے ہی ہو، تو اس سے کیوں یاددہانی حاصل نہیں کرتے؟''

یعنی انسان کی اولین پیدائش میں کئی دلیلیں پنہاں ہیں۔ اس پر قیاس کر کے حیات اخروی کے امکانات کیوں تمھاری سمجھ میں نہیں آتے؟ اسی طرح فرمایا:

﴿وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ (الذاریات: 49)

''اور ہر چیز سے ہم نے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو۔''

ایک سائنس دان نر و مادہ کے جوڑوں کے مطالعہ تک اپنی جستجو کو محدود کر لیتا ہے لیکن یہاں یہ سبق دیا ہے کہ یہ قانون دوسری چیزوں میں بھی جاری و ساری ہے۔ حقائق تک رسائی کے لیے ان کو بھی اسی نقطۂ نظر سے دیکھو۔ دنیا کی زندگی میں بھی ایسے خلا ہیں جن کے باعث یہاں عدل کے تقاضے پورے نہیں ہوتے، آخرت اس کمی کو پورا کرنے والی ہے لہٰذا دنیا کے اس جوڑے کے ساتھ ملا کر دیکھو تو تمھیں اصل حقیقت کا ادراک ہو سکے گا۔

تفقہ کے عام معنی تو کسی بات کو اچھی طرح سمجھ لینے کے ہیں لیکن قرآن مجید کے استعمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک تو یہ لفظ دل کے اس فعل کو بیان کرنے کے لیے آتا ہے جو آدمی کے اندر جذبات و احساسات پیدا کرتا ہے، جب کہ عقل کے فعل کو عمل سے تعبیر کیا ہے۔ دوسرے تفقہ میں کسی بات کو سمجھنے کی وہ کیفیت ہوتی ہے جس میں آدمی کی نگاہیں صرف ظاہر کو نہ دیکھ رہی ہوں بلکہ معاملات کی تہہ تک پہنچیں اور اصل حقیقت کا ادراک کریں۔ مثلاً غزوہ بنی المصطلق کے دوران منافقین نے یہ نعرہ بلند کیا کہ ہم مدینہ لوٹ کر مہاجرین پر کچھ خرچ نہیں کریں گے۔ اس پر فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ﴾ (المنافقون: 7)

''اور اللہ ہی کے ہیں آسمانوں اور زمین کے خزانے لیکن منافقین نہیں سمجھتے۔''

یعنی منافقین کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ مہاجرین ان کے انفاق کے سہارے پر زندہ ہیں۔ اصل میں وہ اس حقیقت کے شعور سے عاری ہیں کہ رزق کے تمام خزانے اللہ کے پاس ہیں، ان کی کنجیاں منافقین کے پاس نہیں ہیں۔ اسی طرح مشرکین کے ساتھ جنگ کی صورت میں قرآن مجید نے یہ خبر دی کہ ایک سو ثابت قدم مسلمان ان مشرکین کے ایک ہزار پر غالب آئیں گے کیوں کہ مشرکین اس شعور سے عاری ہیں جو مسلمانوں کو اسلام لانے کے بعد حاصل

Marfat.com

ہو چکا ہے۔ ان کی ظاہر بین نگاہیں صرف مادی وسائل کو دیکھتی ہیں جب کہ اصل فیصلہ کن چیزیں دوسری ہیں۔
آیت کے الفاظ ہیں:

﴿بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ لَّا یَفۡقَهُوۡنَ۝﴾ (الانفال: 65)

''یہ اس وجہ سے کہ یہ لوگ بصیرت سے محروم ہیں۔''

لفظ فقہ کے ان مفہوموں کی روشنی میں جب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید شواہد کائنات کو بیان کر کے فرماتا ہے:

﴿قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ یَّفۡقَهُوۡنَ﴾ (انعام: 98)

''ہم نے اپنی نشانیاں ان لوگوں کے لیے تفصیل سے بیان کر دی ہیں جو سمجھیں۔''

تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک سائنس دان کو یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ظاہر کے پردوں کے پیچھے جھانک کر ہر معلول کی اصل علت کو دریافت کرے اور محض ایک مشینی آدمی کی طرح کام کرنے کے بجائے اپنے جذبات واحساسات کو تحریک دے کر حقیقت کا شعور حاصل کرے۔

لفظ ''عبرۃ'' کا مفہوم کسی واقعے سے سبق حاصل کرنا ہے۔ اس میں آدمی مشاہدے سے حاصل ہونے والے علم کے ذریعے اس کے گہرے معانی تک جست لگاتا ہے، بعض واقعات کی ترتیب سے ان قوانین کو سمجھتا ہے جو ان واقعات کو وجود میں لانے کا سبب بنے۔ مثلاً ماضی کی بعض قوموں کی بربادی کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ اہل عقل کے لیے اس میں وہ سبق پوشیدہ ہیں جن سے وہ سنن الٰہیہ کو سمجھ سکتے ہیں:

﴿لَقَدۡ کَانَ فِیۡ قَصَصِهِمۡ عِبۡرَۃٌ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ﴾ (یوسف: 111)

''ان کی سرگزشتوں میں اہل عقل کے لیے بڑا سامان عبرت ہے۔''

یہی لفظ عبرۃ ان مشاہدات کے لیے استعمال ہوا ہے جو ہمیں اپنے گردوپیش میں ہوتے ہیں۔ مثلاً فرمایا:

﴿وَ اِنَّ لَکُمۡ فِی الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَۃً نُسۡقِیۡکُمۡ مِّمَّا فِیۡ بُطُوۡنِهٖ مِنۡۢ بَیۡنِ فَرۡثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیۡنَ﴾ (النحل: 66)

''اور بے شک تمھارے لیے چوپایوں میں بھی بڑا سبق ہے۔ ہم ان کے پیٹوں کے اندر کے گوبر اور خون کے درمیان سے تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں، پینے والوں کے لیے نہایت خوش گوار۔''

مطلب یہ ہے کہ اس مشاہدے سے اس حیرت انگیز قدرت کا ادراک کرو جو رب کائنات کی ہے اور جانو کہ وہ کس طرح ناقابل فہم طریقوں سے ایسے نتائج حاصل کرتا ہے جو کسی کے وہم گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ موجودہ سائنس مویشیوں کے اندر دودھ بننے کے نظام کو دیکھ کر اس جستجو میں لگ جاتی ہے کہ وہ کون سے کیمیائی عوامل ہیں جو خوراک کو دودھ میں تبدیل کرتے ہیں۔ خوراک پر کون سے خامرے اثر انداز ہو کر یہ اثر پیدا کرتے ہیں لیکن قرآن کی رو سے ایک سائنس دان کو اس مشاہدے سے جست لگا کر قدرت خداوندی کا ادراک کرنا چاہیے۔ جو لوگ عبرت

Marfat.com

پذیری کی صلاحیت کو مردہ کر دیتے ہیں ان کے عقل ودل کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ وہ دیکھتے سب کچھ ہیں لیکن ان کو سوجھتا کچھ بھی نہیں۔

سورہ جاثیہ کے آغاز میں قرآن مجید نے کائنات کے بہت سے ایسے شواہد کا ذکر کیا ہے جو سائنس کی جستجو کا محور بنتے ہیں مثلاً آسمان اور زمین کا نظام، انسانوں اور حیوانوں کی تخلیق، رات اور دن کی گردش، ہواؤں کی گردش اور زمین پر بارش کے اثرات۔ ان شواہد کے بیان کے بعد فرمایا:

﴿تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ﴾ (الجاثیہ: 6)

''یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم تمھیں بالکل حق کے ساتھ سنا رہے ہیں۔''

اس آیت کی تفسیر میں مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ نے تفسیر تدبر قرآن میں لکھا ہے:

''نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ'' میں 'بِالْحَقِّ' سے مراد وہ قطعی اور حقیقی نتائج ہیں جو ان نشانیوں پر غور کرنے سے سامنے آتے ہیں۔ یہ قید اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ جہاں تک ان نشانیوں پر غور کرنے کا تعلق ہے ان پر غور تو دوسرے بھی کرتے ہیں لیکن وہ اپنے مخصوص اور نہایت محدود زاویے سے غور کرتے ہیں۔ اس وجہ سے یا تو ان حقائق تک پہنچ نہیں پاتے جو ان کے اندر مضمر ہیں یا پہنچتے تو ہیں لیکن چوں کہ وہ ان کے نفس کی خواہشوں کے خلاف ہیں اس وجہ سے ان کے اعتراف سے گریز کرتے ہیں۔ مثلاً آسمان وزمین کی نشانیوں پر فلکیات وارضیات کے ماہرین بھی غور کرتے ہیں، انسان کی خلقت پر اناٹومی والے بھی تحقیق کرتے ہیں، حیوانات کے مختلف پہلوؤں پر علم الحیوانات والے بھی سر کھپاتے ہیں، رات اور دن کی گردش، بارشوں کے اوقات واثرات اور ہواؤں کے تغیر وتبدل پر موسمیات والے بھی بہت کچھ ہوا باندھتے ہیں، لیکن ان سب کا حال ان کی تنگ نظری کے سبب سے یہ ہے کہ یہ اپنی دوربینوں اور خُردبینوں سے تل کو تو دیکھ لیتے ہیں لیکن تل کی اوٹ کا پہاڑ ان کو نظر نہیں آتا۔ موسمیات والے یہ پیشین گوئی تو کر دیں گے کہ آگے چوبیس گھنٹے موسم گرم وخشک رہے گا اور اس کی کوئی الٹی سیدھی توجیہ بھی کر دیں گے۔ اکثر حالات میں ان کی پیشگوئی صحیح بھی ثابت ہوتی ہے اور بعض حالات میں ان کی پیش کردہ توجیہ سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کی نگاہ صرف ہواؤں کے تصرف کی نوعیت اور اس کے اثرات کا اندازہ کرنے تک محدود رہ جاتی ہے، اس سے آگے بڑھ کر وہ اس سوال پر غور کرنے کی زحمت نہیں اٹھاتے کہ ان تصرفات کے پس پردہ حقیقی مصرف [1] کون ہے اور اس کے حقوق وفرائض کیا ہیں! حالاں کہ کائنات کے اندر یہ تمام تصرفات وتغیرات جو ہوتے ہیں یہ اسی لیے ہوتے ہیں کہ انسان اس اصل سوال تک پہنچے، اس کا حل دریافت کرے اور اگر خدا کا کوئی بندہ اس کو اس سوال کا کوئی دل نشین حل بتائے تو اس کو قبول اور اس پر عمل کرے۔ قرآن نے ان نشانیوں کے انہی پہلوؤں کو خاص طور پر بے نقاب کیا ہے

---

[1] مُصرِّف: تصریف (تبدیلی) لانے والا۔

Marfat.com

جو اصل حقیقت پر روشنی ڈالنے والے ہیں۔ اس وجہ سے اس کو "نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ" سے تعبیر فرمایا ہے۔"

(تدبر قرآن، جلد ششم، طبع اول۔ ص ۳۰۶، ۳۰۷)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اس کے باوجود کہ قرآن سائنس کی کتاب نہیں اس نے اپنے بہت سے دلائل کی بنیاد ایسی چیزوں کے مشاہدے پر رکھی ہے جو سائنس کا موضوع ہیں لیکن اس مشاہدے کو اس نے محض ایک سمعی وبصری عمل قرار نہیں دیا بلکہ یہ تحریک دی ہے کہ سمع و بصر کے حواس کے پہلو بہ پہلو تعقل، تذکر، تفقہ اور عبرت پذیری کو بھی جگہ دی جائے تا کہ یہ مشاہدہ اصل حقائق تک انسان کو پہنچائے۔ اگر سائنس دان قرآن مجید کی اس ہدایت کو ملحوظ رکھیں تو سائنس مذہب واخلاق سے اس طرح بے بہرہ نہ ہو جیسی اب ہے۔ اس ہدایت کو نظر انداز کرنے ہی کا یہ نتیجہ آج سامنے آرہا ہے کہ سائنس لامذہبیت کی علامت سمجھی جاتی ہے اور اس کی ایجادات نے انسان کے سر پر ایک تلوار لٹکا رکھی ہے۔ کسی کو یہ معلوم نہیں کہ کب یہ تلوار انسان ہی کا خاتمہ کر دے۔

سیرت نگاری کا مطلوب انداز

اس میں شک نہیں کہ اللہ کا رسول ایک کامل انسان ہوتا ہے، وہ داعی بھی ہوتا ہے اور مصلح بھی، ضرورت پڑنے پر اس کو جنگیں بھی لڑنی پڑتی ہیں اور وہ ان میں کوئی کمزوری نہیں دکھاتا، وہ بہترین معلم بھی ہوتا ہے اور منصف بھی، اس کو سیاسی فیصلے بھی کرنے پڑتے ہیں لیکن اس کو جو چیز دوسرے انسانوں سے ممیز کرتی ہے وہ اس کا مہبط وحی، حامل کتاب اللہ اور لوگوں کی طرف اللہ کا رسول ہونا ہے۔ اس لحاظ سے اسے اللہ تعالیٰ اور انسانوں کے درمیان واسطہ بننا، نازل ہونے والی وحی کو محفوظ کرنا، اس کو اپنوں اور پرایوں تک پہنچانا، اس پر وارد ہونے والے اعتراضات کا جواب مہیا کرنا اور اس کی روشنی میں ایمان لانے والوں کی تربیت کرنا ہوتا ہے۔ اس کام میں رسول آزادی سے کوئی اقدام نہیں کرتا۔ وہ اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت کام کرتا ہے۔ وہ اللہ کی براہ راست نگرانی میں ہوتا ہے۔ اس کو اپنے جانی دشمنوں کے اندر رہ کر دین حق کی تبلیغ کرنی ہوتی ہے لیکن وہ اس کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے کیونکہ رسول کو اللہ تعالیٰ کی حفاظت حاصل ہوتی ہے۔ رسول کے مخاطب بھی اللہ کے بتائے ہوئے بعض قوانین کی زد میں ہوتے ہیں۔ وہ ان قوانین کے اثرات سے کسی طرح بچ نہیں سکتے اور رسول کی جدوجہد فیصلہ کن ہوتی ہے۔ لہٰذا ایک رسول کی سیرت لکھتے وقت یہ تمام پہلو مدنظر رکھنے ضروری ہیں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ اور دعوت دین کی جدوجہد کو اس تناظر میں پیش کروں۔ اس میں مجھے مشکل یہ پیش آئی کہ قدیم سیرت نگاروں نے حضور ﷺ کی رسول اللہ ہونے کی حیثیت کے حوالہ سے بہت کم واقعات قلم بند کیے، لہٰذا ان کو قرآن ہی کی مدد سے واضح کرنا پڑا۔ اسی لیے اس کتاب میں آیات کی کثرت مضمون کی تفہیم کے لیے ضروری تھی۔ (حیات رسول اُمی ﷺ، علامہ خالد مسعود رحمہ اللہ، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، 2014ء، ص: 12 (تمہید)

Marfat.com

ٹیکنالوجی اور قرآن

ٹیکنالوجی کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے: ''مادی ہنرمندیوں کی ایسی ایجاد جو انسان کی جگہ انسان کے ذریعے انسان کے فائدے کے لیے بروئے کار لائی جاسکے۔'' ❶

ٹیکنالوجی کی اس سے بھی زیادہ جامع تعریف یہ ہے:

''فنی آلات، تکنیک، طریق کار، اشیاء اور جدید صنعتی دور کے انسان کی تشکیل کردہ ہنرمندیاں جو اس کی قوت، ذہانت اور جسمانی توانائی کو فروغ دے سکیں۔'' ❷

ان تعریفوں کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ انسان ٹیکنالوجی کا استعمال اسی وقت سے کر رہا ہے جب کھیتی باڑی کے ابتدائی طریقے ایجاد ہوئے تھے۔ اس دور کا سیدھا سادہ آدمی جو آلات استعمال کرتا تھا، وہ پرانے شہروں کے آثار قدیمہ سے دستیاب ہو چکے ہیں اور مصر و عراق کا طریقۂ آبپاشی بھی اس کی تصدیق کر چکا ہے۔ اب تک کی معلوم تاریخ بتاتی ہے کہ انسان پر ایسے کئی دور گزرے ہیں جب ٹیکنالوجی کی ترقی اپنے عروج کو پہنچ گئی، تاہم اب سے دو سو برس پہلے جس سائنسی عہد کا ظہور ہوا وہ اپنے ساتھ ٹیکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی بھی لے کر آیا۔ چناں چہ اب جدید ٹیکنالوجی کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس نے انسانی ترقی کے عمل کو ہمارے تصور سے بھی کہیں زیادہ تیز کر دیا ہے۔ اب انسان کو مادے، ارضی زندگی بلکہ خود انسان پر بھی ایسا غلبہ حاصل ہو گیا ہے کہ ترقی اور غلبے کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی چلی جارہی ہے۔ ❸

ترقی کا یہ سفر ناقابل پیش گوئی طریقوں سے اتنی وسعت اور ہمہ گیری کے ساتھ جاری ہے کہ:

ع نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں!

یوں اس برق رفتار ترقی کی باگ ڈور خود انسان کے ہاتھوں سے نکلی چلی جارہی ہے جس نے اسے جنم دیا اور اب تک پروان چڑھایا۔ جدید ٹیکنالوجی کے اس پہلو سے انسانی اور سماجی علوم کے ماہر فلسفی بہت فکر مند ہو گئے ہیں۔ ان کے علاوہ مسلمانوں میں بھی تشویش کی لہر دوڑ رہی ہے۔ وہ بحیثیت مسلمان ٹیکنالوجی کے منفی اثرات سے پریشان

❶ فنیبل مین جیمز کے۔ ٹیکنالوجی اینڈ ریئلٹی، مارٹنز گلوپ، دی ہیگ، 1982ء، صفحہ ۱۱۔

❷ لارنس ڈبلیو ڈبلیو، ماڈرن سائنس اینڈ ہیومن ویلیو، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 1986ء، صفحہ 32۔

❸ جانز ہینز، دی امپیریٹیوز آف رسپانسبلٹی، یونیورسٹی آف شکاگو پریس، 1984ء، صفحہ 32۔

Marfat.com

ہیں۔ ٹیکنالوجی کے منفی اثرات ترقی یافتہ قوموں میں تو اظہر من الشمس ہیں، خود ترقی پذیر قوموں کا حال یہ ہے کہ وہ جدید ٹیکنالوجی کے مضر پہلوؤں سے بچنے اور اس کے مفید پہلوؤں سے فائدہ اٹھانے میں دشواری محسوس کر رہی ہیں۔

ٹیکنالوجی درحقیقت اللہ تعالیٰ کا فضل ہے:

مسلمان کا نظریۂ حیات قرآن کریم سے متشکل ہوا ہے۔ اس نظریۂ حیات کی رو سے مسلمان فطرت کی طاقتوں کو مسخر کر کے اس سے فائدہ اٹھانے کے عمل کو درحقیقت اللہ تعالیٰ کی فیض بخشی سمجھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے اور فطرت کی توانائیوں کو انسان ہی کے فائدے کے لیے مسخر کر دیا ہے۔ رب العزت نے پرندوں کو ذوق پرواز دے کر انھیں اڑنے کا سلیقہ سکھایا ہے، آشیاں بندی کا شعور بخشا ہے، خوراک ڈھونڈنے کی جستجو ودیعت کی ہے اور افزائش نسل کی صلاحیت مرحمت فرمائی ہے۔ ٹھیک اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو سوچنے، سمجھنے، تحقیق کرنے، سبب جاننے اور نتائج اخذ کرنے کی خوبی عطا کی ہے۔ انسان کو اپنی ضروریات کے لیے جتنی چیزیں درکار تھیں اللہ تعالیٰ نے وہ سب عطا کر دی ہیں اور انسان کو یہ سمجھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمتوں کو انسان کے فائدے کے لیے کس طرح استعمال کرنا چاہیے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ آدمی کھیتی باڑی کرتا ہے، طرح طرح کی فصلیں اور انواع واقسام کے پھل اگاتا ہے، پانی کا ذخیرہ کرتا ہے، زمین کو سیراب کرتا ہے اور پانی کے ذخیرے سے بجلی حاصل کرتا ہے۔ انسان نے جہاز بنا لیے جو سمندر میں تیرتے پھرتے ہیں۔ انسان نے شمسی توانائی سے فائدہ اٹھانا سیکھ لیا اور اس طرح کے کئی مفید کام انجام دینے لگا۔ انسان کی اس صورت حال کا نقشہ قرآن کریم نے اس طرح کھینچا ہے:

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۝ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ۝ وَ اٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۝﴾ (ابراهيم: 32 تا 34)

"یہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اور بادلوں سے زمین پر پانی برسایا جس کی آبیاری سے طرح طرح کے پھل پیدا ہوئے ہیں جو تمھارے لیے غذا کا سامان ہیں اور جہاز تمھارے لیے مسخر کر دیے کہ اس کے حکم (یعنی اسی کے ٹھہرائے ہوئے قانون) کے ماتحت سمندر میں چلنے لگیں، اور دریا بھی تمھارے لیے مسخر کر دیے......
اسی طرح سورج اور چاند بھی مسخر کر دیے کہ ایک خاص دستور پر برابر چلے جا رہے ہیں۔ غرضیکہ تمھیں اپنی زندگی کی کاربراریوں [1] اور کامرانیوں کے لیے جو کچھ مطلوب تھا، وہ سب کچھ اس نے عطا فرما دیا۔ اگر تم اللہ کی نعمتیں گننی چاہو تو وہ اتنی ہیں کہ کبھی ان کا احاطہ نہ کر سکو۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ناانصاف اور بہت ناشکرا ہے۔"

پس سائنس اور ٹیکنالوجی اور ان کی کارگزاریوں کے نتیجے میں ہونے والی پیداوار قرآن کریم کی رو سے انسان پر

---

[1] کاربراری: کام پورا کرنا۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے اور یہ فضل وکرم اس لیے فرمایا گیا ہے کہ انسان ہر طرح کی عبادتوں کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا معبود و مسجود جانے اور اللہ کا ٹھیٹھ عبادت گزار بندہ بن جائے...... پس قرآن کریم ٹیکنالوجی کے خلاف نہیں ہے بلکہ قرآن کریم تو اکثر مصنوعات کو عین اللہ کا فضل قرار دیتا ہے مثلاً زریں پوشاک، اون، زیورات اور اسلحہ کو اللہ ہی کی مہربانی گردانا گیا ہے۔ ❶

اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز بے کار پیدا نہیں فرمائی۔ اس کی کوئی تخلیق منصوبہ بندی سے خالی نہیں ہے۔ وہ انسان پر اپنے منشاء اور اپنے دستور العمل کے مطابق ہی سائنس اور ٹیکنالوجی کے افادات منکشف کرتا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ ❷ (الحجر: 21)

''اور دیکھو کوئی چیز ایسی نہیں جس کے ذخیرے ہمارے پاس نہ ہوں مگر ہم اسے صرف ایک ٹھہرائے ہوئے جانے پہچانے اندازے کے مطابق ہی عنایت کرتے ہیں۔''

ٹیکنالوجی قادر مطلق نہیں ہے:

جدید ٹیکنالوجی نے ترقی کا جو زبردست اور حیران کن ریکارڈ قائم کیا ہے، اس کے باعث اس ٹیکنالوجی کے حامل و مالک لوگوں کے دماغ میں ایک خبط پیدا ہو گیا ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ بس ٹیکنالوجی ہی ہماری قادر مطلق ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جب قرآن اس خبطی انسان کو ٹوکتا ہے اور حقیقت حال سمجھاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اے اللہ کے بندے! تو کسی چیز کو پیدا کر سکتا ہے نہ تو نقشہ ساز ہے...... اس موقع پر قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے قوانین کی طرف اشارہ کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ اے انسان تو جس قدر خام مال اپنے استعمال میں لا رہا ہے، وہ اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا کیا ہے اور تیرے ہی فائدے کے لیے پیدا کیا ہے۔ تو اپنی فنی ترقی میں بس اس حد تک ہی کامیاب ہوگا جس حد تک اللہ تعالیٰ تجھے کامیاب فرمانا چاہے گا۔ مثلاً انسان کنواں کھود سکتا ہے اور جب تک اللہ تعالیٰ چاہے اس سے پانی بھی حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن جب پانی ہی زیر زمین پہنچ کر اڑن چھو ہو جائے تو پھر اسے کوئی مائی کا لال پانی مہیا نہیں کر سکتا۔ ❸

انسان بحری جہازوں پر سفر کرتا ہے۔ ان جہازوں پر سامان بھی لدا ہوا ہوتا ہے۔ اور یہ جہاز آسانی سے اپنی منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ بحری جہازوں کے سفر کی یہ کامیابی اللہ ہی کے حکم اور فضل وکرم کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو جہاز غرق کر دیتا۔ تمام مسافر بے بس ہو کر رہ جاتے اور کوئی بھی ان کی مدد کو نہ پہنچتا۔ ❹

انسان فصلیں بو سکتا ہے، کھیتوں کو پانی دے سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ چاہے تو انسان کی لہلہاتی فصلوں کو عین اس وقت برباد کر سکتا ہے جب وہ بڑے چاؤ سے کاٹنے کے لیے چلا ہو۔ ❺

ان مثالوں سے اللہ تعالیٰ یہ حقیقت عیاں کر دیتا ہے کہ قادر مطلق صرف اسی کی ذات عالی ہے، وہی ہر چیز پر

---

❶ قرآن حکیم: 80،81،14 تا 16۔ ❷ ایضاً، 15:21۔
❸ ایضاً، 67:30۔ ❹ ایضاً، 36:43۔ ❺ ایضاً، 56:65۔

Marfat.com

قدرت رکھتا ہے، ذرے ذرے پر اس کا قبضہ ہے۔لیکن انسان کی نادانی کا عالم یہ ہے کہ وہ اپنے آپ ہی کو اس کائنات کا آقا سمجھ بیٹھتا ہے۔

ٹیکنالوجی اقدار سے خالی ہے:

اہل فکر و دانش ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ خود ٹیکنالوجی کی فطرت کیا ہے؟ کیا یہ کسی اچھی قدر کی حامل بھی ہے؟ یا اچھی قدروں سے یکسر خالی ہے؟ ولیم لارنس کہتے ہیں:

''فنی سرگرمی کو دو معنوں میں قدر سے مزین سمجھنا چاہیے اور وہ یہ کہ خود فنی لوگوں کی بھی سماجی قدریں ہوتی ہیں اور ان کا اپنا تصور اقدار ان کے تحقیقی کام اور خدمات پر اثر انداز ہوتا ہے جس کا لازمی ردعمل یہ ہوتا ہے کہ خود ان کے کام کی اقداری نوعیت پبلک پر اثر قائم کرنے لگتی ہے۔'' ❶

سردار کا خیال ہے کہ ٹیکنالوجی کوری ہے، اس سے کوئی چیز وابستہ نہیں، نہ کوئی قدر، نہ غیر جانبداری! جدید ٹیکنالوجی نتیجہ ہے ایک مخصوص تاریخ اور مغربی تہذیب کے موثرات کا! یہ جہاں جاتی ہے وہاں اپنے ہی مخصوص کلچر کے بیج بھی ساتھ لے جاتی ہے۔ ❷

دوسری طرف پیسی (Pacey) کا کہنا ہے کہ ٹیکنالوجی محض ٹیکنالوجی ہے اور بس! اس کا کوئی کلچر نہیں، کوئی اخلاق نہیں۔ یہ سیاسی لحاظ سے غیر جانبدار ہے اور اپنے جوہر کے اعتبار سے اخلاق سے اس طرح بیگانہ ہے کہ اسے کسی قسم کی قدروں سے کوئی واسطہ نہیں۔'' ❸

پہلے دونوں مفکرین کا موقف یہ ہے کہ چوں کہ ٹیکنالوجی کے حامل لوگوں کی اپنی قدریں بھی ہوتی ہیں، ان کا اپنا کلچر بھی ہوتا ہے، ان کی اپنی ایک تاریخ اور تہذیب بھی ہوتی ہے، اس لیے ان کے یہ مؤثرات ٹیکنالوجی میں بھی اپنا اثر دکھاتے ہیں۔ یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ ان خصوصیات سے خود ٹیکنالوجی کا کوئی جوہری تعلق نہیں ہوتا، بلکہ اس کے جتنے بھی اثرات ہیں وہ سب خارجی مؤثرات کا نتیجہ ہیں۔

یہ بات ایک مثال سے سمجھئے۔ دھاگا کاتنے والی مشین کو لیجیے۔ یہ مشین چلانے والا کارندہ چاہے نیک ہو یا بے دین، مشین تو دونوں کے ہاتھوں میں اپنا فعل انجام دے گی۔ ہلچل اور ہیجان انگیزی بجائے خود ایک مفید عمل ہے اور اس عمل میں انسان کے لیے فوائد کے بے شمار امکانات ہیں۔ اس کی بدولت طرح طرح کے کیمیکل اور ادویات تیار ہوتی ہیں۔ اب یہ فیصلہ خود انسان کی اپنی مرضی پر موقوف ہے کہ وہ کھجوروں اور انگوروں کو کس طرح استعمال میں لانا چاہتا ہے؟ وہ ان چیزوں سے سرکہ بنانا چاہتا ہے یا شراب؟ یہ سوال جب ایک مسلمان کے سامنے آتا ہے تو اس کے لیے بلند اقدار کا سوال آپ ہی آپ پیدا ہوجاتا ہے۔ بس یہی وہ تصور ہے جو ٹیکنالوجی پر خارجی طور پر اثر انداز ہوتا

---

❶ لارنس ولیم ڈبلیو، Loc. Cit, P.6

❷ سردار زیڈ ''اسلامک فیوچرز''، مینسل پبلشنگ لمیٹڈ، لندن، 1985ء، ص 185۔

❸ پیسی۔ آرنلڈ، دی کلچر آف ٹیکنالوجی، MIT پریس، کیمبرج، 1983ء، ص 2۔

Marfat.com

ہے۔ اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ ٹیکنالوجی کا بذات خود اقدار سے کوئی واسطہ نہیں۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ٹیکنالوجی ایک ایسا آلہ ہے جو اچھے اور برے دونوں طرح کے مقاصد کے لیے بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔

اس اہم نکتے کو آنحضرت ﷺ کے عمل مبارک سے سمجھیے۔ جب مدینہ منورہ میں امتناع شراب کی آیات نازل ہوئیں تو رسالت مآب ﷺ نے ''مضافات''، ''نقیر''، ''حنتم'' اور ''ضیا'' کے استعمال کی ممانعت فرمادی۔ یہ مختلف قسموں کے حوض تھے جو خمیر اٹھانے کے لیے کام میں لائے جاتے تھے۔ جب شراب پینے کے بارے میں تمام احکام پوری طرح نافذ ہوگئے تو پھر اسلامی معاشرے میں اس قسم کے حوضوں کے ناجائز استعمال کا کوئی امکان باقی نہ رہا۔ چناں چہ آنحضرت ﷺ نے ان حوضوں کے استعمال پر عائد کردہ پابندی اٹھالی، اور سوائے شراب کشید کرنے کے دیگر نوعیت کے تمام کاموں کے لیے ان حوضوں کے استعمال کی اجازت عام ہوگئی۔ [1]

ٹیکنالوجی کے مضر اثرات اور ان کے اسباب:

اب ہم ایک اور اہم سوال کا جائزہ لیتے ہیں۔ اگر ٹیکنالوجی اقدار سے خالی ہے تو پھر ہم اس کے نقصان رساں اثرات کا تجزیہ کیوں کرتے ہیں؟ کہا جاتا ہے کہ صنعتوں کی بھرمار نے انسان کی شخصیت اور معاشرے کو اخلاقیات سے محروم کردیا ہے۔ انسان کو سماجی، سیاسی، اقتصادی اور عالمی سطح پر طرح طرح کے مناقشات [2] کے گرداب میں پھنسا دیا ہے۔ [3] اسی وجہ سے جرائم منظم ہوگئے ہیں جن سے سماجی نظام کو نہایت مہلک خطرات لاحق ہوگئے ہیں۔

ہر بڑی ترقی اور اہم پیش قدمی انسانی کلچر اور سماجی طرز عمل پر نہایت گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ آج کے حالات دیکھ لیجیے۔ عالمی ایٹمی جنگ کا خطرہ ہر آن منڈلاتا رہتا ہے اور احوال زمانہ ایسی نوعیت اختیار کر گئے ہیں کہ انسانی تہذیب ہی کے مٹنے کے آثار پیدا ہوگئے ہیں۔ یہ ہمارے سامنے کے کٹھن حقائق ہیں لیکن خطرات کے یہ سارے مناظر خارجی ہیں۔ اصل کردار اس آدمی کا ہے جو پیسے کے پیچھے بیٹھا ہے۔ ٹیکنالوجی کے ناجائز استعمال کا مجرم خود انسان ہے۔ مثلاً ایک چاقو کا تصور کیجیے۔ یہ بڑا مفید آلہ ہے۔ بہت سے مفید کام انجام دیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی سفاک شخص اسی چاقو کو کسی کے پیٹ میں گھونپ دے تو اس میں چاقو کی کیا خطا ہے؟ قصوروار تو وہ ہے جس کے ہاتھ میں چاقو ہے۔

قرآن کریم کا فرمان عالی شان ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو غلط طور پر بھی استعمال کر سکتے ہیں، حتیٰ کہ مال و دولت اور اولاد جیسی عزیز چیز کو بھی قرآن کریم نے فتنے سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن کے نزدیک مال اور اولاد آدمی کے ایمان کی جانچ پرکھ اور آزمائش کا سامان ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے چیزوں کی تخلیق جس حکمت کے تحت کی ہے، اس کے پیش نظر اس قسم کا نظام ضروری تھا۔ چوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو انسان کی امتحان گاہ بنایا ہے، اس لیے اس دنیا میں

---

[1] بخاری، کتاب المغازی وفد عبدالقیس نمبر 654۔

[2] مناقشات: جھگڑے۔

[3] سردار زید ''سائنس، ٹیکنالوجی اینڈ ڈویلپمنٹ ان دی مسلم ورلڈ، آدم ہیلم، لندن، 1977ء، ص 55۔

Marfat.com

انسان کے لیے صحیح طریقۂ کار یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اپنی جائز ضروریات پوری کرنے کے لیے بروئے کار لائے اور اپنے خالق و مالک کا شکر ادا کرے...... اس معقول طرز عمل کے برعکس اگر انسان اللہ کی نعمتوں کو غلط کاموں کے لیے استعمال کرے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کا نافرمان، ناشکرا اور نمک حرام ٹھہرے گا اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کا سزاوار قرار پائے گا۔

قرآن کریم میں یہ حقیقت جابجا وضاحت سے بیان فرمائی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا گیا ہے کہ آدمی گھوڑے پر سوار ہوتا ہے، بحری جہاز پر بیٹھتا ہے یا موسم کے شدائد سے بچنے کے لیے حسب حال مطلوبہ کپڑے پہنتا ہے یا دشمن سے بچاؤ کے لیے ہتھیار اٹھاتا ہے، اسے ہر حال میں یہ خیال ملحوظ رکھنا چاہیے کہ یہ سب کچھ اس کے پروردگار کی فیض رسانی کے طفیل ہے۔ [1]

ٹیکنالوجی والی ترقی یافتہ قوموں کی مثال:

قرآن کریم نے اس موضوع کی مزید تشریح کے لیے ٹیکنالوجی سے مستفید ہونے والے دو معاشروں کی مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ پہلی مثال حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے کے معاشرے کی ہے۔ وہ یہودیوں کی تاریخ کے دو پیغمبر بادشاہ تھے۔ قرآن کے مطابق اس زمانے میں لوہے اور تانبے کی ٹیکنالوجی عروج پر تھی۔ ان دھاتوں سے اسلحہ ڈھالا جاتا تھا۔ مزید برآں یہ دھاتیں کئی اور ضروریات کے لیے بھی کام میں لائی جاتی تھیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی زبردست بحری فوج تھی اور ان کے بحری جہازوں کی دنیا کے دور افتادہ علاقوں تک رسائی تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام جس فوج سے کام لیتے تھے وہ انسانوں پر مبنی نہیں تھی، کوئی اور مخلوق تھی۔ وہ ان سے نہایت عظیم الشان تعمیراتی کام بھی لیتے تھے۔ اس دور کی خوشحالی کو دور جدید کے محققین نے آج تک چیلنج نہیں کیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ یہ زمانہ خصوصیت کے ساتھ ذہنی اور ثقافتی تبدیلی کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں ایک زبردست صنعتی انقلاب آیا تھا۔ بحریہ بڑی منظّم تھی اور اسرائیل کی بادشاہت معراج کو پہنچ گئی تھی۔ [2]

بقول قرآن کریم اتنی زبردست خوش حالی اور فراوانی کے باوجود دونوں بادشاہ اللہ تعالیٰ کے بے حد شکر گزار تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ فرائض نہایت اہتمام سے پورے کرتے تھے۔ وہ اپنی کامیابی کو اپنے اعمال کا نہیں بلکہ قادر مطلق کا فضل و کرم گردانتے تھے۔ انھیں پکا یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم اور خوشحالی و فراوانی سے نواز کر در اصل انسانوں کو آزماتا ہے، چناں چہ وہ اللہ تعالیٰ کے بڑے اطاعت گزار تھے۔ اللہ تعالیٰ بھی ان پر نہایت مہربان تھا۔ اس نے ان کے عوام کو بڑی ترقی عطا فرمائی۔ ٹیکنالوجی میں ترقی کرنے والی ایسی شکر گزار اور اطاعت گزار قوم کو رب العزت بہت نوازتا ہے۔ ایسی قوم دوسری قوموں کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے۔

---

[1] قرآن حکیم 43:13 اور 27:81۔

[2] زیڈلن اروِنگ ایم، اینشنٹ جوڈاازم، پولٹی پریس کیمبرج، 1985ء، ص 184، 179، 164۔

Marfat.com

دوسری طرح کی ترقی یافتہ قوموں کی جو مثال قرآن نے دی ہے، وہ عاد وثمود اور اہل سبا کی ہے۔ قوم عاد اپنی طاقت میں بے مثال تھی۔ اس کے عہد کی قوموں میں کوئی اس کا ثانی نہ تھا۔ قوم عاد کی قوت اور خوشحالی ان کی یادگاروں، فلک بوس عمارتوں اور مضبوط قلعوں سے ٹپکی پڑتی تھی۔ ساتھ ساتھ ان کے رویے بڑے سفاکانہ تھے۔

قوم ثمود چٹانوں کے اندر گھر تراشنے اور گھنے باغات لگانے میں ید طولیٰ رکھتی تھی۔ اہل سبا تجارت اور زراعت کے شعبوں میں بڑے ترقی یافتہ تھے۔ لیکن ان قوموں نے ٹیکنالوجی کی بدولت حاصل ہونے والی تونگری [1] کو غلط کاموں اور فساد فی الارض کے لیے استعمال کیا۔ ان کے ناشکرے پن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب نازل فرمایا۔ عاد وثمود قدرتی آفتوں کا لقمہ بن کر تباہ ہوگئے پھر اہل سبا نے دیکھا کہ ان کی خوشحالی کے سرچشمے سوکھ گئے ہیں۔ اس طرح وہ پوری قوم ہلاک ہوگئی۔ ان عذاب زدہ قوموں کا کردار اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دیتا ہے۔ ان کی مثال بہت بری ہے۔ ان کی تقلید سے پرہیز لازم ہے۔

جدید ٹیکنالوجی اور قرآنی اخلاق:

یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ آج کے دور میں ٹیکنالوجی کو جس اسلوب کی ترقی نصیب ہوئی ہے، اسے دیکھ کر قبائل عاد وثمود کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ گزشتہ دو سو برسوں میں جو زبردست ترقی ہوگئی ہے اس کی بدولت اس دور کے آدمی کے ہر شعبۂ زندگی میں بڑی تبدیلیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ مگر ترقی کی اس شیریں کی بغل میں تیشۂ فرہاد بھی چھپا ہوا ہے۔ اس تیشے نے وہ بنیادیں ہی منہدم کر دی ہیں جن سے عمدہ سماجی اور روحانی اسباق اخذ کیے جاتے ہیں۔ یہ ترقی سماجی ہم آہنگی پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اس نے عالمی انصاف مہیا نہیں کیا۔ اس سے اخلاقی اور روحانی ضروریات کا کوئی تقاضا پورا نہیں ہوا۔ آج کے دانشور ٹیکنالوجی سے مغلوب ہو جانے اور نئی اخلاقی پالیسیوں سے سمجھوتہ کر کے جدید اخلاقیاتی نظم وضبط کو اختیار کر لینے کی وکالت کر رہے ہیں۔

قرآن کریم کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسانی اقدار انسان کی فطرت میں رچی بسی ہوئی ہیں اور ہمیشہ رچی رہیں گی، اس لیے انسان کو کسی نئے ضابطۂ اخلاق کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہاں! جس چیز کی اشد ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ ہم انسانی اقدار کے بارے میں آگہی اور بیداری پیدا کریں اور انسان کے اس احساس ذمہ داری کو جگا دیں کہ اسے اپنے رب کے عائد کردہ کون کون سے فرائض انجام دینے ہیں۔ ٹیکنالوجی کو مادر پدر آزادی دینا ٹھیک نہیں۔ اسے انہی حدود میں رہنا اور رکھا جانا چاہیے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دی ہیں۔ تنہا یہی صورت ہے جس کی بدولت انسان ٹیکنالوجی کے مہلک اثرات سے بچ سکتا ہے۔ بصورت دیگر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچنے اور تباہی سے محفوظ رہنے کا کوئی امکان نہیں۔

(انگریزی سے اردو ترجمہ: احمد کامران)

[1] تونگری: خوشحالی، دولتمندی (تو انگر یا تونگر: طاقتور، دولت مند)۔

Marfat.com

حیات وممات کا راز...... ایک لاینحل مسئلہ

اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوران مغربی دنیا کو سائنس کے میدان میں پے در پے کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ دوربین کی ایجاد نے آسمان کی سیر کو دلچسپ بنا دیا اور انسان، چاند، ستاروں اور سیاروں کو پہلے سے واضح تر دیکھنے لگا۔ خردبین کی مدد سے اس نے نباتات وحیوانات کے ایک ایسے جہان تک رسائی حاصل کی جس سے پہلے وہ کبھی واقف نہ ہوا تھا۔ بجلی کی دریافت اور توانائی کے نئے ذرائع علم میں آجانے سے زندگی آسان اور روشن تر ہوگئی۔ فاصلے سمٹنے لگے اور انسان آسائشوں کی نئی جہات سے متعارف ہوا۔ علم کیمیا میں ترقی کے نتیجے میں متعدی بیماریوں پر قابو پانا ممکن ہوگیا۔ بیسویں صدی میں سائنس کی ترقی کی رفتار میں بے پناہ اضافہ ہوگیا اور انسان اس قدر پر اعتماد ہوگیا کہ اس کے خیال میں اب وہ سائنس کی مدد سے ہر میدان میں اپنا رستہ بنانے پر قادر ہو چکا ہے۔ اسے یہ غلط فہمی ہوگئی کہ اب وہ موت وحیات کے عقدہ کو بھی حل کر لے گا اور راز حیات کو پا کر موت پر قابو پالے گا۔ چناں چہ کرۂ زمین پر حیات کے آغاز اور اس کی بقا کے مسئلے کو مغربی سائنس دانوں نے بطور خاص اپنا موضوع تحقیق بنایا۔

سائنس دانوں کی تحقیق کے مطابق کرۂ زمین 46 ارب سال قبل وجود میں آیا۔ اس وقت یہ سخت گرم تھا جس پر زندگی کا وجود ناممکن تھا۔ اس کو ٹھنڈا ہونے اور بیرونی سطح کے معتدل درجۂ حرارت پر آنے میں ایک ارب سال لگے۔ اس کے بعد زمین اس قابل ہوئی کہ زندگی کے لیے موزوں ہو سکے۔ چناں چہ پہلے پہل اس میں شادابی پیدا ہوئی۔ قسم قسم کے خودرو پودے اگنے لگے۔ انواع واقسام کے پھول اور پھل وجود میں آئے۔ اس کے بعد جانور پیدا ہوئے۔ ان میں کیڑے مکوڑے بھی تھے اور رینگنے والے جانور بھی۔ ان میں عظیم الجثہ حیوانات بھی تھے اور خردبینی جاندار بھی۔ زمین کی خشکی کی طرح اس کے سمندر بھی طرح طرح کی آبی مخلوق سے بھرے ہوئے تھے۔

پھر وہ مرحلہ آیا جس میں زمین پر انسان نما جانور پیدا ہوئے اور سب کے آخر میں عقل وخرد رکھنے والا اور حواس وادراک کی صفات سے مالا مال انسان وجود میں آیا۔ اس کی تاریخ دس بارہ ہزار سال سے زیادہ پرانی نہیں۔ سائنس کرۂ زمین کی تخلیق اور آبادکاری کے ان تمام مراحل سے آگاہ ہے لیکن اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں کہ یہ سب کچھ کیسے رونما ہوا۔ نباتات اور حیوانات میں اتنا تنوع کیوں کر پیدا ہوا اور وہ کون سی منصوبہ بندی ہے جو لاکھوں جانوروں کی ضروریات ان کو فراہم کر رہی ہے۔ اس سوال کا جواب مذہب دیتا ہے لیکن مغربی تہذیب میں چوں کہ اسے کوئی اہم

Marfat.com

مقام حاصل نہیں، اس لیے اس کی بیان کردہ توجیہات پر سائنس دان کان دھرنے کو شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔

نباتات اور حیوانات کی شکل میں حیات کا جو وجود ہے اس کی حقیقت پانے کے لیے خردبینی مشاہدات نے کلیدی کردار ادا کیا۔ ایک سائنس دان نے یہ دیکھنے کے لیے کہ کارک پانی پر کیوں تیرتا ہے اس کا خردبینی مشاہدہ کیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی ساخت شہد کے ایک چھتے کی طرح ہے جس میں ایک جیسے ہزاروں خانے باہم جڑے ہوئے ہیں۔ اس نے خانے کو سیل (Cell) یا خلیہ کا نام دیا۔ بعد میں علم ہوا کہ نباتات ہوں یا حیوانات ان کا وجود خلیوں ہی سے عبارت ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہی خلیہ رازِ حیات ہے۔ یہی چیز ہے جو کسی بھی جاندار جسم کی تعمیر میں اینٹ کی حیثیت رکھتی ہے۔ سائنس دانوں نے خیال کیا کہ اگر انسان خلیے کی حقیقت جان جائے اور سائنسی طریقوں سے خود اس کی تخلیق کرے تو زندگی اور موت پر اس کی گرفت آسان ہو جائے گی۔ چناں چہ خلیے پر یورپ اور امریکہ کی متعدد یونیورسٹیوں میں کام ہوا۔ اس کے کیمیاوی تجزیے سے یہ بات سامنے آئی کہ اس میں ۶۵ فیصد پانی ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ نامیاتی چیزیں ہیں جنھیں آگ جلا سکتی ہے۔ وہ پتھر اور ریت یا نمک اور شورے کی طرح جامد نہیں جو آگ سے متاثر نہ ہوتی ہوں۔

اب سائنس دان جس مخمصے میں پڑ گئے وہ یہ تھا کہ کائنات میں پایا جانے والا 98 فیصد مادہ تو صرف چھ عناصر پر مشتمل ہے یعنی پانچ گیسیں ہائڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن، ہیلیم اور نیون، اور ایک ٹھوس یعنی کاربن جس کی معروف شکل کوئلہ ہے۔ ان غیر نامیاتی عناصر سے نامیاتی مرکبات پر مشتمل خلیہ کیسے وجود میں آ گیا؟ 1950ء کے عشرے میں شکاگو یونیورسٹی کے سٹینلے ملر نے کچھ غیر نامیاتی مرکبات کو پانی میں حل کر کے اس محلول میں سے بجلی کا شعلہ گزارا۔ وہ ہفتہ بھر ایسا کرتا رہا۔ بعدازاں جب اس آمیزے کا تجزیہ کیا گیا تو اس میں پانچ فیصد نامیاتی مرکبات پائے گئے جو جانداروں کے جسم کی تعمیر میں استعمال ہوتے ہیں۔ نوعیت کے متعدد تجربات کرنے کے بعد سائنس دان اس نتیجے پر پہنچے کہ غیر نامیاتی اجزاء سے نامیاتی اشیاء حاصل کرنا ممکن ہے۔ چوں کہ کرۂ زمین کا ماحول ایسا ہے کہ اس میں رات اور دن ادل بدل کر آتے ہیں، پھر کبھی سردی کا موسم ہوتا ہے کبھی گرمی کا، نیز بادلوں میں بجلی کوندتی رہتی ہے، اس لیے کیفیات کے اس تنوع کے باعث وہ مرکبات وجود میں آ گئے ہوں گے جن سے مل کر خلیہ بنا۔ اس طرح آغاز حیات کے بارے میں ایک قابل فہم دلیل میسر آ گئی۔

خود خلیے کی حقیقت کیا ہے، خُردبین کی ایجاد اور اس کے اندر پے در پے ترقیوں نے اس راز سے پردہ اٹھایا۔ جدید ترین الیکٹرانی خُردبینیں ایک چیز کو کئی ہزار گنا بڑا کر کے دکھا سکتی ہیں۔ ان کے ذریعے خلیے کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ جس طرح انڈے کے اندر ایک جھلی میں بند سفیدی اور اس کے بیچ میں دوسری جھلی میں بند زردی ہوتی ہے، اسی طرح خلیہ پودے کا ہو یا حیوان کا، ایک جھلی میں بند لیس دار مائع پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے اندر دوسری جھلی میں بند اس کا مرکزہ ہوتا ہے۔ مرکزہ کے اندر دھاگہ نما اجسام ہوتے ہیں جنھیں کروموسوم کا نام دیا گیا۔ اس سے باہر کچھ ایسے ذرات ہوتے ہیں جنھیں طاقت ور خُردبینیں کسی کارخانے کے پائپ اور مشینی حصے کی طرح دکھاتی ہیں۔ خلیے کے اندر یہ صلاحیت

Marfat.com

پائی گئی کہ وہ ایک سے دو، دو سے چار اور چار سے آٹھ خلیوں میں تقسیم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حیات کا تنوع اور کثرت سے اس کا اظہار خلیے کی صلاحیت تقسیم کے باعث ہے۔ لیکن یہ سب کچھ کیسے ہورہا ہے؟ یہ چیز سائنس دانوں کے لیے اچنبھے کا باعث تھی اور اس کے لیے خلیے کی ساخت کی مزید گہرائی میں اترنے کی ضرورت تھی۔

یونیورسٹی آف میامی کے ایک بائیوکیمسٹ سڈنی فاکس نے عرصۂ دراز تک خلیے پر کام کیا۔ اس کا مشاہدہ یہ تھا کہ خلیے میں جس مرکب کی کثرت ہے وہ امائنو ایسڈ ہے جس کی ساخت میں امونیا اور تیزاب کا نمایاں حصہ ہے۔ امائنو ایسڈ سلسلہ وار باہم جڑ کر پروٹین یعنی لحمیات بناتے ہیں جو گوشت، دودھ، انڈے میں بافراط پائے جاتے ہیں۔ فاکس نے مشاہدہ کیا کہ بعض حالات میں امائنو ایسڈ اکھٹے ہوکر پروٹین کی ذراتی گولیاں سی بنا لیتے ہیں اور ان کے اندر خلیے کی صفات پیدا ہوجاتی ہیں۔ اگر انھیں کچھ عرصے کے لیے چھوڑ دیا جائے تو یہ کائی کی طرح پھیل جاتے ہیں اور کائی ایک خرد بینی پودا ہے۔ خلیے پر مزید تحقیقات سے یہ معلوم ہوا کہ اس میں استعمال ہونے والے کل امائنو ایسڈز تقریباً بیس ہیں۔ یہ اپنی ترتیب ادل بدل کر ہزاروں قسم کے پروٹین بنانے کے قابل ہیں۔ جس طرح تقریباً دو درجن حروفِ تہجی کی مدد سے لاکھوں الفاظ پر مشتمل زبان موجود میں آجاتی ہے اسی طرح بیس امائنو ایسڈز سے ہزاروں قسم کے پروٹین بن جانا قابل فہم ہے۔

ایک جرمن سوئس سائنس دان فریڈرک مائیشر نے خلیے کے کیمیاوی تجزیے پر کام کیا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ خلیہ محض پروٹین پر مشتمل نہیں، اس میں ایک ایسا جزو بھی ہے جو خوراک کے معروف اجزاء کاربوہائیڈریٹ اور چکنائی سے مختلف ہے لیکن ہمیشہ پروٹین کے ساتھ منسلک رہتا ہے۔ فاسفورس کا عنصر اس میں نمایاں ہے۔ اس جزو کو نیوکلیوٹائڈ کا نام دیا گیا۔ مزید تحقیق سے پتہ چلا کہ نیوکلیوٹائڈ اصل میں چار نائٹروجنی مرکبات، ایک شوگر اور فاسفیٹ سے مل کر بنتا ہے۔ چار مرکبات میں ایڈنین، گوانین، سائٹوسین اور تھائی مین (یا تھائی مین کے بجائے یوراسل) شامل ہوتے ہیں۔ شوگر رائبوس ہوتی ہے جب نائٹروجنی مرکب یوراسل ہو ورنہ یہ ڈی اوکسی رائبوس ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ جس طرح امائنو ایسڈز بالترتیب جمع ہوکر پروٹین بناتے ہیں اسی طرح نیوکلیوٹائڈ جمع ہوکر نیوکلیک ایسڈ بناتے ہیں اور ان کی دو قسمیں ہیں۔ رائبوس اور یوراسل سے جو مرکب بنتا ہے وہ زنجیر کی طرح سیدھا ہوتا ہے۔ اسے رائبونیوکلیک ایسڈ (RNA) کا نام دیا گیا۔ ڈی اوکسی رائبوس اور تھائی مین کے ساتھ جو مرکب بنتا ہے وہ دو بل کھاتے ہوئے دھاگوں کے مانند ہے۔ ان میں ایک دھاگے پر شوگر اور دوسرے پر فاسفیٹ ہوتا ہے اور ان دونوں کو نائٹروجنی مرکبات بالکل اس طرح ملاتے ہیں جس طرح سیڑھی کے بانسوں کو ڈنڈے ملاتے ہیں۔ اس مرکب کو ڈی اوکسی رائبونیوکلیک ایسڈ (DNA) کا نام دیا گیا۔

اب سائنس دان اس نتیجے کو پہنچے کہ آر این اے (RNA) اور ڈی این اے (DNA) کی خلیے کے اندر تعداد اور ان کی تعمیر و ترکیب ہی میں راز حیات پنہاں ہے۔ اگر مرغی سے مرغی، بطخ سے بطخ اور انسان سے انسان وجود پاتا ہے تو اس کی وجہ ان کے مخصوص ڈی این اے اور ان کی تعداد ہے۔ ان کی تشکیل ہی میں وہ ہدایات موجود ہیں جو موروثی صفات

Marfat.com

آئندہ نسل کو منتقل کرتی ہیں اور کسی شخص یا چیز کا ناک نقشہ، شکل وصورت، طبعی خواص اور صفات متعین کرتی ہیں۔ ڈی این اے اپنا کام آر این اے کے ذریعے کرتا ہے جو مرکز سے نکل کر خلیے کے باقی حصوں کے ساتھ کام کرتا اور ان کے عمل کو کنٹرول کرتا ہے۔ جسم کو جہاں جس قسم کی پروٹین یا دوسری چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ فوراً اسے مہیا کر دیتا ہے۔

خلیے کے متعلق معلومات میں جس قدر اضافہ ہو رہا ہے اس پر سائنس دان حیرت زدہ ہیں اور راز حیات کی تہہ تک پہنچنے اور زندگی اور موت پر قابو پانے کے مقصد کو ممکن الحصول نہیں پا رہے ہیں۔ خلیہ اتنی چھوٹی چیز ہے کہ کاغذ کی موٹائی میں کتنے ہی خلیے سمائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک انسانی جسم میں 60 ہزار ارب خلیے ہوتے ہیں۔ اتنی چھوٹی خُردبینی چیز میں اتنا زیادہ پیچیدہ نظام جو دیکھنے میں آیا ہے، اس نے سائنس دانوں کو چکرا کر رکھ دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ خلیے کو از خود تخلیق کرنا کیمیا دانوں کی بڑی سے بڑی جماعت کے لیے بھی ممکن نہیں۔ وہ تو خلیے کی صلاحیت کار ہی سے مرعوب ہیں اور کسی طرح ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ چھوٹا سا جسم ایسے کارنامے کس طرح انجام دیتا ہے۔

رحم مادر میں انڈے کے بارآور ہونے کے چند روز بعد ایک خلیے سے 32 خلیے پیدا ہو چکے ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسی ترتیب قائم کر لیتے ہیں کہ ان سے انسانی جسم کے اندرونی، بیرونی اور وسطی نسیج (Tissues) پیدا ہو سکیں۔ مزید چند ایام گزرنے کے بعد خلیات کی اقسام 200 ہو جاتی ہیں جن میں سے ہر ایک کی خصوصیت الگ اور اس کا فعل دوسروں سے مختلف ہوتا ہے۔ کسی سے ہڈی بنتی ہے تو کسی سے گوشت۔ کوئی اعصاب کی تعمیر کرتا ہے تو کوئی پٹھے تشکیل دیتا ہے۔ ان خلیات نے جو جسم تعمیر کرنا ہوتا ہے اس میں ہر عضو کا اپنا خاص مقام اور ایک مناسب سائز ہوتا ہے۔ بازو کی جگہ ٹانگ لگ جانے اور معدے کی جگہ جگر کے لے لینے سے جسم کی ہیئت برقرار نہیں رہ سکتی۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ دل اتنا بڑا بن جائے کہ وہ پسلیوں کے اندر سما ہی نہ سکے اور پاؤں اتنے چھوٹے رہ جائیں کہ ان کے اوپر جسم کھڑا ہی نہ ہو سکے۔ ان تمام کاموں کو خلیے کنٹرول کرتے ہیں۔ اگرچہ بظاہر سب خلیے ایک جیسے نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں ان کا اپنا اپنا کام ہوتا ہے اور وہ مخصوص اعضا ہی پر کام کرتے ہیں۔ جب تک نشوونما کا تقاضا ہوتا ہے خلیے یہ کام کرتے ہیں۔ لیکن موزوں ساخت حاصل کرنے کے بعد اپنا عمل روک دیتے ہیں۔ اس نظام کو ابھی تک بالکل نہیں سمجھا جا سکا کہ وہ کنٹرول کیسے ممکن ہوتا ہے۔

مڈل سیکس میڈیکل سکول کے اطلاقی حیاتیات کے پروفیسر لیوس والپرٹ کا کہنا ہے کہ جس طرح تھیٹر میں جانے کے خواہش مند لوگوں کو قطار نمبر اور سیٹ نمبر دے کر ہال میں بھیجا جاتا ہے معلوم ہوتا ہے، ہر خلیے کو بھی اس کا نمبر اور پوزیشن بتا دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے مقام پر پہنچ کر اپنا فعل شروع کر دے۔ ایک خلیہ جنین کے جسم کے ایک خاص حصے پر پہنچ کر انگشت شہادت بنانے لگ جاتا ہے تو دوسرا انگوٹھا بنانے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ جنین کا ایک ملی میٹر حصہ ہوتا ہے جس پر دایاں اور بایاں بازو بنتے ہیں۔ اپنی اپنی جگہ نشوونما پانے اور طویل مدت تک کئی مراحل سے گزرنے کے باوجود دونوں بازو یکساں طوالت پا لیتے ہیں جس کے بعد خلیے اپنا فعل ترک کر دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ کیسے ہوتا ہے؟ سائنس دان مادی ذرائع سے ایک صدی کی تحقیق کے بعد بھی اس تک نہیں پہنچ سکے۔

Marfat.com

شکاگو یونیورسٹی کے آرون ماسکونا کا بیان ہے: ''سائنسی تحقیق میں جہاں تک کامیابی ہوسکی ہے وہ امائنو ایسڈ سے پروٹین بنانا ہے۔ یہ ایک خطی تعمیر ہے۔ بات جب ضخامت رکھنے والی تعمیر کی ہوتی ہے تو معاملہ اس قدر پیچیدہ ہوجاتا ہے کہ سائنس دان اسے حل کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ لہٰذا جدید حیاتیات میں تحقیق کا ہدف آج یہ ہے کہ معلوم کیا جائے کہ ایک خطی تعمیر سے تین ابعاد ❶ رکھنے والا جاندار کیسے وجود پذیر ہوتا ہے۔'' ظاہر ہے اگر تحقیق ابھی اسی نکتے پر مرتکز ہے کہ حجم رکھنے والے پروٹین بننے کا نظام کیا ہے تو خلیے کی مصنوعی تشکیل اور اسے تخلیق کا ذریعہ بنانے کا مقصد تو کبھی پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔

غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح پوری کائنات میں ایک نظم وضبط نظر آتا ہے، زمین کی گردش، سورج کے طلوع وغروب اور چاند کے گھٹنے بڑھنے میں باقاعدگی ہے، موسموں کے ساتھ زمین غلے اور پھل پھول کے خزانے اگلتی ہے، انسان وحیوان پیدائش سے موت تک ایک خاص طرز کی تبدیلیوں سے گزرتے ہیں، ٹھیک اسی طرح حیات کے خُردبینی عنصر خلیہ کی ساخت اور اس کے کردار میں بھی بڑی باقاعدگی اور نظم وضبط ہے۔ انسان اس کو سمجھ تو سکتا ہے لیکن اسے خود تخلیق کرنے پر قادر نہیں۔

حیات کی طرح موت کی حقیقت بھی سائنس دانوں کی گرفت میں نہیں آئی۔ انھوں نے اسے غذا کی ماہیت، ورزش اور بوسیدگی یا کہنگی ❷ کے اسباب کے ساتھ وابستہ کرنے کی کوشش کی۔ لیبارٹری میں جانوروں کو زیادہ حراروں والی ثقیل غذا بھی کھلائی گئی اور کم حراروں والی ہلکی غذا بھی۔ اس مطالعے کا نتیجہ بس اسی قدر سامنے آیا کہ ہلکی غذا جانوروں کو بیماریوں کے حملوں سے بچانے میں ممد ثابت ہوئی، ان پر شوگر کے مرض نے حملہ نہیں کیا اور بڑھاپے کے عوارض کم ہوئے۔ یہی تجربات جب انسانوں پر کیے گئے تو نتائج یکساں نہیں نکلے۔ اوسط سے کم وزن رکھنے والے لوگوں میں شرح اموات کم بھی پائی گئی اور زیادہ بھی۔ امریکہ کے قومی ادارۂ کہنگی کے ایک سائنس دان ایڈورڈ شائڈر کا کہنا ہے ''اعداد وشمار یہ بتاتے ہیں کہ زیادہ موٹے اور زیادہ دبلے آدمی جلد مرتے ہیں لیکن ہمارے پاس ایسے اعداد وشمار نہیں جن کی مدد سے یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ غذا کے کتنے حرارے بہترین تصور کیے جائیں۔''

ورزش کے عامل کے تحت چوہوں پر تجربات سے یہ بات سامنے آئی کہ جن چوہوں سے چھوٹی عمر میں ورزش کرائی گئی ان کی عمر طویل رہی۔ انسانوں میں ورزش کرنے والے افراد میں کولیسٹرول کی مقدار کم پائی گئی اور ان کے اندر دل کی بیماری کے واقعات کم ہوئے۔

موت پر تحقیق کرنے والے سائنس دانوں کا پہلے یہ خیال تھا کہ بڑھاپے کے عمل میں دماغ کا کردار اہم ہوتا ہے۔ اس سے حافظہ متاثر ہوتا اور انسان کی عمر کم ہوجاتی ہے۔ سینٹ لوئی میں قائم واشنگٹن یونیورسٹی کے سکول آف میڈیسن کے شعبہ حافظ کہنگی میں کی گئی تحقیق سے یہ بات سامنے آئی کہ 65 برس یا اس سے زیادہ عمر کے 85 فیصد افراد میں یا تو حافظے کا فقدان بالکل نہیں ہوتا یا اگر تھا تو بالکل معمولی، لہٰذا دماغ کا یہ کام کہ وہ حواس سے حاصل ہونے

❶ ابعاد: بُعد (Dimention) کی جمع، فاصلے، اطراف۔ ❷ بوسیدگی: ٹوٹ پھوٹ۔ کُہنگی: بڑھاپا۔

Marfat.com

والی اطلاعات پر عملی اقدام کرتا ہے، بالعموم بڑھاپے میں سست نہیں پڑتا۔ 15 فیصد افراد میں حافظہ متاثر ہونے کے اسباب دوسرے ہوتے ہیں۔

چوہوں پر تجربات میں ان کا غدہ نخامیہ (Pituitary Gland) نکال کر ان کی غذا میں ہارمون کارٹی سونز کا اضافہ کر دیا گیا تو ان کی عمر بڑھ گئی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ بڑھاپے کی کیفیت پیدا کرنے میں دماغی غدوں کا عمل دخل بھی ہے تاہم ایسے کوئی اجزاء تلاش نہیں کیے جاسکے جن کو موت کے ہارمون کہا جاسکے۔

بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ جسم کے خلیے جب پرانے ہو جاتے ہیں تو ان میں کوئی خاص پروٹین پیدا ہو کر بڑھاپے کے آثار پیدا کرتا ہے۔ نیویارک کی راک فیلر یونیورسٹی میں خلیوں پر تحقیق کرنے والی خاتون یوجینیا وانگ نے ایک پروٹین سٹیٹین (Statin) ان خلیوں میں پایا جن کی نشوونما رک چکی تھی۔ اس کا خیال ہے کہ اس پروٹین کا تعلق بڑھاپے سے ہوسکتا ہے تاہم اس پروٹین کا فعل ابھی تک یقینی طور پر متعین نہیں ہوسکا۔

کچھ سائنس دانوں کا گمان یہ ہے کہ غذا کی جسم میں تحلیل کے دوران ایسے مرکبات بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو جسم کے خلیوں کو تلف کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ صحت مند جسم میں ایسے مرکبات کے زہر کا تریاق ایک مخصوص خامرہ ''سپر اوکسائڈ ڈسموٹیز'' کرتا ہے۔ لہٰذا آدمی مرنے نہیں پاتا۔ جب یہ خامرہ پیدا نہ ہوسکے تو خلیوں کی تلفی موت کا سبب بنتی ہے۔

ان میں سے کوئی بات بھی ابھی حتمی تحقیق قرار نہیں دی جاسکتی۔ انسان جس طرح راز حیات پانے میں خلیے کی پیچیدگیوں کو حل کرنے کی تگ ودو کر رہا ہے اس طرح موت کا راز پانے میں بھی اس کے عوامل کو جاننے کے جھمیلے میں پڑا ہوا ہے۔ وہ تخلیق پر قادر ہوسکتا ہے نہ موت پر قابو پانے میں کامیابی ممکن ہے۔ سائنس دان اپنے اعلیٰ سے اعلیٰ سائنسی اسلحے سے مسلح ہو کر جونئی تحقیق کرتے ہیں وہ انھیں مزید حیرت زدہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ اس کے باوجود مغربی تہذیب چوں کہ خدا اور اس کی صفات سے آشنا نہیں اور مادی ترقیوں کے بل بوتے پر اپنے لیے عجز وفروتنی کو برداشت نہیں کرتی، لہٰذا سائنس دان اس بات کا اعتراف نہیں کرتے کہ موت وحیات کا نظام سائنس کی دسترس سے باہر ہے، سائنس کی ترکتازیوں کی حدود معین ہیں، ان سے آگے ایک ایسی دیوار حائل ہے جسے وہ کبھی عبور نہیں کرسکتے۔ اس دیوار سے آگے وہ حقائق ہیں جنھیں آسمان وزمین کے خالق نے کھول دیا ہے۔ اس نے ہر چیز نہایت منظم بنائی ہے۔ اس کی منصوبہ بندی ہر ہر ذرے سے ظاہر ہو رہی ہے، ایک ایک پتا معرفت کردگار کا ایک دفتر ہے۔ وہی ہے جس کے حکم سے خلیے کام کر رہے ہیں۔ وہی ان میں زندگی کی روح پھونکتا ہے تو جاندار وجود میں آتے ہیں اور جب چاہتا ہے ان کی روح کھینچ لیتا ہے تو وہ خود بھی مردہ ہو جاتے ہیں اور انسان بھی مر جاتا ہے۔ اس حقیقت کو ماننے میں جو غلط فہمی مانع ہے وہ سائنس کے متعلق یہ تصور ہے کہ یہ ہر مسئلہ حل کرسکتی ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ

Marfat.com

اس کی حدود کار معین ہیں۔ ان سے آگے یہ قطعاً رسائی نہیں رکھتی اور حقیقت کے طالبوں کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ وحی الٰہی کو اپنا رہنما بنائیں۔

رسول اللہ ﷺ تایا زبیر کے زیرِ کفالت

والدہ کی وفات کے بعد حضور ﷺ بنو ہاشم خاندان کا ایک فرد ہونے کے باعث قبیلہ کے سربراہ عبدالمطلب کی تولیت میں آ گئے۔ عبدالمطلب آپ پر بڑی شفقت فرماتے، حرم میں اپنے ساتھ لے جاتے اور اپنی مسند پر ساتھ بٹھاتے۔ یہ صورت دو برس ہی قائم رہ سکی اور جب حضور ﷺ کی عمر آٹھ سال تھی تو دادا کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کا جنازہ اٹھا تو حضور ﷺ بھی تابوت کے پیچھے چلنے والوں میں تھے اور دادا کی شفقتوں کو یاد کر کے روتے جا رہے تھے۔

عبدالمطلب نے اپنے بعد اپنے بڑے بیٹے زبیر کو اپنا وصی بنایا تھا لہٰذا حضور ﷺ اب اپنے ان تایا کے سایۂ شفقت میں آ گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو کم سنی ہی میں تایا زبیر سے زیادہ انس تھا اور وہ بھی آپ سے بے حد پیار کرتے تھے۔ کتب سیرت میں ان کی لوریاں نقل ہوئی ہیں جو وہ بھتیجے کو سناتے تھے۔ ان کی زندگی میں آپ انہی کی کفالت میں رہے:

کان الطف عمیه به و یقال اوصاه عبدالمطلب بان یکفله بعده.

''وہ آپ کے چچاؤں میں آپ پر سب سے زیادہ شفیق تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عبدالمطلب نے انہی کو وصیت کی تھی کہ ان کے بعد بھتیجے کی کفالت کریں۔'' (انساب الاشراف، بلاذری، ج:1)

زبیر کی سربراہی کے دوران بنو کنانہ اور ہوازن کے درمیان ایک جنگ ہوئی جسے حرب فجار کا نام دیا جاتا ہے۔ اس میں زبیر بنی ہاشم کے رئیس کی حیثیت ہی سے شامل ہوئے۔ انہی کے دور میں معاہدہ حلف الفضول ہوا تھا اور وہ اس کے روح رواں تھے۔ حضور ﷺ نے بھی اس معاہدہ میں شرکت کی اور اس وقت آپ کی عمر 20 برس تھی۔ جب 25 برس کی عمر میں آپ کی شادی ہوئی تو خطبہ نکاح ابو طالب نے بطور سربراہ خاندان دیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبیر کا انتقال اس وقت ہوا جب حضور ﷺ 22، 23 برس کے ہو چکے تھے اور اب آپ کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ گویا کفالت کا پورا دور زبیر کے ساتھ آپ نے گزارا۔

(حیات رسول اُمی ﷺ، خالد مسعود رحمہ اللہ، ص: 82-83، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، اشاعت: 2014ء)

Marfat.com

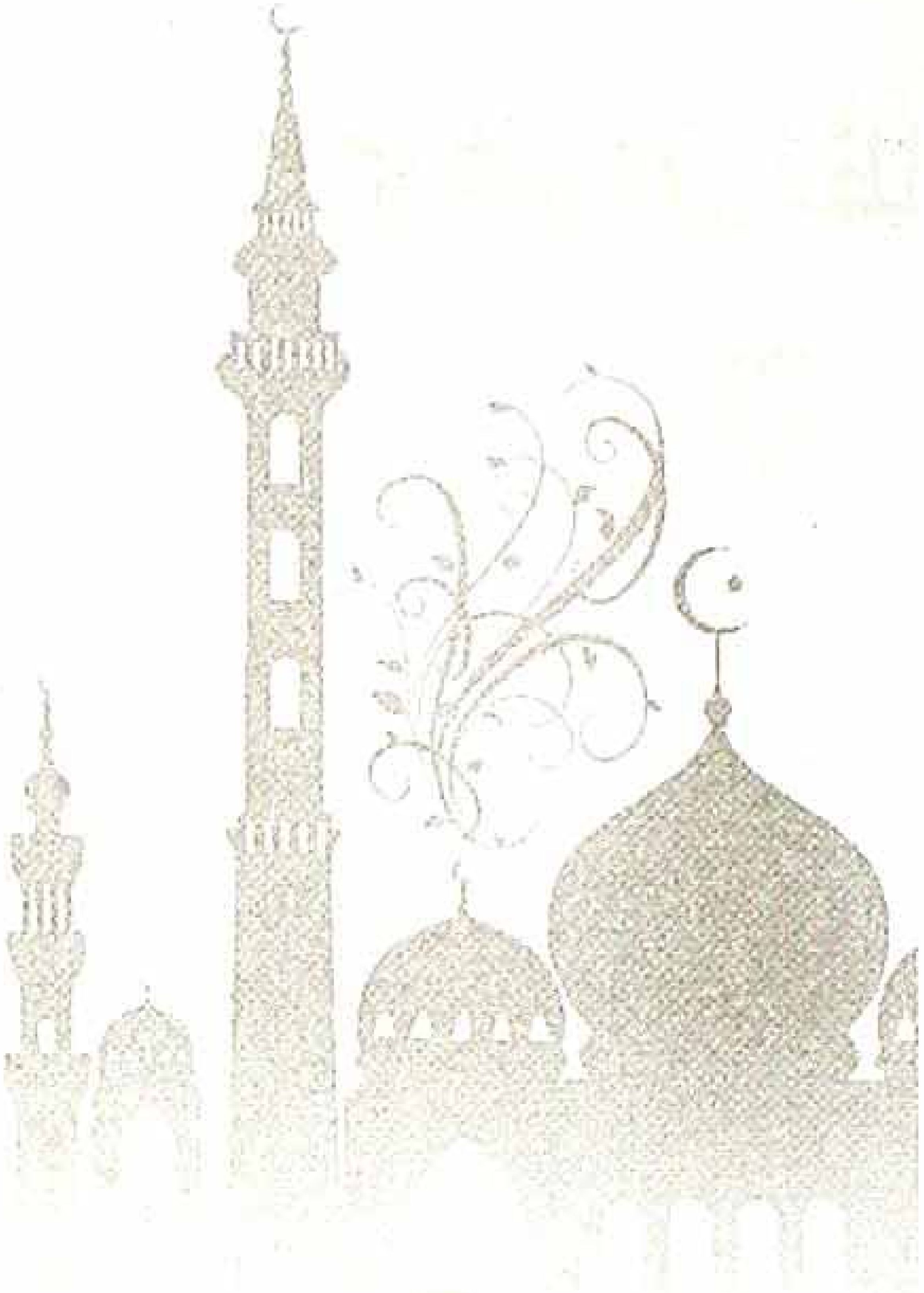

مقالات

باب ششم

اسلام کا شورائی نظام

اسلامی حکومت کا ایک کامیاب تجربہ

مُسلم اُمّہ کی بیداری

قرآن کا تصورِ جنگ

اصلاحِ مُعاشرہ

Marfat.com

اسلام کا شورائی نظام

قرآن مجید میں حکومت وحکمرانی کے بارے میں جو ہدایات ملتی ہیں ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں حاکمیت کا مرکز ومرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی تنہا ساری کائنات کا مالک وحاکم اور تمام انسانوں کا خالق اور آقا ہے۔ تنہا اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ زمین میں اپنے بندوں کے لیے نظام زندگی تجویز کرے اور ان کے لیے قانون بنائے۔ زمین میں خدا کی یہ تشریعی حکومت قائم کرنا بندوں پر اس کا حق ہے۔

﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ﴾ (الاعراف: 54)

''آگاہ رہو کہ خلق اور امر اسی کا حق ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو چوں کہ یہ اختیار دیا ہے کہ وہ چاہیں تو اس کی اطاعت کریں اور چاہیں تو اس کی اطاعت کا قلادہ [1] اتار دیں، اس لیے تشریعی حکومت کے معاملے میں بھی اس نے جبر کو پسند نہیں کیا بلکہ اپنے بندوں کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ اس کی غلامی کے فرائض ادا کرنے کے لیے اس کی ہدایات کے مطابق ایک نظام حکومت قائم کریں جس میں خدا اور رسول کے بتائے ہوئے احکام وشرائع کو نافذ کریں۔ اس اختیار دینے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خدا نے حاکمیت کا حق انسانوں کے سپرد کر دیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو خداوند تعالیٰ قرآن میں ان کے ناحق تصرفات کو ظلم وعدوان، بغاوت، طغیان اور فساد سے تعبیر نہ فرماتا۔ پس معلوم ہوا کہ اسلام میں حکومت کا منصب بہرحال ایک امانت ہے جس کا حق صرف اس صورت میں ادا ہوتا ہے جب حکمران اپنے آپ کو خدا کا بندہ سمجھے، وہ خدا اور رسول کی اطاعت میں سرگرم ہو اور جو احکام وشرائع خدا کے رسول کے ذریعے سے ملے ہیں ان کو بے کم وکاست جاری کرے اور ان میں سرمو کمی بیشی نہ کرے۔ اس حقیقت کا اظہار خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبے میں یہ کہہ کر فرمایا کہ میں تمھارے اندر صرف خدا کی شریعت کو جاری کرنے والا ہوں، اپنی طرف سے کوئی نئی بات نکالنے والا نہیں۔ اگر میں کوئی نئی بات نکالوں یا اللہ کے حدود سے انحراف اختیار کروں تو تم میری راہ سیدھی کر دینا۔

اسلام میں حکمرانی کے مذکورہ تقاضوں ہی کی بدولت مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اولوالامر کی اطاعت کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاحب امر کی اطاعت کو اپنی اطاعت اور اس کی نافرمانی کو اپنی نافرمانی قرار دیا۔ صاحب امر کی یہ حیثیت صرف اس وجہ سے ہوئی کہ وہ زمین میں خدا کی تشریعی حاکمیت کے نفاذ کا ذریعہ بنتا ہے۔

---

[1] قلادہ: پٹا۔

Marfat.com

اسلام نے مسلمانوں کے لیے جو نظام زندگی تجویز کیا، قرآن وسنت میں اس کے اصول ومبادی متعین کر دیے گئے ہیں۔ معاملات کی جزئیات وتفصیلات سے نہ ان میں زیادہ تعرض [1] کیا گیا ہے اور نہ ان کا احاطہ ممکن ہے۔ ان جزئیات وتفصیلات کو طے کرنا اور حالات وضروریات کے تقاضوں کے تحت اسلام کے منشاء ومزاج کے مطابق اقدامات تجویز کرنا امت کی صوابدید پر چھوڑا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام تنہا سربراہ حکومت کے بس کا نہیں۔ اس کی وسعت، گہرائی اور اہمیت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ صاحب امر کے ساتھ ایسے لوگ اس کی ذمہ داری میں شریک کار ہوں جو اجتماعی، سیاسی اور قانونی معاملات میں اس کو صحیح مشورے دے سکیں اور اس کے کام کو آسان بنا سکیں۔ بذات خود سربراہ حکومت کا کام بھی اس قدر وسیع الاطراف اور پھیلا ہوا ہوتا ہے کہ جب تک ثقہ، اہل اور قابل اعتماد رفقاء کار میسر نہ ہوں کسی شخص کے لیے اس سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ حکومت کی ان ضروریات کے پیش نظر اسلام نے ایک مکمل شورائی نظام کتاب وسنت میں تجویز کر دیا ہے۔

یہ معلوم ہے کہ مکہ میں مسلمان نہایت مظلوم ومقہور تھے۔ جب بعض مسلمانوں کے مدینہ منتقل ہو جانے کے بعد اس بات کا امکان پیدا ہو گیا کہ وہ ایک ہیئت اجتماعی وسیاسی میں منظم ہو سکیں تو ان کو جو ہدایات دی گئیں ان میں نماز اور شورائیت سرفہرست تھیں۔ فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۝﴾ (الشوریٰ: 38)

''اور وہ جنھوں نے اپنے رب کی دعوت پر لبیک کہی اور نماز کا اہتمام کیا اور ان کا نظام شوریٰ (پر قائم) ہے اور جو کچھ ہم نے ان کو رزق بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

اس آیت میں نماز کا ذکر ایمان کے مظہر اول کی حیثیت سے ہے اور اجتماعی نظم کے بارے میں فرمایا کہ یہ خودسری، انانیت، خاندانی برتری اور نسبی غرور پر مبنی نہیں، جیسا کہ عام طور پر غلط کار معاشرے سمجھتے ہیں اور جیسا کہ قریش سمجھتے تھے، بلکہ اہل ایمان کے باہمی مشورے پر مبنی ہے، چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے قول وعمل سے شورائیت کے اس نظام کو امت میں رائج فرمایا اور آپ کے خلفاء نے بھی اسی اساس پر اپنا سیاسی نظام قائم کیا۔

سورہ شوریٰ کی مذکورہ آیت میں نماز کے پہلو بہ پہلو شوریٰ کے ذکر سے مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر تدبر قرآن میں نہایت لطیف استدلال کیا ہے۔ وہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ شوریٰ کی وہ کون سی اہمیت ہے جس کی بنا پر اسے نماز کے پہلو میں جگہ دی گئی، لکھتے ہیں:

''ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اسلام کے نظم اجتماعی کی روح اور اس کے قالب کی اصلی شکل نماز میں محفوظ کی گئی ہے۔ اسی کے اندر مسلمانوں کو دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ان کو اللہ کی بندگی کے لیے ایک

---

[1] تعرض: چھیڑنا، زیر بحث لانا۔

Marfat.com

بنیان مرصوص [1] بن کر کھڑے ہونا ہے، کس طرح اپنے اندر سے سب سے زیادہ علم وتقویٰ والے کو اپنی امامت کے لیے منتخب کرنا ہے، کس طرح لوگوں کو حدود الٰہی کے اندر اس امام کی بے چون وچرا اطاعت کرنی ہے اور کس طرح امام اس بات کا پابند ہے کہ لوگوں کو کسی ایسی بات کا حکم نہ دے جو اللہ اور رسول ﷺ کے کسی حکم کے خلاف ہو اور کس طرح اس کے ایک ادنیٰ مقتدی کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ کوئی غلطی کرے تو وہ اس کو ٹوک دے یہاں تک کہ عین نماز کے اندر بھی رکوع، سجود، قیام، قعود یا تلاوت میں کوئی ادنیٰ فروگزاشت بھی اس سے صادر ہو جائے تو اس کے پیچھے ہر نماز پڑھنے والا اس کو متنبہ کرنے کا ذمہ دار ہے اور امام کا فرض ہے کہ اگر مقتدی کی تنبیہ مطابق شریعت ہے تو وہ اس کو قبول اور اپنی غلطی کی فوراً اصلاح کرے۔ گویا اس طرح ہمارا پورا نظم اجتماعی نماز کی صورت میں متشکل کر کے ہمیں یہ دکھایا گیا کہ ہم اپنی سیاسی تنظیم میں اسی نمونے کی پیروی کریں۔ اسی طرح اللہ کے دین کی اقامت کے لیے اپنی تنظیم کریں، اسی طرح اپنے اندر سے سب سے زیادہ اہل اور صاحب علم وتقویٰ کو اپنی قیادت کے لیے منتخب کریں، اسی طرح تمام معروف میں بے چون وچرا اس کی اطاعت کریں اور اگر اس سے کوئی ایسی بات صادر ہو جو شریعت کے معروف کے خلاف ہو تو بے خوف لومۃ لائم اس کو متنبہ کر کے اس کو صحیح راہ پر لانے کی کوشش کریں۔''

آنحضرت ﷺ نے اپنے طرز عمل سے اس شورائیت کی بنا کیسے ڈالی؟ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ سیاسی وانتظامی معاملات میں اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے برابر مشورہ کرتے رہتے تھے۔ آپ ﷺ کی حوصلہ افزائی ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ صحابہ امور مصلحت میں نبی ﷺ کے سامنے یہ عرض کرتے کہ اگر حضور ﷺ کا فلاں اقدام وحی الٰہی پر مبنی نہ ہو تو اس کی جگہ فلاح تدبیر زیادہ قرین مصلحت رہے گی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ لیتے رہنے والا کبھی کسی شخص کو نہیں پایا۔ آنحضرت ﷺ نے جس قسم کے معاملات میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورے لیے، ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان میں جنگی، سیاسی، اقتصادی اور سماجی ہر قسم کے معاملات داخل ہیں۔ خلفائے راشدین کے دور میں مجلس شوریٰ مسلمانوں کے جلیل القدر اور معتمد وذی علم نمائندوں پر مشتمل ہوتی تھی اور تمام اہم امور میں اس سے مشورہ لینے کا باقاعدہ نظام قائم کر دیا گیا تھا۔

قرآن مجید نے اہل شوریٰ کی صفات کے ضمن میں مسلمانوں کو تاریکی میں نہیں چھوڑا۔ سورہ نساء میں مندرجہ ذیل ہدایت دی گئی ہے:

﴿وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ﴾ (النساء: 83)

''اور جب ان کو امن یا خطرے کی کوئی اطلاع ملتی ہے تو وہ اس کو پھیلا دیتے ہیں اور اگر وہ اس کو رسول ﷺ

---

[1] بنیانِ مرصوص: مضبوط بنیاد۔ مقتدی: پیروکار۔ لومۃ لائم: ملامت کرنے والے کی ملامت۔

Marfat.com

اور اپنے اہل حل و عقد کے سامنے پیش کرتے تو اس کو وہ لوگ جو اہل بصیرت ہیں ٹھیک طور پر سمجھ سکتے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اسلامی نظام میں جن لوگوں کے سامنے معاملات پیش کیے جانے چاہئیں، ان کی دو صفتیں متعین ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مسلمانوں کے اولوالامر یعنی سربراہ کار ہوں، دوسری یہ کہ وہ اہل استنباط یعنی معاملات کی سوجھ بوجھ اور دینی و سیاسی بصیرت رکھنے والے ہوں تاکہ وہ ہر معاملے میں صحیح رائے قائم کر سکیں اور معاملات کی تہ تک پہنچ سکیں۔

خلفائے راشدین کے زمانے میں مجلس شوریٰ کے ارکان اگرچہ موجودہ سیاسی مفہوم میں قوم کے منتخب نمائندے نہیں ہوتے تھے، اس لیے کہ اس زمانے میں انتخابات کا موجودہ طریقہ روشناس نہیں ہوا تھا، لیکن یہ لوگ اپنے اپنے گروہوں کے معتمد نمائندے ضرور ہوتے تھے اور دینی بصیرت، اعلیٰ کردار، سیاسی سوجھ بوجھ اور علمی و قانونی مہارت میں ان کے نمایاں مقام کی وجہ سے لوگ اپنے معاملات میں انہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اس وقت یہ اہل الرائے حکومت کے مرکز میں مجتمع تھے۔ نیز گروہوں اور قبیلوں کے سماجی نظام کی بدولت ان کے لیڈروں کا تعین آسان تھا اس لیے ان کے انتخاب میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ دور حاضر میں اسلامی حکومت قوم کے معتمد اور موزوں اشخاص کے تعین کے لیے کوئی جدید طریقہ اختیار کر سکتی ہے جو زمانے کے مزاج کے مطابق ہو۔

اسلام میں خود خلیفہ اور اس کی مجلس شوریٰ چوں کہ خداوند تعالیٰ کی تشریعی حاکمیت کو نافذ کرنے والی ہوتی ہے اس لیے اسلام کے ساتھ وفاداری تمام اولوالامر کے لیے ایک ضروری شرط ہے۔ اس سلسلے میں اہل تحقیق کی رائے یہ ہے کہ وہ چند خصوصیات کے حامل ہونے ضروری ہیں...... مثلاً وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھتے ہوں، خدا کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت کو آخری دینی و قانونی سند مانتے ہوں، اسلام کے احکام و شرائع کے پابند ہوں، تہذیب و معاشرت میں اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہوں اور حلال و حرام کے بارے میں وہ اسلام کے مقرر کیے ہوئے حدود کے پابند ہوں۔ ان خصوصیات سے متصف افراد ہی دین کے لیے اپنی ذمہ داری کو سمجھ سکتے اور اسے ادا کر سکتے ہیں۔

اسلام کے اس شورائی نظام سیاست میں بڑی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ اجتماعیت میں شورائیت اس حسن ظن و اعتماد کا مظہر ہے جو راعی اور رعایا اور امیر و مامور میں ہونا چاہیے۔ اسی سے استبداد [1] اور سخت دلی کی جڑ کٹتی ہے اور راعی اور رعایا کی طرف سے وہ تعاون ظہور میں آتا ہے جو استحکام کی بنیاد ہے اور جس سے وحدت و قوت کی برکتیں ظہور میں آتی ہیں۔ اکثریت کی رائے میں فی الجملہ صحت کا گمان غالب ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اگر فصلِ نزاعات میں اس کو فیصلہ کن مانا جائے تو مصلحت کے پہلو سے یہ راہ مامون و محفوظ ہے۔ چونکہ یہ راہ خدا کی ہدایت اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق ہے اس لیے اس کے اختیار کرنے میں اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے اور اس معاشرے پر خدا کا ہاتھ ہوتا ہے جو اسے اختیار کرے۔

☆......☆......☆

---

[1] استبداد: ضد کرنا۔ آمرانہ حکومت۔

Marfat.com

اسلامی حکومت کا ایک کامیاب تجربہ

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں امت مسلمہ اگرچہ زوال کا شکار تھی، تاہم بعض علاقوں میں اس میں ایسے مصلحین پیدا ہوئے جنھوں نے اسلام کی تعلیم کو نہایت پرحکمت انداز میں پھیلایا، نئے لوگوں کو اسلام سے روشناس کرایا اور اگر موقع ملا تو اسلام کی بنیاد پر سیاسی نظام قائم کرنے کی کوشش کی۔ ہمارے ملک میں سید احمد شہید کی تحریک مجاہدین انہی مقاصد کے ساتھ اٹھی لیکن سید صاحب کی قائم کردہ ریاست 1825ء سے 1831ء تک برقرار رہ سکی اور ان کی شہادت کے بعد اس کا آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ اسی زمانے میں موجودہ شمالی نائیجریا کے علاقے میں بھی ایک اسلامی تحریک اٹھی جس کے سربراہ شیخ عثمان بن محمد تھے۔ اس تحریک نے افریقیوں کو اسلام کی طرف راغب کیا، غیر مسلموں کے خلاف جہاد کیا اور علاقے میں نظام خلافت رائج کردیا جو خلافت سوکوٹو کے نام سے 1805ء سے 1903ء تک تقریباً ایک صدی قائم رہا۔ اس نظام نے ملک کو خوش حال اور اسلام کا گہوارہ بنا دیا اور مغربی و وسطی افریقہ پر انمٹ نقوش ثبت کیے۔ شیخ عثمان کے قائم کردہ نظام کو اس اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل ہے کہ اس کا تجربہ ہمارے زمانے سے قریب العہد ہے۔ اس میں اسلام کی تعلیمات کو مشعل راہ بنایا گیا اور غیر مہذب انسانوں کے براعظم کے قلب میں ایک ایسی حکومت قائم کردی گئی جس کے متعلق ایک انگریز جاسوس کلیپرٹن کے تاثرات یہ تھے کہ اس میں امن وامان کا یہ حال تھا کہ ایک حبشی عورت اگر سونے سے بھرا ہوا ٹوکرا سر پر اٹھائے ہوئے تنہا سفر کرتی تو اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ افریقہ کے اس تجربے میں ان ممالک کے لیے کام کرنے کا ایک نمونہ موجود ہے جو اپنے علاقوں میں اسلام کو رواج دینے کے خواہش مند ہوں۔

شیخ عثمان بن محمد، جو اپنی علاقائی زبان میں شیخو عثمان دان فودیو کے نام سے معروف ہیں، 1754ء میں موجودہ شمالی نائیجریا کے علاقے گوبیر کے ایک قصبے میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق فُلانی یا فولانی قبیلہ سے تھا۔ والد ایک عالم دین تھے اور انھوں نے بیٹے کو بھی دین کی تعلیم دلائی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد شیخ عثمان کو ایک عالم و مبلغ جبریل بن عمر کے زیر تربیت کام کرنے کا موقع ملا جو مشرک طوارق (Tuareg) قبائل میں تبلیغ دین کرتے تھے۔ شیخ نے بھی اسی مشن کو اختیار کرلیا اور 1774ء میں ریاست گوبیر کے ان علاقوں میں دین کی تبلیغ شروع کردی جو ابھی اسلام کی دعوت سے ناآشنا تھے۔ ان کے وعظ میں بلا کی کشش تھی۔ بڑی تعداد میں لوگ ان سے متاثر ہوئے اور اسلام قبول کرلیا۔

Marfat.com

وعظ کے علاوہ تصانیف کو بھی شیخ نے اشاعت دین کا ذریعہ بنایا۔ یہ تصانیف عربی کے علاوہ دو علاقائی زبانوں میں بھی تھیں۔ ان کی مشہور کتابوں کے نام سراج الاخوان، نجم الاخوان، تعلیم الاخوان، تنبیہ الاخوان، تمییز اهل السنه، تمییز المسلمین من الکافرین، کتاب الفرق اور نصیحة اهل الزمان ہیں۔ ان میں انھوں نے اسلام اور کفر کے درمیان فرق کو واضح کیا، مسلمانوں کو دین کے تقاضے بتائے اور دین کے بارے میں پائے جانے والے شبہات کو رفع کیا۔ شیخ کی پیہم جدوجہد کے نتیجے میں علاقے کی کئی ریاستوں میں ان کا اثر ورسوخ پھیلا اور وہ علماء اور عوام دونوں میں یکساں مقبول ہوئے۔

گوبیر کا سلطان مسلمان تھا لیکن اس کا انداز حکمرانی ظالمانہ تھا۔ شیخ اس کے جبر وتشدد، بے انصافی اور عیش وعشرت پر بھی تنقید کرتے جس سے وہ ان کے خلاف ہوگیا۔ ان کی مقبولیت کا خطرہ بھانپتے ہوئے اس نے تبلیغ دین پر پابندی عائد کردی اور یہ حکم جاری کیا کہ کوئی شخص اپنا آبائی مذہب تبدیل نہیں کرسکتا اور جو لوگ مذہب تبدیل کر چکے ہوں وہ دوبارہ اپنے سابقہ مذہب کو اختیار کریں۔ اس نے اپنی ریاست میں مردوں کے پگڑی باندھنے اور عورتوں کے نقاب لینے پر پابندی لگادی کیوں کہ یہ شیخ کے معتقدین کی علامت بن چکی تھی۔ شیخ نے صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی کہ وہ اپنے دفاع کے لیے ہتھیار حاصل کریں اور ان کے استعمال کی مشق کریں۔ 1801ء میں سلطان گوبیر نفاتا کا انتقال ہوگیا۔ اس کی جگہ اس کا بیٹا ینفا گوبیر کا حکمران بنا۔ اس نے کسی زمانے میں شیخ عثمان سے تعلیم حاصل کی تھی اس لیے ان کو توقع تھی کہ اب حکومت کی پالیسی ان کے لیے مخالفانہ نہیں ہوگی۔ لیکن ہوا اس کے برعکس یعنی ینفا نے مسلمانوں پر اور زیادہ سختی شروع کردی اور شیخ کو اپنے ہاں دعوت دے کر قتل کرنے کی کوشش کی جس سے وہ بچ نکلے۔ پھر اس نے شیخ کو علاقہ چھوڑ جانے کا حکم دیا۔ اس صورت حال میں شیخ نے ہجرت کا فیصلہ کرلیا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر ریاست کی سرحد پر ایک صحرا میں نکل گئے۔ اس سفر میں ان کو خوراک کی کمی کے مسئلے سے دوچار ہونا پڑا لیکن مہاجرین نے مشکلات کا مقابلہ بڑی پامردی [1] سے کیا۔

شیخ کی ہجرت کے دوران 1804ء میں ینفا کی فوج نے مہاجرین پر حملے شروع کردیے۔ اس پر شیخ کے ساتھیوں نے ان کو امیر جہاد اور امیر المومنین مقرر کیا تاکہ وہ منظم ہوکر اپنا دفاع کرسکیں۔ مہاجرین کے پاس واحد ہتھیار اپنے علاقے کے تیر کمان تھے جب کہ حکومت نے گھڑ سوار فوج جو بہتر اسلحہ سے لیس تھی بھیج رکھی تھی، تاہم تائید غیبی سے شیخ کے ساتھی فتح یاب ہوتے رہے۔ شہادت کی خواہش نے ممولے کو شہباز سے لڑادیا اور اس دوران میں شیخ نے سیاسی اقدامات بھی کیے اور فلانی قبیلے کا تعاون حاصل کیا۔ اسی طرح دوسرے قبائل میں بھی اپنے نفوذ کو مستحکم کیا۔ اس کا اثر نہایت حوصلہ افزا ہوا اور 1808ء میں شیخ نے گوبیر کے دارالحکومت پر قبضہ کرلیا۔ اب شیخ کے زیرانتظام گوبیر کی ایک شہری ریاست تھی لیکن انھوں نے جلد ہی ان قبائل کے خلاف مہمات شروع کردیں جنھوں نے ان کے لیے

---

[1] پامردی: قوت۔

Marfat.com

رکاوٹیں کھڑی کی تھیں۔ ان مہمات پر انھوں نے اپنے بھائی عبداللہ اور بیٹے محمد بیلو کو مقرر کیا جنھوں نے رفتہ رفتہ گردو پیش کی کئی ریاستوں کو مطیع کر لیا۔ شیخ کی پالیسی یہ تھی کہ صرف ان ریاستوں کے خلاف ہتھیار اٹھائے جائیں جو بت پرست ہیں یا اسلام کے لیے سدراہ بنی ہوئی ہیں یا لادین ہیں۔ ہوتے ہوتے شیخ کی حکومت پچاس ہزار مربع میل پر محیط ہوگئی۔ اس میں وہ علم اور نظم وضبط پر مبنی انقلاب لے آئے جس نے ان کی اسلامی ریاست کو مغربی وسطی افریقہ میں اسلام کا مرکز ثقل بنا دیا۔

حکومت کو اسلامی خلافت کے رنگ میں رنگنا شیخ عثمان کا اصل کارنامہ ہے۔ ان کے سامنے اس کا کوئی نمونہ موجود نہ تھا۔ علماء کی معلومات کتب فقہ تک محدود تھیں۔ صوفیہ کا علاقے میں زور تھا۔ شیخ کے ساتھیوں نے بھی ان کو یہی مشورہ دیا کہ وہ غالب فقہی مذہب اور صوفیانہ مسلک پر مبنی نظام حکومت رائج کر دیں لیکن شیخ نے قرآن وسنت کے تقاضوں کو نہایت عمدہ پیرائے میں سمجھایا اور ان کی معین کردہ پالیسی بعد کے خلفاء کے لیے بھی مشعل راہ رہی۔

شیخ نے ہر اس شخص کو جو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر اعتقاد رکھتا اور قرآن وسنت کو اپنا رہنما مانتا ہو، مسلمان قرار دیا جس کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو اسلام نے اس کو عطا کیے ہیں۔ انھوں نے یہ بات واضح کی کہ اسلامی خلافت کے لیے رہنمائی قرآن وسنت رسول اللہ ﷺ سے حاصل کی جائے گی اور کسی خاص فقہ پر انحصار نہیں کیا جائے گا۔ قرآن وسنت کو اختیار کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے لیکن فقہی مذاہب انسانی جدوجہد کا نتیجہ ہیں اس لیے ان کو اختیار کرنا امت پر فرض نہیں ہے۔ اسی لیے ان مذاہب کی بنیاد رکھنے والوں نے بھی ان کے نافذ کرنے پر کبھی اصرار نہیں کیا۔ اسلام ایک کامل دین ہے۔ اس کے جو عناصر امت پر لازم تھے ان کو حیات نبوی ہی میں کامل کر دیا گیا تھا۔ بعد میں پیدا ہونے والے مسائل کے حل کے لیے اجتہاد کا طریقہ تجویز کیا گیا۔ تمام فقہی مذاہب اصلاً اجتہاد پر مبنی ہیں۔ چوں کہ امت مسلمہ نے ان تمام مذاہب کو شریعت کے اندر قرار دیا ہے اس لیے یہ سب کے سب امت کا ایک قیمتی ورثہ ہیں۔ حکومت کے لیے ضروری ہے کہ ان سب سے فائدہ اٹھائے اور ان میں سے کسی ایک مکتب فکر کے ساتھ جامد نسبت قائم کر کے اپنے اوپر شریعت کی وسعت کو تنگ نہ کرے، ایسا اقدام امت میں تفرقہ پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔ صحیح طرز عمل یہ ہوگا کہ تمام مکاتب فکر سے یکساں استفادہ کیا جائے اور شریعت اور فقہ میں فرق کر کے زمانے کی ضرورت کے لحاظ سے احکام اخذ کیے جائیں۔ شیخ نے علماء کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے علم کو وسعت دیں اور اسلام کے اس تقاضا کو سمجھیں کہ یہ ایک عقلی دین ہے۔ آنکھیں بند کر کے اسلام پر چلنے والا شریعت کی واضح ہدایات کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے۔ علماء کو بالغ نظری کا ثبوت دیتے ہوئے تمام مسائل کا حل دریافت کرنا چاہیے۔ اس کے لیے وہ تمام فقہی مذاہب کو مدنظر رکھیں کیوں کہ یہ سب مذاہب امت کا یکساں محترم ورثہ ہیں۔

شیخ نے واضح کیا کہ احکام شریعت کے مقابلہ میں جو حیثیت فقہی مذاہب کی ہے ٹھیک وہی حیثیت کتاب وسنت کی ہدایات کے مقابلے میں صوفیانہ مسالک یا کلامی مذاہب کی ہے۔ تصوف تزکیۂ نفس کے دائرے میں ایک اجتہاد

Marfat.com

ہے جو صحیح بھی ہوسکتا ہے اور غلط بھی۔ لہٰذا آدمی کی فلاح ونجات تصوف کے اختیار کرنے پر منحصر نہیں ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ان سیدھے سادے عقائد پر ایمان لانا کافی ہے جو قرآن وسنت کی روشنی میں سمجھ میں آتے ہیں۔ ان کے بارے میں گہری فلسفیانہ رائیں اجتہادی نوعیت کی ہیں جن کو اختیار کرنا ضروری نہیں۔ نظام خلافت صرف قرآن وسنت کو رہنما بنا سکتا ہے۔ اگر وہ فقہی وصوفیانہ مسالک کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرلے تو معاشرے میں اختلاف پیدا کرنے کا باعث ہوگا جس سے امت کی وحدت کو نقصان پہنچے گا۔

شیخ نے اپنے عقیدت مندوں کے اندر سیاسی شعور بیدار کیا اور ان کو تلقین کی کہ وہ ہمیشہ افراد کے نہیں بلکہ نظام خلافت کے وفادار رہیں۔ ریاست کے تمام کاموں اور حکومت کی پالیسیوں میں قرآن وسنت کو اولین ترجیح ہونی چاہیے۔ عدل واخوت کا ایسا مظاہرہ ہونا چاہیے جس میں نظام خلافت امت مسلمہ کو متحد رکھ سکے اور ہر شخص اس میں تحفظ پائے۔

شیخ نے مشاورت کے لیے اہل الاختیار کی ایک مجلس قائم کی جو علماء، سرداروں اور فوجی کمانڈروں پر مشتمل تھی۔ انھوں نے عوام کی فلاح وبہبود کے کاموں کے لیے امیر المصالح کا ایک عہدہ قائم کیا۔ ریاست کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک کی امارت اپنے بھائی عبداللہ کے اور دوسرے کی امارت اپنے بیٹے محمد بیلو کے سپرد کی۔ یہ دونوں عالم دین اور صاحب تصنیف تھے۔ شیخ خود خلافت کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیم دین میں بھی مصروف رہے۔ وہ اپنی معاشی ضروریات کے لیے رسی بٹنے کا کام کرتے تھے جو تعلیم وتبلیغ کے دوران بھی جاری رہتا۔ ان کی وفات 1817ء میں ہوئی۔

شیخ کی وفات پر اہل الاختیار نے محمد بیلو کو خلیفہ منتخب کیا۔ ان کے عہدہ سنبھالتے ہی ہر طرف بغاوتیں شروع ہوگئیں۔ محمد بیلو نے پہلے تو اخلاقی اپیل سے لوگوں کو متحد رکھنا چاہا لیکن جب یہ اپیل کارگر ثابت نہ ہوئی تو انھوں نے طاقت استعمال کر کے قلیل مدت میں تمام مخالفین کو زیر کرلیا۔ محمد بیلو کا دور خلافت 1837ء تک رہا۔ بیس سال کی مدت میں انھوں نے نہ صرف نظام خلافت کو مستحکم کیا بلکہ ریاست کی حدود کو وسعت دے کر اس کا رقبہ تین گنا کردیا۔

محمد بیلو کے دور خلافت میں علماء نے پھر فقہی مذاہب کی پیروی پر زور دیا اور خلیفہ کے بعض فیصلوں اور پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا جو ان کے خیال میں شریعت کے مطابق نہ تھیں۔ اس پر خلیفہ نے اپنی تصانیف میں ان پالیسیوں کا دفاع کیا اور علماء پر واضح کیا کہ وہ خود دین کی تعلیم رکھتے ہیں، فقہی مذاہب سے آگاہ ہیں لیکن خلیفہ کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو بھی سمجھتے ہیں۔ ریاست کی پالیسیاں بناتے وقت امام کو فقہ کی کتابوں کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ شریعت کے مقاصد کو حاصل کرنا ہوتا ہے۔ قانون کا مقصد عوام کو جکڑ کر رکھ دینا نہیں بلکہ ان کی مشکلات کو دور کرنا اور زندگی کو آسان بنانا ہوتا ہے۔ شریعت میں حلال اور حرام متعین طور پر معلوم ہیں لیکن باقی چیزیں متعین طور پر نہ حلال ہیں نہ حرام۔ افراد، زمانہ، مقام اور مقاصد کے لحاظ سے ان کے معاملہ میں مختلف آراء قائم کی جاسکتی

Marfat.com

ہیں۔ احوال بدل جانے سے ان کے لیے فتویٰ بھی بدلا جا سکتا ہے۔ خلیفہ کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ایسے معاملات میں حقائق اور مصالح کو پیش نظر رکھ کر قدم اٹھائے۔ اس بحث میں خلیفہ نے حسب ذیل اصول قائم کیے جو مصلحت دین کے نقطہ نظر سے بہت اہمیت رکھتے ہیں:

1۔ کسی اقدام کی صلاحیت پر رائے زنی کے لیے ضروری ہے کہ حاکم کی نیت کو سمجھا جائے۔ خلیفہ نے اپنے عاملین کو حکم دیا تھا کہ وہ اچھا لباس زیب تن کریں۔ علماء نے اس ہدایت کو زہد کے منافی قرار دیا۔ خلیفہ نے اس کی مصلحت کو واضح کرتے ہوئے لکھا کہ خوش لباسی کا مقصد اگر تفاخر یا خودنمائی ہو تو وہ بلاشبہ جائز نہیں لیکن تقریبات میں مثلاً عید کے موقع پر نئے کپڑے پہننا خود سنت کی رو سے ایک پسندیدہ کام ہے۔ حکومت کی ہدایت میں یہ مصلحت ملحوظ ہے کہ حکام کو مختلف وفود کے ساتھ ملاقات کرنی پڑتی ہے۔ خود دینی وقار کا تقاضا یہ ہے کہ حکام خوش لباس ہوں۔

2۔ عامۃ الناس کے لیے شریعت آسانی مہیا کرنے کی ہدایت دیتی ہے۔ جو کام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی نگاہوں میں بے حقیقت تھے بعد کے ادوار میں ان پر عمل کرنا بھی اعلیٰ دین داری قرار پایا۔ خود قرآن نے بعض احکام میں حالات بدلنے پر تخفیف فرمائی۔ لہٰذا موجودہ زمانے میں دین کے ساتھ وابستگی کے رجحان کا لحاظ رکھ کر ہی حکومت کی پالیسیاں وضع کرنا دانش مندی ہوگی۔ ان لوگوں کے لیے وہی معیار سامنے رکھنا زیادتی ہے جو دور اول کے مسلمانوں کے سامنے تھا۔

3۔ مجبوری کی تمام صورتوں میں شریعت نے رخصت دی ہے۔ مثال کے طور پر انگور کی کاشت پر اس خدشے کی بنا پر قدغن نہیں لگائی جا سکتی کہ کچھ لوگ اس سے شراب کشید کر لیں گے۔ اسی طرح ایک تاجر بازار میں بیٹھنے سے اس بنا پر نہیں رک سکتا کہ اس کی نظر وہاں سے بے حجابانہ گزرنے والی نامحرم عورتوں پر پڑے گی۔

4۔ غیر مسلم اقوام کے تجربات سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ وہ شریعت کے منافی نہ ہوں۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ احزاب میں کفار کے حملے کو روکنے کے لیے اہل فارس کے تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مدینہ کے گرد خندق کھدوائی۔

5۔ حکومت کو اپنی پالیسیاں واضح کرنے میں عرف اور رواج کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ عرف سے مراد کسی قوم کا وہ تاریخی اور ثقافتی تجربہ ہے جس سے ان کا ذوق، جبلت، صفات و خصوصیات عبارت ہوتی ہیں اور جس کے باعث وہ دوسری قوموں سے مختلف نظر آتی ہے۔ چوں کہ معاشرہ تغیر پذیر ہوتا ہے اس لیے عرف بھی تغیر پذیر ہے۔ اس سلسلے میں خلیفہ نے ایک حکم نامہ بھی جاری کیا کہ فیصلوں میں موجودہ معاشرتی حقائق کا لحاظ رکھا جائے۔ علماء و قضاۃ ان قانونی نظریات پر انحصار کرنے میں احتیاط کریں جو بالکل مختلف معاشرتی صورت حال پر قائم کیے گئے تھے۔ کتابوں کے متن کے ساتھ جامد وابستگی پر اصرار دین کی غلط تعبیر اور سلف کے طریقے سے ناواقفیت ہے۔

Marfat.com

ب۔ مملکت کے ہر علاقے کے احوال کے لحاظ سے قانونی نظام قائم کیا جائے۔

ج۔ عرف پر مبنی قوانین اور ضابطے اس وقت بدل دیے جائیں جب عرف تبدیل ہو جائے۔

6۔ شریعت کے نفاذ میں سیاست اور حکمت عملی کو ملحوظ رکھا جائے۔ ناروا سختی سے لوگ نظام خلافت کی مخالفت پر آمادہ ہو جائیں گے۔ لوک ناچ اور لوک گانے حبشیوں کی ثقافت کا حصہ تھے۔ بعض علماء نے ان پر پابندی لگانے کی تجویز پیش کی لیکن خلیفہ نے اس کو مصلحت دین کے نقطۂ نظر سے درست نہیں سمجھا۔ انھوں نے دین کی تعلیم کو اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ اسی طرح خلیفہ کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا کہ باؤچی علاقہ فتح ہو چکا لیکن وہاں آبادی غیر مسلم اکثریت پر مشتمل ہے۔ مسلمان اقلیت میں ہونے کے باعث مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں۔ علاقہ پہاڑی ہے جہاں رسل و رسائل، انتظام اور سیاسی تسلط کی راہ میں بڑی رکاوٹیں حائل ہیں۔ مسلمان اپنے علاقے سے نکلنے پر بھی آمادہ نہیں۔ خلیفہ نے علاقے کے امیر کو لکھا کہ حکمران اپنی رعایا کا اسی طرح محافظ ہوتا ہے جس طرح چرواہا اپنے گلے کا، لہٰذا مسلمان اقلیت کو تحفظ دینا حکومت کی ذمہ داری ہے جس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ یا تو مسلمانوں کو یکجا کر کے ان کی اکثریت کے علاقے بنائے جائیں یا باہر سے مسلمانوں کو مراعات دے کر باؤچی علاقہ میں آباد کیا جائے۔ اس ہدایت کی روشنی میں مقامی امیر نے آبادکاری کی اسکیمیں نافذ کیں، زراعت کی بہتری کی تدبیریں اختیار کیں اور نئے شہر آباد کر کے ان میں مسلمانوں کو آباد کیا۔ اس کے نتیجہ میں علاقے کی مسلمان اقلیت پر منڈلانے والے خطرات بھی ٹل گئے اور جا بجا مسلمانوں کے مراکز بھی قائم ہو گئے جو دین کی اشاعت کا بھی ذریعہ بنے۔

محمد بیلو نے اصول جہانبانی اور آداب حکمرانی پر کئی کتابیں تصنیف کیں جن سے ان کے حکام نے رہنمائی حاصل کی اور جو بعد کے خلفاء کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئیں۔ ان کتابوں میں زیادہ شہرت ضیاء الامام، ضیاء الحکام، ضیاء الاحتساب اور اصول السیاسہ کو حاصل ہوئی۔ ان میں خلیفہ نے ایسی ہدایات دیں جو ہر زمانے میں ایک اسلامی حکومت کے لیے رہنمائی دے سکتی ہیں۔ مثلاً:

امام اس شخص کو بنایا جائے جو معاشرے کا بہترین شخص ہو، عالم دین ہو، بلند کردار کا حامل ہو، بلند ہمت اور پرعزم ہو، سیاست کے تقاضوں کو سمجھتا ہو، قرآن وسنت کو رہنما بناتا ہو اور خود عہدہ کا طالب نہ ہو۔

جب کسی شخص کو امارت سونپ دی جائے تو اسے چاہیے کہ اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے میں اخلاص سے کام لے، تقویٰ کی روش اختیار کرے، اللہ کے ساتھ شعوری تعلق قائم رکھے، عوام کے لیے نرم خو ہو اور پالیسیوں کو نرم رکھے، دوسرے لوگوں کے لیے مثالی نمونہ ہو۔

امام افسروں کے انتخاب میں اپنے مفادات کو ملحوظ نہ رکھے بلکہ ان میں خدا خوفی اور عہدہ کے لیے موزونیت کو اہمیت دے۔ عہدے کے طالب کو عہدے پر فائز نہ کیا جائے۔ ہر عہدے کے فرائض اور ہر افسر کے اختیارات

Marfat.com

متعین ہونے چاہئیں تاکہ ذمہ داری کا تعین کیا جاسکے۔ عہدہ قبول کرتے اور اس کو چھوڑتے وقت ہر افسر اپنی جائیداد اور اپنے مفادات کا اعلان کرے۔ اگر عہدے کی مدت کے دوران اس کی جائیداد ناروا طور پر بڑھ گئی ہو تو اس کو ضبط کر لیا جائے۔ تمام عہدے ملک کے مختلف طبقات میں انصاف سے تقسیم کیے جائیں تاکہ کسی طبقے یا علاقے میں احساس محرومی پیدا نہ ہو۔

امام کا معیار زندگی عام آدمی کا سا ہو۔ اگر اس کے پاس اپنے وسائل رزق موجود ہوں تو وہ خزانہ سے تنخواہ نہ لے۔ وہ تحائف قبول نہ کرے۔ اپنی پالیسیوں کے فوائد شہروں تک محدود نہ رکھے بلکہ ان کو دیہات تک پہنچائے۔ وہ خود اسلام کے فرائض پر عمل کرے اور نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج پر لوگوں کے عمل کو یقینی بنائے۔ وہ ملک کے تمام لوگوں کے لیے ایک کم از کم نصاب پر مبنی اسلام کی تعلیم ضروری قرار دے تاکہ لوگ اسلامی اخلاق سے واقف ہوسکیں۔ وہ ان کو اس قابل بنانے کی منصوبہ بندی کرے کہ اپنی روزی کمانے کے اہل ہوسکیں۔ امام حدود کے نفاذ کو یقینی بنائے۔ قانون کے نفاذ میں کسی کے ساتھ رو رعایت سے کام نہ لے۔ قاضی کے فیصلہ میں مداخلت نہ کرے۔ اللہ کے قانون کو بدلنے کی جسارت نہ کرے اور یاد رکھے کہ عدل وانصاف کے بغیر ریاست اپنے وجود کا جواز کھو بیٹھتی ہے۔

خلیفہ نے حکومت کے لیے تین ستون بنائے۔ دیانت دار وزیر، آزاد عدلیہ اور والی المظالم یا محتسب۔ محتسب کے دائرہ اختیار میں حکومت کی پالیسیوں پر نظر رکھنا بھی تھا کہ وہ ظالمانہ نہ ہوں۔ انھوں نے بیرونی حملوں سے بچاؤ کے لیے سرحدی چوکیاں (رباط) قائم کیں۔ ملک بھر میں مدرسوں کا جال بچھادیا اور ہر شہر اور علاقے میں امام، قاضی، محتسب اور معلم دین کے عہدوں پر قابل افراد تعینات کیے۔ اس نظام نے ملک کو لیڈرشپ مہیا کرنے میں بڑی مدد دی جس کی بدولت ریاست سوکوٹو میں امن وخوش حالی کا دور دورہ رہا اور خلافت ایک صدی تک چلتی رہی۔

1837ء میں محمد بیلو کے انتقال کے بعد ان کا بھائی ابوبکر عتیق اور اس کے بعد ان کا بیٹا علی بن بیلو خلیفہ بنے۔ علی بن بیلو کے دور حکومت میں انگریز تاجروں کے روپ میں سوکوٹو میں آئے اور ہندوستان کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے طرز پر رائل نائیجر کمپنی قائم کی۔ ان کی ریشہ دوانیوں کے نتیجے میں مغربی افریقہ کے دیگر ممالک کی طرح 1903ء میں سوکوٹو پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا۔ تاہم اس خلافت کی بدولت آج بھی نائیجریا ایک اسلامی ریاست ہے جس کے شمالی حصہ میں مسلمان بھاری اکثریت میں ہیں۔

Marfat.com

مُسلم اُمّہ کی بیداری

دنیا کے نقشہ پر نگاہ ڈالیے تو جو چیز دامن دل کو کھینچتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں تین براعظموں...... ایشیا، افریقہ اور یورپ...... کے سنگم کے علاقے، مشرقِ وسطیٰ اور جنوبی و وسطی ایشیا کے متعدد ممالک، افریقہ کے شمالی و وسطی اور مشرقی ومغربی علاقے اور بحرالکاہل کے اہم جزائر مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں اور بالعموم ان علاقوں میں مسلمان یا تو واضح اکثریت میں ہیں یا ایک ایسی اقلیت ہیں جس کو خاطر میں نہ لانا وہاں کی اکثریت کے بس میں نہیں۔ ان علاقوں میں نہایت اہم آبی گزرگاہیں اور پہاڑی درے واقع ہیں جن کی عالمی دفاعی حکمت عملی میں زبردست اہمیت ہے۔ اس مسلم خیز خطۂ ارضی کے ممالک نے ایک قابل قدر سیاسی اقدام یہ کیا ہے کہ اپنے آپ کو اسلامی ممالک کی تنظیم کی عالمی برادری میں شامل کر لیا ہے۔ یہ تنظیم فی الوقت زیادہ مضبوط نہ سہی، لیکن اس کے مضمرات ایسے ہیں جو ان قوتوں کی نیندیں حرام کر رہے ہیں جو اسلام کی حتمی شکست کو بس چند سال کا معاملہ سمجھ بیٹھی تھیں۔ دوسری اہم بات جو عالم اسلام کی ایک عمومی خصوصیت بن کر سامنے آتی ہے یہ ہے کہ اس میں سیاسی وسماجی دائروں میں متعدد ایسی کوششیں ہو رہی ہیں جن کا مطمح نظر اسلام کی سربلندی کی جدوجہد ہے۔ ان کی کمیت وکیفیت ہماری نگاہوں میں خواہ کس قدر حقیر ہو، اسلام دشمن قوتوں کے لیے یہ نہایت پریشان کن ہیں۔ صلیبی جنگوں کے زمانے سے لے کر اب تک یورپ نے بھرپور کوشش کی ہے کہ اسلام کو ایسی زک پہنچائی جائے کہ یہ دین دوبارہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہے۔ ان کو اس میں بڑی کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں۔ ہسپانیہ اور سسلی سے انھوں نے مسلمانوں کو بے دخل کیا اور آج بھی البانیہ، کریمیا، یوگوسلاویہ سے جنم لینے والی ریاستوں اور بلغاریہ سے وہ ان کا نام ونشان مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ پہلے انھوں نے عالم اسلام کو نوآبادیاتی نظام میں جکڑ لیا اور اس میں تعلیمی اور معاشرتی میدانوں میں ایسی تبدیلیاں کیں جن کے نتیجہ میں لوگ خواہ عیسائی نہ ہوں لیکن مسلمان بھی نہ رہیں۔ پھر انھوں نے مسلمان ممالک کے قلب میں اسرائیل کی طرح کے ایسے سیاسی خنجر پیوست کیے جو ان کو کسی پہلو چین نہ لینے دیں۔ لیکن ان میں سے کوئی تدبیر اسلام کی قوت کو مٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکی بلکہ اس وقت خود مغربی ممالک میں اسلام اپنے قدم جما رہا ہے۔ فرانس میں مسلمان عددی لحاظ سے دوسری بڑی قوت ہیں۔ ان ممالک میں خود وہاں کے باشندوں نے بڑی تعداد میں اسلام قبول کیا ہے۔

1862ء میں کالج دی فرانس کی افتتاحی تقریب میں خطاب کرتے ہوئے فرانس کے ایک تاریخ دان ماہر

Marfat.com

لسانیات پروفیسر ارنسٹ رینان (Ernest Renan) نے یہ کہہ کر مغربی دنیا کے اسلام کے بارے میں جذبات کی صحیح غمازی کی تھی کہ ''اسلام ہٹ دھرمی کا نام ہے۔ یہ سائنس کا منہ چڑاتا ہے۔ مہذب سوسائٹی کی راہ روکتا ہے۔ یہ سامی ذہن کی سادہ لوحی کی علامت ہے۔ اس ذہنیت نے انسانی دماغ کو پچکا کر رکھ دیا ہے جس کے نتیجے میں وہ ہر ترقی یافتہ تصور، ہر لطیف احساس اور ہر عقلی تحقیق کے لیے بند ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ ''خدا ہی خدا ہے'' کی رٹ لگاتے ہوئے اسی کی عبودیت میں جکڑے رہیں۔'' اسلام کے خلاف دل کی بھڑاس اس طرح نکال کر رینان نے اسلام کے جلد خاتمہ کی نوید یوں سنائی کہ ''بنو اسماعیل کا آخری فرزند بہت جلد یا تو خود فقر و فاقہ سے مرجائے گا یا اس کو خوف زدہ کر کے صحرا کی پہنائیوں ❶ کی طرف بھگا دیا جائے گا۔'' جو لوگ اسلام کے مستقبل کے بارے میں اس طرح کی قیاس آرائیاں کرتے رہے ہوں ان کے لیے یہ حقیقت کس قدر بھیانک ہوگی کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد امارت کی ان حدود کو چھوئے جس کا تصور بھی مغرب کے سرمایہ داروں کے لیے مشکل ہو اور وہ یورپ اور امریکہ کے بزرجمہروں ❷ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرے اور ان کی پالیسیوں کے نفاذ میں سدِ راہ بن جائے۔

یورپین اقوام کے اسلام دشمن اقدامات اور مسلم کش پالیسیوں کے باوجود جب مسلم امہ افتاں و خیزاں ❸ اپنی منزل کی طرف رواں دواں نظر آئی اور مغربی ممالک کو اس کے اندر زندگی کے آثار نظر آنے لگے تو انھوں نے نفسیاتی جنگ شروع کی اور مسلمانوں کے اندر متحرک گروہوں کو طرح طرح کے نام دیے اور اسلامی قوانین کا مذاق اڑانے لگے۔ وہ شریعت کو انسانیت کے چہرے پر بدنما داغ اور انسانی حقوق پر شب خون قرار دینے لگے۔ ہم آئے دن اخباروں میں ان کے بیانات پڑھتے ہیں جن میں وہ مسلمانوں کو بنیاد پرستی (Fundamentalism) کا طعنہ دیتے نظر آتے ہیں۔ ان کا یہ پروپیگنڈہ نہایت زہر آلودہ ہے جس سے خود ہمارے عوام و خواص متاثر ہوتے ہیں۔ چناں چہ ہمارے ارباب اختیار بھی غیر مسلموں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے حدود اللہ کو انسانی احترام کے منافی قرار دیتے اور ان کی راہ روکنے کے عزم کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ برملا بنیاد پرستوں کے اسلام سے اظہار براءت کرتے اور اس اسلام کا دم بھرتے ہیں جس کا تعلق عیسائیوں کے مذہب کی طرح دنیوی معاملات سے نہ ہو اور جو اپنے آپ کو محض انفرادی زندگیوں اور ذاتی پسند و ناپسند تک محدود رکھے۔ اس طرح کے بیانات ہماری وزیر اعظم صاحبہ اور ان کی کابینہ کے ارکان کی زبان سے حال ہی میں جاری ہوئے ہیں۔ ❹

ارباب اختیار کے اس طرح کے بیانات سے یہ بات تو اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ وہ غیر مسلم طاقتوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں اور انہی کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی باعمل

---

❶ پہنائی: وسعت۔

❷ بزرجمہر: بزرگ مہر، نوشیرواں کا وزیر، دانش مند۔

❸ افتاں وخیزاں: گرتے اور اٹھتے۔ گرتے پڑتے۔

❹ وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے اپنے دوسرے دورِ حکومت (96-1993ء) میں اسلامی سزاؤں کو وحشیانہ قرار دیا تھا۔

Marfat.com

مسلمان شریعت کے قوانین کے بارے میں کوئی ایسی بات زبان پر نہیں لاسکتا جو اس کی تنقیص کا باعث ہو اور نہ نفاذ اسلام کو وہ کوئی دقیانوسی حرکت قرار دے سکتا ہے۔ اس کی تمنا تو یہی ہو گی کہ وہ اسلام کے اجتماعی نظام کی برکات سے متمتع ہو اور رب کریم کی عبودیت میں زندہ رہ کر اور اسی میں موت سے ہم کنار ہو کر ابدی سرخروئی حاصل کرے۔ اس سے ہٹ کر کوئی طرز زندگی اپنانا اور خدا کا باغی ہو کر مرنا صرف لادینوں کا مطمح نظر ہو سکتا ہے۔

مغربی دنیا جہاں متعصب ہے وہیں تحقیق پسند بھی ہے۔ اس لیے اگر مسلمانوں کے خلاف سازشیں تیار کرنے والے اور پروپیگنڈہ مہم چلانے والے برسر عمل ہیں تو اس کے ساتھ ہی ان کے محققین بھی یہ جاننے کی کوشش میں مصروف ہیں کہ آخر وہ کیا سبب ہے کہ مسلم امہ اتنے زخم کھا کر بھی شکست خوردہ نہیں ہوئی اور اس کی چنگاریوں میں شعلہ بننے کی صلاحیت ابھی تک موجود ہے۔ مسلمانوں کی بیداری کے اسباب پر مغربی مصنفین نے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ یہاں ان مصنفین کی آراء کا جائزہ لینا مفید ہوگا تاکہ ہمارے ارباب اختیار کو بھی معلوم ہو کہ وہ جس بنیاد پرستی کی مذمت کر رہے ہیں وہ مغرب کے محققین کی نگاہ میں کیا معنی رکھتی ہے۔

جینسن (Janson) نے ''متحارب اسلام'' (Militant Islam) کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ اس میں اس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس دور میں جوشِ عمل اور تحریک صرف مسلمانوں ہی میں نہیں ہے بلکہ دوسرے مذاہب کے پیروؤں مثلاً ہندوؤں اور بدھوں میں بھی ہے۔ یہ مشرقی ممالک کی ایک مشترکہ خصوصیت ہے کہ وہ مغربی تہذیب کی یلغار کے آگے بند باندھنے میں مصروف ہو گئے ہیں تاکہ وہ اپنی مذہبی اقدار کو تباہ ہونے سے بچا سکیں۔ جہاں تک مسلمان معاشرے کا تعلق ہے یہ تیرھویں صدی ہجری کے بعد سے متحجر ہو کر رہ گیا ہے۔ اس پر جمود مسلط ہے۔ جس کے باعث یہ جدید دنیا کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہا، لہٰذا مسلمانوں میں اپنی مذہبی اقدار کے تحفظ کے لیے تحریکیں اٹھ رہی ہیں۔

عمانویل سائیون (Emmanuel Sivan) کی کتاب ''اساسی اسلام'' (Radical Islam) میں بھی مذکورہ نقطۂ نظر کی تائید کی گئی ہے۔ مصنف نے مصر، شام اور لبنان کے سنی بنیاد پرستوں کے مقاصد کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کی تحقیق کی رو سے احیائے اسلام کی کوششوں میں اگرچہ جوش عمل اور جنگجویانہ مزاج پایا جاتا ہے لیکن اصلاً یہ ایک ثقافتی عمل ہے جس میں تیز سیاسی کاٹ بھی آ گئی ہے۔ اس کا مقصد دفاعی ہے تاکہ مسلمان قوم کو جدید تہذیب کی یلغار کے اثرات سے محفوظ کیا جا سکے۔

اسی سے ملتے جلتے نتائج تک پیٹرک بینرمین (Patrick Bannerman) اپنی تصنیف ''اسلام اپنے تناظر میں'' (Islam In Perspective) میں پہنچا ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں پر اپنی سمت اور اپنی منزل واضح نہیں ہے۔ لیکن اپنے بارے میں جو تشویش ان کو لاحق ہے اس کا اظہار مذہبی تنظیموں کی کثرت اور غیر اسلامی قوانین کے خلاف مطالبات کے ذریعے ہو رہا ہے۔ مصنف کا خیال یہ ہے کہ احیائے اسلام کا خواب اب

Marfat.com

شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عملی مسلمان تعداد میں کم ہیں۔ ان کو ارباب اختیار کی طرف سے نفاذ اسلام میں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ معاشرے میں دین اور اقتدار عملاً الگ الگ ہوچکے ہیں۔ اب ان میں اس ہم آہنگی کے واپس آنے کے امکانات نہیں ہیں جو خلفائے راشدین کی حکومت کا خاصہ تھی۔ مصنف کا تجزیہ یہ بھی ہے کہ عالمی سطح پر احیائے اسلام کی کوششوں میں باہم تعاون اور یک جہتی نہیں ہے۔

''اسلام کی حیات نو کے چرچے'' (Voices of Resurgent Islam) کے مصنف جان اسپوسیٹو (John Esposito) کا خیال یہ ہے کہ یورپ کے نوآبادیاتی اقدامات نے اسلامی دنیا کو فوجی، معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے مغربی عیسائی دنیا کے آگے بے بس کر دیا اور اس کی وحدت کو اس طرح پارہ پارہ کر دیا کہ اس کی پہچان مشکل ہوگئی۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کو ایک سیاسی مقصد فراہم کیا، چناں چہ بیسویں صدی عیسوی میں مصر، تیونس، الجزائر اور ہندوستان میں ایسی قومی تحریکیں چلیں جن کا ہدف نوآبادیاتی نظام تھا۔ ان تحریکوں کے باعث مسلمانوں کی سیاست میں مذہب کو عمل دخل کا موقع مل گیا۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد جو ریاستیں وجود میں آئیں انھوں نے مغربی نمونوں کی تقلید کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام پھر سے سیاسی منظر سے ہٹ گیا۔ اس وقت احیائے اسلام کی تحریکوں کے اسباب میں اپنی ملی شناخت کا مسئلہ، مغربی ممالک سے بدظنی، اپنی حکومتوں کی ناقص کارکردگی اور دین سے انحراف اور 1973ء میں فوجی اور معاشی میدانوں میں چند کامیابیوں پر احساس فخر شامل ہیں۔ کامیابیوں سے اشارہ مصر کی اسرائیل کے ساتھ جنگ اور عربوں کے تیل کا ہتھیار استعمال کرنے کی طرف ہے۔

ڈیک میجین (Dekmejian) نے عرب دنیا میں بنیاد پرستی کا مطالعہ اپنی کتاب ''انقلاب اسلامی'' (Islamic Revolution) میں پیش کیا ہے۔ اس نے 92 مسلم سوسائٹیوں کے جائزے کے بعد یہ رائے ظاہر کی ہے کہ مسلمانوں میں اسلامی بنیادوں کی طرف لوٹنے کی تحریک شروع ہوچکی ہے۔ یہ تحریک ہمہ پہلو ہے جس کا اظہار بیک وقت روحانی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی دائروں میں ہو رہا ہے۔ مصنف کہتا ہے کہ اسلام میں ایک داخلی سماجی وسیاسی نظام ایسا موجود ہے جو ملت کی اندرونی کمزوریوں اور بیرونی خطرات کے مقابلے میں تجدید پر ابھارتا ہے۔ اس احیائی ردعمل کے طور پر ملت اصل بنیادوں کی طرف لوٹنے کی کوشش کرتی ہے۔ اسلام میں عملی نمونے کے لیے معیار قرآن مجید کی تعلیم اور رسول اللہ ﷺ کا عملی طریقہ ہے۔ ان سے انحراف کو جاہلیت کی طرف لوٹنے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔

جان وال (John Voll) اپنی کتاب ''اسلامی تاریخ میں تجدید واصلاح (Islamic Revolution) میں اسلامی دنیا کے اندر ایک متحرک پہلو کی نشاندہی کرنے کے لیے اسلام کی تجدید واصلاح کی روایت کا سہارا لیتا ہے۔ اس کے نزدیک بھی مسلمانوں کے سامنے نمونہ قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔ اس سے انحراف ہو تو امت کو تحریک ملتی ہے کہ وہ اپنی اصل کی طرف لوٹنے کی جدوجہد کرے۔

یہ ہے ان اہم کتابوں کی تحقیق کا خلاصہ جو ادھر چند برسوں میں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ ان میں جو مضمون

Marfat.com

مشترک ہے وہ یہ ہے کہ امت مسلمہ مغربی تہذیب کے آگے سرنگوں ہونے کے لیے تیار نہیں۔ وہ اپنی دینی اقدار کا تحفظ چاہتی ہے۔ وہ آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنے حکمرانوں سے یہ توقع کرتی ہے کہ وہ دین کے اجتماعی نظام کو نافذ کریں تا کہ وہ اسلام کی برکات سے پوری طرح متمتع ہو سکے۔ حکمران جب اس توقع پر پورا نہیں اترتے اور اقتدار کے زعم میں دین کے تقاضوں سے گریز کی راہ اختیار کرتے ہیں تو ان کی رعایا جنگجویانہ رویہ اختیار کر لیتی ہے جس کے مظاہرے آئے دن اسلامی ممالک میں ہو رہے ہیں۔ مغربی محققین میں سے بعض دانشور اس حقیقت کو بھی پا گئے ہیں کہ مسلم امہ میں یہ شعوریوں ہی نہیں پیدا ہو گیا ہے بلکہ خود اسلامی تعلیمات کے اندر کوئی ایسی بات موجود ہے کہ وہ لوگوں کو یہ فرض ادا کرنے پر ابھارتی ہے۔

جان وال نے تو اس جذبہ کو تجدید و اصلاح کے اسلامی ناموں سے تعبیر بھی کیا ہے اور وہ اس حقیقت تک پہنچ بھی گیا ہے کہ امت مسلمہ قرآن مجید اور سنت رسول اللہ ﷺ کے عملی معیار کو سامنے رکھتی ہے اور اس سے انحراف برداشت نہیں کرتی۔ کاش! ہمارے حکمرانوں کو بھی ان حقائق کے سمجھنے کی توفیق ہو اور وہ صدق دل سے امت مسلمہ کی دینی امنگوں کو پورا کرنے کی جدوجہد کریں اور اقتدار کے نشے میں اپنے قول و عمل سے کوئی ایسی بات نہ پیدا کریں جو بعد میں خود ان کے لیے پریشانی کا باعث بن جائے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر

سیرت نگاروں کے عمومی بیان کے مطابق نکاح کے وقت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر 40 سال تھی۔ لیکن اس پر اتفاق نہیں ہے۔ ابن کثیر نے اسے 35 سال اور بقول بعض 25 برس بتایا ہے۔ خدیجہ کی وفات کے وقت انہوں نے ان کی عمر 50 برس بتائی ہے اور اسے صحیح ترین قول قرار دیا ہے۔ 50 سال کے حساب سے نکاح کے وقت یہ عمر 25 سال نکلتی ہے۔ اس کے حق میں ابن کثیر نے بیہقی کی روایات کا حوالہ دیا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے عمر بوقت نکاح 28 برس بتائی ہے۔ 40 برس کی روایت کے مقابلہ میں 25 یا 28 برس کی روایت درست معلوم ہوتی ہے۔ عرب میں بلوغت کے جلد بعد لڑکیوں کی شادی کر دینے کا رواج تھا، جیسا کہ خود حضور ﷺ کی اولادوں کے معاملہ میں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے معاملہ میں ہوا۔ تین بچوں کی پیدائش کے بعد شوہر کے وفات پانے کی صورت میں کوئی شریف خاتون 40 سال کی عمر تک بلا نکاح بیٹھی نہیں رہتی تھی۔ کثرت ازواج کے اس معاشرہ میں بہت جلد رشتے مل جاتے تھے۔ عورتوں کے مطلقہ یا بیوہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بلا امتیاز مطلقہ یا غیر مطلقہ بکثرت شادیاں ہوتی تھیں۔ (حیات رسول اُمی ﷺ، علامہ خالد مسعود رحمہ اللہ، ص: 87-88، فاران فاؤنڈیشن، 2014ء)

Marfat.com

قرآن کا تصورِ جنگ

جنگ کے بارے میں ایک تصور تو چنگیز خان کا تھا جو دشمنوں کو شکست دے کران کا تعاقب کر کے ان کی املاک لوٹ کران کے خاندانوں کی آہ و بکا سے محظوظ ہوتا تھا۔ لیکن جنگ کو اسی نے ایک ہلکی چیز نہیں سمجھا بلکہ رومی معاشرہ بھی جنگ کے مفید ہونے کا قائل تھا۔ فلاسفہ میں سے ہابس، مالتھس، کانٹ اور ہیگل جنگ کے ناگزیر ہونے کے قائل ہیں اور اس کو معاشرے کی مضبوطی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔

جنگ کو بعض مذاہب مثلاً بدھ مت، کنفیوشزم اور عیسائیت نے نامطلوب اور دین داری کے منافی رویہ قرار دیا ہے۔ سقراط [1] کے نزدیک بھی جنگ کے اسباب وہی ہوتے ہیں جو ہر شر محض کے ہوتے ہیں۔ آگسٹائن [2] اس کو انسان کی ابدی گنہگاری کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔

آج کے دور میں جنگ کو قومی پالیسی کے ایک آلہ کار کی حیثیت دی جاتی ہے۔ امریکہ دنیا کے تمام ممالک میں جمہوریت کی نشوونما کو یقینی بنانے کے لیے جنگ پر اپنی آمادگی کا اظہار برملا کرتا ہے۔ ملکی معاشی مفادات کا تحفظ اور حریف قوتوں پر دباؤ ڈال کر اپنی مرضی کے فیصلے کروانا جنگ کا جواز مہیا کرنے کے لیے جس طرح کافی خیال کیا جاتا ہے اس کا اظہار حالیہ خلیج کی جنگ سے بخوبی ہو چکا ہے۔ [3]

قرآن مجید نہ تو جنگی جنون کو پسند کرتا ہے اور نہ جنگ کو ایک بالکل ناروا چیز سمجھتا ہے۔ وہ جنگ کے جواز کے لیے معاشی و سیاسی اسباب کو بھی غلط قرار دیتا ہے۔ اسلامی دعوت کے ابتدائی تیرہ چودہ برسوں میں مسلمانوں کو ہتھیار اٹھانے کی اجازت نہیں دی گئی اور جنگ کی تیاری کا حکم اس وقت دیا گیا جب مسلمانوں کی بقا کا مسئلہ پیدا ہو گیا اور کفار ان کی قلع قمع کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس سے اسلام کا مزاج یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنگ کو ہلکی چیز نہیں سمجھتا اور چاہتا ہے کہ ہتھیار اسی وقت اٹھائے جائیں جب ان کا اٹھانا ناگزیر ہو جائے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن انفرادی قتل کو تو گناہ کبیرہ قرار دیتا ہے، وہ جنگ کی اجازت کیسے دے دیتا ہے جبکہ اس میں ہزاروں جانیں تلف ہونے کا امکان موجود ہوتا ہے۔ اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں دوسرے

---

1. یونانی فلسفی سقراط (Socratese) ایتھنز میں پیدا ہوا اور وہیں 399 ق م میں وفات پائی۔ سقراط کا شاگرد افلاطون (Plato) تھا۔
2. سینٹ آگسٹائن چوتھی صدی عیسوی کا مسیحی فلسفی تھا جس کا تعلق رومن نومیڈیا (الجزائر) سے تھا۔
3. خلیج کی جنگ سے مراد آزادئ کویت کے نام پر عراق کے خلاف جنگ (91-1990ء) ہے۔

Marfat.com

مماثل امور پر غور کرنا چاہیے۔ ہم اپنی غذا کے لیے جانوروں کا گوشت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم ان کی جان لے کر اپنی ضرورت پوری کر لیں تو قرآن کے نزدیک ہم ایک حرام غذا کھانے والے ہوتے ہیں۔ اس کو جواز صرف اس صورت میں حاصل ہوتا ہے جب ہم جانور کو اللہ کے نام پر ذبح کر کے اپنے مصرف میں لائیں۔ گویا حرمت کا یہ قفل اللہ کے نام سے کھلتا ہے اور وہی اس فعل کو جواز مہیا کرتا ہے۔

ایک شخص کا دوسرے شخص کو بلاوجہ قتل کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ لیکن انسانی جان لی جاسکتی ہے جبکہ ایسا کرنا بالحق ہو۔ بالحق کا سادہ مفہوم ہے اللہ کے عطا کردہ حق کے تحت۔ مثلاً مقتول کے قصاص میں قاتل کا قتل یا معاشرے کے خلاف سنگین جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کا قتل بالحق ہوتا ہے۔ ایسا قتل ایک صحت مند معاشرے کے قیام کے لیے نہ صرف یہ کہ ضروری ہے بلکہ اس میں کوتاہی کرنا بجائے خود ایک جرم ہے۔ یہاں بھی حرمت جان کا قفل اللہ کے عطا کردہ حق کے ذریعہ سے کھولا گیا اور اس کے اسباب خود ان لوگوں نے پیدا کیے جنہوں نے پہلے جرم کا ارتکاب کیا۔

ٹھیک اسی طرح بعض قوموں کے اجتماعی رویے اس بات کے اسباب فراہم کرتے ہیں کہ منظم جنگ کے ذریعے ان کو درست رویہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اس صورت میں قرآن فی سبیل اللہ کی قید لگاتا اور جنگ کو جواز عطا فرماتا ہے۔ یہ جنگ ایک اعلیٰ دینی مطالبہ قرار پاتی ہے جس سے پہلوتہی کو منافقانہ روش کا نام دیا گیا ہے۔ فی سبیل اللہ جنگ کی شکلیں کیا کیا ہیں یہ ہم آگے بتائیں گے۔

قرآن میں جب پہلے پہل جنگ کا حکم نازل ہوا تو اس پر بعض درویش صفت لوگوں نے یہ سوال اٹھایا کہ ایک نبی کو جنگ سے کیا غرض۔ اسے تو صلح جو اور کشت وخون سے اجتناب کرنے والا ہونا چاہیے۔ اس کا جواب سورۃ الحج کی آیت 40 میں یوں دیا گیا کہ اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے دفع نہ کرتا رہتا تو تمام خانقاہیں، گرجے، کنیسے اور مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے، ڈھائے جاچکے ہوتے اور بے شک اللہ ان لوگوں کی مدد فرمائے گا جو اس کی مدد کے لیے اٹھیں گے۔

اس جواب کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ اگر خدا کے صالح بندوں کو ہتھیار اٹھانے سے روک دیا جاتا تو دنیا میں صرف اشرار اور مفسدین ہی پنپ سکتے اور دین کے تمام مظاہر ناپید ہو جاتے۔ اس طرح دنیا نیکی اور تقدس کے آثار سے خالی ہو کر شر وفساد سے بھر جاتی۔ دوسرا یہ کہ جنگ کا حکم اہل ایمان کے اندر دین کی حمایت ونصرت کے جذبے کے امتحان کے لیے ہے۔ وہ جب حق وعدل کے قیام کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دیں گے تو اللہ ان کی پشت پر ہوگا۔

قرآن کے تصور جنگ کے متعلق یہ غلط فہمی عام ہے کہ یہ جنگ صرف دفاعی ہے۔ اس غلط فہمی کی بڑی وجہ تو یہ ہے کہ یہ تصور پھیلا کر امت مسلمہ کے اندر حرکت ونمو کی خواہش کو ختم کیا جا سکتا ہے اور اس سے دشمنان دین کے مذموم مقاصد پورے ہوتے ہیں۔ لیکن بعض لوگ سورۂ بقرہ کی آیت 190 سے بھی دلیل اخذ کرتے ہیں۔

﴿وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا﴾ (البقرۃ: 190)

''اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تمہارے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور حد سے نہ بڑھو۔''

Marfat.com

حقیقت یہ ہے کہ جب تک مسلمان کمزور تھے تو ان کی خواہش کے باوجود ان کو جنگ سے روک دیا گیا تھا۔ ہجرت کے بعد کفار اسلام کے استیصال کے لیے سرگرم عمل ہو گئے تو مذکورہ آیت میں مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی۔ اس پس منظر میں یہ ایک ابتدائی حکم تھا۔ چند ہی سال میں مسلمانوں کی قوت میں اضافہ ہو گیا تو ان کے فرائض منصبی میں توسیع کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے جنگی احکام میں بھی اضافہ ہوا اور قرآن نے فی سبیل اللہ جنگ کی کئی شکلیں خود واضح کر دیں۔ ان میں جنگ محض دفاعی نوعیت کی نہ تھی بلکہ مسلمانوں کو اقدام کا حکم دیا گیا۔ ذیل میں ہم ان شکلوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

جنگ کے جواز کے اسباب:

امت مسلمہ کی منصبی ذمہ داری یہ ہے کہ یہ امت اللہ کے اتارے ہوئے حق کی شہادت دینے، اس کے مطابق معروف کا چرچا کرنے، برائی کو روکنے اور اس حق کا پیغام اکناف عالم تک پہنچانے کی جدوجہد کرنے پر مامور ہے۔ یہ منصبی ذمہ داری خود انسانیت کی فلاح کے لیے ضروری ہے ورنہ دنیا میں شر و فساد پھیل جاتا ہے۔ امت مسلمہ جب اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہو...... اور اسے ایسا ہونا چاہیے...... تو لازماً اس کا ٹکراؤ ایسے افراد اور اقوام سے ہوگا جو اللہ کے اتارے ہوئے حق کے باغی ہوں۔ اگر یہ لوگ اس حق کی شہادت اور دین کے نفاذ کی جدوجہد میں مزاحم نہ ہوں تب تو یہ جہدوجد پر امن طریقہ سے جاری رہ سکتی ہے اور دین اسلام اسی طریقہ کو پسند کرتا ہے۔ لیکن جب کچھ لوگ اس دعویٰ کو اپنے لیے ایک چیلنج سمجھ کر اس کی مخالفت پر اٹھ کھڑے ہوں تو اس صورت میں ان کی مزاحمت حقیقت میں اللہ کو روکنے کی کوشش کے مترادف ہوگی جو کائنات کا حقیقی بادشاہ ہے۔ یہ بغاوت اس بات کا جواز فراہم کرے گی کہ امت مسلمہ اپنے فرائض منصبی میں حائل ہونے والی طاقت سے ٹکر لے لے اور اس کی مزاحمت کو ختم کر دے۔ ایسے حالات میں قرآن مجید مسلمانوں کو ہتھیار اٹھا لینے کی اجازت دیتا ہے۔

چونکہ امت مسلمہ کا یہ فریضۂ منصبی رہتی دنیا تک کے لیے ہے اور حق کے مخالفین بھی اس وقت تک پیدا ہوتے رہیں گے جب تک انسان پیدا ہوتے رہیں گے، اس لیے نہ تو جہاد کبھی ختم ہو سکتا ہے اور نہ اس کی کامل شکل قتال فی سبیل اللہ کے خاتمہ کا فتویٰ کبھی دیا جا سکتا ہے۔

اللہ کے دین کی راہ روکنے کا معروف طریقہ جو باطل قوتوں نے ہمیشہ اختیار کیا ہے وہ حق کا پیغام قبول کرنے والوں کو جبر و ظلم سے ان کے پسندیدہ دین سے برگشتہ کرنے کی کوشش ہے۔ اس کے لیے وہ اہل ایمان کو سنگ دلانہ ایذائیں دیتے اور تکلیفیں پہنچاتے ہیں۔ قرآن نے اس کے لیے فتنہ کا لفظ استعمال کیا ہے اور نبی ﷺ کے زمانے کے مخالفین کی مناسبت سے یوں فرمایا ہے کہ:

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴾ (البقرۃ: 193)

''اور ان سے جنگ کرو یہاں تک فتنہ باقی نہ رہ جائے اور دین اللہ کا ہو جائے۔''

Marfat.com

یعنی مشرکین عرب سے اس وقت تک جنگ جاری رکھی جائے جب تک اہل اسلام کو ان پر کامل فتح حاصل نہیں ہو جاتی اور عرب میں صرف اسلام ہی کا بول بالا نہیں ہو جاتا۔

فتنہ سے مراد، جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا، اسلام قبول کرنے والوں کو زچ کرنا، اذیتیں دینا اور ان کو ایمان کی راہ ترک کرنے پر مجبور کرنا ہے۔ جب تک کفار مسلمانوں کے معاملے میں اس پالیسی پر کاربند رہیں گے، ان کے ساتھ جنگ ناگزیر ہوگی اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک وہ اس پالیسی کو ترک نہیں کر دیتے۔ قرآن کی رو سے فتنہ کا گناہ قتل سے بڑا ہے اور یہ قتال فی سبیل اللہ کا جواز فراہم کرنے کے لیے کافی ہے۔ موجودہ زمانہ میں انسانی حقوق کو تحفظ دینے کا بہت پرچار کیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بڑے اور چھوٹے بیسیوں ممالک ایسے ہیں جن میں روشن خیالی کے دعووں کے باوجود دین اسلام کو اختیار کرنے، مسلمانوں کے سے نام رکھنے، دین کے شعار پر عمل کرنے اور تبلیغ کرنے پر پابندی لگائی جاتی ہے اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں پر تشدد کیا جاتا ہے۔ یہ فتنہ آج بھی جنگ کا جواز فراہم کر رہا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت 207 میں اس فتنہ کی تفصیل کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ اللہ کے دین کے لیے مسجد حرام میں حاضری کی راہ مسدود کرنا اور ایمان لانے کے جرم میں ان کو گھروں سے نکال باہر کرنا وہ جرائم ہیں جو فتنہ کی تعریف میں آتے ہیں۔

اس فتنہ ہی کی ایک شکل ان مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کرنا ہے جو کفار کے علاقوں میں اقلیت میں ہوں اور اکثریتی آبادی دین کی بنیاد پر ان پر تشدد کرتی ہو۔ قرآن مجید نے ایسے مسلمانوں کی نصرت پر ان مسلمانوں کو بطور خاص ابھارا ہے جو دارالاسلام میں بستے ہوں۔ فرمایا:

﴿وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا﴾ (النساء: 73)

''اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے جنگ نہیں کرتے جو دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں اس ظالم باشندوں کی بستی سے نکال۔''

اس آیت کے نزول کے زمانہ میں مکہ اور دوسری بستیوں میں بہت سے مرد، عورتیں اور بچے مسلمان ہو چکے تھے اور وہ اپنے کافر سرپرستوں یا قبیلے کے دوسرے زبردستوں کے ظلم وستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ وہ رات دن بے قراری کے ساتھ یہ دعا کرتے تھے کہ اے پروردگار ہمیں ان ظالم باشندوں کی بستی سے نکال، غیب سے ہمارے ہمدرد پیدا کر اور اپنی جناب سے ہمارے لیے مددگار کھڑے کر۔ آیت میں مسلمانوں کو یہ بتایا ہے کہ مسلمان اگر کہیں اس طرح کی مظلومیت کی حالت میں گھر جائیں تو ان تمام مسلمانوں پر جو ان کی مدد کرنے کی پوزیشن میں ہوں جہاد فرض ہو جاتا ہے اور اگر وہ ان کی مدد کے لیے نہ اٹھیں تو یہ صریح نفاق ہے۔

اسلام ایک صلح جو دین ہے اور دوسرے مذاہب کے ساتھ امن کے ساتھ رہنے کے لیے متحارب فریق کے ساتھ

Marfat.com

معاہدہ امن کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ نے کفار قریش کے ساتھ دس سال کے لیے امن کا وہ معاہدہ کرنے میں بھی کوئی پس و پیش نہ کی جو معاہدہ حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس طرح کے معاہدہ امن کو اگر فریق مخالف توڑ دے یا اس کی آڑ میں مسلمانوں کے دین کو زک پہنچانے کی کوشش کرے تو حکم ہے کہ مسلمان اس کے ساتھ برسرِ پیکار ہو کر اپنے دین کا تحفظ کریں۔ قریش نے جب معاہدہ حدیبیہ کو توڑنے میں پہل کی تو یوں ہدایت فرمائی گئی:

﴿وَ اِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَ طَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ۝﴾ (التوبة: 12)

''اگر عہد کر چکنے کے بعد یہ اپنے قول و قرار توڑ دیں اور تمہارے دین پر نیش زنی [1] کریں تو تم کفر کے ان سرخیلوں سے بھی لڑو۔ ان کے کسی قول و قرار کا کوئی وزن نہیں، تاکہ یہ اپنی حرکتوں سے باز آ جائیں۔''

معاہدہ کی خلاف ورزی کی صورت میں مخالف فریق کے ساتھ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک وہ اپنا رویہ تبدیل نہیں کرتے اور اسلام دشمن کارروائیوں سے باز نہیں آتے۔

اسلام دشمن رویے کا مظاہرہ اہل کتاب کی جانب سے ہو تو قرآن ان کے ساتھ بھی جنگ کا حکم دیتا ہے۔ ان کے رویہ کی تبدیلی کی علامت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اسلامی حکومت کی ماتحتی میں آ جائیں اور اس کی علامت کے طور پر جزیہ دینا قبول کر لیں، فرمایا:

﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ۝﴾ (التوبة: 29)

''ان اہل کتاب سے جو نہ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے، نہ اللہ اور اس کے رسول کے حرام ٹھہرائے ہوئے کو حرام ٹھہراتے اور نہ دین حق کی پیروی کرتے ہیں، جنگ کرو تا آنکہ وہ مغلوب ہو کر جزیہ ادا کریں اور ماتحت بن کر زندگی بسر کرنے پر راضی ہوں۔''

مذکورہ شکلوں کے علاوہ قرآن نے دو ایسے اسباب بھی بیان کیے ہیں جو داخلی نوعیت کے ہیں اور فوج کشی کا جواز پیدا کرتے ہیں۔ ان میں پہلا سبب اسلامی ریاست کے اندر باغیوں کی کارروائیاں ہیں جو اللہ اور رسول کے قانونِ عدل و قسط کو درہم برہم کرنے اور ملک میں فساد برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کوشش علانیہ بھی ہو سکتی ہے اور درپردہ بھی۔ جتھہ بندی کے ذریعے بھی ہو سکتی ہے اور تخریب کاری کے انداز میں بھی۔ جو مفسدانہ سرگرمی بھی ملک کے سیاسی، اجتماعی اور معاشرتی نظام کے لیے خطرہ بن جائے، اس کے استیصال اور اس کے مجرموں کی سرکوبی کے لیے اسلامی حکومت ضرورت پڑنے پر فوج کشی کر سکتی ہے، تاکہ قیامِ امن کا جو فریضہ اس پر عائد ہے اس سے عہدہ برا ہو سکے۔ فرمایا:

---

[1] نیش زنی: ڈنک مارنا۔

Marfat.com

﴿اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ﴾ (المائدۃ: 33)

''ان لوگوں کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول سے بغاوت کرتے ہیں اور ملک میں فساد برپا کرنے میں سرگرم ہیں، بس یہ ہے کہ عبرت ناک طور پر قتل کیے جائیں یا سولی پر لٹکائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹ ڈالے جائیں یا ملک سے باہر نکال دیے جائیں۔''

فوج کشی کا دوسرا داخلی اسباب اسلامی مملکت کے اندر مسلمانوں کے کسی متحارب گروہ کا مصالحت کی کوششوں کو ناکام بنانا اور حالت جنگ پر اصرار کرنا ہے۔ مسلمان کے درمیان ایسی کوئی چپقلش قابلِ برداشت نہیں سمجھی گئی جس میں وہ آپس کی مخالفت کو قائم رکھنے پر مصر ہوں۔ حکومت ان کے درمیان مصالحت کرائے گی۔ پھر بھی ایک گروہ اگر اپنے مخالفوں پر چڑھائی کر دے تو اس صورت میں اسلامی حکومت باغی گروہ کے خلاف فوج کشی کر سکتی ہے۔

اس کی تفصیل سے جو اصول برآمد ہوئے ان کی رو سے جنگ کا جواز قومی انا کی تسکین، کشور کشائی، معاشی وسائل میں اضافہ یا طبقاتی کشمکش سے فراہم نہیں ہوتا، جیسا کہ آج کے مفکرین حرب کا دعویٰ ہے۔ قرآن ہمیں جو تعلیم دیتا ہے اس کی رو سے جنگ کا جواز موجود ہونے کے لیے اس کے فی سبیل اللہ ہونے کی شرط ضروری ہے۔ اللہ کی ہدایت کا اکناف عالم تک پہنچنا خود انسانیت کی فلاح کے لیے مطلوب ہے۔ جب کوئی قوم اس مقصد کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو جائے، اس کی دشمنی پر کمربستہ ہو جائے اور اللہ کی ہدایت کو قبول کرنے والوں پر ظلم و ستم ڈھائے، اس کو خود انسانوں کی خیرخواہی میں راستے سے ہٹانے کے لیے اس کے ساتھ جنگ کرنا فی سبیل اللہ کے حکم میں آتا ہے۔ کسی قوم کی تعدی اور زیادتی یا اس کے حملہ کا دفاع کرنے کی غرض سے لڑنے کا جواز قرآن کے پیش کردہ تصور عدل سے مہیا ہوتا ہے۔ اندرون ملک ملی اتحاد قائم رکھنے، متحارب و باغی گروہوں کو مطیع کرنے اور مفسدین کا قلع قمع کرنے کی غرض سے فوج کشی بھی فی سبیل اللہ جنگ کی تعریف میں آتی ہے۔

جہاں فوج کشی یا جنگ کا جواز موجود ہو تو اس ذمہ داری سے اچھی طرح عہدہ براہونے کے لیے قرآن مجید نے ایسی عملی ہدایات دی ہیں جو ہر زمانے میں کام آنے والی ہیں۔ ان کو ہم قبل از جنگ، دوران جنگ اور بعد از جنگ کے مراحل میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

مرحلہ قبل از جنگ:

قرآن مجید کی رو سے مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ دشمنان دین پر اپنی دھاک بٹھائے رکھنے کے لیے افواج کو مستعد اور بہتر جنگی ساز و سامان سے لیس رکھیں تاکہ اول تو دشمن کو ان کے خلاف نبرد آزما ہونے کے تصور ہی سے وحشت ہو، اور اگر وہ اس کی ہمت کر ہی لے تو وقت آنے پر مسلمانوں کو جوابی کارروائی کرنے کی تیاری میں زیادہ وقت درکار نہ ہو۔ فرمایا:

Marfat.com

﴿وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ﴾ (انفال: 60)

''اور ان کے لیے جس حد تک کرسکو فوج اور بندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھو، جس سے اللہ کے اور تمھارے ان دشمنوں پر بھی تمھاری ہیبت رہے اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی۔''

اس آیت میں قوۃ سے مراد وہ افرادی قوت ہے جو لڑنے کے کام آتی ہے۔

رباط الخلیل سے مراد قدیم زمانے کے رسالے کی پلاٹون ہیں۔ ان میں تربیت شدہ گھوڑے اور گھڑسوار فوج ہوتی تھی اور ان کی حیثیت وہی تھی جو آج کل کی لڑائی میں ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں کی ہوتی ہے۔ افرادی قوت اور گھڑسوار فوج کو تیار رکھنے کا تقاضا یہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست فوج کے جوانوں اور افسروں کے لیے تربیتی ادارے قائم کرے، فوجیوں کو مستعد رکھے، اسلحہ کا انتخاب اس نوعیت کا ہو جو دشمنوں پر ریاست کی قوت کا رعب طاری کردے۔ فوجی قوت کے مظاہرے وقتاً فوقتاً کرتے رہنا اس مقصد کو حاصل کرنے میں مفید ہوسکتا ہے۔

ایک اسلامی ریاست زمانہ امن میں بھی اپنے دفاع سے غافل نہیں ہوسکتی اس لیے اس کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ دشمنوں کے حالات سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ وہ ان کے علاقوں میں اپنے مخبر تعینات کرسکتی ہے جو دشمن کی تیاریوں اور اہداف پر نظر رکھیں اور اگر ایسے امور کا مشاہدہ کریں جن سے مسلمانوں کے خلاف کسی خیانت کی بو آتی ہو تو وہ فی الفور اسلامی ریاست کو اس سے مطلع کریں تاکہ وہ ان کے ساتھ اپنے تعلقات پر نظر ثانی کرے اور مناسب اقدام کرسکے۔ یہ اطلاع نہایت رازدارانہ ہونی چاہیے۔ اس سلسلے میں قرآن نے منافقین کی ایک خطرناک عادت سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا ہے:

﴿وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ﴾ (النساء: 83)

''اور جب ان کو کوئی بات امن یا خطرے کی پہنچتی ہے تو وہ اسے پھیلا دیتے ہیں۔ اور اگر یہ اس کو رسول اور اپنے اولوالامر کے سامنے پیش کرتے تو جو لوگ ان میں سے بات کی تہہ کو پہنچنے والے ہیں وہ اس کو اچھی طرح سمجھ لیتے۔''

اس آیت میں دشمن کی نقل و حرکت کے بارے میں افواہوں کے روکنے کا حکم دیا گیا ہے۔ عام حالات میں بھی اجتماعی زندگی میں افواہیں نہایت خطرناک نتائج پیدا کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ جب دشمن مقابل میں موجود ہو تو افواہوں کی خطرناکی کئی گنا بڑھ جاتی ہے اور عوام اور افواج دونوں کا مورال تباہ کرنے میں ان کا ہاتھ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ قرآن نے یہ حکم دیا ہے کہ حاصل شدہ ہر اہم اطلاع کو صرف مسلمانوں کے ذمہ داروں کے علم میں لایا جائے تاکہ وہ مزید تحقیق کے بعد اس پر مناسب قدم اٹھانے کا فیصلہ کرسکیں۔

قرآن مجید کی اس رہنمائی کے تحت نبی ﷺ کفار کے ساتھ کشیدگی کے دنوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی

Marfat.com

پارٹیاں ترتیب دے کر ان کو مختلف مقامات کی طرف روانہ فرماتے تاکہ وہ ضروری معلومات حاصل کریں یا دشمن کی جنگی تیاریوں کی اطلاع لے کر آئیں۔ یہ ایک افسوس ناک حادثہ ہے کہ تاریخ کی کتابوں میں اس طرح کی مہمات کو قریش کے قافلے لوٹنے یا اس طرح کے مقاصد حاصل کرنے کی کارروائیاں بتایا گیا ہے۔ حالاں کہ مہم پر بھیجی جانے والی نفری کی معمولی تعداد پر قیاس کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں ہے کہ ان مہمات کا ہدف صرف دشمنوں کی نقل وحرکت اور جنگی تیاریوں پر نظر رکھنا تھا۔ ایسی کارروائیاں ہر زمانے میں ضروری ہوتی ہیں اور ایک اسلامی حکومت ان کا اہتمام کرتی ہے تاکہ دشمن اس کو اچانک حملہ کر کے کسی مشکل میں نہ ڈال دے۔

اس ضمن میں قرآن کی جامع ہدایت ﴿خُذُوْا حِذْرَكُمْ﴾ ہے۔ یعنی اپنی احتیاطی وحفاظتی تدابیر اختیار کرو اور دشمن کے ارادوں کے مقابل چوکنے رہو۔ "حِذْرَ" ایک جامع لفظ ہے جس میں خطرات سے بچنے کی تمام حفاظتی تدابیر شامل ہیں۔ اپنے سپاہیوں کو ہمیشہ مستعد اور تیار رکھنا، پرخطر سرحدوں پر چوکیاں قائم کرنا اور وہ تمام اقدامات کرنا جن سے ضرورت کے وقت فوج کی نقل وحرکت میں کوئی مشکل پیش نہ آئے، اس ہدایت کا لازمی تقاضا ہے۔ اس لفظ میں وہ ضروری اسلحہ جنگ بھی شامل ہیں جو دفاع کے کام آتے ہوں یا جو حملہ کے لیے ضروری ہوں۔

قتال فی سبیل اللہ کے لیے کیے گئے انتظامات کثیر مالی وسائل کا تقاضا کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس طرح کے مواقع پر دل کھول کر خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے۔ خاص جنگی تیاریوں کے ضمن میں فرمایا ہے:

﴿وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ وَ اَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ (البقرہ: 195)

''اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو تباہی میں نہ جھونکو۔ اور انفاق خوبی کے ساتھ کرو۔ بے شک اللہ خوبی کے ساتھ کام کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

جنگی تیاریوں کے سلسلے میں بخل سے کام لینا قوم کو ہلاکت کے غار میں دھکیلنے کے مترادف ہے۔ ہر زمانہ میں امت مسلمہ اپنی جنگی ضروریات کے لیے وسائل مہیا کرنے میں فیاضانہ رویہ اختیار کرے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اس خرچ کو اپنے لیے قرض حسن سے تعبیر کیا ہے اور اس کو کئی گنا اضافے کے ساتھ لوٹانے کا وعدہ فرمایا ہے۔

مرحلۂ جنگ:

جنگ سے آخری حد تک گریز اسلام کے مزاج میں ہے۔ اسی لیے قریش جیسے خطرناک دشمنوں کے بارے میں بھی فرمایا:

﴿وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ (الانفال: 61)

''اور اگر وہ مصالحت کی طرف جھکیں تو تم بھی اس کے لیے جھک جائیو اور اللہ پر بھروسہ رکھیو۔''

صلح حدیبیہ کا معاہدہ قرآن کے اسی حکم کی تعمیل کی ایک واضح دلیل ہے۔ جنگ کے بارے میں نبی کریم ﷺ

Marfat.com

کا ارشاد ہے: ''دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو بلکہ اللہ سے عافیت چاہو۔ لیکن جب مڈبھیڑ ہو جائے تو مقابلے میں ڈٹ جاؤ اور یاد رکھو کہ تلواروں کے سایوں میں جنت ہے۔''

جب فوج کشی ناگزیر ہو جائے اور دشمن صلح پر کسی طرح مائل نہ ہو تو قرآن صورت حال کے مطابق ہر نوعیت کی جنگ لڑنے کی اجازت دیتا ہے۔ اس ضمن میں اس کی تعلیم یہ ہے:

﴿اَنْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِیْعًا﴾ (النساء: 71)

''جنگ کے لیے نکلو، ٹکڑیوں کی شکل میں یا مجتمع فوج کی صورت میں۔''

ٹکڑیوں کی شکل میں نکلنے کی صورت وہ ہے جس کو آج ہم گوریلا جنگ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس میں چھاپہ مار دستے حصہ لیتے ہیں اور ضرورت کے مطابق مختصر کارروائی کرتے ہیں۔ اس جنگ کے مقاصد محدود ہوتے ہیں۔ نبی ﷺ نے بیسیوں چھاپہ مار دستے مختلف مقاصد کے حصول کے لیے مختلف علاقوں میں بھیجے۔ ان میں دشمنوں کی معاندانہ سرگرمیوں کو روکنا، اپنے زیر انتظام علاقے میں ان کی غارت گری کو بند کرنا اور تعاقب کر کے ان پر اپنی دھاک بٹھانا شامل تھا۔ ان دستوں کی کارروائی کے بعد بسا اوقات مدینہ منورہ کی ریاست کے بعض قبائل عرب سے حلیفانہ معاہدات طے پا گئے جس کے نتیجہ میں اسلامی ریاست کے دائرہ اختیار میں اضافہ ہو گیا۔ کبھی چھاپہ مار کارروائی کی صورت کمانڈو ایکشن کی ہوتی تھی جس کے نتیجے میں بعض سرگرم مخالفین کا قلع قمع مقصود ہوتا تھا۔ مجتمع فوج کی لشکر کشی سے مراد وہ جنگ ہے جس میں فوج باقاعدہ منصوبہ بندی سے صف بستہ ہو کر دشمن سے لڑتی ہے۔ نبی ﷺ کے تمام غزوات اسی نوعیت کے ہیں۔ ان میں پیادہ اور سوار فوج نے حصہ لیا۔ ان جنگوں میں اس زمانے کا ہر اسلحہ استعمال ہوا اور موقع و محل کے مطابق جنگی حکمت عملی اپنائی گئی۔

اسی باقاعدہ جنگ ہی کی ایک شکل جس کا تصور قرآن نے دیا ہے وہ کامل جنگ (Total War) ہے۔ قریش ابتدائی جنگوں میں نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکے تو انھوں نے جنگ کی منصوبہ بندی اس طور پر کی کہ تمام حلیف قبائل کی طاقت کو بھی جمع کر لیا۔ ان کا پروگرام یہ تھا کہ ہر قیمت پر دین اسلام کی بیخ کنی [1] کر دی جائے۔ اس پر قرآن نے کامل جنگ کا حکم دیا:

﴿وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِیْنَ كَآفَّةً كَمَا یُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً﴾ (التوبہ: 36)

''اور مشرکوں سے جنگ کرو من حیث الجماعت جس طرح وہ تم سے جنگ کرتے ہیں من حیث الجماعت۔''

جس طرح فوج کی کم یا زیادہ تعداد کے باعث جنگ کی نوعیت مختلف ہو سکتی ہے اسی طرح اسلحہ کی کمی بیشی یا صلاحیت کی کمزوری اور مضبوطی بھی اس کے طریق کار پر اثر انداز ہوتی ہے۔ قرآن نے ہر طرح کی صورت میں مقاصد ملحوظ رکھنے کی ہدایت فرمائی:

---

[1] بیخ کنی: جڑ اکھاڑنا، استیصال۔

Marfat.com

﴿اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ (التوبہ: 41)

''نکلو، ہلکے سامان کے ساتھ بھی اور بھاری سامان کے ساتھ بھی، اور اپنے مال اور اپنی جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔''

قرآن نے پیدل فوج اور سوار فوج دونوں کا ذکر کیا ہے اور جنگ کے دوران سپاہیوں کو ضروری حفاظتی ہتھیاروں سے ہر وقت لیس رہنے کی ہدایت کی ہے، چناں چہ میدان جنگ میں جب وہ نماز ادا کریں تو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے حفاظتی ہتھیار لگائے رکھیں اور ایک حصہ فوج ان کا پہرہ دے۔

مرحلہ بعد از جنگ:

قرآن مجید نے جنگ کے ضمن میں تین اور ہدایات ایسی دی ہیں جو جنگ کے مقاصد کو حاصل کرنے میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کا اثر فوج کے مورال پر بھی پڑتا ہے اور سلسلہ جنگ کے خاتمہ کا بھی ان سے بڑا تعلق ہے۔ ان میں پہلی ہدایت شکست خوردہ دشمن کے تعاقب کی ہے جس کے متعلق فرمایا ہے:

﴿وَ لَا تَهِنُوْا فِی ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ﴾ (النساء: 104)

''دشمن کے تعاقب میں کمزوری نہ دکھاؤ۔''

شکست خوردہ فوج کا تعاقب فتح مند فوج کے لیے کامیابی کی مقدار کو کہیں زیادہ بڑھا دیتا ہے کیوں کہ شکست کھائے ہوئے سپاہی پست حوصلہ ہو کر اپنے مورچے چھوڑتے چلے جاتے ہیں اور ان کے لیے جلد سنبھل کر دوبارہ صف بستہ ہونا مشکل ہوتا ہے۔ ان کی پسپائی سے فائدہ اٹھانے میں فاتح فوج کو کمزوری نہیں دکھانی چاہیے۔ پسپائی کے بارے میں یہ جاننا کمانڈر کا کام ہے کہ پسپائی حقیقی ہے یا مدمقابل فوج کو چکمہ دینے یا پیچھے ہٹ کر اپنی فوج کے ساتھ ملنے کی غرض سے ہے۔

اللہ کی راہ میں لڑنے والے سپاہی کا پسپائی اختیار کرنا قرآن کی رو سے ایک گناہ کبیرہ ہے، البتہ وہ جنگی چال کے طور پر یا اپنی فوج کے دوسرے حصہ کے ساتھ جا ملنے کی غرض سے ایک مورچے سے پسپائی اختیار کر سکتا ہے۔

دوسری اہم ہدایت دشمن فوج کی پشت پناہی کرنے والی طاقت کو توڑنا ہے۔ فرمایا ہے:

﴿اِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ﴾ (الانفال: 57)

''اگر تم انھیں جنگ میں پاؤ تو انھیں ایسی مار مارو کہ جو ان کے پیچھے ہیں ان کو بھی تتر بتر کر دو۔''

آیت کے موقع محل میں پشت پناہی کرنے والی طاقت یہود تھے جو قریش کو مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دیتے اور جنگ کی منصوبہ بندی میں ان کے ساتھ تعاون کرتے تھے لیکن ہر جنگ میں مختلف طاقتیں کسی محاذ جنگ کی طاقت کا باعث ہوتی ہیں۔ ان کا کھوج لگانا اور ان پر کاری ضرب لگا کر ان کو دشمن کی مدد سے باز رکھنا، نیز محاذ جنگ پر لڑنے والی فوج کی سپلائی لائن کو کاٹنا اور کمک کے راستے مسدود کرنا اس آیت کا واضح تقاضا ہے۔

Marfat.com

اس زمانے میں دنیا محدود ہو کر رہ گئی ہے اور جنگ کے اسباب پیدا کرنے والی طاقتیں محاذ جنگ سے کہیں دور ہو سکتی ہیں۔ اور ضروری نہیں کہ ان کے زور کو جنگی کارروائی ہی سے توڑا جا سکے۔ اس کے لیے ڈپلومیسی اور سفارتی ذرائع سے کام لیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن کا مقصد تو پشت پناہی کرنے والی طاقتوں کو تتر بتر کرنا ہے۔ اس کے لیے کیا ذرائع استعمال کیے جائیں، موقع ومحل اور وسائل کے لحاظ سے اس کا فیصلہ کیا جائے گا۔

تیسری اہم ہدایت دشمن کے سپاہیوں کو جنگی قیدی بنانے کی ہے۔ ان کی رہائی حالات جنگ کے خاتمہ کے بعد عمل میں آنی چاہیے۔ یہ شکست خوردہ دشمن کو اپنا احسان مند بنا کر بھی کی جا سکتی ہے اور اگر دشمن کا دم خم ابھی باقی ہے تو اس پر تاوان ڈال کر بھی ہو سکتی ہے۔ چناں چہ فرمایا:

﴿فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا﴾ (محمد: 4)

''پھر جب تمھاری مڈبھیر کافروں سے ہو تو خوب گردنیں مارنا ہے۔ جب اچھی طرح خون بہا چکو تو ان کو قید کرو۔ اس کے بعد خواہ ان کو احسان کر کے چھوڑ دو یا فدیہ لے کر، یہاں تک کہ جنگ کا زور ٹوٹ جائے۔''

ہلاکت خیز اسلحہ کا مسئلہ:

اس زمانے میں ایسے ہتھیار ایجاد ہو گئے ہیں جن کے استعمال سے بہت بڑی تعداد میں نسل انسانی تباہ ہو جاتی ہے۔ ان کی ہلاکت خیزیوں سے خود ان کی موجد قومیں خوف زدہ ہیں۔ اس کے برعکس نبی ﷺ کے زمانے کی جنگوں میں جانوں کا اتلاف حیرت انگیز طور پر کم ہے۔ سات بڑے غزوات میں کل 136 صحابہ شہید ہوئے جب کہ دشمن کے مقتولین کی تعداد 286 تھی۔ اس میں اگر چھوٹی جھڑپوں کی تعداد ملائی جائے تو مسلمان شہداء کی تعداد 255 اور کفار مقتولین کی تعداد 759 ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنے کم جانی نقصان کا سبب صرف یہ نہیں کہ اس زمانے میں بارود اور ٹی این ٹی [1] کی قسم کی چیزیں میسر نہ تھیں بلکہ اس میں نبی ﷺ کے اختیار کردہ اصول جنگ کو دخل ہے جن میں یہ ضروری قرار دیا گیا کہ صرف برسرپیکار فوج ہی کو نقصان پہنچانا جائز ہے۔ اس میں بھی اصل ہدف جانوں کا اتلاف نہیں بلکہ مقاصد جنگ کا حصول ہے۔ آج بھی دنیا جن مسائل سے دوچار ہے ان میں سرفہرست ہلاکت خیز ہتھیاروں سے بچاؤ اور جنگ کے خاتمہ کا مسئلہ ہے۔ ان کا حل اسلام کے فلسفہ جنگ کے اختیار کرنے میں مضمر ہے۔

مسلمان سپاہی کی تربیت:

جنگ سے متعلق ایک اہم سوال سپاہی کی تربیت کا ہے کیوں کہ سپاہی کو موقع جنگ پر موجود رہ کر اور اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر مقاصد جنگ کے حصول کے لیے جدوجہد کرنا ہوتی ہے۔ اگر وہ تربیت یافتہ نہ ہو تو وہ موت کے منہ میں

---

[1] ٹی این ٹی: یہ ایک کیمیکل ٹرائی نائٹروٹالوئین (TNT) ہے جو انتہائی تباہ کن ہے۔

Marfat.com

جانے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ آج ترقی یافتہ ممالک کو فوجیوں کی طرف سے یہ مسئلہ درپیش ہے کہ وہ آسائشوں کے بغیر فوج میں رہنا اور لڑنا نہیں چاہتے اور حکومتوں کے پاس کوئی ایسی بنیاد نہیں جس پر وہ ان کو موت کے بالمقابل سینہ سپر ہونے کا حوصلہ دے سکے۔ اس صورتحال کا باعث ان کے ہاں جنگ کے اخلاقی جواز کا فقدان ہے۔ قرآن مجید کے قتال فی سبیل اللہ کے تصور میں جنگ کے جواز کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔

اللہ اور غیر اللہ کے لیے لڑنے میں جو فرق ہے وہ وہی ہے جو ایک با مقصد اور بے مقصد جدو جہد میں ہوتا ہے۔ ایک میں ضمیر نہ صرف مطمئن بلکہ آرزو مند بھی ہوتا ہے کہ مقصد حق کے لیے جان کی بازی لگائی جائے، دوسرے میں ضمیر برابر کشمکش کا شکار رہتا ہے اور سپاہی اپنی جان بچانے کو ترجیح دیتا ہے۔ مسلمان سپاہی کو اس بات کی تربیت دی جانی چاہیے کہ اس کی خدمت خدا کے ہاں ترقیٔ درجات کا باعث ہوگی۔

سپاہی کی تربیت کے دو پہلو ہیں۔ ایک فنون جنگ کی تربیت، دوسری ذہنی و اخلاقی تربیت۔ جہاں تک فنون جنگ کا تعلق ہے یہ انسان کی اپنی سوچ اور تجربہ کی چیز ہیں۔ ہر زمانے کے انسان نے اپنی ضروریات کے مطابق ان کو نشوونما دی ہے۔ ایسی چیزوں سے قرآن کو بحث نہیں ہوتی۔ لہٰذا جس طرح وہ ہمیں یہ تعلیم نہیں دیتا کہ کھیت میں کیسے ہل چلائیں، کس موسم میں بیج ڈالیں، کب پانی دیں اور فصل کاٹنے تک اس کی نگہداشت کا کیا انتظام کریں، اسی طرح قرآن کو اس سے بھی بحث نہیں کہ انسان کون سے ہتھیار ایجاد کرے، ان کو استعمال کیسے کیا جائے اور جنگی چالیں کیا ہوں۔ یہ تمام باتیں انسانی تحقیق و تجربہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ قرآن کا موضوع سپاہی کی ذہنی و اخلاقی تربیت ہے۔ قرآن جنگ کا جو جواز فراہم کرتا ہے اس سے سپاہی کا ضمیر مطمئن ہوتا ہے اور وہ ترقیٔ درجات کے لیے لڑنے کو سعادت سمجھتا ہے۔ اس کے بعد قرآن سپاہی کا نظریہ زندگی درست کرتا ہے۔ وہ اس کو بتاتا ہے کہ انسان کی زندگی اللہ نے لکھ دی ہے۔ اس میں انسان اپنے اختیار سے نہ ایک سیکنڈ کی کمی کر سکتا ہے اور نہ زیادتی۔ انسان موت سے فرار اختیار کر کے قلعہ بند ہو کر ہی کیوں نہ بیٹھ جائے، موت اپنے وقت پر اس کو آلے گی۔ اسی طرح جس انسان کی موت کا وقت ابھی نہیں آیا وہ تیر و تفنگ کی بوچھاڑ میں بھی نہیں مر سکتا۔ لہٰذا ایک سپاہی کے لیے صحیح طرز عمل یہ ہے کہ وہ موت سے بے پروا ہو کر اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے۔ زندگی اور موت کا یہ تصور عزیمت و استقامت کی راہ میں استوار رہنے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ یہ ایک مسلمان سپاہی کو بہادر، جری اور فرض شناس بناتا ہے۔ وہ سر بکف ہو کر میدان جنگ میں اترتا ہے اور جانتا ہے کہ خدا کے حکم کے بغیر کوئی چیز اس کا بال بیکا نہیں کر سکتی۔

مسلمان سپاہی کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ اس کے تمام معاملات پر کامل اختیار اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اگر اس کو کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو وہ اس کے زور بازو کا نہیں بلکہ اللہ کے فضل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کو جو تکلیف پہنچتی ہے وہ وہی ہوتی ہے جو اللہ نے اس کے لیے مقدر کر دی ہو۔ اس تعلیم کے نتیجہ میں سپاہی میدان جنگ میں نہ تو اتراتا اور اکڑتا ہوا اترتا ہے اور نہ مایوس و دل شکستہ ہو کر، بلکہ وہ پر عزم ہو کر کہتا ہے:

﴿لَّن يُصِيبَنَآ إِلَّا مَا كَتَبَ ٱللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَىٰنَا وَعَلَى ٱللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ ٱلْمُؤْمِنُونَ﴾ (التوبہ: 51)

Marfat.com

”ہمیں وہی مصیبت پہنچے گی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے۔ وہ ہمارا مولا ہے اور اللہ ہی پر اہل ایمان کے لیے بھروسا کرنا زیبا ہے۔“

زندگی اور موت کے بارے میں بنیادی نقطہ نظر درست ہونے کے بعد ایک مسلمان سپاہی کے کردار کے لازمی اجزا صبر واستقامت اور توکل علی اللہ ہو جاتے ہیں۔ وہ ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کرتا ہے۔ مشکلات سے اس کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہیں ہوتی۔ مشکل سے مشکل مراحل میں وہ فرض شناسی سے اپنے مورچے پر ڈٹا رہتا ہے۔ اس کا فلسفہ زندگی اس کو بتاتا ہے کہ زندگی اس کے اعمال کی آزمائش کے لیے ہے۔ راہ حق میں اس کا مشکلات کا مقابلہ کرنا اس کی ترقیٔ درجات کا باعث ہوگا اور اگر وہ کمزوری دکھائے گا تو یہ کمزوری اس کو خدا کی نظروں سے گرانے کا باعث ہوگی۔ چناں چہ وہ اللہ کی رضا کے حصول کی خاطر استقامت کا مظاہرہ کرتا اور اس پر اللہ سے اجر کی امید رکھتا ہے۔

ایک مسلمان سپاہی کو تربیت دی جاتی ہے کہ اس کو اصل اعتماد اپنے زور بازو، اپنے اسلحہ یا اپنی فوج کی کثرت تعداد پر نہیں بلکہ صرف اللہ کی ذات پر ہونا چاہیے جو حالات کو سازگار بنا دینے، اکثریت کے دل میں اقلیت کا خوف بٹھا دینے اور اپنے دین کی خاطر جدوجہد کرنے والوں کی نصرت پر قادر ہے۔ اس کے بندے جب اس کی نصرت پر ایمان رکھتے ہوئے لڑتے ہیں تو وہ ان کی مدد اپنے فرشتوں اور غیر مرئی [1] لشکروں سے کرتا ہے۔

سپاہی کی حوصلہ مندی اور اللہ پر اعتماد قائم رکھنے کے لیے اس کو نماز اور ذکر الٰہی کا سہارا لینے کا حکم ہے۔ خدا کی یاد اس کا تعلق اپنے اصل کارساز سے جوڑے رکھتی ہے اور اس کا توکل مضمحل نہیں ہونے پاتا۔

مسلمان سپاہی کو اس بات کی تربیت دی جاتی ہے کہ اس کا نظم وضبط کی پابندی کرنا ایک عبادت ہے۔ اس کو ہمیشہ مستعد رہنا، اور احکام پر دل وجان سے کاربند رہنا ہوگا۔ اس کی قوت کو کمزور کرنے والی چیز احکام کے خلاف بحثیں اٹھانا اور رائے ہموار کرنا ہے۔ قرآن نے اس عادت کو نجویٰ سے تعبیر کیا اور ایک شیطانی صفت قرار دیا ہے:

﴿إِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطَانِ لِيَحْزُنَ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْئًا إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ﴾

(المجادلہ: 10)

”یہ سرگوشیاں شیطان کی طرف سے ہیں تاکہ وہ ایمان والوں کو غم پہنچائے حالاں کہ اللہ کے اذن کے بغیر وہ ان کو ذرا بھی نقصان پہنچانے پر قادر نہیں۔“

قرآن کی حربی تعلیم قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں کے لیے کامیابیوں کی ایک کلید ثابت ہوئی اور انھوں نے اس کی بدولت اپنے وقت کی مہذب دنیا کے ایک بڑے حصہ پر حکومت کی۔ آج چودہ سو سال بعد بھی یہ کامیابی کی ضامن ہے بشرطیکہ ہم اس کی تعلیم کو رواج دے سکیں اور اس کے مطابق عمل کر سکیں۔

☆......☆......☆

[1] غیر مرئی: نظر نہ آنے والا۔

Marfat.com

اِصلاحِ مُعاشرہ

معاشرہ کسی قوم کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے جس کی قوت اور درستی پر قوم کے وجود، استحکام اور بقاء کا انحصار ہے۔ معاشرے کے بناؤ اور بگاڑ سے قوم براہ راست متاثر ہوتی ہے۔ معاشرہ اصلاح پذیر ہو تو اس سے ایک قوی، صحت مند اور باصلاحیت قوم وجود میں آتی ہے اور اگر معاشرہ بگڑا ہوا ہو تو اس کا فساد قوم کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے۔

معاشرے کا کردار بننے یا بگڑنے کا عمل فی الفور مکمل نہیں ہو جاتا بلکہ اس میں طویل مدت صرف ہوتی ہے۔ بگاڑ کی راہ پر چلنے والے معاشرے میں اچھی اقدار ایک ایک کر کے منہدم ہوتی چلی جاتی ہیں۔ نیک و بد کے بارے میں شدید احساس رکھنے والے لوگ تو اس خرابی کو جلد بھانپ جاتے ہیں لیکن عام لوگوں پر یہ مدتوں بعد کھلتی ہے۔ اسی طرح معاشرے کی اصلاح کا کام بھی ہے۔ جس طرح ایک بنیاد اٹھا کر اس پر ایک ایک اینٹ جوڑنے سے دیوار مکمل ہوتی ہے اسی طرح اصلاح کا کام بھی ایک تعمیر کی منصوبہ بندی چاہتا ہے۔ جب یہ کام منصوبہ بندی کے بغیر کیا جائے تو اس کی کامیابی محل نظر ہوتی ہے۔

قرآن مجید نے قوموں کے عروج و زوال کی جو تاریخ بیان کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قومیں جب بھی خدا اور آخرت کے تصور سے بے نیاز ہوتی ہیں یا ان کا یہ تصور ناقص ہوا ہے اور ان میں اخلاقی مفاسد سرایت کر گئے ہیں تو اگر قوم میں اصلاح احوال کا جذبہ پیدا نہیں ہوا تو وہ ہمیشہ برباد ہو گئی ہے۔ اس کی تباہی میں اس سوال کی کبھی کوئی اہمیت نہیں رہی کہ اس کے فساد کی نوعیت کیا ہے بلکہ ہر برا عمل خواہ اس کی نوعیت اس تکبر کی رہی ہو جو عاد اور ثمود میں تھا، اس اخلاقی گراوٹ کی رہی ہو جو قوم لوط میں پائی جاتی تھی یا اس تاجرانہ خیانت اور بددیانتی کی ہو جس کا مظاہرہ قوم شعیب نے کیا، جب بھی وہ معاشرے کا اجتماعی کردار بن گیا تو اس کی موت کا پیغام لے آیا۔ قرآن مجید کے اس فلسفے کی رو سے ایک قوم کے آبرومند ہونے کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے کے اندر خدا کا خوف اور اس کے ساتھ صحیح بنیادوں پر تعلق پایا جائے۔ دلوں میں آخرت کے محاسبے کا اندیشہ موجود ہو اور کسی بھی قسم کے فساد اعمال کو معاشرے پر مسلط ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔ یہ مقصد ظاہر ہے کہ صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب قوم کے اندر اصلاح معاشرہ کے لیے ایک مسلسل جدوجہد کی جاتی رہے اور کسی بھی فساد کے معاملے میں چشم پوشی سے کام لے کر اسے قوم کے اجتماعی وجود میں راہ پانے کا موقع نہ دیا جائے۔

Marfat.com

معاشرے کے اندر جب فساد راہ پا جاتا ہے تو اس کا ظہور نہ تو کسی ایک ہی شکل میں ہوتا ہے اور نہ کسی ایک ہی طبقے تک محدود رہتا ہے بلکہ ہر شعبہ زندگی اور قوم کا ہر طبقہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔ قوم کے سنجیدہ عناصر جب اصلاح احوال کے لیے فکر مند ہوتے ہیں تو متنوع مفاسد [1] پر گرفت کے لیے انھیں کوئی طریقہ سجھائی نہیں دیتا۔ وہ خرابی کی ہمہ گیری [2] کو دیکھتے ہوئے اشتہار بازی کا سہارا لیتے ہیں اور اس طرح دل کو تسلی دیتے ہیں کہ انھوں نے قوم کی اصلاح کا حق ادا کر دیا۔ با اختیار طبقہ اخلاقی فساد کا علاج نگران ادارے قائم کر کے کرنا چاہتا ہے۔ رشوت ستانی کو فروغ پاتے دیکھتا ہے تو اس کے انسداد کا محکمہ بنا دیتا ہے۔ ملاوٹ اور چور بازاری کی وبا دیکھتا ہے تو چھاپہ مار عملہ ترتیب دے کر اس پر قابو پانا چاہتا ہے۔ حکومت کے کارکنوں میں بدعنوانی کی گرم بازاری دیکھتا ہے تو قواعد وضوابط میں ترامیم کا سہارا لیتا ہے۔ اصلاحی کمیٹیاں قائم کی جاتی ہیں کہ وہ اس ہمہ گیر فساد پر قابو پانے کے لیے سفارشات پیش کریں۔ اس ساری سرگرمی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی کے ہر دائرے میں ادارے اور تنظیمیں تو قائم ہوتی چلی جاتی ہیں لیکن بات جہاں تھی وہیں رہتی ہے بلکہ مفاسد نت نئی شکل اختیار کرتے سامنے آتے ہیں اور معاشرے میں مزید پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام نگران اداروں اور تنظیموں کا عملہ اسی فساد میں مبتلا معاشرے سے آتا ہے۔ وہ نہایت آسانی سے خود انھی خرابیوں کا شکار ہو جاتا ہے جن کی روک تھام کے لیے اس کا تقرر کیا گیا تھا۔

ہمارے نزدیک کسی بھی بیماری کا صحیح علاج صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے جب اس کے اسباب کا صحیح طور پر تعین کر لیا جائے۔ معاشرے کے فساد کے اسباب کے تعین میں بالعموم غلطی کی جاتی ہے۔ کوئی جرم یا گناہ بلاوجہ صادر نہیں ہوتا بلکہ اس کے مرتکب کے دل میں خداوند تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی کمی، تصور آخرت کے شعور میں غلطی اور دنیا کی محبت اس کا سبب بنتی ہے۔ یہ بنیادی سبب پایا جائے تو پھر ہر شعبۂ زندگی میں طرح طرح کے فساد جنم لیتے ہیں۔ انسانی ذہن بڑا زرخیز ہے۔ وہ ایک سے ایک بڑھ کر جرائم کی انوکھی اور نت نئی شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ لہٰذا جب تک لوگوں کی تربیت اس نہج پر کرنے کا انتظام نہ کیا جائے کہ وہ خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں، دنیا کے بارے میں ان کا تصور ذمہ دارانہ ہو جائے اور وہ یہ شدید احساس رکھتے ہوں کہ آخرت میں ان کے تمام اعمال کی باز پرس ہونے والی ہے جس کا نتیجہ ابدی عذاب کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے، لہٰذا ان کی فلاح اچھے کردار کو اپنانے ہی سے وابستہ ہے، اس وقت تک ان کی اصلاح کی توقع رکھنا عبث ہے۔

صحیح بنیاد پر اصلاح معاشرہ کا بیڑا اٹھایا جائے تو اس کی طرف پہلا قدم ایک فرد کی اصلاح کرنا ہوگا یعنی معاشرے کے ہر فرد کے ذہن میں ان حقائق کو راسخ کیا جائے جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ صحیح علم ہی سے صحیح عمل پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لیے موت وحیات کے اصل حقائق کے راسخ علم سے فرد کے اندر تقویٰ، پرہیزگاری،

---

[1] متنوع مفاسد: قسم قسم کی خرابیاں۔

[2] ہمہ گیری: ہر طرف پھیلاؤ۔

Marfat.com

خشیت الٰہی اور خوف آخرت پیدا ہوگا۔ ایک فرد کے دل کا یہ نور اس کے اخلاق و کردار کے تمام گوشوں کو روشن کردے گا اور آپ سے آپ اس کی عملی اصلاح کے آثار پیدا ہو جائیں گے۔

ایک فرد کے اندر کا یہ نور اس کی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس سے اس کا قریبی ماحول اور کنبہ منور ہوتا ہے۔ ایسا فرد اپنے بیوی بچوں اور متعلقین کو گمراہی میں نہیں دیکھ سکتا۔ اسے اس ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے کہ اسے ایک گلے کی نگرانی کا کام سونپا گیا ہے۔ اگر گلے کی ایک بھیڑ بھی ریوڑ سے کٹ کر بھٹک جائے گی تو اس کا مالک اس کی نالائقی پر ناراض ہوگا۔ لہٰذا ایسا شخص اپنے زیر اثر لوگوں کی فکری و اخلاقی اصلاح کے لیے ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔ اس کا یہ عمل معاشرے کی اصلاح کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

اہل دنیا کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ پورے کا پورا معاشرہ غیر ذمہ دار اور خدا اور آخرت سے بے نیاز ہو جائے اور ان کو ٹوکنے والا اور برا سمجھنے والا کوئی نہ رہے۔ اس کے برعکس اہل دین کو یہ ذمہ داری بتائی گئی ہے کہ وہ اپنے حلقۂ اثر میں برائی کے نفوذ کی مزاحمت کریں اور لوگوں میں نیکی اور بھلائی کو رواج دینے کی مثبت کوشش کریں۔ اس سلسلے میں جو شخص جتنا بااثر ہوتا ہے اس کی ذمہ داری اسی قدر زیادہ بتائی گئی ہے، چناں چہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص کسی کو برائی کرتا دیکھے تو وہ اگر بااثر ہو تو طاقت سے اس کا قلع قمع کردے۔ اگر وہ ایسا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو اپنی زبان سے لوگوں کو قائل کرے کہ وہ اس برائی کو ترک کردیں اور نیکی اختیار کریں۔ اگر وہ برائی کے خلاف زبان کھولنے سے بھی معذور ہے، تو اس کے ایمان کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ وہ اس برائی سے دل میں نفرت رکھے اور اس کی آلودگی سے اپنا دامن بچائے رکھے۔ ایمان رکھتے ہوئے اس سے کم تر کسی کردار کا مظاہرہ کرنا کسی مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔

اصلاح معاشرہ کی اس تحریک میں جو فرد کی اصلاح کو مقصد بنائے، ہر نیک آدمی اور ہر مذہبی و سماجی ادارہ حصہ لے سکتا ہے۔ دینی مدارس، سکول، کالج اور یونیورسٹیاں اس میں مد ثابت ہو سکتی ہیں۔ صحیح الفکر سیاسی جماعتیں بھی یہ کام کرسکتی ہیں اور یہ تحریک معاشرے کے ایک مستقل پروگرام کے طور پر جاری رہ سکتی ہے۔ اس تحریک میں ارباب حکومت کا یہ حصہ ہوتا ہے کہ وہ اصلاح کی تمام کوششوں کو تقویت دینے اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے پالیسیاں بنائیں اور اس طرز فکر کی حوصلہ شکنی کریں جو اس کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہو۔ وہ ملک میں ایسا تعلیمی نظام رائج کریں جو اصل حقائق زندگی سے لوگوں کو روشناس کرا کر ان کو ذمہ دار شہری بنائے اور ان میں خوف خدا اور خوف آخرت پیدا کردے۔ ان لوگوں پر ان کی گرفت بڑی سخت ہو جو معاشرے میں فساد کا بیج بوئیں۔ وہ حکومت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک مستقل شعبہ قائم کریں جس کے پیش نظر مقصد ہی یہ ہو کہ وہ نیکیوں اور بھلائیوں کی ترغیب دے اور برائیوں کو مٹانے کے لیے کمر بستہ رہے۔ ان کا عدالتی نظام جرائم کی سزا جلد دینے کا قائل ہو اور مقدمات کو طول دے کر فیصلوں میں تاخیر نہ کرے۔

Marfat.com

یہ تو ہے اصلاح معاشرہ کا اصل طویل المیعاد پروگرام جس سے مطلوبہ نتائج حاصل ہونے کی توقع ہو سکتی ہے لیکن امت مسلمہ کے اچھے حکمرانوں نے اپنے اوپر بعض پابندیاں عائد کر کے بھی اپنی رعایا کے لیے اچھی تربیت کا سامان فراہم کیا۔ عوام اپنے حکمرانوں کی تقلید کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں اور ان کی پسند معاشرے کا فیشن قرار پاتی ہے، چنانچہ خلفائے راشدین نے اپنا معیار زندگی ہمیشہ اتنا پست رکھا کہ ان میں اور ایک کم آمدنی والے کارکن کے معیار زندگی میں کوئی فرق نظر نہ آتا تھا۔ ان کی نگاہ میں امیر اور غریب دونوں کو یکساں قدر و منزلت حاصل تھی۔ وہ جہاں دولت کا مظاہرہ دیکھتے فوراً اس کی حوصلہ شکنی کرتے۔ خلفائے راشدین کے اس طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ کثرت مال معاشرے میں باعث عزت نہ تھی، حصولِ زر زندگیوں کا مقصد نہ بنا اور امیر و غریب کے تفاوت ❶ نے معاشرتی بے انصافیوں کو جنم نہیں دیا۔

خلفائے راشدین کے دور کی دوسری بڑی خصوصیت قانون کا عادلانہ نفاذ تھا جس کے لیے وہ ہمیشہ مستعد رہتے تھے۔ وہ نفاذِ قانون میں نہ عمال حکومت کا لحاظ کرتے تھے اور نہ اپنے اعزہ و اقارب کا۔ درۂ عمر کو جو شہرت حاصل ہوئی ہے وہ اس بناء پر نہیں کہ خدانخواستہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کو اپنے منصبی تفوق اور اختیارات کا احساس دلانے کے لیے ان پر ناروا یہ درہ برسایا کرتے تھے بلکہ یہ شہرت اس بناء پر ہے کہ یہ درہ اس وقت بلا تاخیر حرکت میں آجاتا تھا جب کوئی شخص قانون سے بے پروائی کا اظہار کرتا، کسی کمزور پر ظلم کرتا یا اخلاقی تربیت کے لیے اسے تادیب کی ضرورت ہوتی۔ درۂ عمر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فرض شناسی، بیدار مغزی، عدل گستری ❷ اور قانون و اخلاق کی پاسداری کی ایک علامت تھا۔

ملک کے حکمرانوں کے اندر جب یہ صفات پیدا ہو جائیں تو ان کی رعایا کے لیے یہ قابل تقلید نمونہ بن جاتی ہیں۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ ان کے حکمران وسائل پر اختیار رکھتے ہوئے زندگی کی آسائشوں سے اپنے آپ کو محروم رکھے ہوئے ہیں۔ وہ دولت سمیٹنے کی کوئی آرزو نہیں رکھتے، محض امارت باعث عزت تصور نہیں کی جاتی۔ قانون و اخلاق کی بالادستی قائم رکھی جاتی ہے اور عدل و انصاف کے تقاضوں سے حکمران اپنی ذات کو بھی مستثنیٰ قرار نہیں دیتے تو یہی رسم حکومت کے اہل کاروں اور عوام میں بھی چل پڑتی ہے۔

ارباب حکومت کے علاوہ معاشرے کے دوسرے سربرآوردہ لوگ، خواہ وہ سیاسی میدان سے تعلق رکھتے ہوں یا مذہبی، سماجی یا دوسرے طبقات سے، وہ بھی اپنے طرز عمل سے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں پسندیدہ طرز زندگی کو رواج دینے کی طرح ڈال سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اپنے اوپر چند پابندیاں عائد کریں اور ایسے فلسفۂ زندگی کا پرچار کریں جس کے نتیجے میں اخلاقی فساد کی راہیں مسدود کی جاسکتی ہوں۔ عوام الناس چوں کہ بڑوں کے طریقے سے فوراً متاثر ہوتے اور ان کی تقلید میں عزت محسوس کرتے ہیں، اس لیے اصلاح معاشرہ کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے یہ طریقہ قلیل المیعاد اور نسبتاً آسان ہے۔

☆......☆......☆

❶ تفاوت: فاصلہ، فرق۔ ❷ عدل گستری: انصاف پھیلانا۔

Marfat.com

اپیل

مکرمی ومحترمی .... اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

جامع مسجد، دارالعلوم عزیزیہ اور مجلس حزب الانصار کے زیر اہتمام چلنے والے ادارے آپ کے ہیں۔ یہ ادارے دین کی ڈھال ہیں اور مسلمانوں کی آبرو، یہ ہمارا مستقبل ہیں اور اسی میں ہماری اخروی اصلاح اور اللہ کی خوشنودی مضمر ہے۔ان اداروں کی بقا، تعمیر اور ترقی رب الکریم کے خاص فضل وکرم سے ہے۔آج بھی ان اداروں کی تمام ضرورتیں بفضلہ تعالیٰ آپ ہی کے جذبہ انفاق سے پوری ہورہی ہیں، البتہ موجودہ مہنگائی اور ملکی وملی حالات کے پیش نظر آپ کو آگے بڑھنا ہوگا تاکہ بزرگوں کے لگائے ہوئے یہ تناور درخت سدا بہار شاداب رہیں۔اس سلسلے میں آپ سے خصوصی تعاون کی درخواست ہے جس کی درج ذیل صورتیں ہوسکتی ہیں۔

★ دارالعلوم عزیزیہ کے کسی ایک طالب علم کے تعلیمی اخراجات یا کسی ایک استاد کی تنخواہ کا ذمہ لے لیں۔

★ اپنی آمدنی میں سے ہر ماہ یا سالانہ ایک متعین رقم فری ڈسپنسری اور سالانہ فری آئی اینڈ میڈیکل کیمپ کے لئے مختص کردیں۔

★ برصغیر پاک وہند کے قدیمی رسالہ ماہنامہ شمس الاسلام کے 10 پرچے لیکر مناسب افراد تک پہنچائیں۔

★ مسجد ومدرسہ کے تعمیری پلان میں سے کسی ایک کا مکمل یا جزوی خرچہ اپنے ذمے لے لیں۔

اللہ تعالیٰ پتھروں کے نیچے دبی ہوئی اپنی ناتواں مخلوق کو رزق دے سکتا ہے تو وہ اپنے دین کے لئے پھیلائی ہوئی جھولی کو بھی خالی نہیں رہنے دے گا وہ اُسے امید اور اعانت کی کرنوں سے جگمگادے گا۔

اللہ تعالیٰ آپ کو مسجد ومدرسہ کے خیر وخوبی کے کاموں میں شریک ہونے کی توفیق بخشے۔آمین۔

والسلام

صاحبزادہ ابرار احمد بگوی

امیر مجلس حزب الانصار

بھیرہ ضلع سرگودھا

برائے رابطہ: 0301-6701340

Marfat.com

مجلس مرکزیہ حزب الانصار بھیرہ

1347ھ۔1929ء

اغراض و مقاصد

☆ عام تعلیم اور اسلامی تعلیم کا فروغ

☆ مریضوں کا علاج اور حفظان صحت

☆ مستحق افراد اور خاندانوں کی امداد

☆ ہنر سکھانے اور ضرورت مندوں کی اعانت

مسلک

اعتدال و اصلاح و
اتحاد بین المسلمین

ذرائع و وسائل

توکل علی اللہ اور
اصحاب خیر کا تعاون

شعبہ جات و ادارے

شعبہ علوم دینیہ

دار العلوم عزیزیہ، تجوید و حفظ قرآن اور ذیلی مدارس کا قیام

شعبہ تبلیغ و ارشاد

سالانہ کانفرنس اور مقامی و اصلاحی دورے/ مذاکرے

شعبہ تعلیم و تربیت

☆ دروس قرآن و حدیث کا اہتمام ☆ شعبہ تالیف و اشاعت

☆ اقراء ماڈل سکول ☆ مہتہ مڈل سکول ☆ دستکاری سینٹر

☆ شعبہ تحقیق و افتاء ☆ جامع مسجد بگویہ ☆ بگویہ لائبریری

☆ جریدہ شمس الاسلام

خدمت و سعادت

☆ مستحقین کی امداد و اعانت ☆ سالانہ فری آئی کیمپ

☆ ٹی بی اور امراض سینہ کا علاج ☆ نادار طلبہ کی کفالت

☆ بھیرہ انفارمیشن اینڈ ریسرچ سینٹر ☆ فری ڈسپنسری

برائے چیک/ ڈرافٹ/ عطیات/ زکوۃ/ صدقات وغیرہ کے لیے
مجلس حزب الانصار، اکاؤنٹ نمبر 2-03890101001026
مسلم کمرشل بینک لمیٹڈ، بھیرہ، ضلع سرگودھا

صاحبزادہ ابرار احمد بگوی (ایم اے اسلامیات، ایم اے تعلیمات) امیر مجلس حزب الانصار و
خطیب جامع مسجد بگویہ، بھیرہ ضلع سرگودھا 0301-6701340, 048-6690847

Marfat.com

جلد اوّل

توضیحاتِ فکرِ فراہی

علّامہ خالد مسعودؒ
تلمیذ
مولانا امین احسن اصلاحیؒ

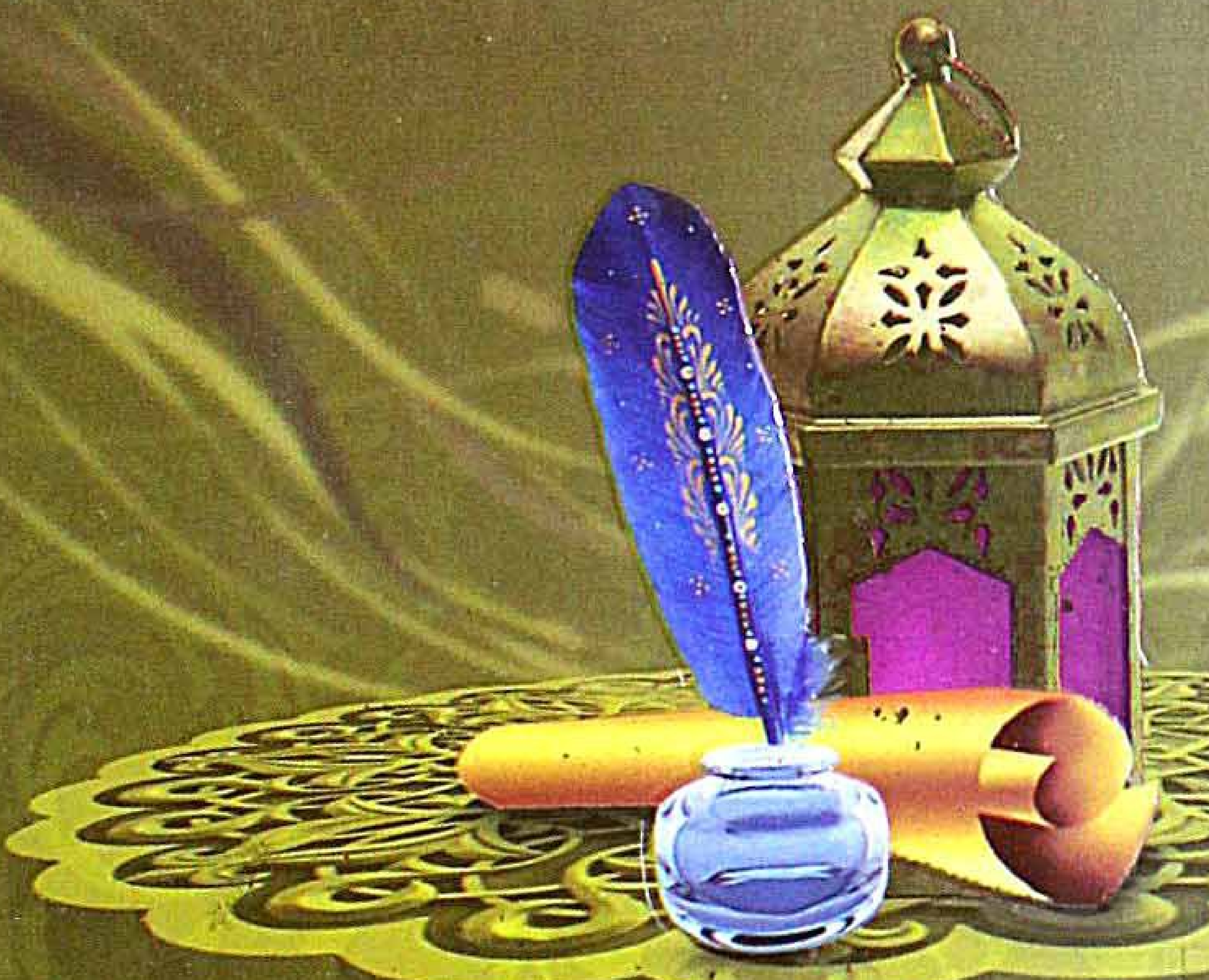

ترتیب و تدوین

حسّان عارف / محسن فارانی

مجلس مرکزیہ حزب الانصار بھیرہ

Marfat.com